اردو نثر کا دہلوی دبستان
ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار
Rs. 20

اُردو نثر کا دہلوی دبستان

ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار

ایم-اے، ال-ال-بی، پی ایچ-ڈی

استاد شعبۂ اُردو ایس-بی آرٹس کالج بیجاپور

شالیمار پبلیکیشنز-نیا ملک پیٹھ

حیدرآباد نمبر ۳۶ ۵۰۰۰۰

اشاعت ...... اوّل

سنہ طباعت ...... ڈسمبر ۱۹۷۵ء

کتابت ...... سید منظور محی الدین طلیاری

طباعت ...... کلی فائن پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار حیدرآباد عـلا ۱ے-پی

بائینڈنگ ...... محبوبیہ بک بائینڈنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد

ناشر ...... شالیمار پبلیکیشنز نیا ملک پیٹھ حیدرآباد
(۵۰۰۰۳۶)

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۱

قیمت ...... بیس ۲۰ روپے

ملنے کے پتے

- ناشر:- شالیمار پبلیکیشنز - نیا ملک پیٹھ - حیدرآباد نمبر- 500036
- مصنف:- احمد منزل، ۱۹۱ سقاف روضہ، بیجاپور- 586101
- اسٹوڈنٹس بک ہاؤز، چار مینار حیدرآباد- 500002
- انجمن ترقی اُردو ہند، اُردو گھر، نئی دہلی- 110001
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-
- "برگ آوارہ" ہفتہ وار- حیدرآباد 500001
- ادبی ٹرسٹ بکڈپو- کنارا بنک، عابد روڈ- حیدرآباد 500001
- اقبال بک ہاؤس، شاہ گنج محلہ قطب عالم ۱۰۶-۳-۲۰ حیدرآباد 500002

والد مرحوم حضرت غلام احمد قادری کے نام

اس مقالے پر مولف کو شیواجی یونیورسٹی کولہاپور مہاراشٹر)
سے ۱۹۷۹ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔

فہرست

تعارف

پیش نظر تصنیف جناب ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار لکچرار اُردو آرٹس کالج بیجاپور کا تحقیقی مقالہ ہے جو شیواجی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا تھا اور اب ضروری حذف و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

کوئی دس سال قبل کی بات ہے میرے عزیز و محترم رہنما مرحوم ڈاکٹر سیّد عبداللطیف کی وساطت سے جناب عبدالرحیم سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ ربط آج تک برقرار ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب گرمائی چھٹیاں بالعموم حیدرآباد میں گزارتے ہیں اور اس دوران میں وقتاً فوقتاً اپنے علمی مشاغل کے سلسلے میں مجھ سے تبادلہ خیال کیا کرتے ہیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران مجھے جناب عبدالرحیم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور علمی مسائل سے اُن کی لگن اور علم و ادب کے لیے ان کی وقف شدگی کے جذبہ نے مجھے بےحد متاثر کیا۔

اُردو کے ایک محقق اور استاد ہونے کے قطع نظر ڈاکٹر عبدالرحیم کی شخصیت میرے لیے اس اعتبار سے کشش ہے کہ وہ قدیم اُردو کے عظیم المرتبت شاعر ملک الشعراء نصرتی کے راست اخلاف میں سے ہیں۔ جاگیردار جو اُن کے خاندانی نام کا جزو ہے ان مناصب و عطایا کی یادگار ہے جن سے والئ بیجاپور علی عادل شاہ شاہی نے جو خود بھی ایک خوش فکر شاعر تھا اپنے لڑکپن کے دوست عزیز مصاحب رزم و بزم کے ساتھی ملک الشعراء نصرتی کو نوازا تھا۔ مرحوم مولوی عبدالحق نے جب اپنی کتاب "نصرتی" تصنیف کی تھی

تو بیجاپور میں انہوں نے جناب جاگیردار کے آبائی مکان میں قیام کیا تھا' اور نثر کی ترقی کے تعلق سے ان تاریخی اسناد کی چھان بین کی تھی' جو ڈاکٹر رحیم کے گھرانے میں اب تک محفوظ ہیں۔ جب میں ڈاکٹر عبدالرحیم کے پختہ ادبی مذاق' سلجھے ہوئے اور تیز ذہن' اور ان کی نفاست و شائستگی پر غور کرتا ہوں' تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر اور فنکار کے ذوق و ذہن کا کچھ حصہ تو انہیں ملنا ہی تھا۔ پھر اُن کے مزاج میں وہ سادگی اور انکسار ہے' جو ہمیشہ صاحبانِ علم و فضل کا خاصہ رہا ہے۔

"اُردو نثر کا دہلوی دبستان" دہلوی نثر نگاروں کی ادبی خدمات کی مبسوط تاریخ ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مصنف نے' صرف یہی نہیں کہ دہلی میں نثر کے ابتدائی نمونوں سے ابتدا کی ہے' بلکہ اُردو زبان کے آغاز کے مسئلہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور محمد حسین آزاد سے لے کر' محمود شیرانی' شوکت سبزواری اور مسعود حسین خاں کی آرا کا' اور دوسری طرف گریرسن' جولیس بلاک اور سنیتی کمار چٹرجی کے نظریوں کا تنقیدی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا ہے' اور ان مصنفین کے طویل اقتباسات پیش کر کے' نتائج اخذ کیے ہیں۔ پھر اُردو نثر کے اوّلین نقوش کا سُراغ لگانے کے لیے' ان ملفوظات کا جائزہ لیا ہے' جو تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کے مختلف صوفیوں سے منسوب ہیں۔ چنانچہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی' بابا فرید' محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین' سے لے کر' چودھویں صدی کے اواخر کے صوفیوں میں' شیخ شرف الدین یحییٰ منیری' اور خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی تک' سارے بزرگوں سے منسوب ملفوظات یا مختصر نثری تحریروں پر نگاہ ڈالی ہے اور بالآخر مربوط اُردو نثر کے آغاز کا

سررشتہ' خواجہ بندہ نواز کے توسط سے' دہلی سے جوڑا ہے۔ اگرچہ خواجہ صاحب سے منسوب کتابچہ' معراج العاشقین کے بارے میں' یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ عہد مابعد کے کسی اور مصنف کی تصنیف ہے' لیکن خواجہ صاحب سے منسوب' دوسرے اُردو رسالوں اور تحریروں کی موجودگی میں' ڈاکٹر عبدالرحیم کے ادعا سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پھر خواجہ صاحب کی تقلید میں' دکن کے نامور صوفیوں کے ہاتھوں اُردو نثر کی نشو و نما' اور سولھویں اور سترھویں صدی میں' دکن میں ادبی نثر کے ارتقا پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۷۰۰ عیسوی کے لگ بھگ' ولی کے سفرِ دہلی کے بعد' دہلی میں اُردو شعر و ادب کی شمع روشن ہوئی' اور اٹھارویں صدی میں اُردو نثر کے متعدد کارنامے یکے بعد دیگرے سامنے آنے لگتے ہیں۔ جن میں فضلی کی "کربل کتھا" "تحفہ مہرافروز و دلبر" شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم قرآن' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۱۸۰۰ عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کا قیام' اُردو نثر کی ترقی کی راہ میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کے سب سے نامور مصنف میرامن' دلّی والے تھے۔ میرامن کو دلّی پر' اور دلّی کو میرامن پر ناز تھا۔ ڈاکٹر جاگیردار نے میرامن کے نثری کارناموں سے بھی' دہلوی نثر کی نشو و نما کے تحت بحث کی ہے۔ انشا نے جو میرامن کے معاصر تھے' اُنیسویں صدی کے ربع اول میں' اپنی دو معرکتہ الآرا کتابیں' "رانی کیتکی کی کہانی" اور "دریائے لطافت" تصنیف کیں۔ پھر انیسویں صدی کے ربع دوم میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ دہلی کالج کے فاضل اساتذہ اور یہاں کے نامور سپوتوں نے' اُردو کو علمی زبان

بنانے کی راہ میں پہلا قدم اُٹھایا، اور اُردو نثر کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ کتاب کے تیسرے باب میں "دہلی میں اُردو نثر کا آغاز و ارتقا" کے عنوان کے تحت کم و بیش ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں، دہلی میں اُردو نثر کی نشو و نما کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ بحث جعفر زٹل کی نثری تحریروں سے لے کر میر امن کی تصانیف، اور پھر اساتذۂ دہلی کالج کی ادبی خدمات کو محیط ہے۔

۱۸۵۰ء میں اُردو نثر کے افق پر ایک نیا ستارہ اُبھرا، اور غالب نے اُردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کر کے اُردو نثر کو ایک نیا اسلوب بخشا۔ مصنف نے "غالب اور معاصرین غالب" کے عنوان سے، ایک مستقل باب تحریر کیا ہے، اور اس عہد کے معروف اور گم نام نثر نگاروں کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

اُنیسویں صدی کا نصف آخر اُردو زبان کی تاریخ کا زرّیں زمانہ ہے۔ یہ اُردو زبان و ادب پر، انگریزی زبان و ادب کے اثرات کا دور ہے جسے اُردو ادب کی تاریخ میں، دورِ جدید سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ "سرسیّد اور ان کے رفقا اور معاصرین" کے عنوان سے، ڈاکٹر جاگیردار نے، اس عہد میں اُردو نثر کے ہمہ جہتی ارتقا، اور نئی اصناف ادب کی نشو و نما پر غائر نگاہ ڈالی ہے۔ پھر چونکہ سرسیّد اور ان کے رفقا، حالیؔ، نذیر احمد، محمد حسین آزادؔ اور ذکاء اللہ، سب کے سب، یا تو دہلوی تھے، یا دہلی کی ادبی روایات سے وابستہ، اسلئے مصنف نے متذکرہ بالا ادیبوں کو بھی، بجا طور پر، دہلی کے نثر نگاروں میں شمار کیا۔

چھٹے باب میں فاضل مقالہ نگار نے بڑی تحقیق و جستجو کے ساتھ، ان اخبارات کا جائزہ لیا ہے، جو مختلف اوقات میں، دہلی سے جاری ہوئے۔ اس سلسلے میں ۱۸۳۶ء اور ۱۸۳۷ء میں جاری ہونے والے "دہلی اردو اخبار"

اور سید الاخبار سے لے کر ۱۸۵۵ء تک کے اخبارات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

آخری باب میں "دہلویت" کے عنوان سے، دبستان دہلی کی خصوصیات اور اس دبستان کی عظمت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس موضوع پر گذشتہ سوا سو سال کے دوران، قدیم و جدید انداز میں، خاصی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں اور لکھنؤ کی طوائفین کے کوٹھے، جو کسی زمانے میں زبان کے معیار کے لیے مشہور تھے، اب اگلے وقتوں کی باتیں ہو گئیں ہیں۔ اردو نہایت وسیع جغرافی علاقے میں بولی جانے والی زبان ہے۔ جہاں تک بول چال کی زبان کا تعلق ہے، مختلف علاقوں میں بولیوں کا اختلاف (DIALECTICAL DIFFERENCE) ہماری زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کی علامت ہے، جو بالکل فطری ہے اور ناگزیر۔ یہی حال انگریزی زبان کا ہے۔ لیکن تحریری اور علمی زبان کا معیار متعین ہے، اور عہد حاضر میں معیاری علمی زبان، وہ زبان ہے جس کی نشو و نما میں دہلی کالج اور پھر سرسیّد اور ان کے رفقا نے اہم رول ادا کیا تھا، اور جسے جامعہ عثمانیہ نے ایک متمول علمی زبان کی حیثیت عطا کی۔ آج اردو بولنے والوں کے نزدیک خواہ وہ برِاعظم ہند میں بستے ہوں، یا انگلستان اور امریکا کے شہروں میں، یہی زبان، علمی زبان کا معیار ہے۔ جس کی تشکیل میں کسی خطہ واری تخصیص کے بغیر، دہلی، حیدر آباد، لکھنؤ، پنجاب اور دوسرے اقطاع ملک کے اکابر اُردو نے حصّہ لیا تھا۔

زبانوں کی نشو و نما میں دو متضاد قوتیں ہمیشہ کام کرتی رہتی ہیں۔ ایک مرکزیت یا معیار پر اصرار کرنے والی قوت ہے، اور دوسری مرکز گریز قوت۔ موخرالذکر

پیش لفظ

یوں تو ادبی تاریخوں میں اردو نثر کے آغاز و ارتقاء کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور صرف نثر پر سید محمد، مولانا احسن مارہروی، مولوی محمد یحییٰ تنہا، مولانا حامد حسن قادری اور محترمہ رفیعہ سلطانہ کی گراں قدر تصنیفات و تالیفات موجود ہیں۔ علاوہ اس کے اردو نثر کی ترقی کی رفتار کے سلسلہ میں سید محی الدین قادری زورؔ کی "اسالیب بیان" اور محمد زبیر کی "اردو نثر کا تاریخی سفر" منظر عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن جس طرح "دلّی کا دبستان شاعری" اور "لکھنؤ کا دبستان شاعری" کے زیر عنوان دونوں دبستانوں کے شعرا اور ان کی شاعری پر سیر حاصل ناقدانہ تبصرہ دو اعلیٰ پایہ ناقدین بالترتیب نور الحسن ہاشمی اور ابو اللیث صدیقی کی کاوشوں کا مرہون منت ہے ایسا کوئی تبصرہ و تنقید اردو نثر نگاروں پر دستیاب نہیں۔ موجودہ مقالہ اسی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے ترتیب دیا گیا ہے۔

ویسے اردو نثر کا آغاز آٹھویں صدی ہجری میں ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی ترقی اور باقاعدہ نشوونما فورٹ ولیم کالج کے عہد سے شروع ہوتی ہے کیونکہ اس سے قبل اردو نثر کا دامن تنگ تھا اور اسالیب کے نقطۂ نظر سے وہ اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی کوششوں سے اردو نثر میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا اگرچہ یہ کوشش بنیادی طور پر اردو نثر کی ترقی و ترویج کیلئے نہیں تھیں۔ مقصد تو یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپرداز دفتری اردو زبان سیکھیں لیکن ان کوششوں سے ضمنی طور پر اردو نثر کو فائدہ ضرور پہنچا اگرچہ فورٹ ولیم کالج میں میر امن کے علاوہ اور بھی کئی منشی تھے تاہم جو شہرت و مقبولیت میر امن کی باغ و بہار کو نصیب ہوئی وہ اس کالج کے دوسرے انشاپردازوں کی تخلیقات کو حاصل نہ ہو سکی۔ انشا، میر امن، غالب اور ان کے دہلوی معاصرین کا مقصد اردو نثر کے دامن کو وسیع کرنا تھا۔ خاص طور پر سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کی خدمات کو اردو نثر کی

قوت، زبان کو اظہار کے نئے سانچے عطا کرتی، زبان کی توانائی میں اضافہ کرتی اور اسے نیا خون بہم پہنچاتی ہے جبکہ اول الذکر قوت، نشوونما میں اعتدال، تسلسل اور تدریج کے اصول کو برقرار رکھنے کا باعث ہوتی ہے۔ زبان کے ارتقا کا راز انہیں دونوں اصولوں کے معتدل اور صحت مند امتزاج میں پوشیدہ ہے۔ متذکرہ دو رجحانات میں سے کسی ایک رجحان پہ اصرار، لسانی ملائیت ہے جو آدمی کو اہل زبان، بنا دیتی ہے، یا نرا جدیدیہ۔

اس باب کا وہ حصہ دلچسپ ہے، جہاں ڈاکٹر جاگیردار نے، عہد حاضر کے کم و بیش تمام بلند پایہ ادیبوں کے اسالیب تحریر میں، دہلی کے بزرگ نثر نگاروں کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ اسالیب کے تجزیہ کی یہ ایک دلچسپ کوشش ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کوشش کی بدولت ڈاکٹر جاگیردار کی تصنیف میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے اور یہ کتاب اردو کے سارے قابل ذکر نثر نگاروں کی ایک مبسوط تاریخ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اردو کے ایم۔ اے، اور تحقیقاتی درجوں کے طلباء اور محققین کے لئے اس تصنیف کی حیثیت حوالے کی ایک ایسی جامع کتاب کی ہو گئی ہے۔ جس میں کمیاب اور قیمتی مواد بھرا پڑا ہے۔ آج کل جبکہ پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالوں کے کم ارز ہونے کی شکایت عام ہے، جناب عبدالرحیم صاحب نے تلاش و جستجو اور تحقیق و تفحص کا ایک معیار پیش کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر جاگیردار کی یہ تصنیف اردو کے تحقیقاتی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

غلام عمر خاں

شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد۔

ترقی کے سلسلہ میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے اُردو نثر ایک قلیل عرصہ میں اس قابل ہوئی کہ اس کو دنیا کی زبانوں کی کسی بھی نثر کے مقابلہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اُن کے خیالات نثر کے متعلق واضح ہیں۔ انہوں نے نہ صرف نثر بلکہ اُردو ادب کیلئے ایک مکتبۂ خیال کی بنا ڈالی۔ ادب کو افادی بنایا۔ ادب برائے زندگی اور ترقی پسند ادب کا رجحان سب سے پہلے انہی دہلوی نثر نگاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے ان کی کاوشوں سے اُردو نثر میں حیرت انگیز انقلاب ہوا۔ چنانچہ انہیں کی مساعی جمیلہ سے اُردو نثر میں تنقید، سوانح، مقالہ، ناول و افسانہ نگاری اور مکالمات وغیرہ اصناف کا آغاز ہوا۔

اُردو نثر کا جو قدیم انداز بیان ہے اس کی مثال ہم فسانۂ عجائب اور نثر کے بہار بے خزاں میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں مقفیٰ، مسجع اور مرصع انداز بیان کا رواج تھا۔ دہلی کے ان نثر نگاروں نے اس قدیم اور پُر تکلف انداز بیان کو ترک کیا اور پہلی مرتبہ اُردو نثر کے رُخ کو سلاست، سادگی اور روانی کی طرف موڑا جس کی وجہ سے اس میں ہر قسم کے خیالات سادگی، صفائی، برجستگی اور روانی کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

مذکورہ بالا اسباب کے پیش نظر ضرورت تھی کہ دہلوی نثر نگاروں کی ان امتیازی خدمات پر روشنی ڈالی جائے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اس سلسلہ میں قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔

مقالہ ہٰذا کے پہلے باب میں اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح میں جو مباحث آئے ہیں۔ ان کی وضاحت تین حصوں کے تحت کی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں اُردو کے آغاز کے متعلق قدیم محققین وماہرینِ زبان اور مستشرقین کے نظریات کا احاطہ کیا گیا۔ دوسرے حصہ میں ان اسباب کو بیان کیا گیا ہے جن کی بنا پر قدیم ماہرین کے نظریات کی تردید ہوئی ہے۔ آخری حصہ میں جدید محققین کی آرا تسلیم کرتے ہوئے ان کے متعلق موجودہ ناقدین کے تاثرات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

دوسرا باب نثر پاروں یا ملفوظات کے تذکرہ، مربوط نثر کے متعلق محققین کی آراء، مذہبیات اور تراجم کلام مجید کی تفصیل اور آخر میں قصے کہانیوں کے تبصرہ پر مشتمل ہے۔

نثر پاروں یا ملفوظات کے سلسلہ میں صوفیائے کرام و بزرگان دین کے اقوال اور ملفوظات میں ایسے جملوں اور فقروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن سے اُردو زبان کی ابتدائی شکل پر روشنی پڑ آتی ہے۔ ان بزرگان دین نے درس و تدریس کے موقعوں پر ہندوستانی طلباء کی سہولت کے لیے یہ فقرے استعمال کیے تھے۔ چونکہ اُردو کے یہ فقرے نظری شکل میں نہیں تھے اس لیے انہیں اُردو کے نثر پاروں کے تحت اکٹھا کیا گیا ہے۔ مربوط نثر کے آغاز کے متعلق قدیم و جدید محققین کے نظریات کو یکجا کیا گیا ہے۔ مذہبیات و تراجم کلام مجید کے تحت اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس عرصہ میں اُردو اپنی تشکیل کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھا آتی ہے۔ صوفیائے کرام اور مشائخ عظام نے طالبانِ علوم دینی کی ضرورتوں کے پیش نظر دینی تعلیمات اور شریعت کے اصولوں کو کتابی شکل دی اور انہی وجوہ کی بنا پر قرآن مجید کے ترجمے بھی کیے گئے۔ جن کے مطالعہ سے اس عہد کی زبان اور نثر کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ آخر میں قدیم قصوں سے متعلق تصنیفات و تالیفات اور تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کا ماخذ قدیم مشرقی قصے اور روایتیں ہیں۔ اس سلسلہ میں سب رس کا بھی ذکر موجود ہے جسے قدیم نثر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ قدیم نثر کے مطالعہ سے ہم پر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اس وقت نثر اُردو کا دامن بڑا محدود تھا۔ صرف مذہبی اور اخلاقی رموز و نکات اور عشقیہ قصوں سے اس کا دامن پُر تھا۔ اس میں ابھی وہ تاب و توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جس کی بدولت ہر قسم کے مضامین ادا کئے جاسکیں۔ اسلوب کے اعتبار سے کرختگی اور ناہمواری پائی جاتی تھی اور اس پر مقامی زبانوں کا لب و لہجہ غالب تھا۔

تیسرے باب میں سادہ دہلی میں اُردو نثر کے آغاز و ارتقاء (ابتداء تا میرامن) پر تفصیلاً نظر ڈالی گئی ہے۔ دہلی میں نثر اُردو کے آغاز کے متعلق اب تک محققین کا یہ خیال تھا کہ زٹلی اور سودا کی تصنیفات میں اُردو کے کچھ فقرے ملتے ہیں اور فضلی کی وہ مجلس کو دہلی کی اُردو مربوط نثر کا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن خواجہ بندہ نواز کے نثری رسالوں کی دریافت و اشاعت کے بعد یہ فیصلہ کیے بغیر چارہ نہیں کہ دہلی میں مربوط اُردو نثر کا

آغاز خواجہ صاحب کے انھیں نثری رسالوں ہی سے ہوا۔ حضرت خواجہ صاحب کے
ایک دہلوی معاصر اور اُن کے پیش رو حضرت عین الدین گنج العلمؒ کے
نثری رسالوں کا حکیم شمس اللہ قادری نے تذکرہ کیا تھا۔ چونکہ یہ رسالے اب ناپید
ہیں اور قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز کب کہاں
اور کیونکر ہوا۔ حضرت عین الدین بیجاپور میں وارد ہونے سے قبل تحصیل درس
کے لیے گجرات اور دوسرے مقامات میں قیام پذیر تھے اور شاید کم عمری ہی
میں انھوں نے اپنے وطن مالوف دہلی کو ترک کیا ہو۔ خواجہ صاحب کے والد محمد تغلق کے
عہد میں دہلی سے دکن آئے۔ خواجہ صاحب اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ
کے ہمراہ کم سنی ہی میں اپنے موروثی وطن کو مراجعت کر گئے۔ جہاں انھوں نے علوم ظاہری
و باطنی کی تکمیل کی اور نصیر الدین چراغ دہلی سے مستفید ہوئے۔ حضرت نے خواجہ صاحب کو
اپنا خلیفہ بنایا۔ حضرت کے انتقال کے بعد خواجہ صاحب نے سجادہ ارشاد پر
متمکن ہو کر درس و تدریس کا کام جاری رکھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں
تیموریوں کی شورش سے جب دہلی میں عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو آپ نے دکن کا
قصد کیا اور گلبرگہ میں قیام فرمایا۔ اور یہ رسالے آپ کے اسی عہد کی یادگار
ہے۔ محققین کی یہ رائے ہے کہ ان رسالوں کی زبان پر دکنی زبان کا
اطلاق بہ مشکل ہو سکتا ہے اور حقیقت میں یہ شمالی ہند کے باشندے
کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ اور چودھویں صدی عیسوی کی دہلوی
زبان (اردو) کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس لیے بلا خوف تردید ہم یہ کہہ سکتے
ہیں کہ دہلی میں مربوط نثر کا آغاز حضرت کے ان نثری رسالوں سے
ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے سلسلے
میں مہاراجہ پرتھوی راج اور اس کی ہمشیرہ کے خطوط پیش کیے ہیں۔ جن کے
مطالعہ سے ہم اس عہد کی اردو کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ خطوط اس عہد کی

زبان میں لکھے گئے تھے جب کہ اردو زبان (کھڑی بولی) بھی دوسری آریائی
زبانوں کی طرح اپ بھرنش سے ارتقا پا رہی تھی۔ اس لیے ان حالات کے
پیش نظر ان خطوط کو اردو نثر کا قدیم سرمایہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسے دہلوی
صوفیائے کرام کے اقوال اور برج بھاشا اور ہندوی زبان میں لکھی ہوئی
عہد مغلیہ کی تصنیفات کے ان فقروں سے جوڑا جا سکتا ہے جو خواجہ صاحب کے
ان رسالوں کے بعد تصنیف ہیں۔ اس کے بعد عیسوی خاں بہادر اور مولانا فضلی سے
قبل مربوط نثر کے فقدان کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔ چند صفحات میں
اردو زبان کی اصلاح و نشو و نما کا احوال بتایا گیا ہے کہ کس طرح اردو زبان کے قدیم
دہلوی شعرا نے اردو زبان کو ترک پاک سے سنوارا۔ دکنی لب و لہجہ کو جو دراوڑی
زبانوں کے اثر سے اردو کی صوتیات پر حاوی تھا خارج کیا۔ جس کی وجہ سے
اس میں درشتگی کے بجائے نرمی اور ملائمت پیدا ہو گئی۔ پھر اس کے بعد دہلی کی
نثر اردو کے سلسلے میں جعفر زٹلی معاصر اورنگ زیب عالمگیر، سودا، عیسوی
خاں بہادر اور مولانا فضلی (معاصرین محمد شاہ اور احمد شاہ شاہانِ مغلیہ)
کی ادبی کاوشوں کو پیش کیا گیا ہے۔ جن کو محققین دہلوی نثر کے قدیم ترین و
اوّلین نثری نمونوں میں شمار کیا ہے۔ مولانا فضلی اور شاہ ولی اللہ کے لائق
فرزندوں سے دہلی میں نثر اردو میں مذہبیات کا جو سلسلہ شروع ہوا اس
کو ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں اور دیگر مصنفین نے جاری رکھا۔ جو آج
تک چل رہا ہے۔ زبان اردو کے معلمین کے سلسلے میں خان آرزو کی لسان دانی
اور لغت نویسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کی روایت کو مرزا جان طپش، انشاء و قتیل
رنگین و غالب اور فرہنگ آصفیہ کے مؤلف نے برقرار رکھا۔ دہلی کی اردو نثر کے

ابتدائی دور میں عیسوی خاں بہادر نے "قصہ مہر افروز و دلبر" لکھ کر قصہ نویسی کی بنا رکھی۔ انشاؔء نے "رانی کیتکی کی کہانی" اور میر امّن نے "باغ و بہار" لکھ کر اس کی بنیاد کو مستحکم کیا۔ جس پر بعد کے دہلوی نثر نگاروں مثلاً نذیر احمد وغیرہ نے ناول نگاری کی عمارت قائم کی جس کے اثرات بعد کے دہلوی ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں پائے جاتے ہیں۔ اُردو نثر کی ترقی و ترویج میں دہلی کالج کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس ادارہ کا مقابلہ ہم صرف فورٹ ولیم کالج سے ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں اس طرز کے صرف دو ہی ادارے تھے۔ بیشک نثر اردو کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج کی حیثیت مسلّم ہے تاہم اس کالج کا مقصد محدود تھا۔ یہ ادارہ بہت دنوں تک کام نہ کر سکا۔ اُردو نثر کی ترقی کے اعتبار سے اس کالج کی ادبی خدمات کا مقابلہ و موازنہ دہلی کالج کی ادبی خدمات سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ دہلی کالج کی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس کا مقصد بڑا وسیع تھا یہی مقصد بعد میں سر سید کی سائنٹیفک سوسائٹی کا پس منظر بنا جس کی بنیاد پر دار الترجمہ آصفیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا۔ گورنمنٹ کے علاوہ علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوابوں نے اس ادارہ کی بڑی فراخ دلی سے مدد کی۔ اس سوسائٹی کے مترجم دہلی کالج کے پروفیسر و ہونہار طلباء مثلاً رام چندر وغیرہ تھے۔ اس کالج کے فارغ التحصیل طلباء آگے چل کر اُردو ادب کے افق پر درخشندہ ستارے بن کر ابھرے جن کی ادبی کاوشوں کا تذکرہ مقالہ ہذا کے پانچویں باب میں موجود ہے۔ ان طلباء کی قابلیت سے ہم ان کے اساتذہ کی اہلیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کالج کے

انگریز اساتذہ بڑے جید اسکالر اور عالم تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ اُردو کے صدر جان گلکرسٹ کی طرح ان کو بھی اُردو زبان و ادب سے والہانہ عشق تھا۔ دہلی کے بڑے بڑے عالم و فاضل ان کے قدر دان تھے۔ آزادؔ کے والد مولوی محمد باقر صاحب سے اس کالج کے پرنسپل کا یارانہ تھا۔ مولانا امام بخش صہبائی اس کالج میں استاد تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ اس کالج کے طلباء کے ممتحن تھے۔ مختصر یہ کہ یہ کالج اپنی نوعیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا۔ اس دور کے نثر نگاروں نے شروع سے ہی مذہب، اخلاق و تصوف کے علاوہ سماجی و معاشی اور روزمرہ کی زندگی سے متعلق مضامین پر قلم اٹھا کر اُردو نثر کے دامن کو وسیع کیا۔ نئے نئے موضوعات کے لیے اسالیب بیان کے میدان میں وہ جولانیاں دکھائیں جو بعد میں دو مکاتیب اسلوب کا پیش خیمہ بنیں۔ قدیم نثر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انداز بیان کے لحاظ سے کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ اس میں گراں قدر ادبی شہ پارے وجود میں آ چکے تھے۔ دہلی کے نثر نگاروں کے ان معاصرین کا انداز بیان جو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں تصنیف و تالیف کا کام انجام دے رہے تھے "مقفیٰ" "مسجع و مرصع" تھا۔ جس میں رنگینی، تصنع اور قافیہ پیمائی پائی جاتی تھی۔ لیکن دہلی کے ان نثر نگاروں نے شروع سے ہی سلیس، واضح اور سلجھا ہوا انداز بیان اپنانے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

چوتھے باب میں مرزا غالبؔ کے خطوط، ان کے مختلف پہلوؤں اور ان کے اسلوب پر بحث کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سلاست روانی

برجستگی جو اُن کے خطوط کے نمایاں اوصاف ہیں ان کا آغاز انشاؔ اور میراؔمن کی تصانیف سے ہوا۔ اور غالبؔ کے اسلوب کو ہم ان دونوں پیشروؤں کے اسلوب سے جوڑ سکتے ہیں۔ اس لئے اِس باب کے آغاز میں غالبؔ سے پہلے کی نثر کے اسالیب کا اجمالی جائزہ دیا گیا ہے۔ غالبؔ کے علاوہ اُن کے دوسرے دہلوی معاصرین نے تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا۔ انھوں نے وقت کی پکار کو مدِّ نظر رکھا۔ تاہم اُن کی حیثیت غالبؔ یا غالبؔ کے متقدمین یا متاخرین کی سی نہیں۔

پانچویں باب میں اُردو نثر کے عناصرِ خمسہ کی نثر سے بحث کی گئی ہے۔ خدا جانے وہ کونسی گھڑی تھی جب مہدی افادی مرحوم کی زبان سے عناصرِ خمسہ کے الفاظ ادا ہوگئے اور نقش کالحجر بن گئے۔ جس طرح قدیم نثر میں خواجہ بندہ نوازؒ شاہ میراں جی شمس العشاقؒ شاہ برہانؒ اور شاہ امین اور وجہیؔ کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور ان کو کلاسکی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح سرسید آزادؔ نذیر احمدؔ حالیؔ اور شبلیؔ کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔ اگر اُن کا بھی شمار قدیم نثر کے محسنوں میں ہوتا ہے تو ان کا شمار جدید اُردو نثر کے محسنوں میں اور ان کے کارنامے کلاسکی حیثیت حاصل کرچکے ہیں۔ اُردو ادب کے آغاز کا سہرا شہرِ دہلی کے ایک صوفی بزرگ کے سر ہے اور شہرِ دہلی ہی کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اُردو نثر کے ان عناصرِ خمسہ میں پہلے دو نثر نگار دہلی کے باشندے تھے۔ نذیر احمد سنِ شعور کو پہنچنے سے پہلے ہی تحصیلِ علم کے لئے دہلی میں اس ادا سے آئے کہ یہاں کی خاک اُن کے دامن گیر ہوئی۔ حالیؔ کی ذہنی و ادبی نشو و نما غالبؔ شیفتہؔ اور سرسید کی مرہونِ منت ہے۔ اور تقریباً یہی حال شبلیؔ کا ہے جس طرح

میراؔمن کی تصنیف 'باغ و بہار' کو دہلی سے نسبت دی جاتی ہے اسی طرح ان بزرگوں کے فکر و فن کو سرسید سے نسبت دی جاسکتی ہے۔ سرسید کی تصانیف کے اجمالی بیان کے بعد اس امر کی نشان دہی کی گئی ہے کہ اُردو ادب اور نثر میں سرسید کی فکر و طرزِ ادا کو کیا دخل ہے۔ اُن کی تصانیف اور ان کی تحریک نے اُردو ادب و نثر کو کیا کچھ دیا۔ سرسید کے بعد آزادؔ، نذیر احمدؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور ذکاءاللہ کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈال کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان ادیبوں نے بھی سرسید کی طرح نہ صرف زمانہ کے تقاضوں کو سمجھا بلکہ سرسید کی پیروی کرتے ہوئے اُردو نثر کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ اُردو نظم پر بھی اُن کے احسانات بہت ہیں۔ نثر کے سلسلہ میں یہ بتا دینا کافی ہے کہ سرسید، آزادؔ، نذیر احمد، حالیؔ اور شبلیؔ کی ادبی کاوشوں نے اُردو نثر کو مقالہ نگاری، سوانح نگاری، تنقید نگاری، تاریخ، ناول و افسانہ نگاری اور صحافت سے روشناس کرایا۔ انھوں نے ان مختلف اسالیب کے ذریعہ زمانہ کے تقاضوں کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر و تشریح کی اس طرح انہوں نے اُردو ادب میں پہلی بار ادب برائے زندگی کے رجحان کو عام کیا۔ لہٰذا ہم ۱۹۳۵ء کی ترقی پسند تحریک کی نشاندہی انہی بزرگوں کی تخلیقات میں کر سکتے ہیں۔ تاہم ان کے جملہ ادبی کارناموں کی بنیاد ان کے پیش رو دہلوی ادیبوں کی تخلیقات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ذکاءاللہ، سید احمد دہلوی اور ناصر نذیر فراقؔ کے ادبی کارناموں کا جائزہ لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی ادبی خدمات میں ادبی روح کارفرما ہے۔

چھٹے باب میں دہلی کے اخبار و رسائل کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ابتدا میں آزادؔ کے والد مولوی محمد باقر کے اُردو اخبار اور سرسید کے بھائی سید محمد کے

سید الاخبار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کام میں آزاد اور سرسید دونوں نے
اپنے والد اور بھائی کا ہاتھ بٹایا ہے۔ سرسید نے اسی تجربہ کی بنا پر علی گڑھ
انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا۔ اسی طرح ماسٹر رامچندر
کے رسائل و اخبار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ اردو کی صحافت
نگاری میں دہلی کے رسائل و اخبارات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

ساتویں باب میں دہلویت سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں دہلی
کے نثر نگاروں کے فکر و فن پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کاوش میں اُن کے
زمانہ کے رجحانات ہمارے پیش نظر رہے ہیں کیونکہ ان تمام نثر نگاروں کا تعلق
عہد بعید اور تقدم سے رہا ہے۔ قدیم نثر، فورٹ ولیم کالج کی نثر اور ہندوستان کے
طول و عرض میں پھیلے ہوئے اردو نثر نگاروں کا دبستان دہلوی کی نثر
سے مقابلہ و موازنہ کر کے دہلوی نثر کی امتیازی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے اور
آخر میں تقسیم ملک سے پہلے دہلی، لاہور، لکھنؤ، علی گڑھ، حیدرآباد، رامپور، اعظم گڑھ،
بھوپال، پٹنہ، الہ آباد، کلکتہ اور دیگر مقامات کے اُن نثر نگاروں اور ادیبوں
کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے فکر و فن پر دہلویت کی چھاپ ہے۔

مقالہ کے آخر میں اُن کتابوں کی ایک فہرست درج ہے جن سے
اس مقالہ کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے۔ میں ان کتابوں کے مصنفین و مرتبین
کا شکر گزار ہوں۔ مقالہ کا یہ تعارف نامکمل رہے گا اگر میں ان حضرات کا
ذکر نہ کروں جن کا تعاون اس کتاب کی تالیف و اشاعت کے مختلف
مراحل میں مجھے حاصل رہا ہے۔ میں استاد محترم ڈاکٹر برکت رام سونی صاحب
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو و فارسی دیانند کالج شولاپور (مہاراشٹرا) کا

شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے تحقیقی کام کے دوران ہر مرحلہ پر میری
مدد کی۔ مقالہ کی تیاری میں شروع سے آخر تک میرے استاد و سینیر
رفیق کار جناب محبوب عباس کھنڈاری صاحب ریڈر و صدر شعبۂ اردو
و فارسی ایس۔ بی۔ آرٹس کالج بیجاپور کا تعاون و رہبری مجھے حاصل رہی
جس کے بغیر اس کام کی تکمیل شاید اس قدر جلد ممکن نہ ہوتی۔

حیدرآباد کی چند مقتدر ادبی ہستیوں کا بھی تذکرہ میرے لیے باعث
افتخار ہے جنہوں نے بڑی وسیع القلبی کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی۔ ہمارے
ملک کے بزرگ اہل قلم و مفکر ڈاکٹر سید عبداللطیف مرحوم نے ابتداً اپنی شفقت
و سرپرستی سے مجھے نوازا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب علیل تھے اس کے باوجود متعدد
ملاقاتوں میں میرے مقالہ کے موضوع پر روشنی ڈالی اور محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور اُن کے رفیق کار ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب
ریڈر شعبۂ اردو سے میرا تعارف کرایا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آخر الذکر
صاحب میرے برادر محترم الحاج محمد معین الدین صاحب کے مخلص و عزیز ترین
دوست ہیں۔ چنانچہ انہیں کی کوششوں سے میرا مقالہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا
اور جب اسکی اشاعت کی نوبت آئی تو صاحب موصوف نے باوجود اپنی
علمی مصروفیات کے شروع سے آخر تک میرے مقالہ کا مسودہ پڑھا اور
گراں قدر مشورے دیئے۔ اگر صاحب موصوف کی عنایت مجھے حاصل نہ ہوتی
تو یہ مقالہ شاید ہی زیور طبع سے آراستہ ہوتا۔ میں اُن کے بے پایاں
خلوص کا ممنون منت ہوں۔ اُن کی ذات میرے لیے چشمۂ فیض ہے۔

برادر محترم الحاج محمد معین الدین صاحب انجینیر آبپاشی حکومت

آندھرا پردیش کے ذکر کے بغیر یہ سطریں نامکمل رہیں گی جن کی محبت و رہنمائی اس کام کے دوران مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔

میں جناب محمود خاور پروپرائیٹر شالیمار پبلیکیشنز اور مدیر "برگِ آوارہ" کا ممنون ہوں جنکے پرخلوص تعاون سے کتاب کے منظرِ عام پر پہنچنے میں مدد ملی۔ لکی فائن آرٹ پرنٹنگ پریس کے پروپرائٹر محمد ہدایت علی اور سید منظور محی الدین خوشنویس کلیانوی بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔

احمد منزل
۱۱-۳-۸۵۹ ملے پلی
حیدرآباد نمبر (۵۰۰۰۰۱)

احمد عبدالرحیم
۳۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء
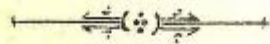
پہلا باب

اُردو زبان کا آغاز

۱- تاریخی پس منظر

۲- قدیم محققین کی آراء

میرامن کا بیان، سرسید کا نقطۂ نظر۔

مولوی عبدالغفور نساخ، امام بخش صہبائی۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا نظریہ۔

حافظ محمود خاں شیرانی، مولانا شیرانی صاحب کے نظریہ کا رد۔

۳- جدید محققین کی آراء۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نظریہ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نظریے سے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی رائے، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی رائے۔ ڈاکٹر شوکت صاحب کی رائے کے متعلق جناب احتشام حسین صاحب، جناب ڈاکٹر اُرتیوی صاحب اور .... ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے خیالات۔

اُردو زبان کا آغاز

تاریخی پس منظر

ہندوستانی لسانیات کی تاریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ ایک ہزار سنِ عیسوی کے قریب راجپوتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ اپ بھرنش کی قسمت کا ستارہ بھی غروب ہونے لگا اور اس کے بطن سے جدید آریائی (ہندوستانی) زبانیں پنجابی، گجراتی، مرہٹی، راجستھانی، بنگالی، اڑیا، مشرقی ہندی، بہاری اور مغربی ہندی جس کی ایک شاخ کھڑی بولی جو دہلی اور نواحِ دہلی میں بولی جاتی تھی اور جس پر اُردو کی بنیاد قائم ہے، اُبھرنے لگی تھیں۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کے فوجی لشکر اور مسلمان صوفیائے کرام شمال مغربی راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوئے یوں تو ہندوستان سے عربوں کے تجارتی تعلقات بدستور قائم رہے لیکن فاتح کی حیثیت سے مسلمانوں کا پہلا قافلہ محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ۷۱۲ء میں آیا۔ انہوں نے کئی برسوں تک سندھ میں حکومت کی لیکن وہ سندھ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ پھر گیارھویں صدی عیسوی سے محمود غزنوی اور محمد غوری کے مسلسل حملوں کے بعد ۱۲۰۶ء میں مسلمانوں کی ہندوستان میں باقاعدہ سلطنت قائم ہوگئی اور بڑے استحکام کے ساتھ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے تک قائم رہی بعد میں مسلمانوں کی حکومت کا زوال شروع ہوا اور آخرکار ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مسلم حکومت کی بساط الٹ دی اور انگریز ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ آٹھ سو برس کا یہ زمانہ بڑی تاریخی تبدیلیوں اور ترقی کا زمانہ ہے۔ اس دور نے ہمیں قطب مینار، لال قلعہ اور تاج محل دیا۔ اسی دور نے چشتی، کبیر اور نانک کا پیغام دیا اور اسی دور کے تہذیبی میل جول اور تمدنی ترقی نے اردو کا خاکہ بنایا۔

محمد بن قاسم کی سرکردگی میں جو مسلمان ہندوستان آئے اور جنہوں نے سیکڑوں برس حکومت کی وہ عرب تھے۔ عربوں کے اثر سے موجودہ سندھی زبان پیدا ہوئی جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جس میں سیکڑوں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ عرب سندھ کے آگے نہ بڑھ سکے وہ ایک خطّے میں محدود ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان کی عام زندگی پر ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہوا لیکن ۱۱۰۰ء کے قریب محمود غزنوی کے حملے سے پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ غزنویوں کی حکومت محض جابرانہ حکومت نہیں تھی بلکہ اس زمانے میں تہذیبی لین دین بھی ہوا۔ محمود اور اس کے خاندان کے لوگ علم دوست تھے۔ ابوریحان بیرونی (۹۷۳ء سے ۱۰۴۸ء) کے حوالے سے یہ بات کئی مورخوں نے لکھی ہے کہ اس عہد میں اکثر یونانی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی اور عربی میں ہوئے۔ غزنوی فوجوں میں ہندو سپاہ سالار ملازم تھے اور تمام رعایا کے ساتھ رواداری کا برتاؤ ہوتا تھا۔ فارسی کے مستند شعراء کے یہاں اکا دکا ہندوستانی الفاظ بھی نظر آتے ہیں اور یہی نہیں محمد عوفی نے (لب الالباب میں) اور امیر خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں مسعود ابن سعد سلمان کو فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی کا بھی شاعر بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ہندی سے مراد ہندوستان کی وہ زبان ہے جو اس علاقہ میں بولی جاتی رہی ہوگی۔ اس مختصر عرصہ میں یہ تہذیبی تعلق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ محمد غوری کے زمانے میں یعنی بارھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے تعلقات کی حدیں وسیع ہوگئیں تھیں لیکن لسانی اختلاط کی شہادتیں اس درجہ واضح نہیں ہیں جنہیں بنیاد بنا کر کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ بیسل دیو راسو اور پرتھی راج راسو میں جو عربی فارسی کے الفاظ ملتے ہیں ان کی صحت مشکوک ہے لیکن محل، انعام، سلطان، پیغام وغیرہ جس

سماجی نوعیت کے الفاظ میں ان کا ہندوستانی شعراء کے قلم سے نکلنا تعجب خیز
نہیں ہے۔ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عوام کی زبان پر الفاظ کا لین دین
بڑی تیزی سے شروع ہو گیا تھا اور نئی زبان کا بالکل ابتدائی روپ بننے لگا تھا۔
۱۱۹۲ء میں سلطان محمد غوری نے راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر راجپوت
اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور ۱۲۰۶ء میں سلطان قطب الدین ایبک نے شمالی ہندوستان
میں مسلمانوں کی ایک مضبوط حکومت قائم کر دی۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے
درمیان زیادہ گہرے اور وسیع تر پیمانے پر تعلقات قائم ہونے کے لئے زمین ہموار
ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شورسینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی سے برج بھاشا
اور کھڑی بولی کی کونپلیں نکل آئی تھیں۔ مسلمانوں کو ملکی اور فوجی ضروریات کیلئے
اس علاقہ کی زبان کو استعمال کئے بغیر چارہ نہ رہا ہوگا۔ اردو کی بناوٹ میں کھڑی
بولی کو بنیادی اہمیت حاصل ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دہلی کے بادشاہوں
کی فوج زیادہ تر کرنال، حصار اور میواڑ کے علاقوں سے بھرتی کی جاتی تھی اور ان خطوں میں
کھڑی بولی کا چلن تھا۔ سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ چونکہ کھڑی بولی کا تعلق مسلمان
بادشاہوں کے دربار سے ہو گیا تھا اس لئے اسے کھڑی بولی کہا گیا ہے۔ اس علاقہ کی
دوسری زبانیں یعنی برج بھاشا وغیرہ پڑی بولیاں کہلائی جاتی تھیں مگر یہ محض
قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ برج بھاشا کی نرم بولی کے مقابلے میں
لوگوں نے اسے لہجہ اور آوازوں کی درشتی کے لحاظ سے کھڑی یا کھری بولی
کہا ہو۔ یا ایرانیوں نے یہ نام دیا ہو۔ بہرحال کھڑی بولی دلی اور مغربی یوپی کے
عوام کی بولی تھی مسلمانوں نے اٹھا کر اسے سینے سے لگایا جس کی وجہ سے اس میں
عربی فارسی آوازوں کے داخل ہونے سے ایک ایسا صوتی نظام بن رہا تھا۔

جس میں فارسی لہجہ اور تلفظ کی کھپت بھی ہو سکے۔ یہی وجہ کھڑی بولی نے جو
ادبی حیثیت سے بالکل تہی دامن تھی اور صرف بول چال کی زبان ہونے کے
لحاظ سے ایک چھوٹے علاقہ میں محدود تھی نئے لسانی عناصر کو جذب کر کے اہمیت اختیار
کر لی اور یہیں سے کھڑی بولی کا ارتقاء ہوا۔ اس میں علمی اور فنی کتابیں تصنیف
ہوئیں۔ مسلمان جہاں گئے دہلی کی یہ ترقی پذیر زبان اُن کے ہم رکاب رہی مسلمانوں
کی فتوحات کے ساتھ یہ زبان بھی ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی اور مقامی بولیوں
کو دھکیل کر اس نے مسلمانی قلمرو کی وسعت کے مطابق بہت جلد ایک عام اور
ملک گیر زبان کا مقام حاصل کر لیا مختلف اوقات میں یہ ترقی پذیر زبان مختلف
ناموں سے موسوم ہوئی۔ مثلاً دکھن میں دکنی، گجرات میں گجراتی، شمالی ہند میں
ریختہ اور اردو اور اردوئے معلیٰ کے نام اسے دیئے گئے۔ اردو کے آغاز و
ارتقاء کے سلسلے میں نہ صرف ہندوستانی بلکہ مغربی ماہرین لسانیات اس کو ایک
کھچڑی زبان تصور کرتے ہیں یا مسلمانوں کی وضع کردہ زبان سمجھتے ہیں بے شک
اس کا نشوونما مسلمانوں کی سرپرستی اور ان کے سیاسی اقتدار کے زیر سایہ ہوا
لیکن زبان خود مسلمانوں کی دہلی میں آمد سے پہلے موجود تھی اور بازار ہاٹ میں
بولی جاتی تھی۔ اگر مسلمان ہندوستان نہ آتے تب بھی جدید آریائی زبانیں (ان میں
سے ایک کھڑی بولی ہے اور جس کی ادبی شکل کو اردو کہتے ہیں) بہرحال پیدا ہوتیں
لیکن اتنا اقرار کرنا پڑے گا کہ انہیں جو سنجیدہ ادبی حیثیت حاصل ہو گئی اس میں
ضرور دیر ہوتی۔ آیئے اردو کے آغاز کے متعلق ان محققین و ماہرین کے
نظریات کا جائزہ لیں۔ ہم ان محققین و ماہرین کے خیالات سے تاریخی ترتیب
کے مدنظر قدیم اور جدید کے تحت بحث کریں گے۔ اس خصوص میں پہلے قدیم

محققین کی آرا خود انھیں کے الفاظ میں پیش کی گئی ہیں۔

قدیم محققین و ماہرین کی آراء

میر امن کا بیان حقیقت اُردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سُنی ہے کہ دِلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجُگی ہے۔ انہی کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاشا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور (جنکے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ....

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے۔ ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔

جب حضرت شاہجہاں صاحبِ قِران نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا...... تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا (اگرچہ دِلّی جُدی ہے 'وہ پُرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلّیٰ خطاب دیا۔

سرسیّد کا نقطۂ نظر ہندوؤں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے چالنے، لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پکڑا تو بادشاہی دفتر فارسی ہو گیا...... سکندر لودھی کے عہد میں سب سے پہلے کائستوں نے جو ہمیشہ سے امورات ملکی اور ترتیب دفتر میں

داخلت رکھتے تھے' فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا...... مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پر جب بھی امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں ہی کے زبان سے فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ لانے شروع کئے...... غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا۔ مگر ایسا نہ تھا جسکو جدا زبان کہا جائے۔ جبکہ شاہجہاں بادشاہ نے شہر شاہجہاں آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا اس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعض فارسی لفظوں اور اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بہ سبب کثرتِ استعمال کے تغیر و تبدیل ہو گئی۔ غرضکہ لشکر بادشاہی اور اُردوئے میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی اور اسی سبب سے زبان کا اُردو نام ہوا۔ پھر کثرتِ استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اُردو کہنے لگے۔

مولوی عبد الغفور نساخ مولوی صاحب نے "رسالۂ تحقیق زبان ریختہ" میں لکھا ہے کہ "زبانِ اُردو روزمرۂ شہر دہلی کو کہتے ہیں۔ جب سُلطان محمد غوری نے ملکِ ہند پر چڑھائی کی اور تمام ملکِ ہند سلاطینِ غور کے قبضۂ اختیار میں آیا رفتہ رفتہ زبانِ قدیم میں لفظ فارسی و عربی و ترکی ملتا گیا...... جب شاہجہاں بادشاہ نے شاہجہاں آباد کو آباد کیا تو اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استدلال اور قابل لوگ مجتمع ہوئے قدیم ہندی متروک ہونے لگی۔ محاورہ میں فرق ہونے لگا۔ زبان اُردو کی ترقی ہوئی"

امام بخش صہبائی امام بخش صہبائی رسالۂ قواعدِ اُردو میں فرماتے ہیں۔ شاہجہاں آباد تیموریہ خاندان کے شاہجہاں نے آباد کیا۔ اُس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرتِ استعمال

سبب تبدیلی و تغیر واقع ہوا اور اس خلا سے جو بولی مروج ہوئی اُس کا نام
اُردو پڑا تھا۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا نظریہ :-

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے
اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا
کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں
اور برج کا سبزہ زار اسکا وطن ہے۔ تم خیال کرو گے کہ شاید اس میراث قدیم کی سند
سنسکرت کے پاس ہوگی۔ وہ ایسا بیج ہوگا کہ یہیں پھوٹا ہوگا اور یہیں پھلا پھولا ہوگا۔
لیکن نہیں یہ بھی سُراغ آگے چلتا ہے ...... اور مولانا نے اس سُراغ کا پتہ لگانے کے
جس میں تقریباً ساڑھے تین ہزار سالہ ہندوستان کی لسانی تاریخ بیان کی ہے!
جسے ہم مختصر بیان کرتے ہیں۔ "دانائے فرہنگ کہ ہر بات کا پتا پتال تک نکالنے
والے ہیں انھوں نے زبانوں اور قدیم نشانوں سے ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے
اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا ......
اس قوم کا نام آریان تھا ...... یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہندوستان میں آکر
راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا۔ ایران میں تاج کیانی پر درفش کاویانی لہرایا ......
قیاس یوں ہے کہ ہندوکش کے پہاڑ سے اُتر کر پہلے پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہونگے
پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں
جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہونگے۔ کچھ فتحیابوں کی غلامی
اور خدمتگاری میں کام آئے ہوں گے اور وہی شودر کہلائے ہونگے ......

شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت رہنے سے اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی
زبان دوغلی ہو جائیگی۔ اسواسطے کہا کہ ہماری زبان زبانِ الٰہی ہے اور ازلی عہد سے
اسی طرح چلی آتی ہے چنانچہ اسکے قواعد اور اُصول باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے
جن میں نقطہ کا فرق نہیں آسکتا۔ اسکی پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبہ
سمجھا ...... اسی بنیاد پر قیاسیوں کی بلند نظری نے اسکا نام سنسکرت رکھا
جس کے معنی آراستہ پیراستہ' وغیرہ وغیرہ۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی پھر بھی منتر سمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی
سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور وید کی زبان میں خاص فرق ہے اور اب اور بھی
زیادہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔
اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعتاً ۵۴۳ ق-م میں بدھ مذہب کے
بانی شاکیہ منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیش سے اُٹھے تھے اس لئے وہیں کی پراکرت
میں وعظ شروع کیا کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے کر بچے اور
بوڑھے تک یہی اس دیش کی زبان تھی ...... کل دربار اور کل دفتروں کی
زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے
ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتبخانے
سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے
راجہ وید کو مانتے رہے وہاں ویدوں کا اثر رہا باقی راج کے دربار اور علمی مرکز سب
ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئے۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر حد سے بڑھے اور آوازہ بلند
کہہ دیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان
بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے۔

زمانہ اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵ سو برس بعد) بدھ مذہب کو بھی رخصت کیا۔ شنکراچاریہ کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا۔ اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اسکی فصاحت نے پائی آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اجالا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربارِ سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کا سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اسی عہد میں جو کالیداس ملک الشعرا نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے اس میں دیکھو کہ بادشاہ، اُمرا اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتا ہے۔

...... دفعتاً زمانہ کی شعبدہ بازی نے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے اب ایرانی بہن کی داستان بھی سن لو ...... جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بدھ وغیرہ کے حادثے گذرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے۔ باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گذرا تھا جو کہ یہاں دو سو برس کے بعد گذرا۔ اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ بہرحال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندوؤں سے ہندی کے

الفاظ ملا ملا کر گذارا کر لیتے تھے۔

ادھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی۔ اس میں ملکشوں کو دخل کہاں! البتہ برج بھاشا نے اس بن بلائے مہمان کو جگہ دی۔ دھرم وان ہندو سالہا سال تک ملیچھ بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے۔ مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے۔ کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی سے بند نہیں ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا لین دین کرنا تھا۔ لفظوں کے بغیر گذارا نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں:-

۱- اول تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔

۲- اکثر معنی ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں انہی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے۔ پھر بھی نہ وہ مزا آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس صورت میں گویا قانون زبان اور آئین بیان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے۔ دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔

۳- جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اس لطف کو جانتے ہیں جبکہ وہ غیر زبان والے بات جلدی کہہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بولنے پڑتے ہیں کہ بے اس کے گذارا نہیں ہوتا۔

۴- پھر ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ اکثر پیار و محبت سے کبھی ہنسی کی دل لگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے۔ جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ یا

یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح اُن کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔

۵۔ بڑی بات یہ ہے کہ چغتائیوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات تو بات بلکہ لباس و دستار و رفتار و گفتار کو بھی ایسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور لوگ اسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں پھر اس میں فوائد عقلی و دلائل سے پیدا کرتے ہیں......

....

ہندو شاعروں کے دوہے بر رنگ بھاشا میں ہیں مگر عہد بہ عہد زبان کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودھی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں یہاں ان پڑھ تھے مگر راما نند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ تصنیفات اگر جمع ہوں تو کئی جلدیں ہوں۔ اُن کے دوہوں میں فارسی و عربی کے لفظ موجود ہیں۔ گرونانک صاحب کی تصنیفات کا بھی یہی حال ہے۔

مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے بہت محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا اس نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی معلوم نہیں ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے برتنے لگے تھے۔ اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہے اور ورق کے ورق اُلٹتے چلے جاؤ فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا۔ مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

ہمایوں نے جب گجرات پر فوج کشی کی تو سلطان بہادر وہاں کا بادشاہ تھا۔

اور جانپانیر کا قلعہ بڑا مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی اکثر وہاں رہتا تھا اور تمام خزانے و دفینے وہیں رکھتا تھا۔ محاصرہ کے وقت رومی خاں میر آتش (باوجود یہ کہ کمال معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان کا تھا) ہمایوں سے مل گیا۔ اور قلعہ (تمام نفائس اموال اور بے حساب خزانوں سمیت) ہمایوں کے قبضے میں آیا۔ سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور دیکھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ سلطان اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھتا تھا اور ایک دم جدا نہ کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ جب دربار میں لائے تو رومی خاں بھی موجود تھا۔ طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام! سب کو تعجب ہوا اور ہمایوں نے کہا "رومی خاں! چکنم کہ جانور است ورنہ زبانش می بریدم۔" اُس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ غرض اِس نقل سے یہ ہے کہ اس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ ضرور چڑھے ہوئے تھے۔ جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا۔ جانور تھا جو سنتا ہوگا وہی بولتا ہوگا۔

سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پنڈت تو تھے ہی شاعر بھی تھے فقیر بھی تھے۔ انہوں نے راماین کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوعۂ خاص و عام ہوئی۔ اُن کے دوہوں میں بہت، اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود ہیں۔ انہی دنوں میں سور داس جی نے شری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔ خیال کرو کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دوہوں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو

گفتگو میں عام ہندو لوگ اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

آخر میں حُسن و خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدر دانی سے ظاہر ہوئی۔ انہوں نے ایک ایک اشرفی دوہا کوری اور گنوان پنڈتوں کو انعام دے کر دہلی اور نواحِ دہلی میں شوق پھیلایا۔

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا ظاہر ہے کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوندِ زمین ہوئے۔ ان ہی آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولتی ہوتی ہوگی۔ تازہ ولایت آدمی اپنی آدھی اُن کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں۔ دہلی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتہ بتاتے ہیں کہ سنہ [illegible] میں یہاں کے مسلمان خاص بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی الفاظ اُن کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے۔ اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اُتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانے میں اقبالِ تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلّی دارالخلافہ ہوگی۔ بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازارِ لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ برتتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا۔ اسے

فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیے کہ یہ زبان خاص و عام میں اردو کی طرف منسوب مشہور ہو گئی ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں اُن سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہو گا اسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر کر دیا ہوگا۔ چند کوی کا کلام مل گیا۔ اس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے۔

بیاناتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی تحریک یا ارادے سے نہ ہوا بلکہ زبانِ مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی اُس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اُس نے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اسکے انتظار میں بیٹھی تھی۔

جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ و روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے۔ اگرچہ اس کے اثرات گفتگو، لباس، خوراک، نشست، برخاست، مختلف رسوم میں بھی ہوتے ہیں اور ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گھل مل جاتے ہیں۔ جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں تو ایک خوشنما اور مفید تبدیلی کیلئے راستہ پیدا ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ نئے انداز کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے مطلب کے بیان کرنے میں ایک دوسرے کے اندازِ بیان سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ پھر نئی نئی تشبیہیں لطیف استعارے کر اُن پرانی تشبیہوں اور مستعمل استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں اور جس قدر زبان میں طاقت ہے ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو

لے کر اپنی زبان میں نیا مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں مستعرفاتِ لطیف سے کچھ ایجاد کر کے نئے الفاظ و اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں۔ ہماری اُردو بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہی۔ مثلاً خاکروب کو حلال خور کا خطاب اکبر بادشاہ کا نوازا ہوا ہے۔ جہانگیر کی رنگیلی طبیعت نے شراب کا نام رام رنگی رکھا اور اس کو شعرائے فارس نے اشعار میں باندھا۔ سنگترا کو اس کی خوبی و خوش رنگی کے سبب محمد شاہ نے رنگترا کہا۔ بلبلِ ہندوستان کا گلدم نام رکھا۔ نواب سعادت علیخاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا۔ لکھنؤ میں عام اور دلّی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاقِ سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے۔

کبھی کبھی ہمارے شعرا نے بعض رسمیں و ڈھنگ جو ایران و توران میں ہوتے تھے اُن کے اشارے بھی اپنے اشعار میں کیے ہیں۔ مثلاً میر اور سودا کے کئی اشعار اگرچہ ان باتوں پر فصاحت کے اصولِ عامہ کے بموجب بہت اعتراض ہوئے۔ ہمارے انشا پردازوں نے جب دیکھا کہ فارسی والے اپنے قادر سخنی کے زور یا ظرافتِ طبع کے شور سے عربی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے تو انہوں نے بھی اپنے پیارے ملک کی زبان کو اس نمک سے بے لطف نہ چھوڑا۔

آزاد لکھتے ہیں کہ نہ صرف فارسی زبان کا اثر ہی ہندی پر ہوا بلکہ فارسی کو بھی یہاں کے الفاظ لئے بغیر چارہ نہیں ہوا۔ چنانچہ جو الفاظ فارسی اور سنسکرت کے اصلیت میں متفق ہیں اُن سے قطعِ نظر سلاطینِ چغتائیہ کے دفتروں میں صدہا الفاظ ہندی کے تھے جو کہ فارسی عبارتوں میں بے تکلف مستعمل تھے۔ اب بھی عہدِ مذکور کی تواریخ میں موجود ہیں مثلاً جھروکہ، درشن، پھول کٹارہ اور کھپوہ وغیرہ۔

جہانگیر بادشاہ اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ اس کا بھائی شاہ مراد کوہستان فتح پور سیکری میں پیدا ہوا تھا۔ اس واسطے میرے والد اسے پہاڑی راجہ کہا کرتے تھے۔ شاہجہاں بچپن میں اکبر کو شاہ بابا اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا کرتا تھا۔ اس ضمن میں مولانا نے امیر خسروؔ، عرفیؔ، ظہوریؔ، اشرفؔ، طغرہؔ وغیرہ کے اشعار پیش کئے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ہم بخوبی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا۔ اُردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا۔ مگر اس کی شدت نے ہمارے ترتیبِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کی خیالی باتوں نے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اُردو میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔[1]

اُردو کے آغاز کے متعلق حافظ محمود خاں شیرانی کا نظریہ:-

اُردو کی ابتدا کے متعلق حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنے نظریے کو پیش کرنے سے قبل مذکورۂ بالا نظریات پر نقد و تبصرہ کیا ہے جو قدیم محققین اس زبان کے تعلق سے پیش کیے ہیں۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:-

"یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے ورنہ کیا اکبر اور شاہجہاں سے پیشتر دلّی نہ تھی یا ہندو و مسلمان نہ تھے یا ترک سودا سلف نہیں لیتے تھے یا مختلف قومیں ایک ساتھ رہ سہہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر اکبر یا شاہجہاں کے عہد کے

ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اُردو کی بُنیاد رکھی جائے۔ شاہجہاں نئی دہلی کا قلعہ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں تیار کرتا ہے۔ محمد افضل پانی پتی متوفی ۱۰۲۵ھ/۱۶۲۵ء شاہجہاں کے آباد ہونے سے پہلے اپنا دوازدہ ماہا یا بارہ ماسا اُردو میں تصنیف کرتا ہے۔ دکن میں اُردو ادبیات کا سلسلہ اکبر بادشاہ کی تخت نشینی سے پچاس سال قبل شروع ہو جاتا ہے اور یہ بزرگ ہیں کہ شاہجہاں آباد کے سنگِ بنیاد کے ساتھ ساتھ اُردو کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بابر نے اپنے ترکی دیوان میں ایک شعر ایسا لکھ جاتا ہے جس کا ڈیڑھ مصرعہ اُردو ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

کج کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و مروارید فقرا ہلیغہ بس بولغوسید دریا بی واروتی

آزاد کے نظریئے پر بحث کرتے ہوئے شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ

ہمارے مصنفین کا ایک اور مزعومہ خیال یہ ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی کوئی اسے برج کی بیٹی بتاتا ہے اور کوئی اس کے دودھ سے اس کی پرورش کرتا ہے۔ آزاد فرماتے ہیں کہ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ .... اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے' حکیم شمس اللہ قادری رسالۂ تاریخ اُردو کے قدیم نمبر میں یوں گویا ہیں:۔

"مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے۔ جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا۔ جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد اُردو زبان کی صورت اختیار کر لی"۔

ان بزرگوں کی آراء کو پیش کرنے کے بعد شیرانی صاحب فرماتے ہیں

"اصل یہ ہے کہ اُردو کی داغ بیل اس دن سے پڑنی شروع ہو گئی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کر لیا۔ مسلمانوں کے تعلقات

ہندوستان اور اہلِ ہند کے ساتھ پرتھوی راج کی شکست اور فتح دہلی کے زمانے سے شروع نہیں ہوتے بلکہ ان واقعات سے کئی صدی پیشتر ابتدا پاتے ہیں۔ وہ عربوں کی فتح سندھ و ملتان اور غزنوی خاندان کی فتح پنجاب سے شروع ہو جاتے ہیں۔ تاریخ ہم کو یہ بتاتی ہے کہ سندھ و ملتان پر مسلمان پہلی صدی ہجری سے قابض تھے۔ پنجاب پر اُن کا قبضہ معزالدین محمد شام کی آمد سے ایک سو ستر سال پہلے تھا۔ سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے انہیں اگر ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی ہوگی اور اُردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیئے۔

"جب ہم اُردو کے ڈول اُس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے برج بھاشا کا رنگ اور ہے۔ دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اُردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریبیہ رکھتی ہے۔ برج سے چند ترکیبیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں برج سے الفاظ مستعار لیے ہیں وہاں برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے اور برج پر کیا موقوف ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اُردو کے پرتو سے خالی نہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے اگرچہ اُردو زبان بھی بین الاقوامی ضروریات کی بناء پر وجود میں آئی لیکن بہت جلد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان بن گئی۔ اس نے سنجیدگی یا دھرکر مسلمانوں کا دامن پکڑ لیا۔ مسلمان سپاہی اہلِ حرفہ علماء دستکار پیشہ ور مزدور فقیر و درویش و مسافر کا

ساتھ دیا۔ دکن و گجرات بنگال و بہار جہاں کہیں وہ گئے یہ اُن کے ساتھ
رہی اور ساتھ ہی ابتدا میں وہ عوام و غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان تھی۔
آخر میں اس کی ہر دلعزیزی دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی اسکی طرف توجہ کی۔[۱۱]

اس موضوع پر مفصل بحث کرنے سے پیشتر پروفیسر شیرانی نے مسلم
عہد کے تاریخی واقعات بالخصوص دہلی اور پنجاب کے تعلقات پر روشنی
ڈالی ہے۔ نیز اس امر کی وضاحت کی ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے پنجاب کا
اثر دہلی پر ہر عہد میں نمایاں رہا ہے۔ "یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ سیاسی
واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی
زبانوں کی صرف و نحو ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر
قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صحیح طور پر
آشکارا ہو جاتا ہے"۔[۱۲]

مذکورہ بالا بحث میں مولانا شیرانی تاریخی نقطۂ نظر سے یہ واضح کرتے
ہیں کہ اردو کا آغاز پنجاب میں ہوا۔ نیز وہ اپنے دعوے کو صرفی و نحوی دلائل سے
استوار کرتے ہیں اور پنجابی اور اردو زبان کا صرفی نقطۂ نظر سے تقابلی جائزہ
لینے کے بعد فرماتے ہیں کہ گذشتہ سطور کے مطالعہ سے ہم پر یہ امر واضح
ہو گیا کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر
اثر تیار رہا۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد
وہی ایک نتیجے کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت
گاہ کا ایک ہی مقام ہے دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی اور جب سیانی ہو گئیں تب ان میں
جدائی واقع ہوئی۔ ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ آخر اس

وقت واقع ہوا جب اردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور
لکھنؤ میں شروع کی۔ انہوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی مگر
اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح اور ترمیم کے اصول نے ایک
صرفی نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری اور پیچیدگی پیدا کر دی۔ قدیم اصول جن
پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی جامع، مفید اور کارآمد تھے۔[۱۳]

صرفی طریق پر پنجابی اور اردو دونوں کا جائزہ لینے کے بعد مولانا شیرانی
ایسے مواد کی نشاندہی کرتے ہیں جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو اور
پنجابی میں عام ہے۔ انہوں نے اس غرض سے مروجہ اردو سے روگردانی کر کے
ایسے نمونوں پر نظر ڈالی ہے جن کا تعلق قدیم اردو سے ہے اور جن کا اکثر حصہ
آج مستعمل نہیں۔ دوسری طرف وہی مواد پنجابی زبان میں بجنسہ یا کسی قدر
تغیر کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے دکنی اردو کو مدِ نظر
رکھا ہے۔ جس کی ادبیات کی قدامت اردو میں مسلم ہے۔

قدیم اردو پر پنجاب کا اثر :-

مولانا شیرانی نے تاریخی اور صرفی نقطۂ نظر سے یہ واضح کرنے کی
کوشش کی ہے کہ اردو زبان کی ابتدا پنجاب میں ہوئی اور پنجابی زبان کی
چھاپ اردو زبان پر بڑی گہری ہے۔ وہ اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے
ہیں کہ اردو پر قدیم زبانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا۔ وہ اپنے دعوے کی
تائید میں لکھتے ہیں کہ موجودہ حالات کے پیش نظر اس کا ثبوت دینا بہت
مشکل ہے کیونکہ ان ابتدائی زبانوں کے جبکہ مسلمان لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں

آباد ہوتے ہیں پھر اس کے بعد تین صدیوں تک کوئی کتابی نمونے نہیں ملتے
اور نہ اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس عہد کی برج اور پنجابی میں کیا
فرق تھا۔ الغرض برج، پنجابی اور اردو کے نمونوں کی غیر موجودگی سے ہمارا کام
بہت مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ جب مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ
قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا تھا۔۔۔۔
جو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی زبان ضرور لیتا گیا ہوگا۔ آیا یہ زبان موجودہ پنجابی کے
مماثل تھی یا اس کی کوئی شاخ تھی جواب معدوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے
متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال یہ زبان برج اور اس کی ہم سائیگی میں
ایک عرصۂ دراز تک رہنے سہنے کے باعث بدلنی شروع ہو گئی تھی۔

برج اور موجودہ پنجابی کا اصولی فرق واضح کرتے ہوئے مولانا نے اس
حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ پنجابی کے الفاظ میں حرفِ علت کو جبکہ حرفِ ثانی
واقع ہو گرا دیا جاتا ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔
کہ جب ہم فارسی کی تصانیف اور تاریخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں جن میں
اتفاقیہ ہندی الفاظ آجاتے ہیں۔ جن کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خلجیوں اور
تغلقوں کے عہد میں پنجابی کا دہلی زبان پر خاص اثر تھا۔ مثلاً پہلا ہندی لفظ
جس پر مولانا شیرانی کی نظر پڑتی ہے "لک" یعنی "لاکھ"۔ فارسی خواں اب تک لک
بولتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کو لک داتا کہا جاتا ہے۔ اب تک پنجابی لہجہ یہی ہے۔
اسی طرح کھٹ (کھاٹ) مولانا ابراہیم فاروقی صاحب فرہنگ صدی ہجری
کے مصنف جو بنگال کے رہنے والے تھے "کت" لکھا ہے یعنی چارپائی۔
مولانا فخر الدین مبارک قواس غزنوی جو ہندوستان میں فارسی

لغت نگاروں کے باوا آدم ہیں اور عہد علاؤ الدین خلجی کے شاعر ہیں اپنی فرہنگ
میں اسی لغت کے لیے کہتے ہیں "کت ۔ تختہ" ہندواں باشد میاں بافتہ۔

تاریخ سید الاولیاء میں جو تغلقوں کے عہد کی تصنیف ہے "یہ لفظ" میں
بار بار ملتا ہے اور ہر بار کھٹ کی شکل میں ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
ان ایام میں اہلِ دہلی کھاٹ کو کھٹ کہتے تھے یعنی پنجابی لہجے میں بولتے تھے۔[1]

مولانا شیرانی نے اس قسم کی کئی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں بخوف طوالت
ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔

بقولِ شیرانی یہ عین ممکن ہے کہ پرانی برج میں اور پنجابی میں کوئی فرق نہ ہو۔
اور آج برج میں حرفِ علت کا اظہار بعد کی نشوونما ہو۔ اس کے متعلق ہم اتنا
جانتے ہیں کہ پنجابی میں یہ قاعدہ یعنی حرفِ علت کی تخفیف تقریباً مسلمانوں
کی ہند میں آنے کے وقت بھی موجود تھا۔ عرب سیاحوں نے بعض ہندی
الفاظ کا ذکر کیا ہے جن میں انبہ اور زط بھی شامل ہیں۔ پنجاب میں انبہ آج
بھی بولا جاتا ہے۔ باقی رہا زط یہ پنجابی لفظ "جٹ" کی معرب شکل ہے۔ اردو
میں برج کی تقلید میں "جاٹ" بولتے ہیں۔ یہ ایک جنگجو قوم کا نام ہے جو ان ایام
میں سندھ و پنجاب میں کثرت سے آباد تھی۔[1]

مولانا نے برج بھاشا کی بعض خصوصیات اس غرض سے بیان کی
ہیں تاکہ قارئین اردو، پنجابی اور برج زبانوں کے فرق کو معلوم کر سکیں اور
یہ رائے قائم کر سکیں کہ آیا اردو زبان پنجابی کے قریب ہے یا برج کے۔

برج بھاشا اصل میں متھرا کی زبان ہے۔ جہاں سے منتشر ہو کر اس نے
بہت وسعت اختیار کی۔ یعنی جنوب میں تمام ضلع آگرہ، اکثر علاقہ ریاست

بھرت پور، دھول پور اور قرولی۔ مغربی علاقہ ریاست گوالیار اور مشرقی علاقہ
ریاست جے پور میں پھیلی ہوئی ہے۔ شمالاً گڑگاؤں کے مشرقی حصے میں، شمال مشرق
میں دوآبہ بلند شہر، علی گڑھ، ایٹہ، مین پوری میں گنگا پار بدایوں میں بریلی اور
ترائی پرگنہ نینی تال میں بولی جاتی ہے۔ مختلف مقامات پر اس زبان کے مختلف
نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ جہاں قنوجی زبان سے اس کا اتصال ہوتا ہے انتربیدی
کہا جاتا ہے۔ گوالیار کے شمال مشرقی گوشے میں جو دھول پور کے متوازی ہے
اور جہاں سیکروار راجپوت آباد ہیں، سیکرواڑی قرولی کے میدانی علاقے اور بعض
علاقہ گوالیار میں جنبل یا جادوباٹی کہتے ہیں اور پھر اس کی تین مقامی تقسیمیں ہیں
یعنی ڈنگرواڑا، ڈانگ کال مال اور ڈھانگ۔ علاقہ نینی تال میں اس کا نام بھکسا ہے۔
قدیم زمانے سے برج بھاشا نے شاہی سرپرستی میں پرورش پائی ہے اور ہندوستان
کے بعض مشہور شعرا اسی زبان میں لکھتے رہے ہیں۔ جن میں وٹھل ناتھ، سورداس،
نابھا داس اور بہاری لال بے حد مشہور ہیں۔[۱۶]

شیرانی صاحب کا کہنا ہے کہ اہلِ مغرب نے اس زبان کی حد بندی
شاید درست طریقہ پر ہی کی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے اس کو بہت وسعت
دے دی۔ وہ اس کو بھاکا یا بھاشا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور بھاکا کے
ذیل میں انہوں نے قنوجی، اودھی اور بندیلی کو بھی داخل کر لیا تھا۔ بلکہ اس کا
میدان اس سے بھی وسیع تر تھا۔ یعنی مشرقی اور مغربی ہندی بھی اس کے دامن میں
آجاتی تھی۔ مولانا شیرانی مسلمانوں کے اس نقطۂ نظر پر انگشت بدنداں ہیں کہ
وہ مسلمان، ہندوستان کی متعدد زبان کو جن میں پنجابی، برج، بندیلی، اردو،
مارواڑی اور بنگالی شامل ہے ہندوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آج ہندو بھی

ہندی کے ذیل میں برج، قنوجی، اودھی، بندیلی، مارواڑی وغیرہ زبانوں کو شامل
کر لیا ہے۔ بھاشا شاعری کی زبان تھی اور اس میں ہر ہندی شاعر اودھی ہو یا گجراتی،
مالوی یا بہاری) عام طور سے شعر لکھتا تھا۔ جس طرح مسلمانوں کے لیے فارسی شاعری
اور ادب کی جان تھی۔ اسی طرح بھاشا موسیقی اور شعر کی زبان تھی مسلمانوں کی
شعر دوستی نے بھاکا کی شاعری کو بہت کچھ تقویت دی۔ ان ہی کے زمانے سے اس
زبان میں شعر و ادب پیدا ہوئے۔ گویا اہلِ اسلام کے پاس تین زبانیں تھیں، اوّل
فارسی جس میں وہ شعر و ادب، تاریخ و انشا لکھتے رہے۔ دوسری اردو جس کو اپنے ساتھ
پنجاب لے گئے۔ تیسری بھاکا یا بھاشا جس میں موسیقی اور شعر لکھتے رہے۔ خلجیوں اور تغلقوں کے
عہد میں فارسی پر زوال آنے لگا۔ آئندہ قرون میں عام توجہ بھاشا کی طرف منعطف
ہو گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں عام ہندی گو شعرا پیدا ہو گئے۔ بھاشا میں
کثرت سے شعرا ہوئے ہیں جن میں صوفی وغیرہ صوفی شامل ہیں لیکن موجودہ
نسلوں کی عدم اعتنا سے ان کے کلام کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا اور جو کچھ باقی ہے
وہ بھی عنقریب معدوم ہو جائے گا۔ برج بھاشا کا کوئی قدیم نام نہیں۔ قدما اس
کو گوالیاری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔[۱۷]

شہر دہلی میں اگرچہ اردو بولی جاتی ہے لیکن آس پاس کے دیہات
میں ہریانی زبان موجود ہے جو حقیقت میں اردوئے قدیم ہی کی ایک شکل ہے
یہ نظریہ کہ اردو برج سے نکلی ہے اس عقیدے پر مبنی ہے کہ قدیم زمانوں میں
دہلی میں برج زبان بولی جاتی تھی۔ حالانکہ آج دہلی برج کے علاقے سے فاصلے پر
واقع ہے۔ مسلمان عہد سے قبل ممکن ہے کہ دہلی میں برج کا رواج ہو۔ لیکن اردو پر
برج کے اثرات کی توجیہ اور ہی ڈھنگ سے کی جاتی ہے۔ سکندر لودھی کے عہد سے

شاہجہاں کے زمانے تک آگرہ لودھیوں، سوروں اور مغلوں کا پایہ تخت تھا جو عین برج کے علاقے میں واقع ہے[۱۵]

مولانا شیرانی کے نظریہ کا ردّ:-

اُردو کے آغاز کے متعلق مولانا شیرانی صاحب کے مذکورہ بالا نظریئے کے تاریخی پہلو پر شوکت سبزواری صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے اس کا ماحصل درج ذیل ہے:-

۱- بقول مولانا شیرانی اگر اسلامی دور میں اُردو دہلی کے اثرات کے تحت بنی تو وہ بارہویں صدی عیسوی سے پہلے پنجاب میں کہاں پہنچ گئی اور اگر پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی جاتی ہے تو وہ اُردو نہیں پنجابی ہے۔

۲- مولانا شیرانی مرحوم کے اس نظریئے پر کہ اُردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سے دہلی گئی ہے۔ سبزواری صاحب تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نظریئے کا منشا در حقیقت یہ خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کی ہندوپاکستان میں آمد سے پہلے کوئی زبان نہ تھی، وہ مسلمانوں کے اثر سے وجود میں آئی۔

۳- مولانا شیرانی لکھتے ہیں کہ اُردو کی داغ بیل اُس دن سے پڑنی شروع ہو گئی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ وہ اوّل اوّل پنجاب آئے۔ وہاں تقریباً ایک سو ستر سال حکمرانی کرنے کے بعد دہلی کا رُخ کیا۔ اُردو اگر مسلمانوں کے اثر سے بنی تو پنجاب میں بنی جہاں وہ ڈیڑھ سو سال سے رہتے بستے تھے سبزواری صاحب لکھتے ہیں کہ مشکل یہ آن پڑی کہ پنجاب کی زبان

آج اُردو نہیں پنجابی ہے۔ جس کا حل مولانا نے یوں تلاش کیا ہے کہ غزنویوں کے عہد میں اُردو اور پنجابی میں کچھ فرق نہ تھا۔ وہ پنجابی تھی مسلمان اُس زبان کو لے کر دہلی گئے جہاں برج کے اثر سے کچھ تبدیلیاں ہوئیں تو موجودہ اُردو کا خاکہ تیار ہوا اور وہ پنجابی سے ممتاز ہو گئی۔ اس پورے استدلال کی بنیاد جیسا کہ شیرانی صاحب نے پہلے بیان کیا ہے یہ ہے کہ اُردو مسلمانوں کے اثر سے وجود میں آئی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اردو کی ابتداء کا مسلمانوں سے یا سرزمین ہند میں اُن کے سیاسی اقتدار کے قیام و استحکام سے کیا تعلق ہے۔ اور کونسی چیز ہے جو اس امر پہ مجبور کرتی ہے کہ ہم اردو کو ہجرت کرا کے دہلی لے جائیں۔ تاریخ صرف ہمیں اتنا بتاتی ہے کہ مسلمان دہلی فتح کرنے سے پہلے ایک سو ستر سال پنجاب میں رہے۔ بارہویں صدی کے آخر میں فتح دہلی کے بعد وہ دہلی میں داخل ہوئے جو مسلمان پنجاب میں ڈیڑھ سو سال سے آباد تھے۔ انہوں نے پنجاب کی زبان سیکھی۔ وہاں سے بولتے ہوئے دہلی پہنچے۔ یہ تاریخ نہیں قیاس ہے۔ فوج میں عام طور سے ۱۸-۲۰ سال تک کے نوجوان بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ جوان پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ولایت زاد نہ تھے۔ یا پنجاب میں عرصہ آباد تھے۔ نو وارد نہ تھے۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ دہلی جانے والے نوجوان عرصے سے پنجاب میں آباد تھے۔ اور انھوں نے اس درمیان میں پنجاب کی زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس زبان نے جو مسلمان پنجاب سے سیکھ کر گئے تھے کسی قدر تغیر و اصلاح کے بعد اُردو کی شکل اختیار کی یہ اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ دہلی میں اس وقت کوئی زبان رائج نہ ہوتی جسے وہاں کے باشندے عام طور سے بولتے ہوں یہ تاریخ اور اصولِ لسانیات دونوں کے خلاف ہے۔

دہلی میں اس وقت پنجابی اور برج دونوں سے الگ ایک زبان بولی جاتی تھی
جیسا کہ خود مولانا شیرانی نے لکھا ہے۔ امیر خسروؒ، ابوالفضل اور شیخ باجن اس زبان
کو دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۴۔ اس کے علاوہ اگر یہ صحیح ہے کہ اُردو کا آغاز اسی دن سے ہونا
شروع ہوا جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا تو
اُردو کا مولد وادیٔ سندھ کو ہونا چاہیے پنجاب سے کئی سو سال پہلے مسلمانوں
نے فتح سندھ کے بعد دریائے سندھ کی وادیوں میں مدتوں زندگی بسر کی جس کی
تاریخی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے سندھی زبان سیکھی۔ اصطخری چوتھی
صدی کا سیاح ہے جس کا بیان ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی
اور سندھی دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ اُردو پنجابی کی شکل میں ڈھل چکی تھی۔
سندھی ملتان اور لاہور ہوتے ہوئے دہلی کیوں نہیں جا سکتی۔ مولانا شیرانی فرماتے
کہ مسلمان جب سندھ اور پنجاب پر قابض ہو گئے تو سندھ میں انہیں تو پنجاب
میں انہیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی
فرماتے ہیں کہ مسلمان پہلے سندھ میں، وہاں کی بول چال کی زبان سندھی اختیار کی
مولانا شیرانی کے اصول کے مطابق مولانا سید سلیمان کا فرمانا بے جا نظر نہیں آتا۔
مسلمان پنجاب سے پہلے سندھ پر قابض ہوئے۔ اصطخری کے بیان سے ثابت
ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ میں سندھی بولی جاتی ہے۔ ہر چند سندھی اور
اُردو میں مشابہت اس درجہ کی نہیں جس درجہ کی اُردو اور پنجابی میں ہے۔
لیکن مولانا شیرانی کے طریقۂ استدلال کو مثال بنا کر کہا جا سکتا ہے کہ سندھی نے
اوّل اوّل پنجابی کا روپ اختیار کیا اور آخر کار اُردو کی شکل میں جلوہ گر

ہو گئی۔ اُردو کو سندھی سے نکلے یا سندھی سے بچھڑے بہت زیادہ عرصہ ہوا۔
سندھ سے نکل کر دہلی تک پہنچتے پہنچتے اسے طویل مسافت بھی طے کرنی پڑی۔ اس لیے
اُردو اور سندھی کی لسانی مشابہتیں پنجابی کے مقابلے میں کم ہیں۔

۵۔ شیرانی صاحب نے اپنے نظریے کی تائید میں خواجہ مسعود سعد سلمان متوفی
۱۱۳۹ء کے متعلق حضرت امیر خسرو اور محمد عوفی کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ تین دیوان
اُن کے یادگار ہیں۔ ان میں سے ایک ہندی زبان میں ہے جو اب ناپید ہے۔ اس سلسلے
میں سبزواری صاحب جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مسلمان اہلِ علم نے ہر چند
اُردو کو ہندی یا ہندوی کے نام سے یاد کیا لیکن وہ ہندوستان کی دوسری قدیم
و جدید بولیوں کو بھی ہندی کہہ گئے۔ مسلمانوں کے لیے ہندی ایک عام لفظ تھا جسے
وہ اُردو، پنجابی، بہاری، برج، اودھی کے علاوہ پراکرت اور اپ بھرنش کے لیے
یکساں طور سے استعمال کرتے اور جب تخصیص کی ضرورت پیش آتی تو وہ ان
زبانوں میں سے کسی ایک زبان کی طرف اضافت کر کے کہتے ہندی برج، ہندی اودھ
چنانچہ خان آرزو نے جب دہلی کی اُردو مراد لی تو انہیں زبانِ ہندی اہلِ اُردو جیسی
ترکیب وضع کرنی پڑی۔

برج، اودھی، راجستھانی اُردو سے مختلف ہیں۔ یہ مانا کہ یہ زبانیں اُردو
سے بہت ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اُردو سے فیض بھی اٹھایا ہے لیکن
جہاں اُردو کا ارتقاء دکھانا مقصود ہو وہاں ان زبانوں کے ادبی نمونے پیش
کرنا ایسا ہے جیسے احمد کی ٹوپی محمود کے سر۔ مولانا شیرانی کی علمی قابلیت اور لسانی
تجربہ مسلّم ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنی لائقِ قدر کتاب میں
اُردو کا ارتقاء دکھاتے ہوئے قطبن اور شیخ عثمان وغیرہ شعراء کا کلام پیش

کر دیا۔ مولانا اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ اودھی کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام اودھی میں ہے۔ اور اودھی جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے اردو سے مختلف زبان ہے۔ راسو کی زبان کے بابت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ملی جلی زبان رہی ہے جس میں راجستھانی برج اور برج پنجابی عناصر قدیم ہندی (ہندوستانی) کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔

ڈاکٹر ہیورنلے اپنی ایک تصنیف کے مقدمے میں ہندو پاک کی جدید آریائی زبانوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی لسانیاتی تاریخ کے چار دور ہیں۔ پہلا دور مگدھی پراکرت کا ہے۔ دوسرے دور میں ماگدھی پراکرت کے ساتھ ساتھ شورسینی پراکرت بھی ابھری۔ تیسرے دور میں ان میں سے ہر ایک نے دو دو بولیوں کو جنم دیا۔ شورسینی نے مغربی اور شمال کی آریائی زبانوں کو اور ماگدھی نے مشرقی اور جنوب کی بولیوں کو۔ چوتھے اور آخری دور میں جدید آریائی زبانیں نمودار ہوئیں۔[۱۵]

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اس لسانی تاثر کے کئی دور ہیں۔ پہلا زیادہ قدیم ہے۔ اس کا آغاز ہیورنلے کے نظریے کے مطابق آریائی زبانوں کے تیسرے دور سے ہوا۔ اس دور میں دوآبہ کی زبان مغربی ہندی نے پنجابی پر اثر ڈالا۔ دوسرا دور مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد کا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شیرانی فرماتے ہیں کہ اس دور میں پنجابی نے کسی قدر اردو کو یا اردو کے دکنی روپ کو متاثر کیا۔ تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جس وقت مسلمانوں نے دہلی میں نئی مرکزی حکومت کے حدود کو وسیع کیا۔ اس کی بنیادوں کو استوار بنایا۔ اس دور میں دہلی کی زبان اردو مسلمانوں کی ہم رکاب رہی

اور ان کے گھوڑوں کے سموں سے اٹھائی ہوئی گرد کے ساتھ ہر مقام پر پہنچی۔ وہاں کی زبانوں کو روندا اور اپنی شخصیت کو متاثر کیا۔ مولانا نے ان تینوں دوروں میں خلط ملط کر دیا۔

ڈاکٹر سبزواری صاحب نے ان تینوں ادوار کا جائزہ لینے کے بعد ان کو اس طرح ترتیب دیا ہے۔ پہلا دور اخذ و استفادے کا تھا۔ اس میں پنجابی، گجراتی، راجستھانی وغیرہ زبانیں قدیم اردو یعنی مغربی ہندی سے متاثر ہوئیں۔ دوسرے دور میں اردو نے پنجابی اثر کو قبول کیا۔ اور تیسرے دور کا آغاز تیرھویں صدی سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور دہلی نے ہندوستان کے سیاسی، علمی، تہذیبی، لسانی، ادبی اور معاشرتی مختصر یہ کہ ہر اعتبار سے دل کی حیثیت اختیار کی۔ ہر تحریک دلی سے اٹھی اور اس کی لہریں ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچیں۔[۱۶]

اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ کی زبان کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ کتاب جس زبان میں چھپی ہے اس پر قدیم ہندوستانی کی گہری چھاپ ہے۔ گرونانک کی سوانح حیات (جنم ساکھی) کی تصنیف کا زمانہ ۱۶۵۷ء ہے۔ جنم ساکھی کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر سدھیشور ورما لکھتے ہیں کہ اس میں ہندی، پنجابی اور لہندا کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ آر سی ٹمپل نے ۱۸۸۰ء میں پنجاب کے لوک گیت شائع کئے تھے۔ ان میں بیشتر گیتوں کی زبان اردو آمیز پنجابی ہے۔ بلکہ بعض بعض گیت خالص اردو میں ہیں جو پنجابی پر اردو اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مولانا شیرانی نے پنجابی اردو کے جو نمونے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ پنجابی کی لہر آنے سے پہلے پنجاب کی زبان کا رنگ

آہنگ کیا تھا۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ متوفی ۶۶۴ھ کے دو چار اقوال تاریخی
کتابوں سے نقل کر کے مولانا شیرانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان ساتویں صدی میں اپنے
امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے"۔[۱۲]

سبزواری صاحب مولانا شیرانی کے مذکورہ بالا دعوے کی تردید کرتے ہوئے
لکھتے ہیں کہ شہاب الدین غوری نے دہلی اور میرٹھ ۱۱۹۳ء میں فتح کیا۔ اس
کے بعد لاکھوں انسان ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوئے۔ اگر
لاکھوں انسان پنجابی بولتے ہوئے دہلی گئے تھے، اس وقت موجودہ اردو کا کوئی ٹھکانہ
نہ تھا تو شیخ فرید کی زبان مبارک پر اردو کے وہ فقرات کیسے جاری ہوتے جو
اردو کے امتیازی خط و خال نمایاں کرتے ہیں۔ کیا پنجابی زبان دہلی پہنچتے ہی ختم شدہ
ہو گئی؟ دہلی کی آب و ہوا نے اس کے خد و خال آن کی آن میں بدل دیئے؟ مولانا
کا یہ فرمانا کہ پنجاب والے چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کے شروع
میں اردو بول اور سمجھ سکتے تھے صرف اسی صورت میں قابل قبول ہو سکتا ہے
جب اردو پہلے سے موجود ہو اور پنجابی سے الگ ایک آزاد اور مستقل زبان کی
حیثیت رکھتی ہو۔ مولانا نے حضرت بابا گنج شکرؒ کی ایک غزل کو بھی پیش کیا
ہے جس کی زبان خالص نکھری ہوئی ہے۔ اگر وہ غزل فرید بابا کی ہے تو ماننا
پڑے گا کہ تیرھویں صدی کے شروع ہی میں اردو دہلی سے ہجرت کر کے پنجاب
پہنچ چکی تھی۔ پروفیسر بلدیو سنگھ نے حضرت بابا فرید کے ۱۳۰ اشلوک اور ۴ شبد
اورینٹل کالج میگزین میں شائع کئے ہیں۔ ڈاکٹر چیٹر جی ان شلوکوں کو
گورو نانک کے معاصر بابا فرید (سولھویں صدی عیسوی) کی تصنیف بتاتے ہیں

اور لکھتے ہیں کہ یہ غلطی سے بابا فرید گنج شکر کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں۔
یہی حال ان سے منسوب کردہ اشعار کا بھی ہے۔

مولانا شیرانی کے اس نظریہ پر کہ صرفی اور نحوی نقطۂ نظر سے اردو اور
پنجابی میں آج جو اختلافات نظر آتے ہیں بیشتر اس وقت پیدا ہوئے۔ جب
دہلی اور لکھنؤ میں شعرا اور اہل علم نے اردو کی نشوونما میں حصہ لیا۔ اپنے اس دعوی
کے دلیل میں انہوں نے مروجہ اردو سے اعراض کر کے ایسے نمونوں کا انتخاب کیا۔
جن کا تعلق قدیم اردو سے ہے۔ دوسری طرف وہی مواد پنجابی زبان میں بجنسہٖ یا
کسی قدر تغیر کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے دکنی اردو
کو منتخب کیا ہے اس طریقہ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب
لکھتے ہیں کہ مولانا اردو کے صرفی نحوی نشوونما اور اس کے فطری ارتقاء کو
نظر انداز کر کے لسانی تغیرات کی ذمہ داری دہلی اور لکھنؤ کے شعراء اور تعلیم یافتہ
طبقے پر ڈالتے ہیں اور اس لسانی حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ زبان
اپنی فطرت میں تغیر پذیر ہے۔ وہ کبھی ایک حالت میں قائم نہیں رہتی، برابر
بدلتی رہتی اور زمانے کے بہاؤ کے ساتھ بہتی ہے۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا
کہ زبان کی رفتار ترقی کی گردش لیل و نہار سے کیا نسبت ہے۔ زبان کتنی تیزی
سے روپ بدلتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں:۔

"زبان دانوں کا قول ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح
فرق پیدا ہو جاتا ہے"۔

سبزواری صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ مولانا کے اس قول کی چنداں اہمیت
نہیں۔ اس میں تحقیق کم اور شاعری زیادہ ہے۔ پھر بھی زبان کبھی ایسے دور سے

گزرتی ہے کہ اس میں رد و بدل اور تغیر کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ اور نصف صدی پہلے اس کا حلیہ بدل جاتا ہے۔ اردو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ترقی کی راہ اس نے بھی طے کی۔ اسے بھی زمانے کے الٹ پھیر کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہمارے اہل علم نے اردو کے حسب و نسب کا تعین کرتے وقت اردو کو بدستور زمانے کے بہاؤ کے ساتھ بہتا دکھایا اور اس کی معاصر بولیوں کو ایک منزل پر ٹھہرا دیا اور اسکی وجہ نہ بتائی کہ جب اردو اور اس کی ہمسر بولیوں کے سفر کا آغاز کسی ایک مقام سے ساتھ ساتھ اور قدم بہ قدم ہوا تھا تو کس لیے اردو منزلوں پر منزلیں مارتی چلی گئی اور اس کی رفیق سفر تھک کر بیٹھی رہیں۔ اردو نے اپنے جگر گوشے کو (برج) کو اپنے سے الگ کر دیا اور اس کی رفیقِ سفر (پنجابی) نے اپنے قدیم سرمائے کو بھی سینے سے چمٹائے رکھا۔ کیا اسلئے کہ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی شکل میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ خیال کئی وجوہ سے ناقابلِ قبول ہے اوّل دو یا دو سے زیادہ زبانیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو اس میل ملاپ کا اثر صرف ایک زبان پر نہیں پڑتا۔ برابر دونوں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ .... دونوں کے تعمیری عناصر تخریب کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اردو برج کی ترمیم قبول کرتی رہی۔ لیکن برج نے اردو سے اصلاح نہ لی۔ کیوں؟ دوسرے موجودہ اردو ساخت اور اساس کے اعتبار سے موجودہ پنجابی سے مختلف ہے۔ اگر اردو اور پنجابی کے اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ اردو دہلی جانے کے بعد برج سے وقتاً فوقتاً ترمیم...... قبول کرتی رہی۔

تو اصلاً اُسے موجودہ پنجابی سے مختلف نہ ہونا چاہیے۔ تیسرے اردو کے ان اہم عناصر کی کیا توجیہہ ہوگی اور انہیں دہلی کی کس زبان سے ماخوذ بتایا جائے گا جو نہ برج میں ہیں اور نہ پنجابی میں۔ نہ انہیں پنجابی کہا جا سکتا اور نہ برج سے ترمیم کرنے کا نتیجہ ٹھہرایا جا سکتا۔ غیر فاعلی حالت میں "وں" کے اضافے سے جمع بنانے کا قاعدہ نہ پنجابی میں ہے نہ برج میں۔ اردو میں یہ قاعدہ کہاں سے آیا؟ دہلی کی جس زبان سے یہ قاعدہ لیا گیا اردو اس زبان کی ترقی یافتہ صورت کیوں نہیں ہو سکتی جو اس نے صرفی نحوی نشوونما کے بعد اختیار کی۔ چوتھے ساری بحث میں دہلی اور میرٹھ کے علاقے میں بولی جانے والی (کھڑی) زبان یکسر سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ اس زبان کے وجود کو مولانا نے بھی تسلیم کیا ہے اور یہ مانا ہے کہ یہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی۔ یہ دہلی کی وہ قدیم زبان ہے جس سے ارتقا پا کر موجودہ اردو وجود میں آئی۔

بے شک دہلی میں مظہر جانِ جاناں اور ظہور الدین حاتم نے اردو زبان میں اصلاح و ترمیم کی بنیاد ڈالی جو لکھنؤ میں ناسخ کے عہد تک جاری رہی۔ اٹھارویں صدی کے نصف تک اردو میں تراش و خراش ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں ذیل کے امور اہل علم کی توجہ کے قابل ہیں۔

شعراء کی اصلاح و ترمیم کا تعلق اردو زبان سے نہ تھا۔ شاعری کی زبان یعنی ریختہ سے تھا۔ حاتم و ناسخ نے اردو کی اصلاح نہیں کی۔ اس زبان کو سنوارا جو ان کے زمانے میں عام طور سے (ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا) شاعری میں برتی جانے لگی تھی۔ شاہ حاتم نے دیوان زادہ کے مقدمے میں اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے۔ دوسرے

یہ اصلاح اُن کی ذاتی استبدادی عمل نہ تھا وہ اپنی خواہش پسند اور صواب دید کے مطابق اُردو شاعری کی زبان کو نئے قالب میں ڈھالنا نہیں چاہتے تھے۔ اُردو میں تراش و خراش ان کا منصب نہ تھا۔ اِس اصلاح کی ضرورت اِس لئے پیش آئی (جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے) کہ دلی میں اُردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو دہلوی شعراء کے سامنے دکن کی اُردو شاعری نمونہ بنی۔ انہوں نے دکنی شعراء کی پیروی کی اور ان کی تقلید میں زبان وہی اختیار کی جو دکنی شعراء کے ہاں استعمال ہوئی تھی یہ زبان دہلی کی رائج الوقت زبان سے مختلف تھی مرزا جان جاناں مظہر اور شاہ حاتم شاعری کی اِس "دکن زدہ" زبان کو دکنی عناصر سے پاک کرکے دلی کے روزمرہ سے قریب تر لے آئے۔

شاہ حاتم فرماتے ہیں:

"روزمرہ دہلی کی میرزایانِ ہند و فصیح گویاں اُردو محاورہ دارند منظور داشتہ یا یوں کہئے کہ شعراء جانتے کہ جو الفاظ وہ باندھ رہے ہیں اُردو نہیں دکن کے ہیں اور ٹکسال باہر ہیں۔ لیکن جیسا کہ میر انشاء اللہ خاں انشاؔ نے لکھا ہے شعری ضرورتوں سے مجبور ہو کر عمداً شعر میں باندھے جاتے ہیں۔ نثر میں مجبوری نہ تھی اسلئے غیر ٹکسالی الفاظ نظم میں جڑ پکڑ گئے نثر میں راہ نہ پاسکے۔ مصلحین زبان نے ان الفاظ کے خلاف جہاد کرکے ریختہ کے باغ کو جو دکنی الفاظ کے خس و خاشاک سے اَٹ گیا تھا پاک کیا"۔[۲۲]

مولانا شیرانی کا ارشاد ہے کہ انہوں نے (اُردو شعراء نے) اپنی دانست میں اُردو کی اصلاح کی۔ مگر ایسے موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اُن کی اصلاح اور

ترمیم کے اُصول نے ایک صرفی نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی پیدا کردی۔ قدیم اُصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی جامع مفید اور کارآمد تھے۔ مثلاً اُردو شعراء کا پرانی جمع کے قاعدوں کو باطل کرنا حرفِ علت اور ان، غنہ کا خارج کرنا وغیرہ اِس سلسلہ میں سبزواری صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ زبان کی تغیر پسند اور نمو پذیر فطرت کے اندرونی تقاضوں کے اثر سے ہوا۔ مسلمانوں کی سرپرستی میں آنے سے پہلے اُردو دہلی اور اُسکے نواح میں بولی جارہی تھی اگرچہ اس شکل میں وہ نہ تھی جو آج ہے۔ یا مسلمانوں کی سرپرستی میں آنے کے بعد ہوئی۔ اپنی زندگی کے قدیم دوروں میں اس نے نت نئی صورتیں بدلیں۔ نئے دور میں قدم رکھنے کے بعد بھی وہ نئے نئے روپ ڈھالتی رہی۔ زبان کی نت نئی تبدیلیوں کا ذمہ دار اُردو شعراء اور تعلیم یافتہ طبقے کو ٹھہرانا حقیقت کے خلاف ہے۔ قیاس صحیح اسکا موید نہیں یہ خلاف حقیقت ہے اِس لئے ان مصلحین شعراء کے کارناموں کی تفصیلات تذکروں میں مرقوم ہیں۔ ان میں صرفی نحوی اصلاحات شامل نہیں۔ اگر شعراء صرفی نحوی اُصول و قواعد میں ترمیم و اصلاح کرتے تو تذکرہ نگاروں کی نظریں اُس پر ضرور پڑتیں اور اُس کا ذکر کرتے قیاس سے اسلئے اس کی تائید نہیں ہوتی کہ صرفی اصولوں کی اصلاح و ترمیم یا ان میں کسی قسم کا تصرف شعراء یا تعلیم یافتہ طبقہ کے اختیار و اقتدار سے باہر ہے۔ اُن کا ہاتھ زبان کے دامن تک نہ پہنچ سکا اُسکے گریبان پر وہ کیا ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

اُردو کے صرفی و نحوی اصول و قواعد میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوئیں۔

ہیں۔ اسی بات سے ہمیں شبہ اس میں ہے کہ یہ ترمیمیں شعرائے اُردو کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔ سبزواری صاحب کہتے ہیں کہ زبان کی فطرت ہے کہ وہ زمانے کی ہر کروٹ کے ساتھ کروٹ بدلتی ہے اور مولانا جسے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی بتاتے ہیں، جدید دبستانِ لسانیات کا امام "یس پرسن" اُسے زبان کی برتری، تفوق اور اصلاح کی ایک اچھی اور صحت مند علامت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے زبان کے بارے میں جو بحثیں کی گئیں وہ بیشتر لاحاصل اور بے سود ہیں۔ ان سے کوئی علمی نکتہ دریافت نہیں ہوا۔ اصل سوال جس کی کوئی اہمیت ہے یہ ہے کہ زبان میں تغیر کا رُخ ترقی کی طرف ہے یا تنزل کی طرف۔ زبان رُوپ بدل کر آگے بڑھتی ہے یا پیچھے ہٹتی ہے۔ اس میں ابتری و برہمی رُونما ہوتی ہے یا برتری و ہمواری۔ یس پرسن کہتا ہے کہ مختلف زبانوں کے تاریخی ارتقاء کے جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صرفی نحوی اُصول کے لحاظ سے زبان کا عام رُجحان و فطری میلان یہ ہے کہ وہ ابتری سے برتری کی طرف قدم بڑھائے اور ناہمواری سے ہمواری کی طرف قدیم اصولوں کو جن پر زبان کی تعمیر ہوئی، جامع مفید اور کارآمد بتانا جدید نظریۂ ارتقاء کے منافی ہے۔ اس سے اس نتیجے کی تکذیب ہوتی ہے جس پر جدید لسانیات کے ماہر تحقیقی جستجو و کاوش کے بعد پہنچے۔ زبان کے قدیم اُصولوں کی جامعیت اگر اُن کی کثرت، وسعت، رنگارنگی اور تنوع ہے تو۔۔۔۔
۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اُصول جامع ہوں۔ لیکن اس میں شبہ کی گنجائش ہے کہ وہ اُصول مفید اور کارآمد تھے۔ اگر وہ مفید ہوتے تو نذرِ تخریب نہ ہوتے مفید اور کارآمد چیزیں مٹتی نہیں، باقی رہتی ہیں۔ پانی کے اوپر کے جھاگ

دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو جاتے ہیں اور سمندر کی تہہ میں بیٹھ جانے والے موتی جو نفع بخش اور کارآمد ہوتے ہیں، باقی رہ جاتے ہیں۔ زبان کے قدیم اُصول جن کے ضائع ہونے کا مولانا کو افسوس ہے، سرے سے بے سود اور غیر مفید تھے۔ اگر مفید تھے تو انسان کی ذہنی اور فکری نشو و نما کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکے تھے اور حرام گوشت کی طرح زبان کے نمو پذیر جسم سے چمٹے ہوئے تھے۔ زمانے کے بے رحم ہاتھ نے اس حرام اور بے جان گوشت کے لوتھڑے کو زبان کے جسم سے نوچ کر الگ کیا۔ مشہور جرمن ماہر لسانیات کراکر کہتا ہے کہ قدیم صیغوں، اصولوں اور آوازوں کے نقوش ڈھونڈتے ہوتے اور مٹتے دیکھ کر دل غم و غصّے سے بھر جاتے ہیں۔ لیکن انصاف پسند جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں جانتا ہے کہ یہ ارتقاء کی جیت ہے جو اُس نے مُردہ اور بے جان مواد پر حاصل کی ہے۔[۲۴]

اُردو کے آغاز کے متعلق مولانا شیرانی کے نظریہ کے تاریخی پہلو اور جس انداز میں انہوں نے پنجابی اور اردو کے صرفی اور نحوی رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس پر تبصرہ کرنے کے بعد سبزواری صاحب لکھتے ہیں کہ:-

الغرض اُردو اگر پنجابی سے ماخوذ ہوتی تو اُس کی حیثیت پنجابی کی ایک بولی یا شاخ سے زیادہ نہ ہوتی اور یہ قریب قریب طے ہو چکا ہے کہ کسی زبان کی شاخ جسے اپنی اصل سے بچھڑے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو، بنیادی طور پر اصل سے مختلف نہیں ہوتی۔ مولانا شیرانی کے لفظوں میں برج کی جگہ پنجابی رکھ کر جب ہم اُردو کے ڈول، اُس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا ڈھنگ اور ہے اور پنجابی کا رنگ اور

دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔

"پنجابی سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں پنجابی نے اس سے مستعار لیے ہیں وہاں پنجابی پر اپنا اثر بھی ڈالا ہے۔ پنجابی پر کیا موقوف ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اُردو کے اثر سے خالی نہیں۔"

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولانا شیرانی کی نشان کردہ اُردو اور پنجابی کے ان تمام لسانی مشابہتوں کے باوجود اُردو اور پنجابی مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں۔ ان میں اصلی اور نسلی امتیازات ہیں جو ان کے مختلف الاصل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور صاف صاف چغلی کھاتے ہیں کہ یہ زبانیں ایک گھرانے کی نہیں، دو گھرانوں کی ہیں، ایک نسل کی نہیں، دو نسل کی ہیں۔[۲۲]

سبزواری صاحب یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیادی طور پر اُردو پنجابی سے مختلف زبان ہے اور اس ضمن میں انہوں نے اُردو اور پنجابی کے لسانی امتیازات کی بھی صراحت کی ہے مگر یہاں جو نظریہ اس کا مزید یہ سوال یہ ہے کہ اُردو اور پنجابی اصل اور اساس کے لحاظ سے اگر ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو ان میں سے کوئی ایک، دوسری کی اصل کیسے ہوئی؟ اس بحث کو انھوں نے حسب ذیل تین بنیادی حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان پر اسی ترتیب سے بحث کرتے ہیں۔

ا۔ اُردو اصل و نسل کے لحاظ سے پنجابی سے مختلف زبان ہے۔

ب۔ اُردو کا اختلافی سرمایہ پنجابی کے سرمائے سے زیادہ قدیم ہے۔

ج۔ اُردو اور پنجابی کا مشترک سرمایہ ان زبانوں کو اپنے اصل سے ترکہ میں ملا یا پنجابی نے قدیم ہندوستانی (اُردو) سے مستعار لیا۔[۲۳]

قدیم دکنی اور پنجابی کے رشتے سے متعلق شیرانی صاحب کی رائے پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تنقید کا بھی ذکر یہاں بے محل نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالہ مقدمۂ تاریخ زبان اُردو میں لکھتے ہیں کہ:-

"پروفیسر شیرانی کے اس دعوے میں بھی کافی حد تک صداقت ملتی ہے کہ قدیم دکنی پنجابی سے مماثل ہے۔ لیکن صوتیاتی صرفی و نحوی لحاظ سے دکنی کے "پنجابی پن" کی توجیہ نواحِ دہلی کی تین بولیوں (کھڑی، ہریانی اور میواتی) سے بھی ہو سکتی ہے۔"

حقیقت یہ ہے جیسا کہ ڈاکٹر چیٹرجی نے اپنی تصانیف میں اشارہ کیا ہے کہ قدیم عہد میں لاہور سے لے کر الہ آباد تک کی زبان میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب کی بولیاں آج بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس زمانے میں اور زیادہ قریب تھیں۔ جدید آریائی بولیوں کے طلوع کا زمانہ ایک ہزار عیسوی سے پیچھے نہیں لے جایا جا سکتا اسلئے قدیم دکنی کا جواز جدید پنجابی میں نہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔ بولی کی حیثیت سے اگر کسی کو قدیم دکنی سے گہری نسبت ہو سکتی ہے تو وہ دہلی کے نواح کی دو بولیاں ہیں یعنی کھڑی اور ہریانی۔ اس سلسلے میں برج بھاشا اور میواتی کو اور ملحوظ رکھنا ہوگا کیونکہ شہر دہلی ان تمام بولیوں کے نقطۂ اتصال پر واقع ہے ہمارا خیال ہے کہ دکنی کے "پنجابی پن" کی توضیح حسب ذیل اضلاع کی بولیوں سے کی جا سکتی ہے۔

(۱) کھڑی کے اضلاع : میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر۔

(۲) ہریانی کے اضلاع : کرنال، روہتک۔

(۳) میواتی کا ضلع : گڑگاؤں۔

(۴) برج کا ضلع : بلند شہر۔

ان میں دکنی اور قدیم اُردو کے نقطۂ نظر سے میرٹھ، روہتک اور گڑگاؤں کے اضلاع کی بولیاں بہت اہم ہیں۔ انہیں علاقوں کے رہنے والے قدیم دہلوی سماج کے ان مختلف طبقات پر مشتمل تھے جو کئی قسم کی ملی جلی زبان بولتے تھے۔ ان سب پر ترک، افغانی سماج کا ٹھپہ تھا۔ اور ابتدا میں شہر دہلی میں خسرو کی "زبانِ لاہوری" کا اثر بھی تھا۔

اُردو کی ابتداء اور ارتقاء کے سلسلے میں جس نظریئے کا خاکہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب مقدمۂ تاریخ زبان اُردو میں تیار کیا ہے۔ اس میں زور نواحِ دہلی کی ان تمام بولیوں پر ہے جن کے سنگم پر شہر دہلی واقع ہے۔ دکن کی قرأت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ ہم معیاری اُردو سے قطع نظر نواحِ دہلی کی بولیوں کا لسانی جائزہ نہیں لیتے۔ محمود شیرانی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پنجابی اور دکنی کی مماثلت اپنی تصنیف میں پیش کی۔ جدید تحقیق صرف اس بات کی منتظر تھی کہ دکنی کی ان خصوصیات کو جنہیں پنجابی سے منسوب کیا گیا ہے نواحِ دہلی کی بولیوں سے ثابت کردے۔ کیونکہ یہ بات تو مسلّم ہے کہ ہریانی اور کھڑی (نواحِ دہلی کی بولیاں) مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد کا ارتقاء نہیں۔

اس تحقیق کام کے سلسلے میں تاریخی مواد وہ صرف ہریانی کا فراہم کرسکے ہیں۔ کھڑی اور میواتی کی جدید شکلوں ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کھڑی کے سلسلے میں

شمالی کی اُردو کے قدیم ادبی نمونوں پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔[26]

"پنجاب میں اُردو کے ردِّ عمل کے طور پر بعض علاقائی نظریئے بھی پیش ہوئے۔ کسی میں اُردو کا مولد دکن بتایا گیا کسی میں گجرات اور کسی میں سندھ۔ یہ نظریات علمی تحقیق پر مبنی نہیں ہیں۔ ان کی بنیاد بھی اسی خیال پر ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی۔ جس علاقہ میں ہندو اور مسلمان کا میل ہوا۔ وہی اُردو کا مولد ہے، دکن، گجرات اور سندھ سے جو نسبت ہے اس کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے، اور بس۔ مسائل زبان کو سمجھنے والے اُردو کی ابتداء کے سلسلے میں ان نظریوں کا ذکر شاید گوارا نہ کریں۔

لیکن اُردو کی ابتداء کے سلسلے میں تحقیق کا دروازہ یہیں پر بند نہیں ہو جاتا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحبان نے لسانیات پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب اپنے مقالہ مقدمۂ تاریخ زبانِ اُردو میں اُردو زبان کے تسلسل کی نشاندہی ویدک زمانہ ۱۵۰۰ ق۔م سے عالمگیر کے عہد ۱۷۰۷ عیسوی تک کی ہے۔ بقول ان کے یہ ضروری بھی تھا۔ کیونکہ ہماری زبان اسی کا پیوند ہے جو سالہا سال کے عرصہ سے ہند کی سرزمین میں پروان چڑھی۔ شمالی ہند میں اُردو زبان کے ارتقاء کی داستان اپ بھرنش سے شروع کی گئی ہے۔ ۸۰۰ عیسوی تا ۱۲۰۰ عیسوی تک کے عہد میں کھڑی بولی کے حروف، افعال اور لاحقوں کو مدِّنظر رکھ کر اس کی قدامت کو قدیم ادب کے ان نمونوں سے ثابت کیا ہے جو عہد اپ بھرنش سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس عہد کی تصانیف جنہیں قدیم ہندوستانی کے مطالعہ کے لئے اہم اور مستند سمجھتے ہیں، ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ علاوہ اس کے

وہ بدھ سدھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب ادبی ذخیرے کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جسے انھوں نے ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں میں مذہبی تبلیغ کے سلسلہ میں استعمال کیا تھا۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے وہ بہت زیادہ اہم نہیں۔ تاہم ان کی پنج رنگی زبان کا جائزہ اس عہد کے لسانی گتھیوں کو حل کر سکتا ہے۔ ان میں چوراسی سدھ و سدھ لوئی اور برو پا سدھ اس نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں زبان کے جو نمونے انھوں نے پیش کیے ہیں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی زبان کو پرکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ "دیش بھاشا" میں ملی ہوئی اپ بھرنش یعنی پرانی ہندوستانی ہے۔ نیز اس سلسلہ میں چند عالموں مثلاً دیو سین و ہیم چندر و ہیرو ننگا سوری اور شارنگ دھر کی تصانیف کا ذکر کیا ہے جس میں کھڑی بولی کے حروف افعال اور لاحقے ملتے ہیں۔

اپ بھرنش کی تصانیف کے بعد ہندی ادب کا وہ عہد آتا ہے جسے "ویر گاتھا" کہا جاتا ہے۔ یہ ادب عام طور سے دو قسم کی زبانوں میں ملتا ہے۔ ایک کا تعلق خاص دربار سے ہے جسے ڈنگل کہتے ہیں اور دوسرا عوامی ادب جو بول چال کی زبان میں ہوتا تھا جس میں کبھی کبھی کھڑی بولی اور پنجابی کا پیوند نظر آتا ہے۔ اسے پنگل کہتے ہیں۔ اس عہد کی زبان کے مطالعے کے لئے سب سے زیادہ مستند تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ بیسل دیو راسو: مصنف نرپتی ناله ۲۔ پرتھوی راج راسو: مصنف چند بردائی

۳۔ پرتھوی راج اور راول سمر سنگھ کے وہ شاہی پروانے جو ناگری پرچارنی سبھا کے لسانی جائزہ کے دوران میں دریافت ہوئے جو ہندی نثر کے قدیم ترین نمونے مانے جاتے ہیں۔

بیسل دیو راسو کے مطالعہ سے ایک بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ

شاعری کی زبان میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے بھی بعض الفاظ کا میل کر دیا جاتا تھا۔ اس میں کچھ مسلمانی الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً محل، انعام، نیجا (نیزہ)، تاجنو (تازیانہ)۔ ممکن ہے کہ یہ الفاظ بعد کو اضافہ کر دیئے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود شاعر نے استعمال کئے ہوں۔ کیونکہ اس سے پہلے پنجاب میں مسلمان عام طور سے پھیل گئے تھے۔ بیسل دیو کے سرداروں میں ایک مسلمان سردار تاج الدین بھی تھے۔

اس عہد کی دوسری مشہور تصنیف پرتھی راج راسو ہے۔ اس کا مصنف چند دہلی کے آخری ہندی راجہ پرتھوی راج کا دوست، وزیر اور درباری شاعر تھا۔ اس کتاب کی ضخامت ڈھائی ہزار صفحات ہے۔ اس میں ۶۹ باب ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا آخری حصہ چند کے بیٹے جلہن نے باپ کی ہدایت کے مطابق مکمل کیا۔ راسو کے نقطوں کی چونکہ تاریخی سند نہیں ملتی اس لئے عرصے سے اس کتاب کی قدامت کے متعلق بحث چلی آرہی ہے اور مختلف مصنفین مختلف وجوہات اور دلائل سے اسے جعلی ثابت کرتے آئے ہیں۔ تاہم مسعود حسین خاں نے اس کتاب کی بعض ایسی لسانی اور تاریخی شہادتوں کی طرف نشاندہی کی ہے جن کو ابھی تک رد نہیں کیا جا سکا۔

راسو کی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ اس میں جہاں پراکرت اور اپ بھرنش کے اسماء اور افعال آئے ہیں وہیں خالص سنسکرت کے الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ یہ پراکرتی میلان کے خلاف شاعر کی "ایجاد بندہ" ہے۔ کیونکہ پراکرت اور اپ بھرنش میں سنسکرت تت سم کا فقدان ہے۔ یہی اصل پراکرت کی پہچان ہے۔ چند نے ت کی جگہ ٹ کا بھی استعمال کیا ہے اور یہ اپ بھرنش کی بجائے قدیم ہندوستانی زبان کی خصوصیت مانی جاتی ہے۔ آج بھی ہریانی

کھڑی بولی (دیہاتی) اور پنجابی کے علاقے میں ’ݨ‘ کی آواز سنائی دیتی ہے۔
لیکن برج اور ادبی ہندوستانی (ہندی) اور اُردو دونوں اور دکنی میں یہ
ہمیشہ (ن) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جن نمونوں کا حوالہ دیا گیا ہے اُن میں بعض
ایسے فعل بھی آگئے ہیں جو برج بھاشا کے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ”آڑی چلیو“ ”آیو“
”کریو“ چند کے یہاں اپ بھرنش کے برعکس (ا) کی جگہ برج بھاشا (او) کا کثرت
سے استعمال پایا جاتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ پنگل بعض اوقات ڈنگل
کی گود میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ بعینہ جیسے کھڑی بولی اوّل اوّل برج بھاشا
کی گود میں نظر آتی ہے اور رفتہ رفتہ اُس کی گدی چھین لیتی ہے۔

چند نے عربی فارسی کے الفاظ کو ہندی عروض اور صوتیات کے مطابق
اپنی شاعری میں اس طرح باندھا ہے کہ اُس کا جواز نہ تو پراکرت میں ملتا ہے اور نہ
اپ بھرنش میں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کی زبان ایک
خاص ڈول اختیار کر رہی تھی جس میں راجستھانی لب ولہجہ کو امتیاز حاصل تھا
مثلاً سلیم کو ’سلیم‘ کمال کو ’کمال‘ عرب کو ’عربی‘ ترکی کو ’ترکی‘ کمان کو ’کمان‘۔
راسو کے قدیم ترین حصوں سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ وہ اس وقت کی معیاری ادبی
زبان میں لکھی گئی ہے جس میں راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ قدیم راجستھانی
اپ بھرنش کی جھلک کافی مل جاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دہلی کے
آس پاس کی زبان بالکل مردہ تھی۔ حال ہی میں ناگری پرچارنی سبھا نے راول سمر سنگھ
اور پرتھوی راج کے نو دان پتروں کا پتہ لگایا ہے۔ راول سمر سنگھ کے پروانے
راجستھانی زبان میں ہیں۔ لیکن پرتھوی راج کے پروانوں سے پرانی کھڑی بولی
کی شکل جھلکتی ہے۔ پرتھوی راج نے چونکہ دہلی کو راجدھانی بنایا تھا۔ اس لیے

وہاں کی زبان سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ لیکن دہلی پرانے اندرپرست ہریانہ
کے علاقہ میں واقع تھی اسلئے اس کی بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے
میں ڈاکٹر صاحب نے ایک پروانہ کو پیش کرکے درج ذیل الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔
جو خالص کھڑی بولی کے ہیں ”لیوے گا“ ”دیوے گا“ ”لایا جائے گا“ ”کرے گا“
”آویں گے“ اس کے علاوہ ”تم نے“ کو ”تم لے“ لکھا ہے جو آج بھی کھڑی بولی کے علاقہ
میں بولا جاتا ہے۔ بعض فارسی الفاظ ”دوا“ ”خزانہ“ ”پرچہ“ ”آرام“ ”حکم“ وغیرہ نظر آتے ہیں
جن کا عام طور سے استعمال ہونا دور از قیاس نہیں کیونکہ اس وقت مسلمان
سارے پنجاب میں پھیل چکے تھے۔

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل زبان کا ہیولیٰ اس طرح تھا جس کا
ابھی ابھی ذکر ہوا۔ وہ نہ تو برج بھاشا ہے نہ کھڑی بولی۔ بلکہ اس عہد کی قدیم
اپ بھرنش کی روایات میں جکڑی ہوئی زبان ہے جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں
ہے۔ در اصل ہندوستان کی جدید بولیوں کی پیدائش صحیح معنوں میں ابھی تک
نہیں ہوئی تھی۔ خاص طور پر ادب نے ابھی انہیں منہ نہیں لگایا تھا۔ اس لیے ان
زبانوں (پنجابی، برج، ہریانی اور کھڑی) کے مستند نمونے سولہویں صدی سے
زیادہ پرانے نہیں۔ کھڑی بولی جس کی شکل ہم قدیم ہندی کے ادب میں پہچانتے
آئے ہیں۔ پہلی بار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ایک نئے عروض اور نئے رسم الخط میں
ڈھلتی ہے۔ لیکن یہ بھی مسلمانوں کے دہلی میں اچھی طرح متمکن ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔
پروفیسر ژول بلوک کی رائے ہے کہ اولین سلاطین کے عہد کی دہلی کو تمدنی اور
لسانی اعتبار سے ہندوستان میں بہت زیادہ مرتبہ حاصل نہ تھا۔ اس وقت
اس کی حیثیت مرکز کی بجائے فوجی چھاؤنی کی زیادہ تھی۔

ہندوستانی (کھڑی بولی) کی قدامت کا مزید ثبوت امیر خسرو (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ء)
شیخ باجن متوفی ۱۵۰۶ء اور ابوالفضل کی تحریروں سے ملتا ہے۔ تینوں نے دہلوی
زبان کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ مسلمان پنجاب سے فارسی آمیز یا جدید
پنجابی بولتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے دہلی میں اور اس کے آس پاس ان کی
مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوتی ہے۔ آس پاس کے علاقوں میں ایک طرف پرانی ہریانی
اور دوسری طرف پرانی کھڑی بولی تھی۔ چونکہ کسی زمانہ میں مشرقی پنجابی خود انہیں
دونوں بولیوں کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی اس لئے پنجابی بولنے والوں کو برج بھاشا
کی نسبت کھڑی بولی اور ہریانی اپنے سے زیادہ قریب دکھائی دی۔ انہوں نے
اس کی صوتیات اور صرف نحو کو پنجابی سے ملتا پایا۔ اس طرح ان کی نظر انتخاب
(غیر شعوری طور پر) برج کی بجائے انہیں بولیوں پر پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا
سیکھ گئے۔ جیسا کہ اپ بھرنش کے باب میں بالتفصیل لکھا جا چکا ہے کہ ناتھ
پنتھی جوگیوں کے ذریعہ دہلی کے آس پاس کی زبان قدیم زمانے سے مذہبی اور
تبلیغی کاموں کے لیے شمالی ہند کے ہر حصے میں استعمال کی جاتی تھی۔ موجودہ
پنجابی سے متعلق ایک اہم غلط فہمی رفع ہو جائیگی اگر اس لسانی حقیقت کو نظر انداز
نہ کیا جائے کہ یہ ایک "ملوان" زبان ہے جو دوآبہ کی بولیوں کے تحت بہت بعد کو
ظہور پذیر ہوئی اور جس کے مقابلے متھرا، دہلی اور ہریانہ علاقوں کی بولیاں بہت
قدیم ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ قدیم اردو کی جن خصوصیات کو پنجابی سے
منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل اس قدیم زبان کی خصوصیات ہیں جسے ہم اپ بھرنش
کی جدید شکل کہہ سکتے ہیں اور جو کسی زمانے میں راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کے
تحت شمالی ہند کی مستند ادبی زبان بن گئی تھی اور جس سے شمالی ہند کی تقریباً

تمام بولیوں نے خوشہ چینی کی ہے۔ شہر دہلی کے جغرافیائی محل وقوع پر نظر ڈالیے
تو معلوم ہوگا کہ یہ شہر برج بھاشا، ہریانی، کھڑی بولی اور میواتی (راجستھان کی ایک
بولی) کے سنگم پر واقع ہے۔ راجپوتوں کی دِلّی، ڈِلّی یا اپ بھرنش ادبیات کی
"ڈھلّی" ہریانہ کے علاقہ میں تھی جس سے کھڑی بولی بہ نسبت میواتی کے
زیادہ قریب تھی۔ شاہ جہاں کی دہلی خود اندرپٹ (اندرپرست) سے کئی میل آگے
شمال میں بسائی گئی تھی جس کی آبادی بیشتر آگرہ کے زود اور برج بولنے والوں کی
تھی۔ پنجابی، مغربی ہندی کی بولیوں میں چونکہ ہریانی قریب تر ہے اس لئے قدیم
اردو اور دکنی میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ بعد کو مغلوں کے عہد میں برج بھاشا
اور کھڑی بولی کے اثرات اس پر غالب آجاتے ہیں اور اردو کا پنجابی پن زائل
ہونا شروع ہوتا ہے۔ لب و لہجہ بدلتا ہے اور ہندوستانی کا اپنا معیار اُس
وقت قائم ہوتا ہے جب وہ ایک طرف بَدَّل، لَتّا اور گَڈی (ہریانہ، میرٹھ اور
سہارنپور) کی بجائے بادل، لتا، گاڑی کو قبول کرتی ہے اور دوسری طرف
جوری، لری، لرائی (آگرہ متھرا) کی بجائے جوڑی، لڑی اور لڑائی کو۔

اس کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۳۰۰ء تا ۱۷۰۰ء
(پانچ سو سال) کا زمانہ جدید آریائی زبانوں کے ارتقاء کا زمانہ ہے۔ لیکن ادبی لحاظ
سے یہ بہت بنجر زمانہ ہے اور اردو زبان تو اس لحاظ سے بیچاری ہے۔ تاہم
اس کی نشاندہی صوفیائے کرام (شیخ حمیدالدین ناگوری ۱۱۹۳ء - ۱۲۷۴ء) روشن
چراغ دہلوی متوفی ۱۳۵۶ء، فرید گنج شکر کے ملفوظات، حضرت امیر خسرو کی شاعری
خواجہ بندہ نواز کے رسالوں اور اس عہد کی فارسی تاریخوں مثلاً تاریخ فیروز شاہی
تاریخ داؤدی، تاریخ ہمایونی، تزک جہانگیری، سفرنامہ، لغات امیر الفضلاء

(۱۵۱۰) کے فقروں سے کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:-

"لیکن ...... اس عہد کی کھڑی بولی پورے طور سے ہندی ادبیات میں ابھرتی ہے۔ پنجابی برج بھاشا اور اودھی کے ساتھ ساتھ وہ بھی (۱) نامدیو، (۲) کبیرداس اور (۳) گرو نانک کی ملی جلی زبان میں روحِ عصر کی ترجمان ہے۔"[۲۵]

اور اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ بابر کی فتح دہلی (۱۵۲۶ء) سے قبل ہی دہلی میں ایک نئی زبان کا ہیولا تیار ہو چکا تھا اور شورسینی اپ بھرنش کا ورثہ اس وقت زبانِ دہلوی کو مل رہا تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں ایک نیا چولا بدل رہی تھی دہلی کے دارالسلطنت بنتے ہی لاہوری زبان پہ دہلی کے اطراف کی زبان غالب آجاتی ہے۔

ہندوستانی (کھڑی بولی) کے ارتقا کی داستان کو مکمل کرنے کے لیے ہندی کی ان نثری تصانیف کا حوالہ بھی ضروری ہے جن میں یہ سنسکرت کا سہارا لے کر ادبی زبان کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ بے جا نہ ہوگا کہ برج بھاشا کی تصانیف میں بھی مروجہ ہندوستانی عنصر مل جاتا ہے۔ مثلاً چوراسی ویشنوؤں کی وارتا۔ اکبر کے عہد میں گنگ کوی نے "چند چھند برنن کی مہما" کھڑی بولی ہندی میں لکھی۔ جس کے اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ کو پہنچنے کے بعد زبانِ دہلوی نے کیا "رول" اختیار کیا۔ اور اسکے اقتباس سے حسب ذیل نتائج ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اخذ کیے ہیں۔[۲۶]

۱۔ کھڑی بولی برج بھاشا کے ساتھ ساتھ بلکہ برج بھاشا سے پہلے شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی اور سلاطینِ دہلی کے ابتدائی عہد میں ایک خاص شکل اختیار کی جس کے نمونوں کے فقدان کی وجہ سے اس کی معیاری

شکل کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتے۔

۲۔ اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ اکبر کے زمانے میں حرم سرا ' امرا ' و دربار کے گھرانوں کی زبان قدیم ہندوستانی تھی جس میں حسبِ موقع 'ہریانی' پنجابی اور برج کا پٹ مل جاتا ہے۔ لیکن دربار اور راج پاٹ کی زبان فارسی تھی اور جو مسلمان امرا سنگیت اور شاعری کے رسیا تھے برج بھاشا لکھتے تھے۔

۳۔ دہلی سے آگرہ کو پائے تخت منتقل ہونا لسانی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ آگرہ کے برج کے علاقہ میں واقع ہونے کی وجہ سے زبانِ دہلوی پر کچھ عرصہ کے لیے سایہ آجاتا ہے۔ چنانچہ اکبری اور جہانگیری عہد کی تصانیف کے لیے جہاں کہیں ہندی لفظ آیا ہے۔ اُس سے مراد برج بھاشا ہے نہ کہ کھڑی بولی۔ دہلی تک میں برج بھاشا کا چرچا تھا۔

۴۔ سولہویں صدی عیسوی میں برج بھاشا ادبی زبان اختیار کر لیتی ہے اور صرف اتفاق کی وجہ سے اُسے کھڑی پر سبقت حاصل ہوتی ہے۔ علاؤالدین اور محمد تغلق کے حملوں سے جو زبان دکن کو جاتی ہے وہ برج نہیں بلکہ وہ کھڑی اور ہریانی کی قدیم شکل ہے۔ اگر دکن کی فتوحات عہدِ اکبری تک ملتوی ہوتیں تو یقین سے یہ کہا جا سکتا کہ وہاں دکنی کے بجائے برج بھاشا کی وہ شکل نظر آتی جو سورداس اور رحیم خانخاناں کے دوہوں میں ملتی ہے۔ لیکن شعری زبان کی حیثیت سے برج بھاشا دکن میں بہت بعد کو پہنچی۔

اس عہد میں ریختہ کا لفظ بھی دو جگہ ملتا ہے۔ جس طرح خسرو نے موسیقی کی اصطلاح کے لیے ریختہ استعمال کیا تھا اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں نے بھی۔ البتہ تزک میں ریختہ زبان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ شاہجہاں کے

عہد تک برج بھاشا منجھ کر شمالی ہند کے بڑے حصے کی واحد ادبی زبان
بن جاتی ہے۔ پنجاب سے لیکر بنارس تک اس کا دَور دَورہ تھا۔ کھڑی بولی
کے علاقے میں عام طور سے ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ شاہجہاں نے
جب آگرہ چھوڑ کر نئی دہلی بسائی (۱۶۴۸ء) تو "زبانِ دہلوی" کا ستارہ پھر
چمکتا ہے۔ چنانچہ اُردو کو ہمارے تذکرہ نویس عہدِ شاہجہانی ہی سے منسوب
کرتے آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "زبانِ دہلوی" کو حیاتِ نو شاہجہاں
ہی کے ہاتھوں ملی۔ اگر آگرہ آخر وقت تک مغلوں کا دارالسلطنت رہتا تو یہ
بتانا دشوار ہے کہ کھڑی بولی اور برج بھاشا کی نبرد آزمائی کا نتیجہ کیا نکلتا۔

۱۶۴۸ء میں دہلی پہنچ کر شاہجہاں اور اس کے دربار کو یک لخت
احساس ہوتا ہے کہ ان کا سابقہ ایک نئی بولی سے پڑا لیکن دربار کے ساتھ ساتھ
برج بھاشا بھی دہلی جاتی ہے جہاں اس کے اثرات بہت آہستہ آہستہ
زائل ہوتے ہیں۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں برج بھاشا کی شہادت ہمیں
مرزا خاں کی "تحفۃ الہند" سے ملتی ہے۔ تاہم برج بھاشا کے اس عروج کے ساتھ
ساتھ ساتھ ہندوستانی (کھڑی بولی) بھی کچھ اُردو اور ہندی ادبیات نکھر رہی
تھی۔ اس عہد کے نثر نگاروں مثلاً "رتن جن" "دولت رام" نابھا داس بنارسی داس
اور جٹمل کی زبان کا لسانی تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی سے
قدیم پنجابی کے اثرات زائل ہو چکے تھے اور ان کے مطالعے سے ہندوستانی کا وہ
رُوپ نظروں کے سامنے آتا ہے جو اب تک اوجھل تھا۔ یہ رُوپ نئی ہندوستانی
کا ہے وہ ہندوستانی جو قدیم اپبھرنش کی لسانی روایات کو ترک کر چکی ہے جس پر سے
پنجابی اور ہریانی کا وقتی اثر بھی زائل ہو چکا ہے جس کی تربیت برج بھاشا کے

ہاتھوں ہو چکی ہے اور جو لسانی ارتقاء کے مدارج میں قدیم دکنی سے بہت آگے ہے۔

شاہجہاں ہی کے زمانے میں نئی دہلی میں وہاں کی پُرانی زبان نئے سرے
سے زندہ ہوتی ہے جو عہدِ عالمگیری میں برج بھاشا کے قدم ادبی حلقوں سے اکھاڑ
دیتی ہے۔ بعض محققوں کے مطابق اُردو کی اوّلین غزل جو اس وقت دستیاب ہے
شاہجہاں کے عہد میں پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۴ء تا ۱۶۶۲ء) نے لکھی تھی۔

جیسا کہ خان آرزو کی تصنیف "غرائب اللغات" سے معلوم ہوتا ہے کہ
زبانِ اُردوئے شاہی یا زبانِ دہلوی کو عالمگیر کے عہد میں ایک خاص اہمیت حاصل
ہو گئی تھی اور اورنگ زیب کی سنگیت دشمنی نے برج بھاشا کے وقار کو زبردست
صدمہ پہنچایا اور اس کی فتح دکن نے بالواسطہ زبانِ دہلوی کے ارتقاء کو تیز تر
کر دیا۔ دہلی والوں کا دکن سے یہ نیا ربط و ضبط لسانی اعتبار سے بہت بار آور
ہوا۔ اورنگ آبادی دکنی اور دہلی کی زبان میں جو حیرت انگیز مماثلت پائی
جاتی ہے اورنگ زیب کی فتح دکن ہی کا نتیجہ ہے۔ یہی زمانہ ہے جبکہ دہلی کی
عوامی زبان کا نام زبانِ اُردو یا زبانِ اُردوئے شاہی یا زبانِ اُردوئے معلّیٰ
پڑتا ہے۔ اور زبانِ دہلی بزم ادب میں بار پاتی ہے۔

ولی کے پہنچنے کے قبل ہی دہلی میں ادبی تخلیق کے لیے زبان ہموار ہو چکی تھی۔
فارسی دانوں کو یہ احساس ہو چلا تھا حسب خواہ داد نہیں ملتی۔ برج بھاشا میں
شاعری کرنا رحیم اور رسکھان کی طرح ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسلئے مسلمان
شعراء نے "زبانِ اُردوئے شاہی" کو پہلے تو ہندی پنگل (ہندوستانی عروض)
پر آزمایا جیسا کہ ہریانوی مصنفین (محبوب عالم وغیرہ) کے کلام سے ظاہر ہے۔
لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس عروض پر ڈھل کر زبان

خود بخود شعر و ادب کی زبان برج بھاشا کا سانچہ قبول کر لیتی ہے۔ اس لیے رفتہ رفتہ ریختہ کی شکل میں نئی زبان نئے عروض پر ڈھلنے لگی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام مولانا محمد افضل (متوفی ۱۶۲۵ء) ساکن جھنجھانہ (ضلع میرٹھ) کا ہے۔ افضل کی زبان کا لسانی جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ کئی لحاظ سے افضل کی اردو دکنی کے مقابلے میں ارتقا یافتہ ہے اہلِ دہلی کو دکنی پر اپنی زبان کے تفوق کا احساس تھا۔ اس کا احساس شاہ گلشنؔ کی اسی نصیحت سے ہوتا ہے جو انہوں نے ولیؔ سے کی تھی۔

عہدِ عالمگیر میں زبانِ دہلوی کی مقبولیت کا اندازہ اس عہد کے ایک دوسرے مشہور مصنف شاہ برکت اللہ کے اُن چند ریختوں سے ہوتا ہے جو برج بھاشا کے پٹ کے باوجود 'کھڑی بولی' میں ہیں۔ غرضیکہ اٹھارویں صدی کے آغاز تک 'زبانِ دہلوی' نے ایک طرف برج کو زبان کے اکھاڑے سے نکال باہر کیا اور دوسری طرف بدیسی فارسی کو پچھاڑ لیا۔ اس سلسلے میں اردو کے ارتقا کو سب سے زیادہ مہمیز ربط و ضبط سے ملی جو اورنگ زیب کی فتوحاتِ دکن کے بعد شاہ جہاں آباد اور دولت آباد کے درمیان پیدا ہوا۔ شہر دہلی میں لوگوں کی توجہ اردو کی طرف سنجیدگی سے اس وقت منعطف ہوئی جب باشندگانِ دکن جوق در جوق دہلی پہنچے۔ دکن کی بے شمار اردو کتابیں بھی شمالی ہند پہنچیں خاص کر ولیؔ کے دیوان (۱۷۲۱ء) نے دہلی میں ایک ادبی آگ سی لگا دی۔ حاتمؔ اور دوسرے اساتذہ متقدمین نے اُن کی اُستادی کا اعتراف کیا اور اُن کی زمینوں میں غزلیں لکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ولیؔ سے پہلے ہی شمالی ہند میں اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کے

شواہد بھی ملتے ہیں۔ تاہم دکن کے ادبی اثرات متقدمین شعرائے دہلی پر مسلّم ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مقالہ 'مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو' کے متعلق گوپی چند نارنگ اپنے ایک مضمون 'اردو میں لسانیاتی تحقیق' (مطبوعہ نوائے ادب۔ بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء) میں اس طرح رقم فرما ہیں۔ لیکن اُن کی کتاب سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اردو کی ساخت میں اصل بولی کونسی ہے۔ کھڑی، ہریانی یا میواتی (جن کے لیے وہ نواحِ دہلی کی بولیوں کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں) دوسری دقت یہ ہے کہ کھڑی کے قدیم نمونے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مسعود صاحب نے نواحِ دہلی کی اہمیت پر بجا طور پہ زور دیا ہے۔ لیکن جس طرح شیرانی صاحب فتح دہلی کے بعد کے اثرات کے منکر ہیں، مسعود صاحب فتح دہلی کے پہلے کے اثرات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کے نظریے کی کوتاہی یہی ہے کہ انہوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اردو کا آغاز کسی محدود علاقے میں نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا سلسلہ ایک طرف پنجاب سے آگرہ تک، دوسری طرف شمالی ہندوستان سے دکن تک تقریباً چھ صدیوں کے زمانے تک پھیلا رہا۔ اردو کی تشکیل میں کئی بولیوں نے حصہ لیا ہے۔ نیز دکنی اور پنجابی کی واضح مشابہت پکار پکار کر کہتی ہے کہ اردو کی ابتدا دہلوی اثرات سے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر یہ طوالن زبان تغلقوں کے زمانے تک اس درجہ ارتقا پذیر ہو چکی تھی کہ دیوگری (دولت آباد) کو آبادی کی ہجرت سے وہاں اردو کی داغ بیل پڑ گئی۔ یا امیر خسرو کے زمانے تیرھویں صدی میں یہ نوزائیدہ زبان اس قابل ہو گئی تھی کہ اس میں دادِ سخن دی جا سکے تو فتحِ دہلی سے پہلے کے لسانی اثرات کو یکسر غیر اہم قرار دے کر رد کر دینا کہاں تک

قرینِ صحت ہے۔

حال ہی میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب "اُردو زبان کا ارتقاء" میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ اُردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرنا چاہیے کیونکہ قواعد کی ساخت کے اعتبار سے اُردو سب سے زیادہ اُسی سے مماثلت رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اُردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی میرٹھ اور اُس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی، امیر خسرو، ابوالفضل، شیخ بہاء الدین باجن سے دہلوی اور ہندوی اہلِ علم عام طور سے برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے جو اس وقت پڑی کہلاتی تھیں کھڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی، مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔ زبان بنیادی طور پر وہی رہی جو آج ہے اس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے۔ ناموں کی کثرت یا تنوع کی وجہ سے اہلِ علم کو اس کی شخصیت میں شبہ ہونے کا امکان ہے، میری اُردو وہ فرماتے ہیں (مغربی) ہندی کا ایک روپ وہ شستہ (خالص) ہندی (اُردو) سمجھا جاتا ہے، جو میرٹھ دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ اس سے ڈاکٹر سبزواری صاحب نے حسبِ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔

۱۔ اُردو، ہندی، ہندوستانی، دہلوی ایک زبان کے کئی نام ہیں۔

۲۔ یہ زبان کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

۳۔ کھڑی بولی دہلی اور میرٹھ کی زبان ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔

۴۔ کھڑی بولی مغربی ہندی کی شاخ ہے

۵۔ مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے نکلی جو کبھی دوآبہ گنگ و جمن کے زرخیز علاقے میں بولی جاتی تھی۔[۱۹]

اُردو کی تشکیل اور نشوونما کو دوسرے الفاظ میں وہ اس ترتیب میں پیش کرتے ہیں۔ اُردو اس سے پہلے درجے میں ہندوستانی اور اس سے قبل مغربی اپ بھرنش یعنی شورسینی پراکرت اور قدیم پراکرت۔ ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب متفقہ طور پر اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ اُردو اس کی ادبی شکل ہے۔ اس زبان کو یہ نام بعد میں اس وقت دیا گیا۔ جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب و شعر کی زبان کا درجہ پایا۔ مسلمانوں کے ہم رکاب یہ زبان دہلی سے نکل کر ملک کے دور دراز حصوں تک پہنچی۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کا اقتدار بڑھا اور اس کی حدیں وسیع ہوئیں لوگ بھول گئے کہ کبھی یہ زبان چھوٹے سے علاقے میں محدود تھی۔ اس سے پہلے پالی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اُردو کی طرح وہ بھی اپنے مولد سے نکل کر برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچی اور ایک عام علمی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے سارے ملک پر چھا گئی۔

اُردو میرٹھ اور دہلی کی زبان ہے اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں مولانا محمود خاں شیرانی کو بھی یہ ماننا پڑا کہ اُردو نے جس زبان سے ارتقا پایا ہے وہ دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ زبان کا مولد وہی ہوتا ہے جہاں وہ بلا شرکتِ غیرے بولی جائے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں یا اس سے کچھ پہلے اُردو کے خط و خال ابھرے یا یوں کہیے قدیم مغربی ہندی سے ترقی پا کر موجودہ

روپ اختیار کیا۔ قدیم مغربی ہندی کونسی زبان ہے اور اُس کی خصوصیات کیا
ہیں؟ اِس کا جواب آسان نہیں۔ اُردو، برج، ہریانی، بندیلی، قنوجی آج
جہاں بولی جاتی ہیں، دسویں صدی عیسوی میں یہ پورا علاقہ کسی ایک زبان کے تصرف
میں تھا۔ یہ زبان ان بولیوں کے حدود میں رائج تھی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس
زبان میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا، ہر لحاظ سے وہ واحد اور یکساں تھی۔ لیکن
اس میں اتنا اور اس درجہ کا اختلاف نہ تھا جتنا کہ آج ان بولیوں میں ہے
جو اس زبان سے متفرع ہوئیں۔ یہ زبان بدلتی رہی۔ اس کے اختلافات جو کسی
زمانے میں معمولی اور غیر اہم تھے شدید سے شدید تر ہوتے رہے اور گیارہویں
صدی عیسوی کے آتے آتے اتنے نمایاں ہو گئے کہ وہ پانچ بولیوں میں بٹ گئی
اس قدیم زبان کو جو دسویں صدی عیسوی میں اردو اور اس کی ہمسر بولیوں
میں منقسم ہوئی قدیم ہندی کہتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس اس زبان کی
تحریری دستاویز نہیں جن کی مدد سے ہم بتا سکیں کہ اُس کی لسانی خصوصیات کیا تھیں
اور یہ اپنی بولیوں میں کس سے زیادہ قریب ہے۔ عام طور سے چند بردائی کی کتاب
پرتھی راج راسو کی زبان کو قدیم ہندی بتایا جاتا ہے۔ اس میں کئی الجھنیں ہیں۔ ایک تو
راسو پوری چند کی کہی نہیں۔ اس کے بہت سے حصے پندرھویں اور سولھویں
صدی کی تصنیف ہیں۔ دوسرے اس کی زبان خالص ہندی نہیں۔ اس میں پنجابی
راجستھانی، مغربی اپ بھرنش کی آمیزش بھی ہے۔ تیسرے یہ وہ زبان نہیں جو کبھی
برج، اردو وغیرہ میں مشترک تھی۔ اور جس سے یہ بولیاں متفرع ہوئیں۔ یہ
قدیم برج ہے۔ برج کی طرح اس کے اسمائے دیر ختم ہوتے ہیں اور معطوفہ پر
پر۔ وہ "ے" کے اور "ے" و کی جگہ "نے" اور "نے" وا استعمال کرتی ہے"

اس میں "ے" سے ذکے بجائے استعمال ہوا ہے۔ شیام سندر داس کی رائے ہیں،
"پرتھی راج راسو" میں برج کے ڈھانچے کا بہت کچھ احساس ہے۔ ڈاکٹر گریرسن راسو
کی زبان قدیم برج بتاتے ہیں،

ڈاکٹر چیٹرجی لکھتے ہیں:۔

"اس میں بڑی حد تک شبہ کی گنجائش ہے کہ اس نظم (راسو) کے مضامین
سچے یا واقعی اور اس کی زبان اصلی یا حقیقی ہے یعنی بارھویں صدی عیسوی کی زبان ہے
جب اس نظم کا خالق اور اس کا ممدوح دونوں بقید حیات تھے۔ ہو سکتا ہے کہ
اس نظم کا کچھ حصہ چند بردائی کی تصنیف ہو۔ لیکن اس کی زبان بڑی حد تک مسخ ہو گئی ہے[2]
اس کے بعد فرماتے ہیں "راسو کی زبان زندہ کسی صوبے میں یا کسی زمانے
میں بولی جانے والی زبان نہیں۔ وہ ایک طرح کی خود ساختہ ادبی زبان ہے۔
جس میں ایک سے زیادہ زبانوں کے، جو کبھی دہلی سے دور دراز کے مقامات
میں بولی جاتی ہوں گی بہت سے صیغے اور ان کے مختلف روپ شامل ہو گئے
ان کے اہم عناصر مغربی اپ بھرنش، قدیم مغربی ہندی، راجستھانی اور اس کی
مختلف بولیوں اور قدیم پنجابی کے مختلف روپ ہیں جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔"[3]
راسو کی زبان قدیم برج ہے یا خود ساختہ مخلوط ادبی زبان۔ قدیم مغربی ہندی
ہرگز نہیں جسے اردو یا ہندوستانی کی اصل بتایا جا سکتا ہے۔ جب تک مغربی ہندی
کا اصل روپ سامنے نہ ہو اُس کے خط و خال متعین نہ ہوں، اُس کی لسانی
خصوصیات کی نشاندہی نہ کی جائے ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی
میں مغربی ہندی دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی، اردو اس سے ترقی پا کر
سبزواری صاحب کے خیال میں مغربی ہندی کا تصور ایک طرح کی ذہنی تدریج یا

منطقی نتیجہ ہے۔ دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں آئے نا غیر معمولی مشابہتیں دیکھ کر دانایانِ مغرب کو خیال ہوا کہ اُن کا ایک متحدہ ماخذ قرار دیا جائے۔ چنانچہ مغربی ہندی کے نام سے ایک زبان فرض کر کے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ زبان گیارہویں صدی عیسوی میں ہریانی، برج، کھڑی، قنوجی، بندیلی کے وسیع و عریض علاقے میں بولی جاتی تھی۔ یہ بولیاں اُس زبان کی کوکھ سے پیدا ہوئیں۔ ڈاکٹر گریرسن ہندوستانی کو مغربی ہندی کی نمائندہ زبان قرار دے کر لکھتے ہیں۔ اس میں فعل کی صرف ایک گردان (مضارع) اور اسم کی صرف ایک اعرابی حالت (غیر فاعلی) ملتی ہے۔

اُردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے۔ اسلئے مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر یہ کہنا کہ اُردو اپ بھرنش سے ارتقاء پا کر وجود میں آئی زیادہ صحیح ہے۔ لیکن اپ بھرنش کسی ایک بولی کا نام نہیں۔ پراکرت دور کے بعد کی سبھی بولیاں جو بدل بدلا کر کچھ سے کچھ ہوئیں اور درمیانی عہد کی پراکرتوں کی مختلف اور نئی زبانیں بنیں۔ اپ بھرنش یا اپ بھرمسنٹ یعنی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ کہلائیں۔ مشہور قواعد نویس مارکنڈے نے اپنی پراکرت سروسو میں کسی نامعلوم مصنف کے حوالے سے ستائیس اپ بھرنش شمار کرائے ہیں۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اصل اپ بھرنش صرف تین ہیں۔ ناگر اپ ناگر اور وراچڈ۔ وراچڈ سندھ میں بولی جاتی تھی۔ ناگر کے بارے میں گریرسن کا خیال ہے کہ وہ شورسینی یا اپ بھرنش ہے۔ یہ گجرات کی زبان تھی۔ ہیم چندر گجرات کا رہنے والا تھا۔ اس نے مغربی اپ بھرنش کو مستند قرار دے کر اس کے اُصول و قواعد اپنی کتاب میں بیان کئے۔ اپ ناگر کے بارے میں گریرسن کہتے ہیں کہ

یہ غالباً گجرات اور سندھ کے درمیانی علاقے یعنی مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب میں بولی جاتی تھی۔

اگر درحقیقت مغربی اپ بھرنش گجرات کی زبان ہے تو وہ اُردو کا ماخذ نہیں ہو سکتی۔ اُردو کھڑی سے ترقی پا کر بنی جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ دہلی اور میرٹھ کی زبان کسی ایسی زبان سے کیوں کر ماخوذ ہو سکتی ہے جو کبھی وہاں نہ تھی۔ اُس کے حلقۂ اثر سے میلوں دور گجرات میں بولی جاتی تھی اور راجستھانی بولیوں کے وسیع و عریض علاقے بیچ میں حائل ہو کر ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو کی لسانی خصوصیات کا مغربی اپ بھرنش سے مقابلہ کریں تو دونوں میں شدید اختلاف نظر آتا ہے اور ایک دو اصولوں کے سوا کوئی مشابہت نہیں۔

شورسینی پراکرت بھی اُردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتی۔ شورسینی کے جو اسماء و صفات 'ے' 'و' پر ختم ہوئے ہیں اُردو میں ان کے آخر میں 'ے' 'ا' ہے۔ شورسینی اسم حالیہ کی 'ت' 'د' سے بدلی تھی۔ اُردو میں اپنی حالت پر قائم رہی۔ پراکرت 'ے' 'ب' اور 'ٹ' 'ڈ' مرکب حرکات اُردو میں 'ب' 'ے' اور 'ٹ' 'و' ہیں۔ مخلوط حروف صحیح کی تخفیف کے بعد ماقبل حرکت کا اشباع شورسینی کے رجحان کے خلاف ہے۔ اُردو علامت فاعل (آد) نے پراکرت 'ب' 'ے' سے زیادہ قدیم ہے۔ شورسینی قدیم سنسکرت 'ن' کو 'نڑ' کر دیتی ہے۔ اُردو میں 'نڑ' بھی 'ن' ہو جاتا ہے۔ شورسینی 'ی' کو 'ے' 'ی' کو 'ے' سے بدلنا اُردو کے مزاج کے خلاف ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اُردو شورسینی پراکرت

...... سے ماخوذ نہیں۔ یہ ترتیب قریب سبھی نے مانا ہے کہ جن پراکرتوں کا
ذکر ہیم چندر، وررچی، مارکنڈے، ترووکرم، لکشمی دھر وغیرہ عالموں نے کیا ہے۔
وہ سب ادبی بولیاں ہیں جو بول چال کی زبان سے بن سنور کر وجود میں آئیں۔
یہ تعداد میں چھ ہیں۔ اس لئے شڈ بھاشا (شٹ بھاشا = چھ بولیاں)
کہلاتی ہیں۔ وررچی نے مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، پیشاچی چار پراکرتوں
کے قواعد لکھے۔ ہیم چندر نے چورکا پیشاچی اور اپ بھرنش، دو کا اضافہ
کر کے چھ پراکرتوں کے اصول اور قواعد بیان کئے۔ ترووکرم اور لکشمی دھر ہیم چندر
کی تقلید میں ان چھ پراکرتوں کے قاعدے اور ضابطے بیان کرتے ہیں۔
اپ بھرنش کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کسی مخصوص
پراکرت کا نام نہیں۔ پراکرت میں جب تبدیلیاں ہوئیں اور وہ بگڑ بگڑ کر
معیاری پراکرت سے مختلف زبان بنی تو اپ بھرنش کہلائی۔ پراکرتیں ہم عصر
نہیں۔ پالی ان میں زیادہ قدیم ہے۔ اسے اولین پراکرت کہتے ہیں۔ نئی تحقیقات
کے مطابق سنسکرت، پالی، شورسینی، مہاراشٹری، مغربی اپ بھرنش ایک
زبان کے متعدد ادبی رُوپ ہیں۔ یہ زبان مدھیہ دیس (وسط ملک) یعنی بالائی
دوآبہ میں بولی جاتی تھی جس سے نکھر کر یہ زبانیں بنیں۔ بول چال کی زبان بدلتی
رہی۔ یہ زبانیں جو علم و ادب کے اظہار و بیان کا آلہ بن چکی تھیں رُکی رہیں۔
قواعد و اصول کی پابندی میں جکڑے ہونے کی وجہ سے یہ وہیں رہیں جہاں تھیں۔
بول چال کی زبان ترقی کر کے بڑھ گئی۔ یہ زبانیں بول چال کی زبان کی چھوڑی
ہوئی منزلوں کو یاد دلاتی ہیں۔ یاد دلانے سے سبزواری صاحب کا مطلب جس کی
وہ وضاحت کرتے ہیں یہ ہے کہ یہ زبانیں بول چال کی زبان کے گذرے ہوئے

دوروں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پنڈتوں نے بول چال کی زبان میں تصرفات کرنے
کے بعد انہیں ڈھالا۔ بول چال کی زبان کا اصلی روپ ....
اُن سے مختلف تھا جو ان زبانوں کا ہے۔ یہ زبانیں اس کا اصلی روپ دکھاتی
ہیں۔ اُن کے خط و خال کا دھندلا عکس ان زبانوں کے آئینہ نقش و نگار میں
دیکھا جا سکتا ہے۔ مسیح علیہ السلام سے چھ سو سال پہلے مدھیہ پردیس (یو۔پی کے
مغربی اضلاع) کی بولیوں پر سنسکرت کو ڈھالا گیا۔ اس کے بعد پالی کی تشکیل
عمل میں آئی۔ میلادِ مسیح کے بعد شورسینی اپ بھرنش وضع ہوئی۔ چوتھی صدی
عیسوی میں مہاراشٹری کا خمیر تیار رہا۔ شورسینی اپ بھرنش اس سلسلۂ
ارتقاء کی آخری کڑی ہے جس سے اُردو یا ہندوستانی جنم لیا۔

ہر چند یہ زبانیں ارتقاء کے سلسلے میں واقع ہیں اور ایک ہی
بولی کے پانچ مختلف دوروں کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن ان کو ایک
دوسرے سے ماخوذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پالی مثلاً
سنسکرت سے ترقی پا کر بنی یا شورسینی پالی کا بدلا ہوا روپ ہے۔ یا
مہاراشٹری سے جنم لیا۔ ایک تیسری زبان سے ان زبانوں کو وضع کیا گیا۔ اگر
یہ تیسری زبان ہمارے سامنے ہو تو ہم اس کے ارتقائی دوروں کا تعین کرتے
یہ زبانیں اس زبان کے ادبی روپ کو پیش کرتی ہیں جو اُن کی اصلی بول
چال کے رُوپ سے مختلف ہے۔

اُردو یا ہندوستانی اپ بھرنش کے اس رُوپ سے ماخوذ ہے جو گیارہویں
صدی عیسوی کے آغاز میں مدھیہ دیش میں رائج تھا۔ مغربی اپ بھرنش اسکی
ادبی شکل ہے اور جیسا کہ سبزواری صاحب نے اس حقیقت کی طرف اشارہ

کیا ہے کہ وہ بول چال کی اپ بھرنش سے مختلف ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی راہ ہے کہ ہم گیارھویں صدی کی بول چال کی اپ بھرنش تک جو ہندوستانی کی ماں ہے راہ پا سکیں؟

یہ بول چال کی اپ بھرنش دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی۔ چیٹرجی اور گریرسن اُسے مغربی اپ بھرنش کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اپ بھرنش وہ نہیں جس کے قواعد ہیم چندر نے اپنی کتاب میں بیان کیے۔ مغربی اپ بھرنش کہنے سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ ہیم چندر کی اپ بھرنش ہے اگر یہ اشتباہ نہ ہو تو دہلی اور میرٹھ کی اس قدیم زبان کو اپ بھرنش کے نام سے یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس زبان میں پورے پورے نمونے دستیاب نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ شورسینی اپ بھرنش کے اصول و قواعد کی وضاحت کرتے ہوئے ہیم چندر نے متعدد دوہے اپنی گرامر میں نقل کیے ہیں۔ ان میں بول چال کی اپ بھرنش کے بہت سے صیغے، شکلیں اور نحوی استعمالات بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں جب بول چال کی زبانیں کروٹ بدل رہی تھیں اور قانونِ ارتقا کے اثر سے نت نئے روپ اختیار کر رہی تھیں۔ زبان کو خالص اور باہر کے اثرات سے پاک نہیں رکھا جا سکتا تھا۔
زبانوں کے لیے یہ تعمیر کا دور تھا۔ تعمیر کے دور میں زبانوں کا اختلاط معمولی بات ہے۔ ہیم چندر کے پیش کردہ دوہوں میں زبانوں کا یہ اختلاط صاف نظر آتا ہے۔ ان میں آس پاس کی بولیاں گلے ملتی اور آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ راسو کی بابت گریرسن اور چیٹرجی کے حوالے سے یہ کہا جا چکا ہے کہ اس کی زبان ایک طرح کا ملغوبہ ہے۔ جس میں پنجابی، راجستھانی سے اور قدیم ہندی مغربی اپ بھرنش سے

دست و گریباں ہوتی ہے۔ یہاں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مغربی اپ بھرنش کا وجود ہے۔ مثال کے طور پر ہیم چندر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں اگر ان کا لسانی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ساتھ کی زبان پر بھی نظر رہے تو اردو کی لسانی خصوصیات اور اس کے صرفی نحوی سرمایہ کا سراغ آسانی کے ساتھ لگ سکتا ہے اور اردو کے قدیم رنگ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ہیم چندر کے دوہوں اور راسو کی زبان قدیم اُردو (قدیم اُردو اپ بھرنش) نہیں۔ اس میں قدیم اردو زبان کے مختلف روپوں کی ملاوٹ بالکل اسی قسم کی ہے جیسے بالو میں سونے کے ذرّے ملے ہوتے ہیں۔

سبزواری صاحب نے ان زبانوں میں سے قدیم اردو کے روپ کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً (۱) مذکر اسماء کے اختتامیے: اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اردو کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ہے۔ ہیم چندر نے اس اختتامیے کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ مثلاً 'ڈھولا' 'سانولا' 'دیہا' 'وارا' وغیرہ اسماء و صفات 'الف' پر ختم ہوتے ہیں۔ اپ بھرنش کے عام رجحان کے مطابق ان کے آخر میں 'و' (ضمہ) ہونا چاہیے تھا۔ شام سندر داس اسے پشاچی اپ بھرنش کا روپ بتاتے ہیں۔ لیکن سبزواری صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ دہلی اور میرٹھ کی اپ بھرنش کا روپ ہے اور اس کی تائید میں فعل حال اور حالیہ ناتمام کے لاحقہ (تا) کا ذکر کرتے ہیں جو سنسکرت کے حالیہ ناتمام کے اختتامیے (ت۔ ت) سے ماخوذ ہے۔ اردو نے اس کے آخر میں (ا) جوڑ کر فعل حال بنایا اور (ہے) فعل معاون کے سہارے اُسے گردانا 'کرتا ہے' 'کرتا ہوں' وغیرہ۔

(۲) اردو فعل حال سنسکرت حالیہ ناتمام سے ماخوذ تھا۔ ماضی مطلق

سنسکرت حالیہ تمام سے لی گئی ہے۔ راسو میں دکنی اُردو کی طرح ماضی کے صیغوں میں آخری حرف سے پہلے ایک (ی) بھی ہے۔ اس کے دو صیغے ہیں:

	راسو		اُردو
مذکر:	چلیو - چلیے	=	چلا - چلے
مؤنث:	چلی - چلیں	=	چلی - چلیں

(ی) مخلوط بارھویں صدی کی اُردو میں بھی تھی جو بعد میں تخفیف کی نذر ہوگئی۔ فعل کے لاحقے (نا) کی طرح قدیم اُردو میں ماضی کے صیغے (ا) پر ختم ہوتے تھے۔ اس کے دو قرینے ہیں۔ پہلا یہ کہ 'کرنا' کی ماضی 'کیا' راسو میں جان بیمز کو ملی ہے۔ دوسرے مولانا شیرانی تاریخ فیروز شاہی سے فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۸۸ء) کا یہ ہندی مقولہ نقل کرتے ہیں:

"برکت شیخ تھیا (تھا) اک مرا (مرا) ایک نہا (نسا) بھیا گا۔"

اس میں 'تھیا' 'مرا' 'نہا' ماضی کے صیغے (ا) پر ختم ہوئے ہیں۔

ہیم چندر کا مندرجہ ذیل دوہا:

"بھلا ہوا جُ مارا بہن ہمارا کنت"

اوپر کہیں نقل ہو چکا ہے کہ اس میں 'ہوا' 'مارا' کے آخر میں 'ا' ہے۔

یہ دوہا گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے کا ہے مندرجۂ ذیل مصرع بابر کی طرف منسوب ہے جس کی ڈاکٹر بیلی نے بابر کے ترکی دیوان مخطوطہ ۱۵۲۹ء میں نشاندہی کی ہے۔

"مجھ کا نہ ہوا کچ ہوس مانک موتی"

اس میں بھی 'ہوا' الف کے ساتھ ہے۔ اسی طرح سکندر شاہ بادشاہ گجرات کا

مقولہ جو سولھویں صدی کا ہے اُس کا بھی ذکر کیا ہے۔

"پیر موا مرید جوگی ہوا"

سبزواری صاحب نے اس ضمن میں شاہ ہاشم علوی اور ان کے ایک مرید نظام الدین کے کچھ اقوال اور حضرت امیر خسرو کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں جن میں حالیہ تمام 'وا' پر ختم ہوئے ہیں۔

(۳) اُردو کی ایک خصوصیت مخلوط حروف کی تخفیف و تسہیل بتائی گئی تھی۔ اس کے آثار راسو کی زبان میں ملے ہیں۔ ڈاکٹر ہیور نلے 'پراکرت پرکاش' کے حوالے سے لکھتے ہیں، پراکرت کے آخری دور میں مخلوط حروف میں سے ایک گرا کر اس سے پہلے حرف کی حرکت کھینچ دی گئی۔ ہیورنلے پراکرت کے اس آخری دور کا تعین نہیں کرتے۔ سبزواری صاحب کا خیال ہے کہ راسو کی تصنیف سے پہلے دسویں صدی کے آخر یا گیارھویں صدی کے شروع میں تسہیلی رجحان دہلی اور میرٹھ کی زبان میں رونما ہوا۔ یہ رجحان ویدک عہد کی بعض بولیوں میں تھا، پراکرتیں اس کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ماگدھی پراکرت کے لاحقہ اضافت (ہ) کی بابت کہتے ہیں کہ یہ پراکرت 'س' سے بنا ہے۔ قدیم اُردو کے منتشر اور پراگندہ نمونے راسو میں دیکھئے۔

'جز' (سنسکرت 'یہ') موصولی کلمہ ہے جس کا مونث 'ج' (بکسرۂ ج) ہے۔ پراکرت میں اس پر 'س' لاحقہ اضافت کا اضافہ ہوا تو مذکر کے لئے 'جس' (بفتح اوّل و تشدید ثانی) ہوا۔ اور مونث کے لئے 'جس' (بکسرہ اوّل) تخفیف و تسہیل کے بعد 'جس' کا 'جاس' بنا اور 'جس' کا 'جیس'۔ اُردو میں 'جس' 'جیس' کی تخفیف ہے میں سمجھتا ہوں کہ قدیم اُردو میں 'جس' کی صرف تخفیف ہوئی یعنی 'اُس' کا 'اُسا'

حذف ہوا اس کی تسہیل یعنی 'س' کے عوض میں ماقبل حرکت کی تطویل نہیں
ہوئی۔ یہ کلمہ احادی المقطع یعنی ایک جز تھا۔ اُردو میں عام طور سے یک
جزے کلمات کی تسہیل نہیں ہوتی۔

اس کی تائید میں سبزواری صاحب نے شیخ وجیہہ الدین گجراتی
(۹۰-۱۵۰۵ء) شیخ بہاء الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ) کے اقوال اور محمد قلی قطب شاہ
(۱۵۸۰-۱۶۱۱ء) کے شعر کا تذکرہ کیا ہے۔

۴۔ 'ہیں' اور 'پہ' اُردو کے ظرفی لاحقے ہیں جو اُردو کی خصوصیات
میں شمار ہوتے ہیں۔ راسو میں 'ہِں' اور 'پے' عام طور پہ استعمال ہوئے ہیں۔
'ہیں' کی جگہ چند بردائی نے 'مُدھ' 'مدھئے' 'مجھ' 'ماجھ' 'مجھی' 'امہ' وغیرہ صیغے استعمال
کئے ہیں۔ جن میں سے 'ہی' اور 'امہ' کے بارے میں بیورنکے وغیرہ علمائے لسانیات
کا خیال ہے کہ یہ 'ہیں' کے قدیم ترین روپ میں ہیں۔ راسو میں 'میں' بھی ملا ہے۔
جیسے 'ایک ماس میں نگر بسایو' (ایک ماہ میں شہر بسا)۔ یہ مصرع حال کی زبان کے
بہت قریب ہے۔ شاید اہل علم اس کی قدامت سے انکار کریں لیکن بجان بیمز
اسکے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مصرع چند بردائی کا ہے۔

واحد متکلم کے لیے 'میں' خاص اُردو ہے۔ برج بھاشا اور پنجابی میں
'ہوں' اس کا جانشین تھا۔ راسو میں 'ہوں' کے ساتھ 'میں' بھی دیکھا گیا ہے۔
'میں' کی غیر فاعلی حالت 'مجھ' ہے اور 'تم' کی جگہ 'تجھ' ہے۔ 'میں' اور 'تم' کے ساتھ
ان کی غیر فاعلی حالتیں 'مجھ' اور 'تجھ' راسو میں ملی ہیں اور 'ہم' اور 'تم' کی شکلیں
بھی موجود ہیں۔ اس طرح مصنف نے راسو میں 'میرے' 'میری' 'ہمارے' 'ہماری'
متکلم ضمیروں کی اضافی حالتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

'جیسو' (جیسا)، 'کیسو' (کیسا)، 'کتنو' (کتنا) وغیرہ کلمات راسو میں
برنا کے لہجے میں استعمال ہوئے ہیں۔

اُردو کی طرح چند نے حاصل مصدر مادے پر 'ن' بڑھایا ہے۔

'اُن' 'اِن' 'کوں' (کو) 'کے' 'کی' اضافت کیلئے 'کا' کا استعمال بھی عام طور سے
راسو میں دیکھا گیا ہے۔

سبزواری صاحب لکھتے ہیں کہ علامتِ مستقبل 'گا' کا سراغ راسو میں
نہ مل سکا۔ لیکن شیخ شرف الدین بو علی قلندر (متوفی ۱۳۲۴ء) کبیر اور شیخ باجن کے
اشعار میں 'گا' کا سراغ ملا ہے۔

اُوپر کے جو صیغے اور ان کی مختلف شکلیں راسو، اپ بھرنش اور
صوفیائے کرام کے مقولوں سے اخذ کر کے درج کی گئی ہیں۔ جن کے متعلق سبزواری
صاحب لکھتے ہیں کہ یہ اُردو کی اہم لسانی خصوصیتیں ہیں اور جن کا ذکر ان کے
مقالے کے تمہیدی حصے میں تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ یہ صیغے گیارھویں
صدی کے قریب دہلی اور میرٹھ کی زبان میں رائج تھے۔ آج کی اُردو میں بھی جوں
کے توں یا کسی قدر تصرف کے ساتھ ان کا عام رواج ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے
کہ اُردو نے جس قدیم اپ بھرنش سے ارتقا پایا گیارھویں صدی میں اس کی
شکل موجودہ اُردو سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی وہ اس زمانہ میں برج، ہریانی،
شرقی پنجابی وغیرہ پاس پڑوس کی زبانوں سے مختلف اور آزاد زبان تھی۔
اس نے شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے جس کے قواعد ہیم چندر
اور ارکنڈے بیان کرتے ہیں، ارتقا نہیں پایا۔ وہ دہلی اور میرٹھ میں بولی
جانے والی اپ بھرنش سے ترقی پا کر بنی۔ ہر چند اس اپ بھرنش کے خط و خال

واضح نہیں لیکن اردو کی موجودہ خصوصیات کو دیکھ کر اس کے نقش و نگار کا تعین نہ سہی اس کا دھندلا سا خاکہ جو کسی قدر غبار آلود بھی ہے، مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں ابھر ور آجاتا ہے۔[32]

جناب محمد ایوب صابر لکچرر گورنمنٹ کالج [illegible] اپنے ایک مضمون "لسانیات کا جائزہ" مطبوعہ "پاکستان میں اردو" (مارچ ۱۹۶۵ء) میں لکھتے ہیں: "اردو زبان کا ارتقاء" ڈاکٹر شوکت سبزواری کی لسانیات پر پہلی تصنیف ہے جس میں بقول خود ڈاکٹر صاحب کے اردو زبان کے صرفی نحوی اور صوتی سرمایہ کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد اردو کے ماخذ کا کھوج لگایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب زبان اردو کے آغاز کے سلسلے میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ "اردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی درجے کو پاکر ٹھہر گئی۔ لیکن اردو ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے برابر ترشتی ترشاتی اور چلتی چلاتی رہی۔"[33]

اردو کے آغاز کے متعلق سبزواری صاحب کی اس رائے کے سلسلے میں احتشام حسین صاحب لکھتے ہیں: "لیکن یہ بہت بحث طلب مسئلہ ہے اور ابھی اس کے تسلیم کئے جانے کے لیے کافی مواد فراہم نہیں ہوا۔ ابتدائی تحریریں

مواد کی کمی ہونے کی وجہ سے قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ لیکن جیوز بلاک نے جو بات کہی وہی قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس سے اس نظریے کو بھی نقصان نہیں پہنچتا کہ اردو کی ابتدائی ہیئت ترکیبی میں پنجابی کا زبردست ہاتھ ہے۔ اردو کی صوتی خصوصیات اسے برج بھاشا سے دور رکھتی ہے۔ لیکن پنجابی یا ہریانی اور کھڑی بولی کی صوتی خصوصیات ابتدائی اردو میں پائی جاتی ہیں۔ بعد میں ایسی تبدیلیاں ہوتی گئیں جنہوں نے اسے پنجابی سے دور کر دیا اور کھڑی بولی نکھرتی گئی۔ یہاں تک کہ محض بول چال کے دائرے سے نکل کر وہ ایک ادبی زبان بن گئی۔"[34]

لیکن ڈاکٹر سبزواری نے اپنی دوسری تصنیف "داستانِ زبانِ اردو" میں کا پھر اپنے نظریہ کی مزید صراحت کی ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں "ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ:۔

"میں پالی کو اردو زبان کی اصل قرار دیتا ہوں یہ درست نہیں۔ میں وہی کہتا ہوں جو جیولز بلاک گریرسن چیٹرجی اور دوسرے ائمہ فن نے کہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے وہ بھی بالائی دوآبہ میں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اپ بھرنش بالائی دوآبہ کی اس بول چال کی زبان کے مختلف العہد ادبی روپ ہیں۔ کھڑی یا ہندوستانی (اردو) اس کی فطری ترقی یافتہ یا بدلی ہوئی صورت ہے۔ یہ زبانیں اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔"[35]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے اسی مضمون "اردو میں لسانیاتی تحقیق" میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اس نظریہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ اردو کو قدیم الاصل

سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ زبان مسلمانوں کے داخلۂ ہند سے پہلے مروج تھی وہ دلی زبان میں اس کا سلسلہ پالی سے بھی ملاتے ہیں۔ اگرچہ یہ کہ اس کا اقرار نہیں کرتے۔ اردو لسانیات کی تاریخ میں اس سے زیادہ دور از کار اور ناقابلِ فہم بات اس سے پہلے نہیں کہی گئی۔ اس نظریہ کو پوری طرح ثابت کرنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اُن کی کتابوں کا بڑا حصہ الفاظ کے مادوں اور ان کی تاریخی شکلوں کے ارتقاء کی بحث سے متعلق ہے۔ اور یہ مباحث بھی زیادہ تر پراکرتوں پر کام کرنے والے مستشرقین سے ماخوذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ دوسروں کے کام کو اپنا کارنامہ بتا کر پیش کرنے سے مسائل حل نہیں ہو جاتے ہیں۔[۳۳]

مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ جدید محققین یعنی ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریات کو حرفِ آخر سمجھنا غلطی ہی ہوگی۔ لیکن جب تک کوئی دوسرا مدلل نظریہ سامنے نہیں آتا ان کے نظریات زیرِ بحث موضوع پر اساسی مواد کی حیثیت سے قبول کیے جائیں گے۔

دوسرا باب

قدیم نثر کا سرسری جائزہ

۱۔ نثر پاروں یا ملفوظات کا عہد (ساتویں صدی ہجری تا تیرھویں صدی عیسوی)

۲۔ مربوط نثر کا آغاز و ارتقاء۔

ا۔ مربوط نثر کے آغاز کے متعلق محققین و مورخین ادب کی آراء کا خلاصہ۔

ب۔ مذہبیات و تراجمِ قرآن مجید۔

ج۔ قصے اور کہانیوں کا تذکرہ۔

نثر پاروں کا آغاز

ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی کا آغاز اُردو کی تشکیل کا دَور ہے۔ یہ اُردو کے نثر پاروں یا ملفوظات کا دَور ہے جو ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام تک جاری رہا۔ سو سال کے اس عرصہ میں اُردو مستقل صورت اختیار کر گئی۔ اس کا اندازہ اُن بزرگوں کی تحریروں سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنے اطراف کے عوام کی بول چال کی زبان کی رعایت یا اسکے استعمال کرنے کی مجبوری کے مدِ نظر اپنی فارسی تصانیف میں ہندی عوام اور خواتین سے تخاطب کے موقعہ پر کچھ اُردو کے جملے بھی شامل کر لیے ہیں۔

یہ ابتدائی آثار گو مربوط نثر کی تاریخ میں نہیں آ سکتے تاہم نثر کی تعریف سے خارج بھی نہیں کیے جا سکتے کیونکہ بزرگوں کے یہ ملفوظات نظم میں نہیں اور وہ اُردو میں ہیں۔ اسلئے ہم انہیں نثر یا نثر پاروں میں شمار کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ اُردو کی حد تک یہ گویا نثر کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دہلی میں محمد غوری کی حکومت اپنے ابتدائی کشمکش کے دَور سے گذر کر کسی حد تک استقلال کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ گذشتہ عہد کے مقابلے میں امن و امان کا زمانہ تھا۔ بڑے بڑے اہلِ قلم صوفی، شاعر، تاجر اور صناع ایران اور عرب سے ہندوستان آ رہے تھے اور نئی شائستگی اور نئی زبانیں رکھنے والی قوموں کے میل ملاپ سے جو لسانی نتائج فطرتاً پیدا ہونے چاہیے تھے وہ پیدا ہو رہے تھے۔
اس زمانے میں ایرانی ادب پر بھی تصوف کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے

ہندوستان میں مذہبی لہریں طوفانی انداز سے اُٹھ رہی تھیں۔ ہر مکتبۂ خیال کا آدمی اپنے فلسفہ کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ کر رہا تھا۔ مسلمان فقراء نے بھی تبلیغِ اسلام کیلئے قدم بڑھایا اور تبلیغ کے لیے تصوف کو شعلِ راہ بنایا۔ اس میں فلسفہ کا نچوڑ بھی تھا اور شریعت کا رس بھی اور ساتھ ہی ساتھ وسیع الخیالی اور ہمہ گیری بھی۔ اسلام کے خالص عقائد اور شرع کی سخت گیری بھی نہ تھی کہ دوسرے فرقے والے بدک کر بھڑک جائیں۔ نئی قوم نئے مذہب کے لوگوں سے ہندوستان میں ربط پیدا ہونے کے بعد مسلم علماء و فقراء نے کوشش کی کہ ہندوستانی عوام کو اپنے اپنے مذہب کے حقائق یعنی ہمہ گیر محبت کی زبان میں سمجھائیں۔ مسلمان علماء نے تصوف کی اصطلاح میں مذہب اسلام کو پیش کیا تاکہ محبت اور پریم کی مفاہمت کے ذریعے نئے تصورات رکھنے والے عوام کے درمیان زیادہ مستحکم تعلقات پیدا ہو سکیں۔ صوفیاء علماء کے مقابلے میں زمانہ کی ضروریات اور حالات سے زیادہ واقف ہوتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ مقبول ہوئے اور انہیں اپنی دعوت میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ وہ اپنے پیغام کی تلقین کے لیے ایسے ڈھنگ استعمال کرتے تھے جن سے، بجائے وحشت کے لوگوں کو اُلفت ہوتی تھی اور ہر قوم و ملت کے لوگ حصولِ سعادت کے شوق سے اُن کے پاس آتے تھے اور اُن کی زیارت کو اپنے لئے موجبِ برکت خیال کرتے تھے۔ ان بزرگوں کے بہت سے سلسلے تھے جیسے چشتی، قادری، نقشبندی، سہروردی وغیرہ۔ ان میں سے کوئی عرب سے کوئی ایران سے اور بعض افغانستان سے آئے تھے۔ اُن کی اپنی زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن انھوں نے یہاں کے لوگوں کو اُن کی زبان ہندی میں مخاطب کیا تاکہ ان کا پیغام گھر گھر پہنچ سکے۔ جتنے اولیاء اللہ سرزمینِ ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے عوام سے

انہیں کی بولی میں بات چیت کرتے تھے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ یہ بڑا آرٹ تھا۔ صوفیائے خوب سمجھتے تھے۔ باوجود صاحب علم و فضل ہونے کے وہ تلقین و تعلیم لوگوں کی عام زبان میں کرتے تھے اسی وجہ سے اردو ان بزرگوں کی بڑی مرہون منت ہے۔

"ان صوفی بزرگوں کے ہندوستان میں آنے اور ارشاد و ہدایت کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی سے اس نوخیز زبان کا تسلط زیادہ وسیع ہوتا نظر آتا ہے۔ تحریری آغاز کا یہ ارتقا ایک حد تک منطقی بھی ہے یعنی اس سے پہلے کے دور کے منفرد الفاظ جن کے جملوں کے دوسرے اجزا فارسی کے نقاب میں چھپے ہوئے تھے اب اردو میں مکمل طور پر بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ تحریری آثار کا دوسرا مرحلہ ہے جس میں کم سے کم ایک مربوط خیال کے اظہار کی حد تک فارسی کے سہارے چھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر اکثر بزرگوں کی فارسی تحریروں کے درمیان اردو کے کچھ جملے بھی مل جاتے ہیں۔ ان جملوں کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ فارسی کے مصنفین اور بزرگان دین کو ایسے موقعوں پر اردو جملوں کی مدد لینی پڑتی تھی جب وہ ہندی عوام سے گفتگو کرتے یا ان کے خیالات کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ نوخیز بولی اب ہندوستان کے لاکھوں عوام کی زبان بن چکی تھی اور ان کے لئے فارسی میں ابہام و تفہیم کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اسی لئے فارسی یا عربی بولنے اور لکھنے والے بزرگوں کو بھی اس زبان سے مدد لینی پڑتی تھی۔"[2]

ان فارسی علماء کا اردو ادب کی تاریخ پر بڑا احسان ہے کہ ان کے احساس حقیقت پسندی نے حسب ضرورت ہندوستانی زبان سے کچھ جملے اپنی اصل صورت میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ۱۱۳۵ء / ۵۳۰ھ تا ۱۲۳۴ء / ۶۳۰ھ

مذکورہ بالا بزرگوں میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کا نام سرفہرست ہے۔ ملک محمد جائسی کی ہندی تصنیف "اکھراوٹ" کے شارح کے درج ذیل بیان کو تسلیم کیا جائے تو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ خواجہ موصوف بھی زبان میں گفت و شنید فرماتے تھے۔ وہ لکھتا ہے "توہم نہ کنند کہ اولیاء اللہ بغیر از عربی تکلم نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ بلکہ بہر ملک کہ بودہ زبان آں ملک بکار بردہ اند وہم و گمان نہ کنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ خواجہ بزرگ معین الحق والملت والدین بدین زبان سخن فرمودہ"۔

اس کی تائید خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی سے ہوتی ہے۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کو دن رات ہندی عوام سے واسطہ پڑتا تھا کیونکہ ان کا پیشہ طب تھا قرین قیاس ہے کہ خواجہ صاحب ہندوستانی مریضوں سے انہی کی زبان میں گفتگو کرتے ہوں گے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی اولیاءؒ ۱۱۸۶ء / ۵۸۲ھ تا ۱۲۳۲ء / ۶۳۴ھ

حضرت قطب الدین بختیار کاکی چشتیؒ سید اور معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کا تعلق ماوراء النہر کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدینؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے آپ کو دہلی میں اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ ان دنوں دہلی کے تخت پر شمس الدین التمش تھا جو حضرت کے

ارادت مندوں میں داخل ہو گیا۔

حضرت بختیار کاکیؒ کے خلیفہ بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات "جواہر فریدیؒ" میں حضرت سے ایک جملہ منسوب کیا گیا ہے۔ بابا فرید جس زمانے میں دہلی میں قیام فرما تھے اس وقت آشوبِ چشم کی وجہ سے آنکھ پر پٹی باندھے ہوئے اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے بابا سے پٹی باندھنے کا سبب دریافت کیا تو بابا نے جواب دیا۔ "آنکھ آئی ہے۔" جس کے جواب میں حضرت نے فرمایا۔ "اگر آنکھ آئی ہے تو سو آئی ہے۔"

حضرت بابا فرید شکر گنج ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء تا ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء یا ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء

حضرت بابا فرید ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء ملتان میں تولد ہوئے۔ شیخ کا سلسلۂ نسب حضرت سیّدنا عمر فاروق خلیفۂ دومؓ سے ملتا ہے۔ ایک روز ملتان کی مسجد میں منہاج الدینؒ سے فقہ میں نافع کا درس لے رہے تھے کہ حضرت بختیار کاکی کا اُدھر سے گذر ہوا۔ بختیار کاکیؒ نے اُن سے پوچھا۔ "اے طفل چہ می خوانی؟" جواب دیا۔ "نافع" فرمایا۔ "نفع آور ہمؔ" اس پہلی ملاقات میں وہ حضرت سے بہت متاثر ہوئے کہ کچھ روز کے بعد دہلی پہنچے۔ حضرت سے خرقۂ خلافت لے کر پنجاب کے شہر اجودھن میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ کے ملفوظات "جواہر فریدیؒ" کا ایک جملہ "پرتوں کا چاند بالا ہوتا ہے" بہت مشہور و معروف ہے۔ آپ نے یہ جملہ جمال الدین ہانسویؒ کے فرزند برہان الدین ہانسویؒ کی نسبت اُن کی والدہ "مادرِ مومنہؒ" سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا۔

"سیر الاولیاء" میں بابا کا ایک اور فقرہ ملتا ہے جو بابا فرید نے اپنے بھانجے اور خلیفہ شیخ علی احمد صابر سے اس وقت کہا تھا جب وہ اپنے خلفاء کو مختلف سمتوں میں روانہ کر کے نصیحت فرما رہے تھے۔ بابا صاحب نے حضرت صابر موصوف کو دیکھ کر فرمایا۔ "اے صابر بر در بر گاہ خواہی کرد" یعنی زا عیش خوش خواہد گذشت۔

علاوہ اس کے "جواہر فریدیؒ" میں اُن کا ایک ذکر بھی ہندی زبان میں منقول ہے: —

"اینو نہہ توں اُنھوں نہہ توں اُین توں"

(یہاں توُ، وہاں توُ، سب جگہ توُ)

'جواہر فریدی' کے مذکورہ بالا ہندی فقرہ کی تصدیق دارالمصنفین کے کتب خانہ میں محفوظ ایک رسالے 'جواہر فریدیؒ' سے ہوتی ہے۔ یہ رسالہ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء کا مرقومہ ہے۔

اسی کتاب میں بابا کا ایک اور فقرہ بھی منقول ہے۔ لکھا ہے کہ "ایک مُرید نے بابا صاحب سے دریافت کیا کہ جسم میں عقل کا مقام کونسا ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ "بیچ سر کے"

بابا صاحب کے مذکورۂ بالا اقوال کے علاوہ اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام اور تاریخِ داستانِ اُردو میں آپ سے کچھ اشعار منسوب کئے گئے ہیں۔ ایک شعر یوں ہے ؎

وقت سحر وقتِ مناجات ہے   خیز دراں وقت کہ برکات ہے

مولوی عبدالحق نے حضرت قطبِ عالم کے "جمعات شاہیؒ" سے بابا فرید کا مندرجہ ذیل قول بھی درج کیا ہے —

ایسا کبری میں سو ریت ؎ جاؤں تائے کا جاؤں بیت

باباصاحب سے ہندی اور پنجابی میں چند کافیاں بھی منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن پروفیسر شیرانی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور سنیتی کمار چیٹرجی کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کافیاں بابا فرید کی نہیں بلکہ نانک کے معاصر کسی اور فرید نامی بزرگ کی ہیں۔

حضرت نظام الدین محبوب الہیٰؒ ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء تا ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء

آپ حضرت بابا فرید گنج شکر کے خلیفہ تھے۔ آپ کے ملفوظات آپ کے دو شاگردوں یعنی سید محمد مبارک علوی کرمانی اور حضرت امیر خسروؒ کے دوست میر حسن سنجریؒ نے تالیف کیے ہیں۔ مگر ان ملفوظات میں آپ کے دہنِ مبارک سے فرمایا ہوا اُردو زبان کا کوئی فقرہ موجود نہیں۔ تاہم اس خیال کے پیش نظر کہ اس سلسلے کے سارے بزرگ ہندوستانی عوام کے ارشاد و ہدایت کیلئے ہمیشہ اُردو زبان استعمال کرتے رہے۔ یہ بات بڑی حد تک یقینی ہے کہ حضرت نے بھی ضرور اس زبان کو اظہارِ مطالب کا ذریعہ بنایا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے ملفوظات محفوظ نہ رہ سکے اور شاید اب ناپید ہیں۔ البتہ حضرت ہاشم حسینی العلوی کے ملفوظ "مقصود المراد" میں ایک جملہ ملتا ہے۔ حضرت موصوف نے حضرت نظام الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ دہرائے ہیں: "چہ خوش گفتار خواجہ نظام است" "نظام کرنا دآپ کرنا"۔ اس قول کے بارے میں حکیم شمس اللہ قادری کا خیال ہے کہ یہ ملفوظ حضرت نظام الدین کا نہیں بلکہ ہاشم حسینی علوی کے کسی مرید نظام الدین کا ہے۔ لیکن جس ادب و احترام سے

حضرت نے نظام الدین اولیاءؒ کا ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت ہاشم کے پیرِ طریقت ہی ہیں، نہ کہ اُن کے شاگردوں میں سے کوئی اور۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء

اس عہد کے دوسرے مشہور بزرگ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی ہیں۔ آپ حضرت نظام الدین کے خلیفہ تھے۔ چونکہ آپ بڑے زاہد اور جیّد عالم تھے۔ اسی بنا پر حضرت نے آپ کو "چراغ دہلوی" کا خطاب دیا تھا۔ ان کے ملفوظات "خیر المجالس" میں ان کی نثر پارے ملتے ہیں۔

حضرت شاہ بوعلی قلندر پانی پتیؒ (وفات ۱۳۲۳ء)

آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے ولی تھے۔ فارسی میں اُن کی مندرجہ ذیل تصانیف موجود ہیں۔

"جامع علم توحید"، "رسالۂ حکم نامہ"، کچھ عارفانہ مثنویاں اور چند فارسی مکتوبات جو انہوں نے اپنے مرید اختیار الدین کے نام لکھے تھے۔

اُردو میں اُن کی کوئی تالیف یا تصنیف نہیں ملتی۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں مندرجۂ ذیل واقعہ نقل کیا ہے اور حضرت کا ایک مقولہ اور دوہا درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

ایک مرتبہ امیر خسرو نے اُن کو اپنا کلام سنایا جس کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اپنا بھی کچھ کلام سنایا۔ اسے سن کر امیر خسرو بہت آبدیدہ ہوگئے حضرت نے فرمایا "ترک کچھ سمجھا ہے"۔ امیر خسرو نے کہا "اسی لئے تو رو رہا ہوں کہ مجھ

نہیں سمجھتا۔ مندرجہ ذیل دوہا بھی انہی سے منسوب ہے ؎

"سجن سکھارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہووے"

حضرت شرف الدین یحییٰ منیری ۶۲۲ھ ۱۲۲۵ء تا ۷۷۲ھ ۱۳۷۰ء

حضرت شیخ شرف الدین کا تعلق بہار کے مشہور صوفی خاندان سے تھا۔ شیخ کے دادا حضرت تاج فقیہہ بیت المقدس سے ۵۷۶ھ ۱۱۸۰ء میں منیر شریف تشریف لائے۔ شیخ صاحب کی ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی۔ سن رُشد کو پہنچنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاء کے علم وفضل کا حال سن کر بیعت کے ارادے سے دہلی گئے۔ لیکن چونکہ خواجہ صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اس زمانے کے ایک بہت بڑے بزرگ نجیب الدین کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے بیعت کے بعد وطن کو واپس ہوئے۔ اُن کے زہد و اتقاء، عبادت و ریاضت کا دُور دُور چرچا تھا۔

پروفیسر حسن عسکری نے اپنے ایک مضمون "قرون وسطی کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخ کی اہمیت" مطبوعہ سالنامہ "ساقی" ستمبر ۱۹۵۲ء میں حضرت کے ایک اُردو نثری قلمی نسخے کی نشاندہی کی ہے۔ چونکہ یہ رسالہ ہماری دسترس میں نہیں اسلئے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تاہم حضرت کا ایک آدھ نثری رسالہ یادگار چھوڑنا ناممکن نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اُن کا بہت سا اُردو کلام دوہوں کنج مندروں وغیرہ کی شکل میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے اُن کے مرید خاص حضرت زین بدر عربی نے ۷۹۲ھ ۱۳۹۰ء میں "معدن المعانی" کے

نام سے حضرت کے کچھ ملفوظات کو قلمبند کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی صاحب نے "معدن المعانی" سے اردو کے کچھ فقرے نقل کئے ہیں لکھتے ہیں: خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی کے عرض کرنے پر کہ :۔

"بزبان ہندی شیخ گفتہ است ہر کہ بات بھلی پُر سانہ کر"
حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا "بعد ازاں بندگی مخدوم عظمہ اللہ برزبان مبارک راند دیسی بھلا پر دُور" (ا)

"نقوش سلیمانی" میں ندوی صاحب نے دلیسنہ ضلع پٹنہ کے کتب خانہ اصلاح میں محزونہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے ایک نامہ کا بھی ذکر کیا ہے جو ستائیس نقروں پر مشتمل ہے۔

چند اُردو فقرے حسب ذیل ہیں :۔

۱- جو من کی خوشی کیا ہوئی سو ہوئی۔
۲- ناہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات۔
۳- راج پاٹ چل کے دیا منگوں۔
۴- آگے بڑے دن گئے اب سکھ پاؤ گے۔

ایک کنج مندرا انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔ جس کا ذکر پروفیسر عبدالغنی نے اپنی تصنیف "پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ" میں کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنی تصنیف "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں اُن کے چند دوہے نقل کئے ہیں۔

اشرف جہانگیر سمنانی ۶۸۰ھ ۱۲۸۱ء تا ۸۰۰ھ ۱۳۹۷ء

آپ اپنے زمانہ کے بہت بڑے صوفی اور زاہد تھے ۲۴ سال کی عمر میں

اپنے وطن سمنان کو ترک کرکے ہندوستان آئے اور پہلے واچھ (سندھ)
میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر وہاں سے دہلی
چلے آئے۔ جہاں شیخ علاؤالدین علاؤالحق بنگالی کی خدمت میں حاضر ہوئے شیخ نے
آپ کی بڑی عزت و تکریم کی اور خرقۂ خلافت عطا کرنے کے بعد جونپور جانے کا حکم
دیا۔ حضرت اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ آپ نے ایک رسالہ
خلفائے راشدین کی مدح میں لکھا تھا جس میں حضرت علیؓ کو دیگر صحابۂ کرامؓ پر
کسی قدر فوقیت دی تھی۔ اس بنا پر عوام کو ان پر شیعہ ہونے کا شبہ ہوا لیکن
بعد میں لوگ ان کے علم و فضل کے قائل ہو گئے۔

آپ نے فارسی میں بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ مولانا حامد حسن
قادری نے تاریخ نثر اردو کے سلسلے میں حضرت کے ایک نثری رسالہ کا ذکر کیا ہے
جس کا مفصل ذکر اگلے صفحات پر کیا جائے گا۔ حضرت کے ملفوظ "لطائفِ
اشرفی" میں کئی اردو مقولے اور الفاظ ملتے ہیں۔ ایک حکایت انہی ملفوظ میں
اس طرح آئی ہے:۔

"سید اشرف جہانگیر سمنانی جب رودل سے گذر رہے تھے۔ اس کے قریب
گاؤں میں مولانا کریم الدین دانشمند رہتے تھے۔ سید موصوف ان سے ملنے جانے
لگے تو کسی نے مولانا کو جا کر اطلاع دی۔ انھوں نے فرمایا "ہی ہی" حضرت ایشان
را نہ شاید کہ در خانۂ من بیایند ایشان بسیار مرد بزرگ الذ دخل ہندوی
فرمودند کہ:۔

"چھیری کے منہ کھنڈا سہائے"

ان کے ملفوظ میں سانپ بچھو کے کئی منتر اور دواؤں کے کئی نسخے بھی

ملتے ہیں جو اردو میں ہیں۔ کچھ ہندی الفاظ بھی دستیاب ہوئے ہیں جیسے
چونا، میٹھی وغیرہ۔

حضرت زین الدین خلد آبادیؒ ۱۳۰۱ء / ۷۰۱ھ تا ۱۳۶۹ء / ۷۷۱ھ

آپ کا نام سید داؤد حسین تھا۔ ۷۰۱ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے۔
اپنے وقت کے بڑے جید عالم تھے۔ آپ سے اردو کا ایک جملہ منسوب ہے۔ کہا جاتا
ہے کہ ان کے انتقال کے وقت ان کے مرید نصیر الدین بدھری نے کسی کو خلیفہ
مقرر کرنے کے لیے وصیت کرنے کی خواہش کی تو منہ پھیر کر قبلہ رُو ہوئے
اور اردو میں کہا: "منہ مت بلا وانجھ"

حضرت مخدوم جہاں نیاں جہاں گشتؒ

آپ اور آپ کے معاصرین قطب عالم اور شاہ عالم پر اردو کے
نثر نگاروں کا عہد ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت حضرت
خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد مکرم شاہ راجو قتال کے حقیقی بڑے بھائی اور
شیخ احمد کبیر کے فرزند تھے۔ ان بزرگوں کی چوکھٹ پر تغلق تاجداروں کے سر جھکتے
تھے۔ جب فیروز تغلق ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت نے فرمایا "کاکا فیروز
چنگا ہے"۔ بادشاہ نے اس پرسشِ حال کو موجب افتخار سمجھا۔

پروفیسر سید حسن عسکری نے حضرت امام الدین راجگیری کے قلمی ملفوظ کے
حوالے سے اپنے ایک مضمون "بہار کے ایک شطاری صوفی" میں حضرت کے ایک
مقولے کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ مقولہ یوں ہے: "کھانڈا ہے بھانڈا کہاں"۔

یعنی خندق تو موجود ہے اس سے نکلنے کا ذریعہ کہاں ہے؟ مطلب یہ ہے کہ خدا کے پیچھے عرفان کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت کے اور بھی متعدد اقوال کا تذکرہ پروفیسر موصوف نے کیا ہے۔

حضرت قطب عالم ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء تا ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء

حضرت سید برہان الدین قطب عالم سید جلال الدین جہاں گشت کے پوتے تھے۔ ان کا تھوڑا سا حال مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تصنیف "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں لکھا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت مخدوم جہانیاں کے چھوٹے بھائی اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد سید راجو قتال کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحیٔ نے "گل رعنا" میں لکھا ہے کہ موصوف بچپن میں اپنے ننھیال گجرات چلے آئے تھے۔ وہاں وہ قطب عالم کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ دونوں باپ بیٹے اپنی خاندانی بزرگی و عظمت کے ساتھ خود بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ گجرات کے بادشاہ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جب وہ بٹوہ میں مقیم تھے ایک رات نماز تہجد کیلئے اُٹھے صحن میں ایک لکڑی پڑی ہوئی تھی اس سے ٹھوکر لگی۔ پاؤں میں چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ اس وقت اُن کی زبان سے یہ کلمہ نکلا جسے "ڈاکٹر غنی نے اپنی تصنیف "پرشین...... ایٹ دی مغل کورٹ" میں "مرأۃ سکندری" کے حوالے سے اس طرح نقل کیا ہے۔

"لوہ ہے یا لکڑ ہے یا پتھر ہے یا کیا ہے"

لیکن اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام میں "تحفۃ الکرام" کے حوالے سے یہ جملہ یوں منقول ہے:۔

"لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے"

سراج اورنگ آبادی کے پیر طریقت شیخ عبدالرحمٰن چشتی کی تصنیف "مرأۃ الاسرار" میں ایک اور واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سندھ کے حاکم جام جانو نے اپنی دو لڑکیوں میں سے ایک کی نسبت شاہ عالم (فرزند حضرت قطب عالمؒ) سے اور دوسری کی محمد شاہ، بادشاہ گجرات سے کی تھی۔ جس لڑکی کی نسبت شاہ عالم سے ہوئی تھی وہ حسن و جمال میں اپنی بہن سے بہتر تھی۔ محمد شاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے حاکم سندھ پر دباؤ ڈال کر نسبت بدلوا دی۔ شاہ عالم کو یہ سن کر ملال ہوا۔ انہوں نے باپ سے اس کی شکایت کی۔ اسوقت قطب عالم کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا۔ "بیٹے تسا نصیب دعون دیجؒ"

اس واقعہ کو مولانا عبدالحیٔ نے "گل رعنا" میں بھی نقل کیا ہے۔

حضرت شاہ عالمؒ (سنہ وفات ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء)

یہ حضرت قطب عالمؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ نام سراج الدین تھا۔ لیکن شاہ عالم کے لقب سے مشہور تھے۔ اُن کو یہ خطاب شاہ بارک اللہ چشتی نے دیا تھا۔ جو حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ایک بار انہوں نے بے اختیاری میں ان کو "شاہ عالمؒ" سے مخاطب کیا اسی وقت سے انکا یہ خطاب مشہور ہو گیا۔ شاہ عالم نے یہ واقعہ اپنے والد حضرت قطب عالمؒ سے بیان کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا "چشتیوں نے پکائی اور اُسے بخاریوں نے کھائی"۔

ان کے ملفوظ "جماعت شاہی" میں ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ کہتے ہیں ایک روز شاہ عالمؒ کہیں جا رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے حضرت مخدوم شاہ احمد بھی

ہم رکاب تھے۔ سلطان شاہ بادشاہ گجرات کا بھی اسی وقت اس طرف سے گزر ہوا۔
اس نے سلام نہیں کیا۔ آپ کے صاحبزادے نے شاہ عالمؒ کو اسکے غرور کی طرف توجہ
دلائی تو ہندی میں جواب دیا۔

"ارجن جی کا روند بیایا ہوئے تو مجھ سے نقیروں کی برسوں تیں کاس کرے۔"

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تیرہویں اور چودہویں صدی (مطابق
ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں) "اردو" عام طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔

حضرت شاہ عالم کے بعد بھی کئی علماء اور بزرگانِ دین کے مقولے اور ملفوظات
بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ مذکورہ بالا بزرگوں میں سے کئی ایک ایسے ہیں جن کی
تصانیف اُردو نظم و نثر کی شکل میں بھی ملتی ہیں۔ کیونکہ ان بزرگوں کو زبانِ ہند سے
خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا ثبوت پندرھویں صدی عیسوی کی ایک تصنیف
"مناقب محمدی" سے ملتا ہے۔

مربوط نثری کارناموں کا جائزہ

مربوط نثر کا آغاز محققین کی آراء

مربوط نثر کے آغاز کے تعلق سے محققین میں سب سے پہلے مولانا آزادؒ
"آبِ حیات" میں مولانا فضلی کو پہلا نثر نگار قرار دیا ہے۔ مولانا آزاد کے بعد
مولوی محمد یحییٰ تنہا مصنف "سیر المصنفین" اور مولانا عبدالحی مصنف "گلِ رعنا"
نے بھی فضلی کی "کربل کتھا" کو مربوط نثر کا پہلا کارنامہ ٹھہرایا ہے۔ لیکن جدید تحقیقات
کے پیش نظر آزاد کی یہ تحقیق بھی ان کی دوسری تحقیقات کی طرح غلط ثابت

ہوئی ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نثری رسالوں کی دریافت کے بعد ان کے
مرتبین اور محققین نے ان نثری رسالوں کو اُردو زبان کی قدیم ترین تصنیفات
و تالیفات قرار دیا ہے۔ اُردو کے ایک اور محقق حکیم شمس اللہ قادری اپنی تصنیف
"اُردوئے قدیم" میں شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۱۳۹۳ء) کے رسالوں کا ذکر کیا
ہے اور ان کو اُردو نثر کا سب سے پہلا نثر نگار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔
ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب "اُردو شہ پارے" میں حکیم صاحب کی
رائے کو تسلیم کیا ہے۔

حال ہی میں حامد حسن قادری مرحوم نے اپنی تصنیف "داستانِ تاریخ اُردو"
میں امیر نظر علی وردؔ کاکوروی کے حوالے سے اشرف جہانگیر سمنانی (جن کا مزار کچھوچھا
شریف علاقہ اودھ میں ہے) کے ایک اخلاقی اور مذہبی رسالے کو اُردو کی مربوط
نثر کا پہلا کارنامہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں محترمہ رفیعہ سلطانہ نے قادری صاحب
اور نظر علی ورد کاکوروی کے حوالے سے اشرف جہانگیر سمنانی اور ان کے
رسالہ کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اورنگ آباد میں حضرت شاہ قادر اولیا کی درگاہ میں محبوب علی شاہ نامی
ایک خادم تھے (عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو گیا) ان کے پاس سید اشرف جہانگیر کے
مذکورہ بالا رسالہ کو خود نظر کاکوروی نے دیکھا تھا۔ یہ قلمی کتاب تھی۔ اس کتاب کے
اٹھارہویں صفحہ پر یہ ٹکڑا درج تھا۔

"اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے جو تحقیق جان اگر تجھے میں
کچھ سمجھ کا ذرہ ہے۔ تو صفات کے بار بھیتر سب ذات ہی ذات ہے۔"

مذکورہ بالا نمونہ اس قدر مختصر ہے کہ اس میں رسالہ کی زبان اور

موضوع کے بارے میں کسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس زیر بحث نمونہ کی زبان سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ملفوظات کی زبان سے مختلف اور شاید خواجہ بندہ نواز کے نثری رسالوں کے بعد کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ جملوں کی ساخت میں فرق ہے۔ کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دیتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ تیرھویں صدی عیسوی (مطابق آٹھویں صدی ہجری) کے آخری زمانہ کی تصنیف ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو بھی اس رسالہ کے اصلی ہونے پر شک ہے۔

محترمہ رفیعہ سلطانہ کو اپنی تحقیق کے سلسلہ میں بیجاپور کے سرکاری عجائب خانے کی لائبریری میں ایک مختصر سا نثری رسالہ دو منظوم رسالوں کے ساتھ منسلک دستیاب ہوا ہے۔ اس رسالہ میں اردو مقولوں کی تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔ محترمہ اس رسالہ کے آغاز عبارت اور اس کتب خانہ کے کیٹلاگ کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ اس رسالہ کا نام "جنونیہ" ہے جو ۱۳۹۲ء / ۷۹۵ھ کی تصنیف ہے لیکن وہ یہ بھی لکھتی ہیں کہ یہ سن صرف کیٹلاگ کی فہرست میں درج ہے اور رسالہ کے متن میں کہیں درج نہیں۔ معلوم نہیں مرتب فہرست نے اس سن کو کہاں سے اخذ کیا تھا۔ محترمہ نے چند اندرونی شواہد کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ رسالہ سنہ ۱۴۳۰ء / ۸۳۴ھ کے بعد کا ہے۔ اس رسالہ میں ایک مقام پر خواجہ حافظ کا ایک مصرعہ منقول ہے۔ اور دوسرے مقام پر حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ فارسی زبان کے مشہور شاعر حضرت حافظ شیرازی سنہ ۱۳۲۰ء / ۷۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۳۸۹ء / ۷۹۱ھ میں وفات پائی اس طرح حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا زمانہ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی (مطابق ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری) کے درمیان کا ہے۔ محترمہ اس

رسالہ کی زبان کے متعلق لکھتی ہیں کہ "رسالہ کی زبان اسکے اسلوب کی وضع اور بندش سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر کی تصنیف ہے۔ اردو کا یہ رسالہ اخلاق اور تصوف کے نکات و رموز پر مشتمل ہے"۔

مذکورہ بالا بیان سے یہی واضح ہوتا ہے کہ مربوط اردو نثر کا آغاز دکن سے ہی ہوا۔ دہلی کی فوجوں اور عام جاننے والوں نے اس نئی زبان (اردو) کو مختلف خطوں اور حصوں میں پہنچایا۔ دکن کی زمین سب سے پہلے اردو ادب کی پیدائش اور ترقی کے لئے سازگار ہوئی۔ اسی لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہاں کی نثری خدمات اور نثری کارناموں کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا جائے۔

محترمہ رفیعہ سلطانہ کی تحقیق کے پیش نظر رسالہ "جنونیہ" کے مصنف مربوط نثر کے پہلے نثر نگار قرار پاتے ہیں۔ لیکن مصنف کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ اس رسالہ کے مصنف کے بعد عین الدین گنج العلم اور ان کے بعد حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا شمار اردو کے قدیم ترین نثر نگاروں میں ہوتا ہے یہ دونوں بزرگ دہلی کے متوطن تھے۔

خواجہ صاحب نے چھوٹے چھوٹے رسالوں کے ذریعہ عوام کے لئے ارشاد و ہدایت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسکو دوسرے بزرگوں اور خاص کر ان کے فرزند اور پوتے اور خلفاء نے جاری رکھا۔

حضرت سید محمد اکبر حسینی

حضرت خواجہ بندہ نواز کے فرزند اکبر بڑے عالم و فاضل تھے۔ ان کے

کمالات ظاہری و باطنی کے متعلق خود ان کے والد بزرگوار نے اپنی تصنیف "خطائر القدس" میں اشارہ کیا ہے۔[۸]

حضرت خواجہ صاحب نے انہیں اپنا خلیفہ بنایا مگر اس واقعہ کے سات ماہ بعد ہی باپ کی زندگی میں وہ رحلت کر گئے۔ انہوں نے فارسی و عربی میں کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کو نثر و نظم میں مہارت تھی ان کی ایک کتاب کا پتہ چلتا ہے جس میں نثر و نظم دونوں موجود ہیں۔ اس کتاب کا تذکرہ مولوی محمد عمر یافعی اور نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف "دکن میں اردو" طبع چہارم میں کیا ہے۔ اُن کی نثر کے نمونے محترمہ رفیعہ سلطانہ نے مولوی صاحب کی کتاب سے پیش کیے ہیں۔[۱۲]

"سنو اے مسلمانو! طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے۔ جیون کا بھروسہ نہیں ہے موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت عجلوا بالتوبہ قبل الموت۔ یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سوں اگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سوں آگے یعنی مرید ہو کر توبہ کرنا سوں گناہ و خطا سوں آپس کو پاک کرنا ایک کے تابع ہو کر خدا طلبی میں عاقبت کی راہ سنوارنا۔"

حضرت عبداللہ حسینی

مولوی سید محمد اپنی کتاب "ارباب نثر اردو" میں عبداللہ حسینی کو خواجہ صاحب کا نواسہ اور حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں اور ڈاکٹر زور نے "اردو کے اسالیب بیان" نیز "اردو شہ پارے" میں انہیں خواجہ صاحب کا پوتا بتایا ہے۔ لیکن "سیر محمدی" میں حضرت گیسو دراز کا جو

شجرہ دیا گیا ہے اس میں عبداللہ حسینی کو خواجہ صاحب کی نواسی کا شوہر بتایا گیا ہے اور وہ سید ابوالمعالی کے فرزند بتائے جاتے ہیں۔

عبداللہ حسینی نے اپنے معتقدین کی ہدایت کے لیے حضرت عبدالقادر جیلانی کی تصنیف "نشاط العشق" کا قدیم اردو (دکنی) میں ترجمہ فرمایا تھا اور اس کی شرح قلمبند کی تھی۔ بقول اسٹوارٹ (مرتب فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان) اس کا ایک نفیس مخطوطہ کتب خانہ ٹیپو سلطان موجود تھا۔ افسوس ہے کہ اب اُسکے دستیاب نہ ہونے کے مزید کوئی صراحت نہیں کی جاسکتی۔

حضرت شاہ داول

ان کا رسالہ "کشف الوجود" کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں محفوظ ہے۔

اس رسالہ میں چودہ اوراق ہیں۔ اس کا موضوع تصوف اور "روح رسالۂ شاہ داول مرحوم" ہے۔ ان کا نام داور الملک اور عرف شاہ داول ہے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے بڑے خدا رسیدہ بزرگوں میں ہوتا تھا۔ صاحب "برکات الاولیاء" نے ان کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شاہ عالم کے مرید اور خلیفہ تھے۔ گجرات کے حکمران سلطان محمود کے دربار کے امراء سے تھے۔ شاہ عالم ان کو بڑی عقیدت تھی اور ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے "کشف الوجود" کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"تمام حمد سزاوار ہے حق سبحان تعالیٰ کوں ہور صفت اس کا لانہایت کہاں تلک بولے گا ہور کہاں تلک سکے گا۔ اینسال مذکور من یو جدول پو ہور نفس مرید کا سوال ہور جواب ہور لکھیا ہے۔ جو خدا کے دوست دیکھ کر سو ہور دیں

ہور نیکی سوں یاد کریں۔ ۱۴۰ھ

رسالۂ حضرت شاہ قلندرؒ

سالار جنگ کے کتب خانہ میں "چہار دہ رسائل" کا ایک مجموعہ ملتا ہے۔ اس میں ایک "رسالۂ شاہ قلندرؒ" بھی ہے۔ اس رسالہ کے ترقیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ قلندرؒ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے نبیرہ شاہ ید اللہ کے مرید تھے جو خواجہ صاحب کے چھوٹے بیٹے اصغر حسینی عرف میاں پرہ کے فرزند اکبر تھے۔

انہوں نے اُس زمانے کے مشہور علماء قاضی بہاء الدینؒ قاضی شیراز الدینؒ وغیرہ سے علوم متداولہ کی تکمیل کرائی۔ تذکروں میں یہ بھی منقول ہے کہ خواجہ صاحبؒ نے ان کو اپنی زندگی میں ہی اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔

شاہ ید اللہ حسینیؒ نے بھی اپنے دادا کی طرح دعوت حق اور ارشاد و ہدایت کا کام جاری رکھا تھا۔

شاہ قلندر کے رسالہ کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

"عشق بلند ہے۔ وار عشق عاشق راز عشق قدیم آراکیس عشق دکھاوے۔ بدالش عشق ہے دستیا لذت ہے محبوب عشق دکیھا عشق سب کا لذت لیا۔ عشق حالت سب مغلوب۔ طلب طالب وہیں مطلوب۔ عشق آزاد و ظہور عشق۔ نظر میں پایا موتی شاہ ید اللہ دستا جوتی دکیھا جیت دستا اندھیا کیا تھا۔ دستا کرن قلندر دل کے اندر ظاہر ہے شاہ حامی ہے۔ جنت او نچے ناکی ہے۔ غرض میرا ہوا تمام۔ غرض تھا میرا کام۔ یقین رہبر یقین جان۔ یقین ثابت دہی ایمان ہے۔ عاشق درد دربوبایک ایمان پہ رسول خداؐ"

اس رسالہ کی عبارت وجہی کی "سب رس" کی طرح مسجّع و مقفّیٰ ہے۔ لیکن وجہی کا اسلوب زیادہ فنکارانہ اور ترقی یافتہ ہے۔ یہ مسجّع اور مقفّیٰ عبارت کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے۔ اس میں کہیں کہیں ابہام بھی ہے۔ اکثر محققین کو سب رس کے اسلوب بیان کی رنگینی کے مدنظر یہ خیال تھا کہ ایسا ادبی شاہکار یکایک پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے پہلے بھی یہ طرز نگارش رائج رہ چکا ہوگا۔ شاہ قلندر کے اس رسالہ کی دریافت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محققین کا اندازہ غلط نہیں تھا اور یہ رسالہ اور "معراج الحقائق" اسی گمشدہ سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

محترمہ رفیعہ سلطانہ نے شاہ داول ہی کے ساتھ اس دور کے دو اور بزرگوں سیّد محمد جونپوری اور حضرت بہاء الدین باجن کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جنہوں نے اُردو کو تقریر و تحریر کیلئے استعمال کیا۔

سیّد محمد جونپوری ۸۴۷ھ ۱۴۴۳ء تا ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء

یہ بہت بڑے بزرگ تھے۔ انہوں نے فرقہ مہدویہ کی بنیاد ڈالی۔ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے بہت سا زمانہ وطن سے دور سیاحت میں گذارا۔ ان کے بعض اقوال اُردو میں ملتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے تاریخ سلیمانی کے حوالے سے ان کا مندرجہ ذیل جملہ درج کیا ہے جو انہوں نے مشہور بزرگ شیخ احمد کھٹو کی نسبت فرمایا تھا۔

"دو بیٹے خدا کون پوچھے"۔ ۱۴۰ھ

خراسان کے سفر میں سلطان حسین کی فوج نے اُن کے ساتھیوں کو بہت

تکلیف دی۔ جب سلطان کو اس کی خبر پہنچی تو معذرت کی۔ اُس وقت اُنہوں نے سلطان کے سفیر کے سامنے یہ جملہ کہا۔ "شہ کی چوٹ شکر کی پوٹ"۔

ان جملوں کے علاوہ شعر اور ابیات میں ان کے چند اور بھی دوہے ملتے ہیں۔

حضرت بہاء الدین باجن پیدائش ۱۳۸۸ء تا ۱۴۹۶ء

حضرت شاہ باجن حضرت معزالدین کے فرزند تھے۔ انہوں نے ایک کتاب "خزانۂ رحمت" کے نام سے لکھی۔ جس میں اپنے مرشد کے ملفوظات اور ارشادات قلمبند کئے۔ خزانۂ رحمت کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ باجن نے شمال میں خراسان اور جنوب میں سیلون تک سفر کیا تھا۔[۱۵]

حضرت شاہ کمال الدین

پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کے ذاتی کتب خانہ کی ایک بیاض میں خواجہ بندہ نواز کے ایک رسالہ خلاصۃ التوحید اور شاہ میراں جی شمس العشاق کے رسالہ تصوف کی کچھ عبارت کے ساتھ خواجہ کمال الدین کا ایک رسالہ ارشاد نامہ بھی منقول ہے جس کے سرنامہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"ارشاد نامہ کمال الدین شاہ صاحب قدس سرہ العزیز"

اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"کلمۂ طیب، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ
لَا اِلٰہَ نہیں کوئی اللہ بندگی لینے کی اور خدائی کی لائق"۔

اختتام مندرجہ ذیل فارسی عبارت پر ہوتا ہے۔

"آنگاہ مقراض راند بر موی پیشانی سر موی بلبیر دو بجائے آں تخم سعادت بہ نشاند"۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق

اُردو نثر کی تاریخ میں چودھویں صدی عیسوی (مطابق آٹھویں صدی ہجری) کا آغاز حضرت شاہ راجو اور ان کے خاندان کی خدمات کا عہد تھا۔ سید شاہ راجو نے نثر کی بنیاد رکھی۔ اس پر ان کے فرزند خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے عمارت اٹھانی شروع کی۔ گیسو دراز کے پوتے عبداللہ حسینی اور ان کے دوسرے معاصرین نے اس عمارت کو اونچا اٹھایا۔ نویں صدی ہجری مطابق پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کی خدمت کا عہد کہنا چاہیئے۔ شاہ میراں جی بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کے ابتدائی دور میں بیجاپور تشریف لائے۔ شاہ میراں جی اور ان کے فرزند و پوتے نے عادل شاہی حکومت کے تقریباً سارے دور میں تصنیف و تالیف کے سلسلہ جاری رکھا۔ شاہ میراں جی کی کئی نثری تصانیف میں حسب ذیل مشہور ہیں۔

۱۔ گل باس (۲) جلترنگ (۳) سب رس (۴) شرح مرغوب القلوب۔
۵۔ رسالۂ تصوف۔

گل باس اور جلترنگ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور نے ان رسالوں کا ذکر نہیں کیا۔ صرف حکیم شمس اللہ قادری کے بیان سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت میراں جی شمس العشاق نے نثر اُردو میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ منجملہ ان کے دو رسالے ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک کا نام جل ترنگ اور دوسرے کا گلباس۔ یہ چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ شاہ صاحب نے اِن میں تصوّف کے اسرار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کئے ہیں"[11]

شرحِ مرغوبُ القلوب

میراں جی کی نثری تصانیف میں یہ کتاب بہت اہم ہے۔ اس کا تذکرہ کئی علماء نے بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے کتب خانے میں اس کے دو نسخے تھے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں: "یہ چھوٹا سا رسالہ نثر میں ہے۔ اس کے بھی میرے پاس دو نسخے ہیں اور دونوں میں اسے حضرت میراں جی کی تصنیف بتایا گیا ہے"۔

اس رسالہ میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ پہلے وہ قرآن کی آیتیں مگر زیادہ تر حدیثِ نبوی لکھتے ہیں۔ اس کے بعد ترجمہ اور مختصر تشریح کرتے ہیں۔ مضمون کے لحاظ سے یہ کتاب بہت معمولی ہے اور کچھ اہمیت نہیں رکھتی البتہ زبان کی تاریخ کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

سب رس

میراں جی کی اس کتاب کا ذکر ڈاکٹر زور کے سوا اور کسی نے نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب دکنی نثر میں ہے اور شاہ وجیہ الدین کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا ایک مخطوطہ ۱۱۱۸ھ آغا حیدر صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ کل ۱۰۸ ورق ہیں۔ ہر ورق میں ۲۶ سطر۔ زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے۔

چونکہ اُردو کی ابتدائی نثری کتابوں میں ہے اس لیے یہ مخطوطہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

سالار جنگ کے کتب خانہ میں سب رس کا ایک اور نسخہ موجود ہے۔ وہ خاصہ ضخیم ہے اور اس کے صفحات کی تعداد کل ۲۱۶ ہے اور اس کے ترجمہ کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہ میراں جی شمس العشاق کی تصنیف ہے۔ نسخہ کے سرنامہ پر ذیل کی عبارت درج ہے۔

"کلام میراں جی شمس العشاق از کلام وجیہہ الدین بزبان دکنی ترجمہ نمودہ اند سب رس نام کردہ اند"[12]

پروفیسر عبدالقادر سرفراز شیخ نے بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات میں وجہی (مصنف سب رس) سے ایک اور تصنیف "تاج الحقائق" منسوب کی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی قطب مشتری اور سب رس کے دیباچوں میں وجہی کی تیسری تصنیف 'تاج الحقائق' کا ذکر کیا ہے۔ لیکن پروفیسر شیخ صاحب نے تاج الحقائق کا جو اقتباس پیش کیا ہے وہ سالار جنگ کے کتب خانہ کے سب رس کے پیش کردہ اقتباس سے ملتا جلتا ہے۔ علاوہ اس کے "تاج الحقائق" کی فہرست کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی کتاب کے دو نام نہیں ہو سکتے۔ اور ایک ہی کتاب کے دو مصنف ہیں جن کے زمانے میں تقریباً ایک سو سال کا فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب سب رس نہیں ہے۔ اس طرح اسے شاہ میراں جی سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ تاج الحقائق ہے۔ حال میں بمبئی کے نور السعید اختر صاحب نے تاج الحقائق پر تحقیقاتی مقالہ پیش کیا ہے۔

اور اِسے دکنی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

شاہ میراں جی کا طرزِ بیان اپنے مذکورۂ بالا معاصرین سے زیادہ سلیس ہے میراں جی کے معاصرین نے ٹھیٹ گجراتی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اُن کے بیٹے اور پوتے شاہ برہان اور شاہ امین الدین اعلیٰ کے ہاں گجراتی کا اثر اتنا گہرا نہیں گو انہوں نے بار بار اپنی زبان کو گجراتی کہا ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میراں جی نے نہ صرف ہندوستانی زبان اختیار کی بلکہ اُن کے فن کی خصوصیات بھی ہندوستانی ہیں۔ تصوف کی باتیں بیان کرتے ہوئے وہ ہندی شاعری کی تکنیک سے کام لیتے ہیں۔ میراں جی سے پہلے عموماً فلسفیانہ مباحث صرف مذہب کے اطراف گھومتے تھے لیکن میراں جی نے دوسرے موضوعات جیسے عشق، عقل کے بنیادی مسائل پر بحثیں کر کے زبان میں وسعت اور زور پیدا کیا۔ انہوں نے ہندوستانی اشیاء اور ماحول کی تصویریں بڑی خوبی سے کھینچی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں ہندوستان کا دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے۔

شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

چودھویں صدی عیسوی (مطابق نویں صدی ہجری) کے اواخر میں شاہ میراں جی کے علاوہ کبیرؔ، نانکؔ، خوب محمد چشتی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی، عبدالقدوس گنگوہی، بہاء الدین برناوی اور گولکنڈہ کے اشرف اور فیروز وغیرہ کے کارناموں میں بھی اردو کے ابتدائی آثار دستیاب ہوتے ہیں۔ گو ان کے کارنامے منظوم ہیں تاہم ان کی تخلیقات سے زبان کے ارتقاء کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس زمانے میں جن بزرگوں نے اردو کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ان میں

ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اِس عہد میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہو چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہو گئیں تھیں اور طوائف الملوکی کا دور بھی۔ مسلمان حکمرانوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے ایک طاقت ور مستحکم مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

ہندوستانیوں کو جنگ و پیکار سے فرصت ملی تو مذہب اور ثقافت کی طرف توجہ ہوئی۔ یوں بھی ہندوستانی عوام پر ابتدا سے مذہب کا تسلط رہا۔ لیکن فرصت کے دور میں اِس رجحان نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔ اِس لیے۔ اِس زمانے کے عوامی ادب پر بھی مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ہندی میں یہ دور "بھگتی کال" کے نام سے موسوم ہے۔ جس سے ہندو بھی متعلق ہیں اور مسلمان بھی۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے شاہ برہان الدین کے کارنامے محققین کیلئے کافی مواد پیش کرتے ہیں[۱۸]۔

قدیم نثر نگاروں میں شاہ برہان ہی وہ خوش قسمت ہستی ہیں جنکی تصانیف زمانے کے دستبرد اور تصرف سے بچ رہیں۔ انہوں نے نثری تصانیف کے علاوہ تقریباً آٹھ ہزار اشعار کا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے جس کے مطالعہ سے اُس عہد کے لسانی، سماجی اور تہذیبی حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔

شاہ برہان کی شاعری شاہ میراں جی کی شاعری کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے۔ شاہ برہان نے جس وقت لکھنا شروع کیا بیجاپور میں ہر طرف علم و ادب کا چرچا تھا۔ شاہ برہان علی عادل شاہ اوّل کے عہدِ حکومت میں ارشاد و ہدایات کا مرکز تھے۔

اُن کی منظوم تصانیف کی تعداد کے متعلق محققین کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم ان کی تعداد دس کے لگ بھگ ہے۔ شاہ صاحب کی

نثری تصانیف حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) کلمۃ الحقائق (۲) مقصود ابتدائی (۳) ذکر جلی (۴) کلمت الاسرار
(۵) معرفت القلوب (۶) ہشت مسائل اور (۷) رسالۂ تصوف۔

اُن کی نثری تصانیف کا موضوع تصوف اور مذہبی مسائل ہیں۔ اُن کے نثری رسالے مختصر ہوتے ہیں لیکن اُن کا اسلوب اگلے مصنفین کے مقابلے میں زیادہ صاف اور سلیس ہے۔ اس میں بہت سی ادبی خوبیاں بھی ملتی ہیں جن کی طرف اکثر محققین نے اشارہ کیا ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ

مذہبی تصانیف و تالیف کا وہ دَور جس کی ابتدا خواجہ بندہ نواز سے ہوئی تھی دو سو سال تک یعنی شاہ امین الدین اعلیٰ کی وفات تک جاری رہا۔ شاہ امین الدین اور اُن کے معاصرین نے نثری طرف کافی توجہ دی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں کہ اس زمانے میں نہ صرف مذہب کے موضوع پر طبع زاد کتابیں لکھی گئیں بلکہ عربی فارسی کی مستند کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں کئے گئے۔ جن میں شرح تمہیدات، شرح عوارف المعارف، احکام الصلوٰۃ اور مفتاح الخیرات وغیرہ قابلِ ذکر ہیں بقول ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ یہ باتیں اس کا ثبوت ہے اور اس حقیقت کا آئینہ ہیں اس عہد تک آکر اردو میں اتنی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ اس میں فقہ، تفسیر، حدیث اور قرآن کے دقیق مسائل کی افہام اور تفہیم خوش اسلوبی سے کی جا سکتی تھی۔ اس سلسلے میں شاہ امین الدین اور اُن کے خلفاء و تلامذہ کے نام یادگار رہیں گے۔[19]

شاہ امین بیجاپور کے آخری چار تاجداروں ابراہیم ثانی، محمد علی ثانی اور

سکندر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے دادا اور والد کی طرح اُردو نظم و نثر میں گراں پایہ کارنامے چھوڑے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے شاہ صاحب کی متعدد تصانیف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاہ صاحب کی منظوم تصانیف کی تعداد تقریباً دس ہے۔ اور اُن کی نثری تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

(۱) گنج مخفی (۲) گفتار شاہ امین (۳) نور نامہ (۴) رسالۂ ارشادات
(۵) نکات معرفت (۶) رسالۂ نظم و نثر (۷) عشق نامہ (۸) شرح کلمہ طیبہ
(۹) ذکر نامہ (۱۰) ارشاد نامہ (نثر) (۱۱) رسالۂ وجودیہ۔[20]

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ شاہ امین کی تصانیف کی زبان اُن کے دادا اور والد سے کسی قدر صاف ہے۔[21] ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اُن کے اسلوب بیان میں روانی اور نزاکت پائی جاتی ہے۔[22] شاہ امین کی تحریروں میں اُن کے دادا اور والد کے برخلاف عربی و فارسی اثرات زیادہ ہیں جبکہ شاہ برہان پر ہندی کا اثر زیادہ ہے۔ وہ فارسی اضافتوں اور ترکیبوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اُن کے رسالوں کے مخاطب زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ اسی سبب ان میں عوامی مسائل کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ صرف تصوف اور حقیقت کے مسائل ہی بیان کئے گئے ہیں۔ شریعت کے مسائل پر بھی وہ زیادہ توجہ نہیں کرتے۔

شاہ برہان و شاہ امین کے خلفاء و تلامذہ

اُردو نثر جس کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی (مطابق آٹھویں صدی ہجری) کے اواخر میں ہوئی۔ اس کو چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی (مطابق نویں اور دسویں صدی ہجری) میں ارتقاء حاصل ہوا۔ اور گیارھویں صدی ہجری (مطابق سولہویں صدی عیسوی) کا

کے اختتام تک اس میں تصنیف و تالیف کے انبار لگ گئے۔ شاہ میراں جی شاہ برہان اور شاہ امین الدین اعلیٰ جیسے بزرگوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کرکے جو شمع روشن کی تھی اُس کو اُن کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں اور تلامذہ نے برقرار رکھا۔ اُس کی روشنی میں تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا اور اردو نثر کو اس قدر ترقی دی کہ اس کو قدیم اردو نثر کا سنہرا زمانہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اس عہد میں اردو نثر کی وسعت اور ترقی کا اندازہ ادبا اور نثر نگاروں کے اس گروہ سے ہو سکتا ہے جو اس زمانہ میں منظر عام پر آیا اور ایسے گراں پایہ نثری کارنامے یادگار چھوڑے جو کلاسکس کی تعریف میں آسکتے ہیں۔ ان میں گولکنڈہ کے وجہی، بیجاپور میں شاہ میراں جی شاہ برہان، شاہ امین اور ان کے متبعین شاہ میراں جی خدانما، مولانا عبداللہ وغیرہ نے مذہبی، تصوفانہ اور فلسفیانہ تحریروں سے قدیم اردو نثر کو چار چاند لگا دیے۔ ان کے خلفا و تلامذہ نے انہی بزرگوں کی پیروی میں ان کے مشن کو جاری رکھا۔ لکھنے والوں میں حسب ذیل حضرات مشہور ہیں۔ طوالت کی بنا پر ہم یہاں صرف ان کے ناموں کا ذکر کرکے اس موضوع کو ختم کرتے ہیں۔

میراں حسینی، میراں یعقوب، برہان الدین رازابی، مخدوم شاہ حسینی، حبیب اللہ قادری، ولی اللہ قادری، سید شاہ میر اعظم وغیرہ۔

ان بزرگوں پر یہ عہد ختم ہو جاتا ہے۔ اس عہد کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ مذہبی دور ہے۔ اس عہد میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے والے چونکہ اپنے عہد کے مشہور صوفیا و اولیاء کرام تھے جنہوں نے اپنے مریدوں اور اپنے اردگرد کے عوام کی فہمائش کے پیش نظر مذہبی تحریروں میں عوامی زبان استعمال کی

اُس وقت درباری اور نظم و نسق کی زبان فارسی تھی۔ لیکن عوام کی زبان اردو تھی جس کو ہندوستانی، ہندی، دکنی اور گجراتی کے نام سے ملک کے مختلف حصّوں میں موسوم کیا جاتا تھا اور یہ زبان ملک کے تقریباً تمام حصّوں میں رائج تھی۔ اس لئے اس عہد میں گجرات، پنجاب، دکن اور بنگال میں اردو میں مذہبی کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف ہوئے۔ اس دور کی تقریباً تمام تصانیف فارسی رسم الخط میں ہیں لیکن کبھی کبھی اردو کے علاوہ اودھی، برج بھاشا بھی فارسی رسم الخط یا کھڑی بولی میں لکھی ہوئی تصانیف بھی ملتی ہیں۔ اس خصوص میں ملک محمد جائسی کی تصنیف "پدماوت" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جائسی نے اودھی اور دیہاتی بولی کو فارسی رسم الخط میں لکھا۔ اسی طرح اردو یا کھڑی بولی کے ادیبوں اور شاعروں نے اس کے لئے دیوناگری رسم الخط بھی استعمال کیا۔ اس کی مثالیں کبیر اور نانک کی تصانیف میں ملیں گی۔ رسم الخط کے بارے میں اس آزادی کے باوجود اس دور کے ادب کی سب سے بڑی امتیازی صفت یہی ہے کہ چاہے وہ گجرات کے دوہے ہوں یا میراں جی اور بجلی وغیرہ کے کچھ منظر رسالے ان سب پر مذہب کی چھاپ ہے[۲۳]۔

مذہب کے علاوہ ان بزرگوں کی تصانیف میں علوم عقلی و نقلی کے مباحث بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف نماز، روزہ جیسے مضامین سے متعلق بحثیں ملتی ہیں تو دوسری طرف سماجی، معاشی، مابعد الطبیعاتی مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاں تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے دقیق مسائل بیان کئے ہیں وہاں اَن پڑھ عورتوں کی فہمائش کے لئے چکی نامہ وغیرہ کی شکل میں مذہبی احکامات بیان کئے گئے ہیں۔

بعض مصنفین نے مذہب کے خشک اور ٹھوس مسئلوں کو ادبی رنگینیاں

عطار کے عبارت کو شگفتہ اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شاہ میراں جی کی نظم "خوش نامہ" اور شاہ برہان کی نظم "وجودیہ" اس حقیقت کی شاہد ہیں۔

اس دور کے ادیبوں کا ایک امتیازی وصف جس پر آج بڑا زور دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی ماحول، فضا، اثرات اور جذبات کی صحیح عکاسی کی ہے چنانچہ اکثر تشبیہ، استعارے ہندوستانی سماجی زندگی سے لئے گئے ہیں جن میں مقامی رنگ پایا جاتا ہے۔

ان بزرگوں نے اپنی تحریروں میں فنی اور جمالیاتی قدروں سے زیادہ اخلاقی قدروں کی تلقین کو پیش نظر رکھا جو بہت بڑا کام ہے۔ مختصر یہ کہ قدیم مذہبی ادب اپنے دامن میں بہت سے جواہر لئے ہوئے ہے جن پر ہنوز اہل تحقیق کی نظر نہیں پڑ سکی ہے۔

قدیم اردو میں کلام مجید کے ترجمے

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے سب سے پہلے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا جس کے طبع ہوتے ہی ایک عظیم تہلکہ کٹ ملاؤں کے گروہ میں پیدا ہو گیا۔ وہ شاہ صاحب کے جانی دشمن ہو گئے اور ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ یہ تو شائع کرنے کا ذکر ہوا۔ زبانی ترجمہ پڑھانے کو بھی ہمارے علما پسند نہیں کرتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں جب بعض بزرگوں کو قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے متعین کیا گیا تو اسی قسم کا ہنگامہ ہو گیا۔

اردو میں عام طور پر قرآن شریف کا پہلا ترجمہ شاہ صاحب کے فرزندان شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کا سمجھا جاتا ہے۔ یہ دونوں ترجمے تیرھویں صدی عیسوی (مطابق اٹھویں صدی ہجری) کے اواخر میں ہوئے۔ لیکن بہت کم

لوگوں کو اس کی خبر ہے کہ اس زمانہ میں اور نیز اس سے بہت پہلے ہندوستان کے مختلف مقامات میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں کی گئیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: بہت ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی ترجمے ہوئے ہوں گے جن کا آج ہمیں علم نہیں۔ ان میں زیادہ تر تفسیریں ہیں جو برائے نام تفسیریں ہیں حقیقت میں یہ قرآن کے لفظی ترجمے ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ یا ایک آدھ سطر صراحت کے لیے بڑھا دی گئی ہے۔ ایک مشکل یہ آ پڑی ہے کہ بعض میں مؤلف کا نام اور سن تالیف موجود نہیں، یا بعض اول و آخر ناقص ہیں۔ اس لیے یہ معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ ان کے لکھنے والے کون تھے اور یہ تفسیریں کب لکھی گئیں۔ البتہ زبان سے تالیف کا تقریباً بہت قیاس ہو سکتا ہے۔

اس قسم کی سب سے قدیم تالیف جو دستیاب ہوئی ہے وہ پرانی گجراتی اردو زبان میں ہے۔ افسوس کہ وہ شروع سے لے کر آخر تک ناقص ہے۔ اس سے مصنف اور سن تصنیف کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔ اس کتاب کی قدامت اس کی زبان سے ثابت ہوتی ہے۔ بہت سے الفاظ اور محاورے ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو بعد کی زبانوں کی کتابوں میں نہیں پائے جاتے اور اسلوب بیان بھی قدیم ہے۔

تفسیر حسینی کا ترجمہ بھی کسی صاحب نے پرانی دکنی میں کیا ہے۔ یہ تفسیر شاید بہت مقبول ہوئی کیونکہ اس کے متعدد ترجمے دکنی زبان میں ہوئے۔

سید بابا قادری نے ۱۱۴۰ھ میں "تفسیر منزل" کے نام سے قرآن پاک کی تفسیر لکھی۔ کتاب کے اختتام پر خود انہوں نے اس کی تعریف کر دی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی زبان صاف ہے اور بارھویں صدی کے وسط کی زبان کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ زبان سے بظاہر قیاس کرنا مشکل ہے کہ مصنف

کس مقام کا ہے۔ چونکہ ایک آدھ لفظ کہیں کہیں دکنی کا آ گیا ہے۔ اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ دکن کا باشندہ ہے۔

صرف پارۂ عم کی بھی تفاسیر ملتی ہیں۔ اس قسم کی ایک تصنیف کا نام "خدا کی نعمت" معروف "مرادیہ" ہے۔ اس کے مصنف شاہ مراد اللہ سنبھلی اور سن تصنیف ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء ہے۔ چنانچہ تفسیر کے خاتمہ پر مصنف نے خود ان تمام باتوں کی وضاحت کی ہے۔

"حمد اور شکر کا سجدہ لائق ہے سزاوار ہے پاک پروردگار کے تئیں جس خداوند نے اپنے فضل و کرم سے اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے عم سپارے کی تفسیر ہندی زبان میں تمام کروا دی اور اس عاصی گنہگار مراد اللہ انصاری سنبھلی قادری نقش بندی حنفی کو یہ خدمت فرما کر توفیق بخش کر یہ تفسیر کا کام پورا کر دیا اور پھر اس تفسیر کا نام "خدا کی نعمت" مقرر کروایا۔ یہ تفسیر محرم کے مہینے کی ۱۴ تاریخ جمعہ کے دن گیارہ سو چوراسی برس ہجری تمام ہو کر پچاسی شروع ہوا تھا (۱۱۸۵ھ) جو تمام ہوا۔"

یہ تفسیر بڑی تقطیع کی ۳۰۲ صفحوں پر مشتمل ہے اور شہر ربیع الاول ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں نستعلیق ٹائپ میں طبع ہوئی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ یہ کتاب شاید اس سے پہلے بھی چھپی تھی۔

تفسیر کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ متروک الفاظ خال خال ہیں اور وہ بھی بہت معمولی۔ جملوں کی ساخت البتہ کسی قدر پرانی ہے۔ اس سے پہلے جن کتابوں کا ذکر آیا وہ برائے نام تفسیریں ہیں، درحقیقت ترجمے ہیں۔

قدیم نثر میں قصے کہانیاں اور ترجمے

سترھویں صدی کے اوائل تک اردو نثر بڑی حد تک مذہبی اور متصوفانہ مسائل تک محدود تھی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کے استحکام کے بعد جب سیاسی اور تہذیبی شکست و ریخت سے مہلت ملی تو ذہنی عیش کوشی کے جذبات پرورش پانے لگے اور ادب جذباتِ انسانی کا مفسر اور اظہار کی لطافتوں کا مظہر بھی بننے لگا۔ یہیں سے قصے کہانیوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ مذہب کے خشک موضوعات سے ہٹ کر قصے کہانیوں کی دلچسپی نے شعرا اور مصنفین کے دامنِ دل کو کھینچا اور اظہار کے سانچوں میں نئی پہلو جاگزیں ہونے لگے۔ شعرا و قصہ گو حضرات منظوم داستانیں تیار کرنے کا آغاز اس صدی کی ابتدا سے ہو چکا تھا۔ گیارہویں صدی کے ربع اول کے بعد سے نثر میں بھی داستانیں لکھی جانے لگیں۔

نثری قصوں میں وجہی سے پہلے لکھے ہوئے نثری قصے اب نایاب ہیں۔ لیکن وجہی کا نشو و نما پایا ہوا آرٹ اور اس کی زبان شہادت دیتی ہے کہ یہ نقشِ اول نہیں ہو سکتا۔ وجہی کے قصے کتابِ دل کی تفسیریں ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں۔[25]

تصانیف

وجہی کی صرف دو تصانیف کا حال معلوم ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک "قطب مشتری" منظوم داستان ہے اور "سب رس" نثری شاہکار۔ لیکن گارساں دتاسی نے وجہی کی ایک تیسری تصنیف "تعدا و سیادہری ازرخ" کا ذکر بھی

اپنے خطبات میں کیا ہے۔

پروفیسر سید ضامن علی نے "جائزہ زبان اردو" میں لکھا ہے کہ اسکا ایک نسخہ محمد حفیظ صاحب مرحوم الہ آبادی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

تاج الحقائق

مذکورہ بالا تین تصانیف کے علاوہ مولوی عبدالحق نے "تاج الحقائق" کو وجہی کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔ حال میں نورالسعید اختر صاحب نے تاج الحقائق پر اپنا تحقیقاتی مقالہ بھی پیش کیا ہے۔

وجہی کے بعد دوسرے قصہ نویسوں اور ان کی تصانیف کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جائے کہ عہد قدیم سے ہی داستان گوئی اور تمثیل کی اکثر پیمائیوں میں مشرق مغرب سے بہت آگے رہا ہے۔ بقول عبدالقادر سروری مرحوم "مغرب نے مشرق سے قصہ نویسی کا فن سیکھا جس کے معترف اکثر مغربی مصنفین و مؤلفین ہیں عربی فارسی اور سنسکرت زبان میں ایسے عظیم الشان قصے لکھے گئے۔ اور ان کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ آج ان کا شمار عالمی کلاسکی ادب میں ہوتا ہے اور دنیا کی مشہور زبانوں میں کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اس کے ترجمے نہ ہوئے ہوں۔ عربی اور فارسی سے زیادہ سنسکرت ادب اپنے قصوں کی نوعیت اور ٹکنیک کی وجہ سے دنیا کی اکثر زبانوں میں قصہ گوئی کے لئے محرک ثابت ہوا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی اور فارسی کے مصنفین نے ان قصوں کو اس خوش اسلوبی سے اپنایا کہ ان کی اصل عربی فارسی ہی سمجھی جانے لگی۔ ان کی نمایاں مثال انوار سہیلی اور طوطی نامہ وغیرہ کی حکایات ہیں۔"

قدیم کہانیوں اور قصوں میں ذیل کے قصے جو دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں بہت مشہور ہیں اور کم و بیش کلاسکی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

انوار سہیلی (پنج تنتر)، طوطی نامہ (شک سپتتی) سنگھاسن بتیسی، الف لیلیٰ۔ گلستان، عشقیہ افسانے، جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور یوسف زلیخا۔ ان سب میں زیادہ مقبولیت "انوار سہیلی" کو حاصل ہوئی۔ جس کی تلخیص اور ترجمے مختلف ناموں سے شائع ہوئے۔

اکبر کے نورتن ابوالفضل نے "انوار سہیلی" کا خلاصہ "عیار دانش" کے نام سے کیا تھا۔ اردو میں اس کے ترجمے مختلف ناموں سے ملتے ہیں۔ اس کا دکنی ترجمہ جو فارسی کے مشہور ادیب ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی پر مبنی ہے ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء مدراس سے شائع ہوا۔ اس ترجمہ کی زبان قدیم اور املا نوس ہے۔ ترجمہ میں روانی اور شگفتگی نہیں۔

بستان حکمت معروف انوار سہیلی ضیائی حکمت

عمر علی خاں خاں وحشت یا وحشی کی تصنیف ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء کی ہے۔ اس عرصہ تک زبان کافی منجھ چکی تھی۔ اس کا اسلوب گذشتہ دونوں ترجموں (مذکورہ بالا) کے مقابلہ میں کافی ترقی یافتہ ہے۔

بہار دانش کے ترجمے

شیخ عنایت اللہ دہلوی نے ۱۸۱۴ء میں "بہار دانش" کے نام سے ایک

قصہ لکھا تھا جس میں جہاندار شاہ اور مہرو ولفروز کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔

نگارِ دانش اور مفرح القلوب

اس کا ماخذ سنسکرت زبان کا قصہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں میر بہادر علی حسینی نے "اخلاق ہندی" کے نام سے اسکا ترجمہ اُردو نثر میں کیا۔ چنانچہ اسکا مجموعہ انڈیا کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

چہارِ چمن

ڈاکٹر گیان چند کے مضمون "اُردو کی چند فراموش شدہ داستانیں" سے ایک اور قصہ "چہار چمن" کا سُراغ ملتا ہے جو نواب سعادت علی خاں کے عہد میں [illegible] میں لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر گیان چند جین صاحب نے جو تفصیلات دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورق پر اس کا نام "چہار چمن" درج ہے لیکن دیباچہ میں اس کا نام "دلفریب" بھی لکھا گیا ہے۔ اسکا مصنف عاجز یا فاخر نامی کوئی شخص تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی تراجم ہیں لیکن متذکرہ تراجم کے مقابلے میں کم اہمیت کے حامل ہیں۔

تیسرا باب

دہلی میں اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء

(میر جعفر زٹلی تا میر امن)

١- دہلی میں اُردو کے نثر پاروں اور مربوط نثر کا آغاز
٢- دہلی کی بہ نسبت دکن میں اُردو زبان و ادب کی ترقی کے اسباب۔
٣- دہلی میں اُردو کی آمد اور اسکے اثرات۔
٤- اُردو زبان سے متعلق دہلی کے بزرگ شعراء آرزو، حاتم، مظہر اور سودا کی اصلاحی خدمات پر مختصر تبصرہ۔

۵۔ میر جعفر زٹلی تا میر امن تک دہلوی نثر نگاروں کی ادبی خدمات کا جائزہ :۔

۱۔ میر جعفر زٹلی
۲۔ عیسوی خاں بہادر
۳۔ مولانا فضل علی فضلی
۴۔ مرزا رفیع سودا
۵۔ حکیم شریف خاں۔
۶۔ شاہ رفیع الدینؒ
۷۔ شاہ عبد القادرؒ
۸۔ مرزا جان طپش
۹۔ انشاء اللہ خاں انشا
۱۰۔ محمد حسن قتیل
۱۱۔ سعادت یار خاں رنگین
۱۲۔ مولوی اسمٰعیل دہلوی
۱۳۔ دہلی کالج کے اساتذہ اور طلباء کی علمی و ادبی خدمات
۱۴۔ میر امن دہلوی۔

دہلی میں اردو نثر کا آغاز و ارتقاء

گذشتہ باب میں قدیم نثر کے سرسری جائزے کے سلسلے میں ہم اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ تیرہویں صدی عیسوی (مطابق ساتویں صدی ہجری) کے شروع ہی سے اردو نثر پاروں کا عہد شروع ہوتا ہے۔ گو یہ ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں دہلی میں بھی اردو نثر پاروں کا عہد اسی زمانے سے شروع ہوا۔ مشاہیر صوفیائے کرام حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی اور امیر خسروؒ ایک عرصۂ دراز تک شہر دہلی میں قیام فرما رہے۔ ان بزرگوں نے اپنی فارسی تصانیف میں ہندی عوام و خواتین سے تخاطب کے موقعوں پر کچھ اردو کے جملے بھی استعمال کئے ہیں۔ علاوہ اس کے اردو زبان کی نشو و نما کے سلسلہ میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے سمراٹ پرتھوی راج اور اس کی بہن کے خطوط کا تذکرہ کیا ہے۔ ان خطوط کا شمار بھی اردو کے نثر پاروں میں ہو سکتا ہے کیونکہ یہ خطوط دہلی کی اس ترقی پذیر زبان میں لکھے گئے ہیں جس کی بنیاد پر مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد اردو زبان کی نشو و نما ہوئی۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم بلا جھجک یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دہلی میں اردو کے نثر پاروں کا آغاز سنہ ۱۳ء سے پہلے ہی ہوا جب مندرجۂ ذیل شعر یا اس جیسے کسی اشعار کو اردو زبان کے ارتقائی نمونوں کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے تو مذکورہ خطوط کو اردو کے ابتدائی نثر پاروں میں شمار کرنے میں کیا حرج ہے۔

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ تلے پڑی
غصہ کیا وہ گالی دیا دگر لڑی

مربوط نثر کے سلسلے میں دہلی کے قدیم ترین نثر نگاروں میں حضرت عین الدین گنج العلم اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا شمار ہوتا ہے۔ سید شمس اللہ قادری نے اپنی تصنیف "اردوئے قدیم" میں حضرت عین الدین گنج العلم کے متعلق لکھا ہے: "آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکنی زبان میں تصنیف کئے تھے۔ من جملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعہ میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانہ میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی مجموعی تعداد ۸۰ تھی اور اس میں ارکانِ دین کے متعلق مختلف احکام و مسائل تحریر تھے۔" چونکہ یہ رسالے اب ناپید ہیں اس لیے ان کی زبان کے متعلق کچھ حکم لگانے سے ہم قاصر ہیں۔

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے نثری رسالے مشہور و معروف ہیں۔ ان کے متعلق ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دہلی میں مربوط نثر کا آغاز حضرت کے نثری رسالوں سے ہی ہوا کیونکہ پندرہ سال کی عمر سے لیکر اسّی سال کی عمر تک کا زمانہ انہوں نے دہلی میں گزارا تھا۔ ان کے خاندان کا تعلق بھی دہلی سے تھا۔ اس لیے حضرت گیسو درازؒ کی زبان کے متعلق یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ وہ چودھویں صدی عیسوی (مطابق آٹھویں صدی ہجری) کی زبانِ دہلوی کا نمونہ ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کے نثری رسالوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان رسالوں کو انہوں نے دکن میں اپنے دورانِ قیام کے زمانہ میں مرتب کیا تھا۔ لیکن چونکہ خواجہ صاحب کی تربیت اور نشو و نما دہلی میں ہوئی تھی ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں صرف ہوا تھا اور انہوں نے اپنے مرشد نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی ہدایت پر درس و تدریس کے مشغلہ کو اپنایا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ظاہر ہے کہ اپنے اطراف کے عوام کی زبان کو ملحوظ رکھا ہوگا۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ ان کی زبان پر دہلی کا روزمرہ اور محاورہ غالب ہوگا اور یہی زبان میں انہوں نے اپنے نثری رسالوں کو قلمبند کیا ہوگا۔ اس لیے بلاخوف تردید ان کے نثری رسالوں کو

زبانِ دہلوی (اردو) کی ابتدائی نثر کا نمونہ کہہ سکتے ہیں علاوہ اس کے عقلِ سلیم کا بھی یہی تقاضہ ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے کے محققین اور ناقدین "باغ و بہار" کے مؤلف میر امن کو دہلی کا باشندہ گردانتے ہیں۔ ان کو میر امن دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کی کتاب باغ و بہار کو دلی کی زبان اور دلی کی تہذیب و تمدن کے سلسلہ میں پیش کرتے ہیں جبکہ یہ کتاب دہلی سے بہت دور کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے زیرِ نگرانی تصنیف ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں خواجہؒ کے نثری رسالوں کو دہلی کی ابتدائی نثری تصانیف اور خواجہ صاحبؒ کو دہلی کے ابتدائی نثر نگار کی حیثیت سے پیش کیا جانا حقیقت پسندی پر مبنی ہوگا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز کی نثری تصانیف کے بعد دہلی کے اردو نثر کی تاریخ پردۂ خفا میں ہے اور یہ بڑا تعجب خیز امر ہے کہ دہلی کی بہ نسبت دہلی سے دور دراز واقع علاقے میں اردو نثر کو اس قدر ترقی ہوئی جو بیان سے باہر ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنی تصنیف "ہندوستانی لسانیات" میں شمالی ہندوستان کی بہ نسبت جنوبی ہندوستان میں اردو زبان و ادب کو سرعت سے ترقی کرنے کا جو موقع ملا اس کے اسباب پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

جو رنگ سلطان علاؤ الدین خلجی اور اس کے مشہور سپہ سالار ملک کافور کے ہمراہ ۱۳۱۰ء میں اور خاص کر محمد تغلق کے ساتھ ۱۳۲۷ء میں دکن پہنچے ان کی زبان بالکل ابتدائی، غیر منقح اور اثر پذیر حالات میں تھی چنانچہ یہی غیر متعین اردو دکن کے مسلمانوں میں اشاعت پانے لگی جو یا تو یہیں کے باشندے تھے یا ایرانی یا عربی مہاجرین کی اولاد سے تھے مگر جب بہمنی سلطنت کے قیام ۱۳۴۷ء کے بعد دکن اور شمال سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

تو ان دونوں مقامات کی زبان کے اتحاد کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ اس میں ان علاقوں کے غیر مسلم باشندوں کی زبانوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ شمال یا دوآبہ گنگ وجمن میں جو ہندو مسلم اتصال کے حساب سے بڑا مرکز ہے اہل ہندوستان کی صرف ایک ہی بولی تھی۔ مگر دکن میں مختلف زبانیں مستعمل تھیں جن میں کوئی آریائی تو کوئی دراوڑی۔ پس اُردو جہاں شمال میں ایک خاص زبان سے مالامال ہو رہی تھی دکن میں اپنی ہمسایہ زبانوں سے کسی طرح سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ شمال کی زبان ماخذ کے لحاظ سے اردو کے قریب تر تھی۔ اس کے برخلاف دکن کی زبانیں ایک تو متعدد تھیں اور دوسرے لسانی حیثیت سے آپس میں مختلف اور اردو سے بہت دور تھیں۔

فارسی اور ترکی بولنے والے ممالک سے دکن بہت دور تھا اس کے علاوہ ان سے کوئی سیاسی تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف شمال پر ہمیشہ ان اجنبیوں کے حملے ہوتے رہے۔

دہلی میں قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء) سے بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) تک جتنے شاہی خاندان گذرے۔ قریب قریب ہر حکمراں خاندان غیر ملکی تھا۔ ان کی زبان رعایا کی زبان سے مختلف تھی۔ دکنی سلطنتوں کے بانی وہی تھے جو دکن یا ہندوستان میں ایک مدت سے مقیم تھے اور جنکو ہندوستانی زبان و طرز معاشرت سے رغبت تھی۔ دہلی کے کسی بادشاہ نے ہندوستانی میں نثر نہ لکھی۔ اس کے خلاف دکن میں کئی بادشاہ مثلاً قطب شاہیوں میں محمد قلی، محمد عبداللہ اور ابوالحسن اور عادل شاہیوں میں ابراہیم ثانی، علی ثانی اور سکندر ایسے گذرے ہیں جن میں سے اکثر کی ہندوستانی

نظم و نثر اس وقت بھی موجود ہے۔

بادشاہوں کے علاوہ شمالی سلطنت کے امراء اور علماء و فضلاء نے بھی ہندوستانی زبان کے ارتقاء میں بہت کم حصہ لیا۔ ان پر ہمیشہ فارسی کا اثر غالب رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کبھی ترکستان، ایران یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا یا تباہی آتی تو وہاں کے باشندے پناہ لینے کے لیے یا تلاش معاش کی خاطر ہندوستان ہی کا رخ کرتے چونکہ دہلی کے امیروں اور قدردانوں کے دسترخوانوں کی وسعت میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اس لیے سب کے سب وہیں جم جاتے اور اہل زبان کے زبان و محاورہ کا اثر اور گہرا ہوتا جاتا۔ اس طرح دہلی کے درباروں نے ہندوستانی کے ارتقاء پر کوئی صحت مند اثر مرتب نہیں کیا۔

شمال مغرب کی جانب سے اکثر حملے بھی ہوا کرتے تھے۔ جن کا سلسلہ احمد شاہ درانی کے پانچویں حملہ ۱۷۶۱ء تک برابر جاری رہا۔ یہ تمام حملہ آور غیر ملکی زبانیں برتتے تھے۔

ان کی سیاسی مداخلتوں کے سوا علمی و ادبی فضا میں بھی ہر وقت ایرانی اثر غالب رہتا تھا۔ شاہی درباروں سے محمد شاہ کے زمانہ تک بالعموم ٹھیٹ ایرانی شاعر اور عالم گراں بہا صلے حاصل کرتے تھے پر دیسی شعراء کی قدر و منزلت میر و سودا کے زمانے تک جاری تھی۔ فارسی گو امیروں اور عالموں کی آئے دن کی درآمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں فارسی دانی دربار و مجلسوں میں عام اور لازمی ہو گئی۔ اگر کبھی مہلت پا کر فارسیت کا پیدا کیا ہوا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر فارسی زبان بولنے والوں کا ایک ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سر نو ہرا ہو جاتا۔

اِس طرح سے شمال کی ہندوستانی میں ایک مستقل علمی اور ادبی زبان کی
حیثیت سے کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ البتہ فارسی اور ترکی الفاظ اس میں داخل ہوتے رہے۔
بازاروں اور عام مقامات پر اس کا سکہ چلتا تھا۔ جس کی وجہ سے روزمرہ کی
زبان کا ارتقا ہوتا گیا۔ دکن میں ہندوستانی باوجود کئی صدیوں کی علمی سرپرستی
کے دکنی ہندوؤں کی مقامی بولیوں سے مختلف تھی۔ وہ اپنی دیسی بولیوں کو اس
میں یا اس کو اپنی بولیوں میں ضم نہ کر سکے جیسا کہ شمال کے ہندوؤں نے کیا۔

مغلیہ سلطنت کے آخری زمانے میں شمال میں ہندوؤں اور مسلمانوں
کی زبانیں ریختی کھڑی اور اُردو مرورِ ایام کے ساتھ گھل مل کر ایک ہو گئی تھیں۔
لیکن جہاں دوآبہ کے ہندوؤں نے ایک طرف مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان کو بالکل
اپنا لیا دوسری طرف اپنی ادبی زبان برج بھاشا کو ترک کر کے فارسی میں تصنیف
و تالیف شروع کر دی۔ علاوہ اِن وجوہات کے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شاہجہاں کے
عہد تک پایۂ تخت برج کے علاقہ میں واقع ہونے کی وجہ زبان دہلوی کی ترقی
مذکورہ مدت تک رُک جاتی ہے۔ جب اس نے آگرہ چھوڑ کر نئی دہلی کو ۱۶۴۸ء میں
آباد کیا تو زبانِ دہلوی کا ستارہ پھر چمک اٹھا اور اس نے عہد عالمگیری میں
ایک طرف تو برج بھاشا کو زبان کے ادبی اکھاڑے سے نکال کر باہر کیا تو دوسری طرف
بدیسی فارسی کو پچھاڑ لیا۔ اس سلسلہ میں اُردو کے ارتقا کو سب سے زیادہ مہمیز
عالمگیر کی فتح دکن سے ملی۔ دکن کے شعرا وقتاً فوقتاً دہلی کو جاتے رہے۔
ان میں شمس ولی اللہ ولی سرِ فہرست ہیں۔ دہلی میں کچھ دن اُن کا قیام رہا۔
وُن کا رنگ چمکا۔ ہر طرف قدر دانی ہوئی۔ لیکن اُن کی زبان میں اور دہلی
والوں کی زبان میں قدرتی طور پر کچھ فرق موجود تھا۔ اسی لئے ولی شیخ سعداللہ گلشن کے

اشارہ پر ریختہ کو چھوڑ کر اُردو میں شعر گوئی شروع کرتے ہیں۔ جو شاہراہ انہوں نے
دکھلائی تھی اُس کے پیرو دہلی میں بہت پیدا ہو گئے۔ آبرو، حاتم، ناجی، مضمون،
مرزا مظہر جانِ جاناں جو ولی کے ہم عصر تھے۔ اور فارسی میں خوب کہتے تھے انہوں نے
ولی کی پیروی شروع کی۔ یہی دہلی کی وہ چند رنگ ہستیاں ہیں جن کی آغوشِ
تربیت میں نونہال اُردو نے پرورش پائی۔ اِس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ
پختگی حاصل کی شاعری کیلئے کوئی خاص طرز اب تک مقرر نہیں ہوئی تھی اب غرض شاعری کیلئے خاص ستھری زبان
پیدا ہو گئی تھی۔ بہت سے سخت اور بھدے دکنی الفاظ محاورات جو دیوانِ ولی
کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کو چھانٹنا اور نکالنا پڑا۔ اِسی
وجہ سے اِن حضرات کی خدمات تصفیہ زبان کے متعلق لائقِ تحسین ہیں انہوں نے
یہ مشکل کام بہت حسن و خوبی اور بڑی محنت اور جانفشانی سے انجام دیا۔
اِسی لئے اُن کی قابلیت اور خوش مذاقی کی داد دینا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ
بھاشا الفاظ کی خوبصورتی اُن کی نظر میں نہ جچی ورنہ اپنے ملک کے دیسی
الفاظ کے بدلے غیر ملکی الفاظ کم لئے جاتے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان
لوگوں نے اِس کانٹ چھانٹ اور متروکات کے خارج کرنے میں بڑی تالیف
اور دقتِ نظر سے کام لیا۔ اور بھدے ناتراشیدہ محاورات اور تراکیب کی
جگہ خوش نما محاورے اور دلکش ترکیبیں داخل کیں جو عموماً فارسی سے
لی گئیں۔ کیونکہ اسی کے وہ مشاق تھے۔ زبان میں چونکہ روح اور قوتِ جذب
پہلے ہی سے موجود تھی اس لئے یہ سب جدید تصرفات اس نے آسانی سے قبول کر لیے۔
اور یہ سلسلہ میر و سودا کے زمانے سے لیکر شیخ ناسخ کے عہد تک جاری رہا۔ مورخین
اِن کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے

الفاظ خارج کر دیئے گئے مگر اس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں،
خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیئے گئے۔ عربی فارسی کے مترادف
قبول کئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ۔ عربی و فارسی الفاظ میں صحت کا خیال
ہونے لگا قدیم محاورات و الفاظ جو ولی کے زمانے میں مستعمل تھے اُن میں تغیرات
پیدا ہونا شروع ہوئے اور جدید محاورات بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس ضمن
میں خان آرزو، حاتم، مرزا جان جاناں مظہر اور سودا کی خدمات خاص طور پر
قابلِ ذکر ہیں۔

سراج الدین علی خاں آرزو ۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء

دہلی کے شاعروں میں زبانِ اُردو کے معمار اور اسکو بامِ ترقی پر لیجانے
والے کی حیثیت سے سراج الدین علی خاں آرزو کا نام یادگار رہے گا۔ انہوں نے
"نوادر الالفاظ" کے ذریعہ اُردو کی بڑی اہم باشان خدمت انجام دی ہے۔

سراج الدین علی خاں متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو، شیخ
حسام الدین حسام کے صاحبزادے تھے۔ ہندوستان کے مشہور شعراء اور نقادانِ
فن میں سے تھے۔ یہ میر کے سوتیلے ماموں بھی تھے۔ لالہ سری رام مصنف "خمخانۂ جاوید"
کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا وطن اکبرآباد تھا لیکن وہ گوالیار میں بسلسلۂ
ملازمت رہے۔ بعد میں شاہجہاں آباد دہلی میں قیام رہا۔ رام بابو سکسینہ مصنف
تاریخ ادب اُردو کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ کے رہنے والے شاہ محمد غوث
گوالیاری کی اولاد میں سے تھے۔ ابتدائی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور مختلف
علوم و فنون میں بصیرت کاملہ حاصل کی۔ جوانی میں بہ مقام گوالیار منصب دار

مقرر ہوئے مگر فرخ سیر کے عہد میں سنہ ۱۱۳۰ھ میں دہلی واپس آئے۔

اُن کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت، ہندی، پنجابی اور
دوسری ہندوستانی زبانوں سے واقف تھے۔ ان اوصاف کی بناء پر ہندوستانی
زبانوں کے متعلق اُن کی زباندانی مسلم تھی۔ اس کا اندازہ اُن کی تصانیف سے
ہو سکتا ہے۔ آرزو کی اُستادی کا اعتراف اُن کے سارے معاصرین نے کیا ہے۔
میر تقی میر کا قول ہے کہ "ان کے زمانے میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر
شیریں زبان نہ تھا۔ وہ "نکات الشعراء" میں لکھتے ہیں: "ہمہ اُستادان
مضبوطِ فنِ ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوار اند۔"

میر حسن اُن کی تعریف و توصیف میں "رطب اللسان"
ہیں .... مصحفی بھی اُن پر اپنی مدح سرائی سے لطف کرتے ہیں۔ اور
فتح علی اُن کو اُن کے نام کی مناسبت سے "چراغِ محفلِ فصاحت" کے معزز لقب
سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں کہ اُن کو زبانِ اُردو
کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ اور منطق سے ہے۔ میر تقی میر
اُن کا ذکر نہایت ادب سے کرتے ہیں اور اپنا اور اُس زمانہ کے شعراء کا
جگت اُستاد مانتے ہیں۔ خان آرزو، اُردو اور فارسی دونوں کے اُستاد
تھے اگرچہ اُردو کم کہتے تھے مگر اُن کے استاذ الاساتذہ ہونے میں کسی کو کیا کلام
ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کہ میر، سودا، مظہر اور درد جیسے قادر الکلام اُن کو
اُستاد مانتے تھے۔

مختصر یہ کہ اُن کے علم و فضل اور فارسی زبان و ادب کے قواعد و دقائق
پر اُن کو عبور تھا اور اُن کی اثر انداز شخصیت فارسی اُردو دونوں زبانوں کیا

کام کرنے والے ہر ادیب کے لیے یکساں طور پر چشمۂ فیض اور شمع ہدایت تھی۔

یوں تو آرزو شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور رہیں لیکن واقعہ یہ
ہے کہ شاعری آرزو کا بڑا کارنامہ نہیں بلکہ اُن کی وہ خدمات ہیں جو انہوں نے
اُردو زبان کی ترقی اور مقبولیت کے سلسلہ میں انجام دیں۔ قابلِ ذکر ہیں
اُن میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اُردو میں خود شعر کہے، اپنے
شاگردوں میں اُردو شاعری کا ذوق پیدا کیا اور اس طرح اُردو کے ادبی پایہ
کو بلند کیا۔ انہوں نے اپنے فارسی مذاق کے پیرایہ پر اُردو کے اشعار میں بھی
ایک خاص رنگ پیدا کر دیا تھا۔ یہ کسی حد تک صحیح ہے کہ جان جاناں مظہر
پہلے شخص تھے جنہوں نے ریختہ کو فارسی کے قالب میں ڈھالا مگر اس سے انکار نہ
ہو سکے گا اُردو کو فارسی معیار پر لانے میں آرزو کا بھی کچھ کم حصہ نہیں۔ اس کے
علاوہ انہوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی اور ہندوستانی
لسانیات کے ابتدائی قواعد وضع کیے۔ علاوہ ازیں پروفیسر عبداللہ لکھتے ہیں۔ جہاں تک
اُردو لغت نگاری کا تعلق ہے ہم آرزو کو اُردو کا پہلا معیاری اور بلند پایہ
لغت نگار قرار دے سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میر عبدالواسع ہانسوی کو ان پر تقدیم
ہے مگر فن اور معیار کے اعتبار سے خان آرزو ہی کو ترجیح اور تقدیم حاصل ہے۔
انہوں نے فارسی کی نثری وقیع اور گراں مایہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں
لیکن اُردو سے متعلق انہوں نے صرف ایک لغت لکھی ہے۔ جس کی
افادیت و اہمیت پر ذیل کے ضمنی عنوان کے تحت روشنی ڈالی گئی۔

آرزو کی لغت نگاری

اُردو لغت نویسی کے سلسلہ میں
آرزو کی تالیف "نوادر الالفاظ"

بڑی اہمیت کی مالک ہے۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء ہے۔ جیسا کہ آرزو نے
نوادر میں لفظ 'بیساکھ' کے ضمن میں خود تصریح کی ہے۔

"لیکن تفاوت در بیساکھ و نوروز بیں اتفاق می افتد۔ چناں ایں
کہ امسال کہ نوروز بست و چہارم محرم ۱۱۶۵ھ واقع شدہ و آں۔ غرّہ
نوروز بست و در بیساکھ نوازدہ یا بست روزی باید۔"

سبب تصنیف

نوادر کا سببِ تصنیف آرزو نے کتاب کے دیباچہ میں خود بیان
کیا ہے:۔

"می گوید بندہ حقیر ...... آرزو کہ یکے از فضلائے کامگار و علمائے نامدار۔
مسمی بہ 'غرائب اللغات' و 'لغات ہندی' کہ فارسی یا عربی یا ترکی آں زبانِ
اہلِ دیار کمتر بود، در آں یا معانی آں مرقوم فرمودہ چوں در میان معانی
الفاظ تسامحے یا سقم بنظر آمد۔ لہٰذا نسخۂ درین باب بقلم آوردہ جائیکہ سہو و
خطائے معلوم کردہ اشارات بداں نمودہ و نیز آنچہ بہ تتبع ناقص ایں
کمال وسعت در آمد بر آں افزودہ۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ یہ تالیف کہنے کو تو غرائب اللغات
کی تصحیح و ترمیم ہے مگر اُن مفید و عالمانہ تنقیدوں اور اضافوں کو دیکھ کر
جن کا ثبوت ہر ہر صفحہ پر ملتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تالیف اپنی ایک مستقل
حیثیت رکھتی ہے اس لیے غرائب کا اولہ اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔
ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ آرزو نے معنوی اصلاح کے علاوہ

غرائب کی ترتیب کو بھی درست کیا ہے۔ کیونکہ غرائب میں پہلے حرف کی رعایت تو تھی مگر دوسرے حرف کی رعایت ملحوظ نہ تھی۔ آرزو نے نوادر میں اس سقم کو دور کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی تصنیف کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں "مگر نوادر کے الفاظ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آرزو کی یہ کوشش ہر جگہ کامیاب نہیں ہوئی۔"

آرزو نے غرائب کے سب الفاظ کو نوادر میں سمیٹ لیا ہے (ہر چند کہ ان الفاظ کے تلفظ اور املا وغیرہ کے سلسلہ میں اعتراض بھی کیے ہیں) انھوں نے اپنی طرف سے جن الفاظ کو شامل کیا ہے وہ یا تو ہندی کتابی (سنسکرت) سے متعلق ہیں یا پھر فارسی یا ترکی کے ایسے الفاظ ہیں جو اردو کا جزو بن گئے ہیں۔ (جن کو غرائب کے مصنف نے غلطی سے فارسی سمجھ کر اپنی کتاب میں شامل کیا تھا) اس طرح آرزو نے بعض جملوں کا اضافہ کیا ہے جن کی وجہ سے نوادر میں مفردات کے علاوہ چند مرکبات اور جملے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ غرائب اور نوادر کی تقابلی حیثیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ غرائب ایک معمولی کتاب ہے جس کا مطمح نظر سراسر تدریسی ہے۔ اس کے مخاطب عام طالب علم ہیں۔ اس کے برعکس نوادر ایک عالمانہ اور محققانہ کتاب ہے جس کی ناقدانہ حواشی فارسی اور اُردو کی لغت میں اس کو بلند مقام و رتبہ بخشتے ہیں۔ علاوہ اس کے غرائب کے الفاظ میں ہرجائی تلفظ اور قصباتی محاورہ و روزمرہ کا عنصر غالب ہے۔ اس کے مقابلے میں آرزو وقت کی فصیح ترین زبان کو رواج دینا چاہتے ہیں۔

لیکن اسی ضمن میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ آرزو کی یہ کوشش ہر جگہ کامیاب نہیں ہوئی۔ میر عبدالواسع نے جہلا اور عوام کی زبان و الفاظ کو مستند اور صحیح قرار دے کر غرائب میں شامل کر لیا ہے۔ آرزو نے اگرچہ ایسے الفاظ کو نقل کیا ہے مگر اُن کی رائے ہے کہ عوام کے محاورے اور جہلا کے الفاظ کو صحیح اور فصیح الفاظ کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ بنا بریں انہوں نے میر عبدالواسع پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔

آرزو ایک زباندان اور محقق کی حیثیت سے

اگرچہ خان آرزو بہت سے علوم میں کامل مانے جاتے ہیں مگر نوادر کے غائر مطالعے سے وہ ایک بہت بڑے زباں داں اور محقق کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اُن کی فارسی کتب لغت (مثلاً چراغ ہدایت اور سراج اللغت) سے بھی ڈاکٹر صاحب کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فارسی زبان و ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ معانی و مفہوم کے صحیح تعین کے علاوہ مترادفات کے باریک اور لطیف امتیاز سے بھی پورے واقف تھے۔ اور اسی تبحر اور ژرف نگاہی کی بدولت نوادر الالفاظ کا ہر لفظ معانی کی لطافتوں اور نزاکتوں سے رنگین ہے۔ وہ لفظوں کی معنوی خوبیوں پر سے پردہ اُٹھا کر اُن کی اصلی تصوّرات کے قریب لے جاتے ہیں۔ مثلاً "ادا" ایک عام لفظ ہے مثلاً ادائے معشوقانہ یا ناز و ادا وغیرہ۔ میر عبدالواسع اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں "ادا کیفیتے باشد معشوقاں را کہ بتقریر نیاید و ذوق آں را دریابد آں...."

میر عبدالواسع کی یہ تشریح کسی حد تک تشنہ ہے۔ آرزو اس لفظ کی تشریح
اس طرح کرتے ہیں کہ سب سے پہلے وہ لفظ کا ماخذ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لفظ
عربی کا ہے۔ فارسی میں اکثر حرکت موزوں کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً ابروئے چشم کی
موزوں حرکت کو بھی ادا کہا جا سکتا ہے۔ ادا بعض اوقات مطلقاً یعنی حرکت آتا ہے۔
مثلاً ادائے خارج۔ غرض ادا معشوقوں کی کیفیت نہیں بلکہ ان کے اعضا خصوصاً
چشم و ابرو کی حرکت کا موزوں نام ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب "آن" کے متعلق لکھتے
ہیں کہ لفظ "آن" جو میر صاحب کی لغت ادا کی تشریح میں مستعمل ہے وہ آرزو کے
بیان کے مطابق ادا سے الگ کیفیت کا نام ہے۔ یہ محبوبوں کی ایک جبلی حالت
اور کیفیت ہے جس کی تعبیر کسی اور لفظ سے ممکن نہیں۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

یاراں ایں دارد و آں نیز ہم

ایک اور شعر میں کہا ہے ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

برہان قاطع میں آن کی ضمن میں لکھا ہے: "آن" نمک و چاشنی و حالت
کیفیت را نیز می گویند کہ در حسن می باشد و در تقریر نمی آید"۔
ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ان الفاظ کی تشریح سے آرزو کی تخیلی و تجرباتی
اور تحلیلی تجزیاتی صلاحیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا
ہے کہ وہ لفظوں کی خوب چھان بین کرتے تھے۔

نوادرالغات کی تنقیدی حیثیت

آرزو کی اس دقت نظر اور وسعت علم کا اندازہ سراج اللغات

وغیرہ سے بھی ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے فارسی لغت نگاروں پر تنقیدیں
کی ہیں مگر وہ عام ہیں خاص نہیں۔ نوادر میں عام تنقیدوں کے ساتھ غرائب کی خاص
تنقید بھی مد نظر ہے اور اس کے صفحات میں اس کے عملی ثبوت ملتے ہیں عام لغت
کے برعکس نوادر محض تشریح و توضیح نہیں بلکہ غرائب کی تنقید بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے
آرزو کو ہر موقع پر میر عبدالواسع کی مبہم اور سست تشریحوں کو واضح اور چست
کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس غرض سے مجبور ہو کر مختلف الفاظ کے معین تصورات ہمارے
سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مجہول مفہوم کو دور کرتے ہیں جو
عبدالواسع کی تشریحوں کا خاصہ ہے۔

یہ مسلم ہے (جیسا کہ دوسرے موقع پر بیان ہوا ہے) کہ میر عبدالواسع کی
بہت سی غلطیاں عموم و خصوص سے متعلق ہیں۔ چنانچہ آرزو کی تنقید و تصحیح کا بہت
بڑا میدان بھی یہی ہے۔ عموم و خصوص سے مراد یہ ہے کہ معنی بیان کرتے وقت جو بات
عام طور پر صحیح ہے اس کو کسی ایک چیز سے خاص کر دیا جائے یا جو بات ایک خاص
شئے یا حالت سے متعلق ہے اس کو عام چیزوں سے وابستہ کر دیا جائے۔ مثلاً
چھتری کا لفظ دیکھئے۔ میر عبدالواسع فرماتے ہیں: "چھتری ...... جفتے کہ تاک
انگور و بیار خیار و کدو وغیرہ برآں اندازند نیم۔
آرزو اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"لیکن چھتری اعم است و آں چوب پایہ باشد کہ باہم بندند و در میان
آں خانہ ہائے مربع گذارند جفتے کہ برائے تاک انگوری سازند۔ نشنیدہ ام کہ
آں را چھتری گفتہ باشد و نیز برائے بیارہ خیار و کدو ساختن چھتری موسوم
نیست پس غیر محرم باشد و نیز در رسالہ "چھتری آنست کہ در چوب بلند را بر جا

فرو برند تا کبوتران و جانوران دیگر بر آں نشینند و آں را اڈہ نیز خوانند و ایں نیز خطا است، چرا کہ در ہندی آں را چھتری نگویند بلکہ چھتری آنست کہ چند چوب پائے در عرض و طول باہم بندند و بیک چوب یا چہار چوب استادہ نمایند خواہ کبوتران را براں نشانند و خواہ بپارۂ عشق پیچاں و آن چہ ما راست بداں۔ بر آں انداز و دو چوب کلاں را ہرگز چھتری نخوانند بلکہ اگر برائے جانوران شکاری مثل باز و باشند ساز ند تیاز گویند و لا اڈہ۔"

غالباً اسی ایک تشریح سے آرزو کے ذہن کے تنقیدی رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ بطور ایک لغت نگار کے اُن کو معنی کے صحیح تعین اور اشیاء کے کامل تشخص کا ملکہ کس حد تک حاصل تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ معنی و مفہوم کے تعین میں کسی بھول اور سستی کو گوارا نہیں کر سکتے مگر میر عبدالواسع ہیں کہ دو لکڑیوں کو زمین میں گاڑ کر ان کو چھتری کا نام دیتے ہیں اُس کے بعد کسی کو اڈہ کے مرادف قرار دے کر اس پر کبوتروں کو بٹھا دیتے ہیں۔ حالانکہ فارسی اور اردو زبان کے ذخیرے میں ان سب چیزوں کے لئے الگ الگ الفاظ موجود ہیں۔

آرزو کو اس قسم کی ڈھیلی لغت نگاری سے کس قدر چڑ ہے اس کی مزید توثیق کے لیے نوادر میں بارہ دری، ڈنڈا، تھیکرا، تیجی، تیل، ٹٹی، بیڑا، ڈنڈا، بڑا تنکا، پہیلی، پینچی، ترنبڑی، ڈنڈ اور اس طرح کی بہت سی تشریحات کو دیکھ لیجئے ان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ خان آرزو سستی اور مبہم شرح کو کسی صورت گوارا نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ اشیاء اور اسماء کے معین تصورات اور اُن کی باریکیوں کو ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

آرزو کا مشاہدہ اور تجربہ

ایک خاص بات جو آرزو کو فارسی اور اردو کے لغت نگاروں پر تفوق بخشتی ہے یہ ہے کہ علمی وسعت کے علاوہ ان کی معلومات کا بہت سا حصہ ذاتی مشاہدے اور علمی تجربے پر مبنی ہے۔ وہ الفاظ کے مفہوم کے تعین کے لئے صرف فارسی عربی کی قدیم لغات پر بھروسہ کر لینے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اُن کی دی ہوئی معلومات کو ذاتی تحقیق اور چھان بین سے ٹھوک بجا کر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس غرض کے لئے وہ لغت اور ادب کے عام ماخذ کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کی مستند کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ملک کے عام طبعی اور مجلسی حالات اور عام رسوم و رواج کی باقاعدہ تحقیق کرتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے اوضاع اور اطوار کے معاملے میں بھی ذاتی تجربے کے ذریعے تحقیق کی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان سب ماخذوں سے استفادہ کرنے کے بعد لفظوں کا اصلی مفہوم متعین کرتے ہیں اور تقریباً ہم معنی الفاظ کے لطیف امتیازات کو واضح کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اس کے علاوہ جن چیزوں کا تعلق اپنے ملک سے ہے اُن کے سلسلے میں براہِ راست مشاہدہ و تحقیق سے کام لیتے ہیں اور جو چیزیں ایران و توران سے متعلق ہیں اُن کی ماہیت ہندوستان میں آئے ہوئے ایرانیوں اور تورانیوں سے دریافت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ فلاں چیز یا قاعدہ یا رسم ہندوستان میں ہے توران میں نہیں۔ یا توران و ایران میں ہے اور ہندوستان میں نہیں۔ وہ اس طریق کار کو صرف بیرونی ممالک کے حالات و واقعات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ہندوستان کے

مختلف صوبوں اور خطوں کے معاملے میں انھیں پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

آرزو کی فراوانیِ معلومات اور مشاہدات کی وسعت کا اندازہ بھی اُن کی اس کتاب سے ہم کر سکتے ہیں۔ اُن کی لغت نویسی کا ایک خاص اسلوب ہے جس کی وجہ سے اُن کو اردو فارسی کے لغت نگاروں میں ممتاز ترین مقام دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً نوادر الالفاظ کے مصنف کی حیثیت سے اُن کا رتبہ بہت بلند ہے کیونکہ نوادر لغت کی کتاب ہونے کے علاوہ معلوماتِ عامّہ کا مخزن بھی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے بعض عجیب و غریب غلط فہمیاں بھی دور ہو جاتی ہیں جو عام معلومات کے اعتبار سے مسلّمات کی فہرست میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ نوادر کے بعض بیانات سے اس زمانے کے عام ملکی اور مجلسی حالات پر نہایت معلومات افزا روشنی پڑتی ہے۔ اس لغت کو ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر اردو پنجاب یونیورسٹی نے اپنے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع کیا ہے۔

خان آرزو ایک ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے

لسانیات کے سلسلے میں سراج الدین علی خاں آرزو کا نام اس حیثیت سے یکتا ہے کہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے فارسی اور ہندی (یا سنسکرت) کی وحدت اور توافق کا راز دریافت کیا۔ تقابلی لسانیات کے سلسلے میں جرمن فضلا نے بہت کام کیا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کارنامے کا سہرا عموماً انھیں مستشرقین کے سر باندھا جاتا ہے۔ مگر بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ایرانی اور ہندوستانی زبانوں کی اصولی وحدت کا انکشاف سب سے پہلے خان آرزو نے کیا۔"

خان آرزو کے لسانی نظریات اور قواعدِ زبان پر عبور کا صحیح اندازہ اُن کی ایک کتاب "مثمر" سے ہو سکتا ہے۔ یہ بڑی قیمتی کتاب ہے۔ خوش قسمتی سے اُس کا ایک قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ہے جو ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظر سے گزرا ہے۔ اُس کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اس نسخہ میں خان آرزو نے مفصلاً توافقِ لسانین کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ موجودہ لسانیاتی تحقیق اب اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ اس کے سامنے آرزو کی بعض باتیں شاید چنداں توجہ کے لائق نہ سمجھی جائیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خان آرزو کی یہ تحقیق فارسی کی لسانیاتی جستجو کی تاریخ کا شاندار باب ہے۔

خان صاحب مصلحِ زبان کی حیثیت سے

خان صاحب کے زمانہ میں گوالیار کی زبان اپنے عروج پر تھی۔ خان آرزو نے زبان کی فصاحت و عدمِ فصاحت کے سلسلہ میں گوالیار کی زبان کو مستند مانا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ خود اصلاً گوالیار سے متعلق ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے تک خاص دلّی کی زبان کو وہ سرکاری اور مذہبی اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی جو بعد میں حاصل ہوئی۔ دہلی کے عوام ایک مخلوط قسم کی زبان برتتے تھے جسے بھاکا گنوارو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں پرانی الفاظ اور دیہاتی محاورے کی خاصی آمیزش تھی۔ خان آرزو نے اس طرف توجہ کی اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اُردو کے ابتدائی لہجہ اور تلفظ کو معیّن کرنے اور ٹکسالی اردو کو متعین کرنے میں انھوں نے ایک محسن اور مصلحِ اوّل کا کام کیا۔ اصلاحِ زبان کی کوششیں اس کے بعد کی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بتانا

دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آن کے زمانہ میں زبانِ اُردو کی اصطلاح ایک مخصوص مفہوم اور محدود معنی رکھتی تھی۔ غالباً آرزو ہی پہلے مصنّف ہیں جنکی تصانیف میں اُردو کا لفظ زبان کے معنی میں استعمال ہوا۔

آن کی زباندانی اور عام لسانیاتی دلچسپی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ نوادر میں جابجا ہندوستانی الفاظ کی مختلف حوالوں سے تصحیح و تعین کرتے ہیں۔ رائج الوقت فصیح ہندی کے علاوہ وہ مقامی بولیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اس عام واقفیت کی وجہ سے انہیں الفاظ کی لغوی تحقیق اور ان کے مختلف تلفظات کے جانچنے کا خوب موقعہ ملا ہے۔ نوادرالالفاظ میں اُنہوں نے جن ہندوستانی زبانوں کا تذکرہ کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے: ہندی کتابی (سنسکرت) گوالیاری (برج)، ہندی راجپوتی (راجستھانی)، کشمیری یا ہندی کشمیری، ہندی پنجاب (پنجابی)، زبانِ مردم پنجاب، زبانِ اُردو، زبانِ اکبرآباد، زبانِ شاہجہاں آباد، اصطلاح شاہجہاں آباد، زبانِ اہلِ اردو، ہندی فصحا۔

نوادرالالفاظ ایک اور حیثیت سے قابلِ ذکر ہے کہ زبانِ اُردو کے محقق اور مورّخ کے لیے یہ بات فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نوادر عہدِ عالمگیری سے لیکر شاہ عالم کے زمانے تک کی زبانِ اُردو پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جس میں اُردو اپنی تعمیر کے عبوری دور سے گذر رہی تھی۔ اس زمانہ میں اس کی جو حالت تھی اس کے جاننے کے لیے "غرائب" اور "نوادر" دونوں ہمارے لئے نہایت مفید ماخذ ثابت ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ غرائب، نوادر ایک ہی زبان کے مختلف رنگوں کا اظہار کرتی ہیں۔ غرائب اور نوادر کی زبان اور الفاظ کا فرق نہ صرف قصباتی

اور شہری محاورے کا فرق ہے بلکہ اس سے اور رنگ ریپ' محمد شاہ اور احمد شاہ کے اَدوار کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں' ہرچند کہ یہ دور بہت مختصر ہے مگر زبانِ اُردو کی تعمیر کے سلسلے میں اس کو بحرانی اور انقلابی دَور کہا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے نوادرالالفاظ زبان کے مطالعہ کے سلسلہ میں بڑی قیمتی کتاب ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ اُس زمانہ کی معیاری زبان کا حال معلوم ہوتا ہے۔ نوادرالالفاظ میں خان آرزو کئی موقعوں پر غرائب کے الفاظ کو "زبان جہلاء" یا "زبانِ وطنِ صاحبِ رسالہ" کے پُرحقارت نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں گوالیاری زبان کو ہندوستان کی فصیح ترین زبان کہتے ہیں جس کی وجہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

غرائب اور نوادر کے مُطالعے سے اُردو زبان کی تاریخ کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اس پہلو کا تعلق دخیل الفاظ سے ہے یعنی عربی' فارسی اور ترکی کے اُن الفاظ سے جو یا تسوی اور اُردو کے زمانے تک جزوِ زبان بن چکے تھے مثلاً ادا' آن' ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں بڑی تفصیل دی ہے اور لکھتے ہیں کہ ان میں بیشتر الفاظ ایسے ہیں جن کی اُردویت اس حد تک مسلّم ہو چکی ہے کہ بہت کم لوگ ان کے حسب و نسب کے متعلق شک و شبہ میں مبتلا ہونگے۔ خان آرزو کی ساری تصانیف شائع ہونے کے قابل ہیں۔ خالص اُردو کے نقطۂ نظر سے نوادرالالفاظ کو ان کے اہم ادبی کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مگر لسانیاتی نقطۂ نظر سے نوادرالالفاظ کے علاوہ مثمر بھی نہایت مفید اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ اور اس قابل ہے کہ مناسب ایڈیٹنگ کے بعد اس کو بھی چھاپا جائے۔

شاہ حاتم ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۱ء

ظہور الدین نام اور حاتمؔ تخلص۔ مشاہیرِ قدما میں سے ہیں۔ اُن کو دہلی کے رنگ کا موجد خیال کرنا چاہیے۔ ریختہ بطرزِ ولیؔ و مضمونؔ و ناجیؔ و آبروؔ کہتے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ تھے۔ کچھ عرصے تک نواب امیر خاں صوبۂ الہ آباد کی رفاقت میں رہے۔ سنہ ۱۷۲۲ء میں جب دیوانِ ولیؔ دہلی میں آیا اور اُس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا تو حاتمؔ نے بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو پہنچ گئے۔ خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ۔ اور بعد کو مصحفیؔ کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے اُستاد مانے گئے۔ دو دیوان اُن کی طرف منسوب ہیں۔ ایک قدیم رنگ میں جس میں صنعتِ ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش ہے۔ دوسرا جدید رنگ میں۔ عالمگیر ثانی کے زمانہ میں ایک دیوان کلیات سے منتخب کرکے مرتب کیا۔ اس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کلیات۔ آبروؔ و ناجیؔ کی طرز میں لکھا تھا۔ تذکرہ قدرت میں لکھا ہے کہ "نا مازغم شاعری بسیار دارد دیوان قدیم او از نظر این مؤلف گذشتہ۔ بطرزِ آبروؔ و ناجیؔ حرف می زند۔ اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم۔"

محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ایک مثنوی حقہ پر لکھی جو زیادہ دلچسپ نہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان فارسی بھی ہے۔ نہایت متین و مہذب بزرگ تھے۔ اپنے دیوان کے دیباچے میں ۴۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں۔ جس میں سب سے پہلے مرزا رفیع سوداؔ کا نام نامی ہے۔ یہ ایسے شاگرد تھے جن پر استاد کو بھی فخر تھا۔

تصفیۂ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیے۔ درستیٔ زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوقؔ و آتشؔ و ناسخؔ کے زمانے میں ایک سو برس بعد پورا ہوا۔ اُسی کی داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔ افسوس ہے کہ اُن کے معاصرین نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اُسی زمانہ میں بہت کچھ تکمیل ہو جاتی۔ شاہ صاحب اس کے متعلق فرماتے ہیں:-

"خوشہ چین خرمنِ سخن وران عالم بصورت محتاج بمعنی حاتم کہ از سنہ ۱۱۲۹ھ ۱۷۱۶ء تا سنہ ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء کہ چہل سالہ باشد عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی پیرو مرزا صائب و در ریختہ ولی را استاد می داند۔ اول کسے کہ دریں فن دیوان ترتیب کردہ او بود۔ و معاصرین فقیر شاہ مبارک آبرو و شرف الدین مضمون و مرزا جان جانان مظہر و شیخ احسن اللہ تاوری و مرزا شاکر ناجی و غلام مصطفیٰ یک رنگ است۔ در لفظ دو رو پرداز و الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوانِ قدیم خود تمہید دارد۔ دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند۔ و روزمرۂ دہلی کہ مرزایان فصیحان رند در محاورہ آرند منظور دارد۔ زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود ...... مختصر کہ لفظ غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود۔"

اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی و اصلاحِ زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتبہ ادبِ اُردو میں منفرد اور ممتاز ہے۔ وہ سوداؔ اور دوسرے بڑے بڑے

شاعروں کے استاد تھے اور اصلاحِ شعر اور دکنی زبان میں انہوں نے بہت
نمایاں حصہ لیا۔

اُن کا کلام زبانِ اُردو کی تاریخِ ارتقاء میں ایک خاص درجہ اور اہمیت
رکھتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اس میں فارسی کی نئی نئی
ترکیبیں اور خیالات داخل کیے۔ زبان میں یہ جدید رنگ انہیں کا پیدا کیا ہوا ہے۔
مگر افسوس ہے کہ مصحفی اور شوق کے علاوہ بہت کم لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

مرزا جانِ جاناں مظہر

نام مرزا جانِ جاناں اور تخلص مظہر تھا۔ مظہر نے اردو زبان کی اصلاح اُس
وقت کی جبکہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد شمال اور دکن کے اختلاط
سے شمال کے اہلِ علم پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ دکن کے اہلِ قلم نے اپنے اسلوب
میں بہت کچھ ادبی کام کیا ہے اور وہ خود اس معاملہ میں بہت پیچھے ہیں۔
یعنی انہوں نے اپنی ادبی زبان کی علمی سرپرستی کی طرف توجہ نہیں کی۔ پھر
اُن کے دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ دکنی شعر و ادب کے نمونوں کی تقلید میں
وہ بھی اپنی بول چال کی زبان میں شاعری کریں۔ اسی کے نتیجہ میں مرزا مغل موسوی
خاں فطرت معاصر اورنگ زیب جو فارسی زبان کے شاعر تھے۔ اُن کے ذیل
کے شعر کی طرف تذکرہ نگار اشارہ کرتے ہیں ؎

از زلفِ سیاہ تو بدل دوم بری
در خانۂ آئینہ گھن جوں پری

اس طرح اس دور کے ایک شاعر قزلباش خاں امید کے بھی کئی

اُردو شعر ملتے جس کا ایک نمونہ یہ ہے ؎

بامن کی بیٹی آج مری آنکھو میں بھری
غصہ کیا و گالی دیا اور رو گر لری

شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا اور فارسی کے ترک کر دینے
کا سبب میر نے شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن تھا

اُس زمانے میں دکن کے جو شاعر شمال کو گئے اُن کی تعداد میں جیسے جیسا
اُردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جا رہے ہیں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مصحفی کے
ایک تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ یا ۱۴ شاعر دہلی گئے تھے۔ دہلی والوں نے انہیں
ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مصحفی ہی نے دوسرے تذکرے میں شمال کے ۳۰ ایسے شاعروں کے
نام دیے ہیں جو دکن گئے۔

یہ تو شاعروں کا حال تھا۔ اُس زمانہ میں دکن کی بہت اُردو کتابیں
بھی شمال پہنچیں چنانچہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں دکن کی متعدد
اردو قلمی کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ اسپرنگر کا کیٹلاگ اُن کے تذکروں سے معمور ہے
یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دکن کے اردو ادب نے شمال میں کس قدر
مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی شہادت اس طرح بھی ملتی ہے کہ یورپ کے
مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکنی مخطوطے محفوظ کر لیے گئے ہیں اُن میں سے
بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنہوں نے
محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی اِن اردو کتابوں کو نقل کیا تھا۔

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکن کے
اُردو اشعار دلچسپی سے سُنے جاتے تھے اور دکنی شاعروں کی آؤ بھگت
ہوتی تھی۔ ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا
ایک غزل میں لکھتے ہیں ؂

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین ٭ جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دہلی کے شاعر ولی کی غزلوں کی تقلید میں غزل لکھتے اور انہیں کے
شعروں سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ
اب تک کے اُس زمانے کے شمال کے اُردو شاعروں کے کلام کے نمونے
عام طور پر دستیاب نہیں ہوئے ہیں تاہم "دیوان زادہ" حاتم سے اس کا ثبوت
ملتا ہے۔

ولی کے علاوہ دکن کے جن اُردو شاعروں کے کلام نے دہلی میں شہرت حاصل
کی اُن میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرہ کے آغاز
میں یہ لکھنے کے بعد کہ "باید دانست کہ ریختہ اوّل از زبان دکنی است" فقیر اللہ
آزاد کا حال لکھتے ہیں اور اُن کی شاعری کی یوں تعریف کرتے: "ہمراہ فراقی
دکنی در شاہجہان آباد آمدہ بود طبع دردمندے داشت و بسیار بصنع حرف
می زند۔ خالش بیاثر زد۔"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتیجہ کے طور پر دہلی میں اُردو تصنیف و
تالیف اور شاعری کا آغاز ہوا۔ ساتھ ہی فارسی کا اثر کم ہونے لگا۔ چونکہ دکن کے
اُردو کلام کے اثر سے ابتداء ہوئی تھی اس لیے اوّل اوّل دکنی طرز کی پیروی کی گئی
اس کے خلاف لکھنے والے کی شاعری غلط سمجھی جاتی۔ چنانچہ اسی ابتدائی دور کے

ایک مشہور شاعر شاہ مبارک آبرو نے اُس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو
حاتم نے اپنے "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں نقل کیا ہے:۔

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے
اُن سے کہتا ہوں کہ بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اُس کے ریختہ میں حرف ہے

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا اظہار ضروری ہے کہ شمال کی ہندوستانی
بولنے والوں نے جب دیکھا کہ دکن سے جو کتابیں آ رہی ہیں اُس کی زبان اُن کی
زبان سے مختلف ہے اور اس میں کچھ برج بھاشا کے الفاظ اور اسلوب شامل
ہیں تو انہوں نے شاید خیال کیا کہ دکن والوں نے برج بھاشا کی تقلید میں
شعر و شاعری شروع کی ہے اس لیے خود بھی برج بھاشا کی طرف متوجہ ہوئے
اور اس کے دوہوں وغیرہ کے طرز پر اُردو میں بھی کہنا شروع کیا۔ چنانچہ
اسی اثر کے تحت صنعت ایہام کا رواج بڑھنے لگا۔ عہد محمد شاہ کے جملہ شاعروں
کے کلام میں اس صنعت کی جو کثرت ہے اس کا اصلی راز یہی ہے۔

لیکن شمال کے ہندوستانی بولنے والوں کا یہ اندازہ درست نہ تھا۔
دکنی ہندوستانی کی تصنیف و تالیف برج بھاشا کی تقلید میں نہیں شروع
ہوئی تھی۔ جیسا کہ گذشتہ فصلوں میں ذکر آ چکا ہے دکن کا ہندوستانی ادب وہاں کے
حالات و واقعات کی فطری پیداوار تھا۔

لیکن شمالی ہندوستان کا یہ اسلوب عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔
دکنی طرز کی پیروی اہل شمال کے لیے غیر فطری تھی۔ اس میں خیال ادا کرنے کیلئے

انہیں تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا۔ اب انہوں نے اِس بات کی کوشش کی کہ اپنی روزمرہ کی زبان میں فارسی اجزا کی آمیزش کرکے شعر کہیں۔ اگرچہ پہلے پہل بعض شعرا نے اس کی مخالفت بھی کی۔ لیکن تدریجی طور پر اُردوئے معلیٰ کی زبان میں شعر و شاعری ہونے لگی۔ اِس رجحان کا آغاز مرزا مظہر جان جاناں نے کیا اور اس کی ترقی ناسخ کے عہد تک جاری رہی۔

مرزا مظہر اگر اُس وقت یہ تحریک شروع نہ کرتے تو آج اُردو زبان غالباً موجودہ شکل میں نہ ہوتی۔ مظہر کے اس اجتہاد سے متعلق اسی زمانے کے اُستاد شاعر شیخ مصحفی اپنے تذکرہ ہندی میں لکھتے ہیں:۔

"در ابتدائے شوقِ شعر کہ ہنوز از میر و مرزا وغیرہ کہ در عرصہ نیامدہ بود و دور دورِ ایہام گویاں بود اوّل کسی کہ شعرِ ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ اوست ...... فی الحقیقت نقاشِ اوّل زبانِ ریختہ بالاتفاق مرزا است — بعدہٗ تتبعش بدیگراں رسیدہ"

حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں کیا۔ اور چونکہ وہ دہلی میں اُردو شاعری کے ابتدائی اور اصلاحی دونوں رجحانوں کی ترویج و ارتقا کے وقت زندہ تھے اس لئے اُن کا بیان اس بارے میں زیادہ دلچسپ اور مستند ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"درین ولا ایں ترتیب طلب از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسانِ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد ...... نہ دہند کہ الانسان مرکب السہو و النسیان واقع است واللہ علی التوفیق"

غرض مرزا مظہر کی تحریک کے بعد ایک طرف برج بھاشا اور دکنی ہندوستانی کی تقلید موقوف ہوگئی اور بہت سے الفاظ اور محاورے متروک قرار پائے مثلاً نین، جگ، نت، بسرنا، اپڑھنا وغیرہ اور دوسری طرف لفظوں کی شکلوں اور املا میں بھی فرق پیدا ہوگیا۔ اس سے پہلے جس طرح بولتے تھے اسی طرح لکھتے تھے اور یہ نتیجہ تھا صدیوں کے تغیرات اور ارتقائی حالات کا۔ اس زمانے میں لفظ 'تسبیح' یا 'صحیح' کا تلفظ 'تسبی' یا 'صحی' کیا جاتا تھا اور آج تک بھی اِن لفظوں کا تلفظ یہی ہے۔ مگر اس زمانہ میں انھیں لکھتے بھی انہیں تلفظ کے مطابق تھے۔ البتہ آج ہم لکھتے کچھ اور پڑھتے کچھ ہیں۔

مظہر کی تحریک کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ الفاظ اصل عربی یا فارسی املا کے مطابق لکھے جانے لگے۔ اُردو زبان میں داخل ہونے کے بعد اُن کے تلفظ یا شکل میں جو کچھ تغیر یا ارتقا ہوا تھا۔ وہ غلط قرار پایا۔ مثلاً: تسبی، صحی، بگانا، دوانا کو پھر سے تسبیح، صحیح، بیگانہ اور دیوانہ لکھنے لگے۔

سودا کے منظر عام پر آنے سے پہلے اُردو زبان کی اصلاح کا یہ پس منظر تھا۔ خان آرزو، حاتم اور مظہر نے اُردو زبان کو نوک پلک سے دُرست کرکے [illegible] کی۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ

جب ہم سودا کی اصلاحی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اصلاحی رجحان اِن بزرگوں سے بالکل مختلف تھا۔ اور اُس کی بنیاد وسیع النظری اور غیر جانبداری پر مبنی ہے۔ گذشتہ صفحات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردوئے معلیٰ کی زبان میں

فارسی اجزا کی آمیزش سے شعر و شاعری کی نشو و نما تو ہوئی لیکن اس پر فارسیت کا غلبہ ہوگیا۔ اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کے ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

سودا کے زمانہ کی شعری زبان دراصل مختلف منزلوں سے گزر رہی تھی۔ دہلی میں اردو شاعری کا چرچا چونکہ ولی کے دیوان سے شروع ہو رہا تھا۔ اس لئے دکنی اثرات نمایاں طور پر دہلی کے ابتدائی دور کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ دوسری طرف بول چال کی زبان نے کوئی معیاری شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اس میں بیک وقت پوربی، برج، ہریانی، ٹھیٹ ہندی اور پنجابی الفاظ ملے ہوئے تھے۔ تیسرے ولی نے چونکہ فارسی لہجہ پر اردو غزل لکھنے کی کوشش کی تھی اس لئے فارسی ترکیبیں، اصطلاحیں، تلمیحیں اور بھی اس میں داخل ہوگئے۔ جن میں نامانوس اور غریب الفاظ بھی تھے۔ زبان کا کوئی لہجہ نہیں بنا تھا۔ پھر ایہام گوئی سے جہاں الفاظ کے مفہوم متعین کرنے میں مدد ملی۔ وہاں یہ نقصان بھی ہوا کہ ہر طرح کے الفاظ جو رواں اور شستہ تھے، بے تکلف استعمال ہونے لگے۔

اس عبوری دور کی ناہمواری اور بے رنگی کا اندازہ حاتم کے "دیوان زادہ" کے دیباچہ سے بھی ہوتا ہے۔ ریختہ میں فارسی کے فعل و حروف

استعمال کرنا ترک ہوا۔ الفاظ کے تلفظ اور املا کے بارے میں صحیح فارسی یا عربی شکل سے رجوع کیا گیا۔ دکنی کے نامانوس الفاظ اور تراکیب میں تراش خراش ہوئی، 'نی' کی جگہ 'نہیں'، 'منیں' کی جگہ 'میں'، ٹھیٹ بازاری بولی کے الفاظ میں بھی تراش خراش سے کام لیا گیا۔ 'ایدھر' کی جگہ 'ادھر' رائج ہوا۔ اور حاتم کا وہ اقتباس جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، اس کے مطالعہ سے ان کے نظریہ اصلاحِ زبان کا علم ہوتا ہے۔ لیکن سودا کے پیش نظر سوال محض تراش خراش کا نہیں تھا۔ زبان کو ٹکسالی اور معیاری بنانے کا تھا۔ اس کو ایک واضح کردار بخشنے کا تھا۔ قواعد کی پابندی، الفاظ کے مفہوم کی وضاحت، جملوں کی ساخت اور ربط کلام، مونث و مذکر، واحد اور جمع کے تعین کا تھا۔ ایک جمع میں یکساں صیغہ استعمال کرنے کے التزام پر اصرار کا بھی مسئلہ درپیش تھا۔ نامانوس الفاظ مثلاً خعیب اور غیر فصیح الفاظ مثلاً ضکو و جلو کے استعمال پر بھی مرزا سودا نے سبیل ہدایت میں اعتراض کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا زبان کی ہمواری اور روانی کے فریفتہ تھے اور اس کا ایک معیاری پیکر تراشنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مرزا روزمرہ کی زبان اور شاعری کی زبان کی درمیانی خلیج کو پاٹنے میں بھی کوشاں تھے۔ تراش خراش اور اصلاح کا کام نسبتاً آسان ہے۔ لیکن

سودا کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ اس سے جہاں
زبان نکھرتی اور سنورتی ہے۔ وہاں وہ محدود بھی ہوتی
ہے۔ اور آہستہ آہستہ ایک مخصوص بولی کی شکل اختیار
کرلیتی ہے۔ جہاں نامانوس الفاظ کی تراش اور خراش
ضروری ہے۔ وہاں زبان میں نئے نئے الفاظ و تراکیب کے
خزانوں کے دروازے کھولنا بھی ضروری ہے۔

سودا کا تطہیر زبان کا رویہ تنگ نظری اور تنگدلی
پر مبنی نہ تھا بلکہ وسعت قلب اور وسیع النظری پر مبنی تھا
اس کے لئے اگر مزید ثبوت درکار ہو تو ان الفاظ پر
غور کرنا چاہیئے۔ جو انہوں نے دکنی سے لیئے ہیں۔ اور انہیں
تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اپنا لیا ہے یا اُن الفاظ
کو دیکھنا چاہیئے جو ٹھیٹھ ہندی سے لئے گئے ہیں۔
یا اُن لاتعداد فارسی محاوروں، اسماء، اسمائے مفعول
اور فقروں کو پرکھنا چاہیئے جس میں تبدیلی کرکے یا
جن کا ترجمہ کرکے سودا نے انہیں استعمال کیا ہے۔
یا اُن لاتعداد اصطلاحات کی فہرست کو دیکھنا
چاہیئے جو مختلف ہستیوں یا شعبوں کے بارے میں
سودا نے نظم کی ہیں۔ یا بول چال کی زبان کے
ان گنت لفظوں پر غور کرنا چاہیئے جو سودا کی
ہجویات، مثنویوں اور مرثیوں میں بکھرے

ہوئے ہیں۔

سودا ہماری زبان کو عربی فارسی اور ہندی تینوں خزانوں سے مالامال کرنا
چاہتے تھے۔ جہاں بھی اظہار خیال کا دامن تنگ ہوتا تھا وہاں وہ بے تکلف ان
تینوں میں سے کسی کی طرف رجوع کرتے۔ سودا تنگ نظر روایت پرست
زبان داں نہیں تھے وہ ردو تنسیخ سے زیادہ اخذ و قبول کے قائل نظر آتے
ہیں۔ اُن کی زبان دانی روزمرہ کی بول چال سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے
اور شاعری کی زبان کو کتابی بنانے کی بجائے کوچہ و بازار، مدرسہ و خانقاہ، گھر اور
آنگن کی زبان بنا دینا چاہتی ہے۔ یہاں زبان چھوئی موئی کا پودا نہیں ایسا تناور
درخت ہے۔ جس کی جڑیں ہماری سماجی زندگی کے ہر شعبے میں مضبوطی کے ساتھ
پھیلی ہوئی ہیں۔ ہاں اُن کی یہ کوشش ضرور ہے کہ اردو زبان کا اپنا ایک
کردار ایک مزاج اور ایک لہجہ اور نہج بن جائے تاکہ بیرونی الفاظ اس کے
دائرے میں آکر شگفتگی اور روانی کی خراد پر چڑھ کر سڈول اور سبک بن سکیں
اور ان پر انہی اصول کا اطلاق ہوسکے جو ٹھیٹھ اردو الفاظ کے لئے روا
رکھا جاتا ہے۔

سودا کی دنیا تنگ اور محدود نہیں ہے۔ وہاں سورج کی روشنی ہوا کی
مستی، فضا کی وسعت اور زندگی کی چہل پہل اپنی پوری آب و تاب کے
ساتھ موجود ہے۔ اس کا اندازہ اُن سینکڑوں اصطلاحات سے کیا جاسکتا
ہے جو سودا نے زندگی کے مختلف شعبوں کے سلسلے میں استعمال کی ہیں۔
مثلاً سپاہیوں، بچہ بازوں، جہادوں، آتش بازوں، باورچیوں، شکاریوں،
طوائفوں، ساہوکاروں، جنیوں، طبیبوں، اہل دفتر، شاعروں وغیرہ کا تعلق ہے

بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ دہلی کے ان معلمین زبان کی اصلاحی خدمات کے بعد اگلے صفحات میں ہم دہلی کے ابتدائی دور کے نثر نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

میر جعفر زٹلی ١٦٥٩ء/١٠٦٨ھ تا ١٧١٣ء/١١٢٨ھ

میر جعفر ہزل گو شاعر تھے۔ اسی مناسبت سے انہوں نے زٹلی تخلص اختیار کیا۔ یہ نارنول کے باشندے تھے۔ اورنگ زیب کے بیٹے کام بخش کے ساتھ دکن آئے اور اسی زمانہ میں شاعری شروع کی۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ فارسی میں ہے لیکن جو اردو کلام ملتا ہے وہ بھی ناقابل لحاظ نہیں۔ خصوصاً بیان کی ندرت اور اچھوتے پن کے لحاظ سے ان کا اردو کلام قابل ذکر ہے۔ گو انہوں نے سنجیدہ شاعری کی طرف توجہ نہیں کی لیکن مرثیۂ عالمگیر سے جو انہوں نے اورنگ زیب کی وفات پر لکھا تھا اُن کی سنجیدگی اور شرافتِ نفس کا پتہ چلتا ہے۔

زٹلی نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہنگامہ آرائیوں اور طوائف الملوکی کی ستم رانی کی بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ کو مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے

محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

ایک مثنوی میں خود اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ ان کی ہزل گوئی اور ہجو سے سب ہی خائف رہتے تھے یہاں تک کہ امرا بھی۔ اس لئے ١١٢٥ھ/١٧١٣ء میں فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دئے گئے۔

اُن کی حسب ذیل نثری تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے:۔

(١) اخبار سیاسیہ (٢) اخبار دربار معلی

اخبار سیاسیہ: اس میں متفرق واقعات پر چار کہانیاں ہیں جو اورنگ زیب کے سامنے بیان کی گئی ہیں۔ اردو میں اس کا جواب بھی ہے گو جواب چار سطروں میں ہے۔ بقول ڈاکٹر زور "وہ اس حیثیت سے بہت اہم ہیں کہ شہنشاہ بھی اپنی خانگی گفتگو میں اردو زبان استعمال کرتا تھا"۔

اخبار دربار معلی: اس میں پانچ قصے ہیں۔ جن میں سے چار خود شاعر کے متعلق ہیں کہ وہ درباریوں سے کس طرح روپیہ کھینچتا تھا۔ ان کو سن کر بادشاہ نے کیا جواب دیا۔

محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں کہ:۔

کلیات کا ایک نسخہ پروفیسر سروری صاحب نے رام پور کی رضا لائبریری میں دیکھا تھا۔ اس کلیات میں نثر کے کچھ حصے بھی شامل ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی فرماتے ہیں "محمد معظم کے دور میں جعفر نے ایک رسالہ 'دربار معلے' کے نام سے لکھا ہے جس میں اول دربار کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ پھر ان کے متعلق احکام صادر ہوتے ہیں۔ میر جعفر نے یہ شاہی احکام اکثر ضرب الامثال کی زبان میں ادا کر دیئے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر کچھ ضرب الامثال ہم حسب ذیل پیش کر رہے ہیں۔

١۔ جوم جھاڑا اجباری پتھر ٢۔ تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی آپ نبیڑ ٣۔ ہمارا حکم خاصن چاہئے۔ ٤۔ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا ٥۔ دم جو پکڑی بھیڑ کی وارا ہوا نہ پار۔

کتب خانۂ آصفیہ میں "لغاتِ ہندی" کے نام سے ایک مخطوطہ لکھا ہوا ہے۔ اس میں ۱۵۵۵ کہاوتیں یکجا کی گئی ہیں جن میں بعض فحش بھی ہیں۔ اندرونی شواہد کی بنا پر محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا خیال ہے کہ یہ دہلی ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔

عیسوی خان بہادر

عیسوی خاں بہادر محمد شاہ رنگیلے کے ہمعصر تھے۔ اُن کی یادگار صرف ایک نثری تصنیف ہے جس کا نام "قصۂ مہر افروز و دلبر" ہے۔ مرتبِ قصہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں پیش نامہ میں لکھتے ہیں: "غالباً اردو کی قدیم ترین مختصر داستان جس کا واحد نسخہ آغا حیدر حسن صاحب (حیدرآباد) کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس نسخے کے سرورق پر مصنف کا نام عیسوی خان بہادر لکھا ہوا ہے۔ آغا حیدر حسن صاحب کو یہ نادر مخطوطہ "حضرت سید علی شاہ قادری دہلوی ثم الگوالیاری" حضرت جی کی درگاہ سے حاصل ہوا تھا۔[11]

عیسوی خاں بہادر کے والد بزرگوار کون تھے ابھی اس کا تاریخی تعین نہیں ہو سکا۔ مرتبِ قصہ نے آغا حیدر حسن صاحب کی روایت کو قلم بند کیا۔ آزاد نے آبِ حیات میں شاہ نصیر کے سلسلے میں جو باتیں بیان کی ہیں ان سے آغا حیدر حسن کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں دو بھائی دہلی میں تھے۔ مال و دولت کی بابت دونوں میں کچھ جھگڑا ہوا۔ عیسیٰ خاں ناکام ہوئے۔ موسیٰ خاں نے کچھ

عدالت کے زور اور کچھ حکمتِ عملی سے سارا مال مار لیا۔ شاہ صاحب بطورِ ظرافت چند شعر کا قطعہ کہا۔ ایک مصرع یاد ہے وہی قطعہ کی جان ہے ؎

"ہوئی آفاق میں شہرت کہ عیسیٰ خاں کا گھر موسیٰ"

لطف یہ ہے کہ دونوں بھائی شاعر تھے۔ ایک کا تخلص آفاقی اور دوسرے کا شہرت تھا۔[12] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عیسوی خاں بہادر کے آبا و اجداد دہلی کے قدیم باشندے تھے۔

یہ خاندان ثروت و اقتدار کے ساتھ علم و فضل میں بھی ہمیشہ مفتخر اور ممتاز رہا ہے۔ ایک طرف یہ لوگ دربار میں امرا کے طبقے میں کھڑے ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف خلوتِ خاص میں علما کے ساتھ بیٹھے نظر آتے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زمانے میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کو کلام مجید پڑھانے کی خدمت اسی خاندان میں تھی اور غدر تک قائم رہی۔[13]

علاوہ اس کے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے ایک مقالہ "حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان" کا اس سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا حیدر حسن خاں صاحب اور عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم دونوں دو بھائیوں کے نواسے تھے۔ جن کا تعلق عیسوی خاں بہادر سے تھا۔[14]

مذکورۂ بالا خاندانی روایت کے علاوہ مصنف کے بارے میں اور کسی قسم کی تفصیل نہیں ملتی اور یہ یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ اس خاندان کے کس عیسیٰ خاں (عیسوی خاں) نے اس قصہ کو تصنیف کیا ہے۔ سرورق پر مصنف کا نام بظاہر کاتبِ قصہ کا لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ مزید یہ کہ بے ترتیب طور پر ایک طرف حاشیہ پر لکھا ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعد کو کسی دوسرے شخص نے

تحریر کیا ہے۔ سرورق دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ غالباً کسی
یورپین کے قبضہ میں رہا ہے جس نے ایک جگہ "مالک اس کتاب نائب صاحب"
اور کچھ غیر متعلق خامہ فرسائی کی ہے۔[۱۵]

عہد شاہجہانی سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہد تک عیسیٰ خاں، موسیٰ خاں،
موسوی خاں ایک سے زائد امراء و درباری کے نام ملتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کا نام
عیسوی خاں نہیں ملتا اور ان میں سے کوئی اردو کا صاحب تصنیف نہیں بتایا گیا ہے۔
غرض کہ اس نادر داستان کے نادر مصنف کے بارے میں صحیح علم ہو سکا اور نہ
اس کے سن تصنیف یا کتابت کی تصدیق موجود ہے۔ ایسی صورت میں اس داستان
کے مرتب نے اس کے مصنف اور زمانہ کیفیت کے بارے میں صرف داخلی اور سیاقی
شواہد سے بحث کی ہے۔

جہاں تک داخلی شہادتوں کا تعلق ہے قصہ کے متن میں بعض ایسے اشارے
ملتے ہیں جن سے اس کے مصنف کے دہلوی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ داستانی منظر کشی
میں مصنف لال قلعہ دہلی کی دو عمارتوں (ساون اور بھادوں)، ایک باغ (حیات بخش باغ)
اور دیوان خاص کی اندرونی محرابوں پر درج امیر خسرو کے اس شعر کا حوالہ دیتا ہے جو لال
قلعہ بننے کے بعد زبان زد خلائق ہو چکا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است ۔ ہمیں است و ہمیں است

قصہ کے اندر شہزادہ اور وزیرزادہ جب ایک عالی شان عمارت میں
پہنچتے ہیں تو اس کی خوبی کا ذکر مذکورہ بالا شعر بنا کر ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں
"یہ جو سیر کرتے ہیں سو سمجھتے ہیں کہ بہشت جو روئے زمیں پر سنا ہے سو یہی ہے"[۱۶]
قصہ میں لال قلعہ کی عمارت "ساون" کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"آگوں چل کے ایک عمارت کے اندر جو پیٹھے دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا حوض
ہے اور فوارے اس میں اچھلتے ہیں اور چادریں پڑتی ہیں اور دالان جو اس کے
آس پاس ہیں تس میں کسی میں فوارہ چھوٹی بوند پڑنے کا بہار رکھا ہے۔ جس میں
چھوٹی بوند ہے تس میں ساون کا بہار رکھا ہے۔ اور چھتوں میں ان کی گھٹا
بنائی تھی اور گرجتا تھا اور بجلی چمکتی تھی اور دھنک و ساجھ بھوں کا بہت نمود
ایسا رکھا تھا کہ گویا ساون ہی پڑی ہے اور تیسی ہی درختوں کی وہاں چھاؤں ہو رہی
تھی۔ مور و کوکل و پپیہا بولتے تھے۔ سو بغیر برسات، برسات معلوم ہوتی تھی"۔

مذکورہ بالا بیان کا مقابلہ لال قلعہ دہلی کے ساون بھادوں کے سلسلہ میں
سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں جو کچھ لکھا ہے[۱۷] اس سے کیجئے تو یہ حقیقت
واضح ہو جاتی ہے کہ قصہ مہر افروز کے مصنف نے لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کا
عینی مشاہدہ کیا ہے۔[۱۸]

"بھادوں کی طرح اس میں چادر بھی ہوئی ہے اور حوض بھی بنا ہے۔
اور اسی طرح گلدان اور چراغ دان رکھنے کو مہرابی طاق بنائے ہیں۔ اس سبب سے
اس مکان میں پانی کی آمد اور چادر کا پڑنا اور زور و شور پانی کا بہنا ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ جیسا ساون کا مہینہ......"

مصنف قصہ مہر افروز ساون بھادوں کے اس نقشہ پر تخیلی اضافہ
اس انداز پر کرتا ہے کہ گرمی اور سردی کے سمیا کی بھی ان الفاظ میں تخلیق کرتا
ہے جس میں لال قلعہ کے حمام کے سرد خانہ اور گرم خانہ کی تصویر ملتی ہے۔
"وہاں سے جب لے آگو چلے تب دیکھیں تو ایک جگہ تس میں ایک
حمام گرمی کا سمیا رکھا ہے کہ دھوپ بھی چلتی ہے تابش آفتاب کی ویسی ہی رہتی۔"

فلک بھی وہ گرم ہے۔ وہاں سے آگے چلتے ہیں ایک جگہ دیکھتے کہ تہہاں جاڑے کا سماں رکھا ہے۔ ٹھنڈک بھی تہہاں ویسی ہی ہے اور برف بھی پڑتی ہے"

غرض کہ قصّہ مہر افروز کی پوری فضا لال قلعہ دہلی کی جھلکیوں سے بھری پڑی ہے۔ محل، دلکشا، فوارے، آبشار، پانی کی چادریں، نہریں، حوض، دالان در دالان، نشیمن، پچیکاری، غرض ہر ہر رُخ سے قلعہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ لال قلعۂ دہلی وہ مادی بنیاد ہے جس پر عیسوی خاں بہادر کا تخیل طلسم آرائی کرتا نظر آتا ہے۔ تفصیلات، جزئیات کا مطالعہ اس بات کا ثبوت ہر ہر صفحہ پر فراہم کرتا ہے کہ مصنف کے لیے دیدہ تھیں نہ کہ شنیدہ اور مصنف قلعہ و دربار سے گہری وابستگی رکھتا تھا۔[۹]

اسی طرح مرتب قصّہ نے قصّے میں مہتاب باغ کا جو ذکر ہمیں ملتا ہے اس کو سر سید احمد خاں اور مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے حوالے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی زمانہ میں مہتاب باغ کا وجود تھا۔

مرتب قصّہ لکھتے ہیں کہ مصنف نے اپنے قصّہ میں قلعۂ دہلی کی رسومات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً جشنِ مہتابی، مہتاب باغ اور جشنِ مہتابی کی بزم آرائیاں شاہجہاں کے بعد اپنے پورے شباب پر دوبارہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد میں پہنچتی ہیں۔ محمد شاہ ہی کے عہد میں 'بوستانِ خیال' کی پہلی جلد ۱۱۵۵ھ میں مرتب ہوتی ہے اور داستان گوئی کا فن کی حیثیت سے عام چرچا ہوتا ہے۔ فارسی میں قصّہ حاتم طائی کا جو قدیم ترین نسخہ (تاریخ کتابت ۱۱۳۵ھ) ملتا ہے۔ وہ بھی محمد شاہ کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ قصّہ حاتم طائی کا عکس قصّہ مہر افروز میں ملتا ہے۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ محمد شاہ کے آخری دور یا احمد شاہ کے عہد کے عیسوی خاں نے

جن کا لال قلعہ دہلی سے گہرا تعلق رہا ہے، فارسی داستانوں سے متاثر ہو کر یہ اولین کوشش اُردو زبان میں کی ہوگی۔ اس داستان میں دو کرداروں کے نام ہوبہو خاندانِ تیموریہ کے افراد کے ناموں پر ہیں۔ ایک جہاں آرا اور دوسرا شاہ عالم۔ جہاں آرا، شاہجہاں کی محبوب بیٹی تھی جو اس کے انتقال کے بعد ۱۶۸۱ء تک زندہ رہی۔ شاہ عالم اوّل، اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ اوّل (۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء) کا لقب بھی تھا اور شاہ عالم ثانی، عالمگیر ثانی کے جانشین کا بھی جس نے ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء حکمرانی کی ہے۔ اگر ہم آدابِ داستان گوئی کے پیشِ نظر جس میں شاہِ وقت کے نام کو کرداری حیثیت سے استعمال کرنے کی مثال نایاب ہے، شاہ عالم اوّل اور ثانی دونوں کے عہد کو خارج کر دیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عیسوی خاں نے یہ قصّہ کسی وقت ۱۷۳۲ء تا ۱۷۵۹ء کے درمیان لکھا ہوگا۔ اور یہ عیسوی خاں غالباً حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کے چچا ہوں گے کیونکہ احسان کے والد حافظ غلام رسول خاں کا خطاب موسیٰ خاں محب الدولہ خاں بہادر تھا اور وہ محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) اور احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) کے زمانے میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کو کلام مجید پڑھانے پر معمور تھے۔[۱۰]

قصّہ مہر افروز و دلبر پر ایک نظر

یہ ایک طبع زاد مختصر داستان ہے۔ طبع زاد ان معنوں میں کہ داستان کے عناصر ترکیبی ہی سے مصنف نے ایک نیا قصّہ گھڑا ہے۔ اس میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو فارسی کی داستانوں کا طرّۂ امتیاز ہیں۔[۱۱] یعنی اس کے کردار

بادشاہ زادے، وزیر زادے، شہزادیاں، پیر و فقیر، تاجر، دیو، دیونیاں،
پریاں وغیرہ غرض فوق الفطرت عناصر کی اس قدر بہتات ہے کہ قصہ انہیں کی
مدد سے منزل بہ منزل آگے بڑھتا ہے۔ عام داستان کے بعض عناصر اس میں
حیرت انگیز طور پر مفقود ہیں مثلاً پیر و فقیر ہیں لیکن جادوگر، ساحر اور عیار بالکل
نہیں ملتے تاہم قصہ میں ایک دو جگہ مصنف نے ایسے مقاموں کا ذکر کیا ہے جو طلسم
سے بھرے ہوئے ہیں۔

قصہ کا خلاصہ

اس قصہ کا آغاز بھی عام قصوں کی طرح ہوتا ہے۔ یعنی ایک بادشاہ
لاولد بے اختیاری کے عالم میں بادشاہی چھوڑ کر فقیری اختیار کرتا ہے۔ جنگل کی
راہ لیتا ہے۔ ایک فقیر کی دعا سے آخرکار ایک بیگم کی بطن سے شاہزادے کا
تولد ہونا، نازو نعمت سے پلنا۔ وہی شکار کی اجازت، وزیر زادے کے ساتھ
اس کا ایک خوش رنگ جانور کے پیچھے جانا، جانور کا غائب ہو جانا، راہ گم کر دینا۔
پھر ایک پُر رونق پہاڑ کے دامن میں آ نکلنا .... بندروں کی رہبری،
آرزو جوشش فقیر تک باریابی، فقیر کا تسلی دینا اور روم کے بادشاہ منور شاہ اور
اس کے بیٹے نور عالم کا قصہ سنانا کہ کس طرح نور عالم خواب میں دلربا کو دیکھتا
ہے۔ گردشِ محبت طلسم کی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں بے شمار دھڑ بن دھڑ،
سر جدا پڑے ہیں۔ وہی گنبد پر طوطا، تیر کمان کا پڑا ہونا، مری نشانہ بازی، شاہزادے
کی ناکامی، اس کے دوست سوداگر بچہ کی کامیابی اور طلسم خانہ سے سب کی
رہائی، شہزادے اور سوداگر بچہ کا مختلف ملکوں کے ساحلوں پر پہنچنا، سوداگر

بچہ کا اس ملک کی شہزادی سے شادی کرنا اور شہزادے کی تلاش کرنا۔ شہزادے
کا ایک جنگل میں پناہ لینا۔ سیمرغ کے انڈے کھانا اور پر نکل آنا۔ ادھر
دلربا کا شہزادے کی تلاش میں نکلنا۔ ایک صیدی کے ہاتھ جا پڑنا ......
بالآخر فقیر کی مدد سے شہزادہ مہر افروز و دلبر کا اپنی مراد کو پہنچنا۔ اس مقام پر
مصنف داستان کو روک دیتا ہے اور شادی کے بعد ایک نیا سلسلہ
شروع ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ دونوں اپنے وطن پہنچیں۔

افسانے کی قسموں میں داستان ایک مخصوص اور مکمل صنف کا نام پڑ گیا تھا۔
اس کی چند خصوصیات ذیل کی عبارت میں بتائی گئی ہیں جسے خواجہ امان نے
"حدائق انظار" (ترجمہ "بوستانِ خیال") کے دیباچہ میں درج کی ہے۔[21]

"ظاہر ہے کہ نفسِ قصص اور افسانہ کے واسطے چند مراتب لازم و
واجب ہیں۔ اوّل مطالبِ مطوّل و خوش نما جس کی تمہید و بندش میں توارد
مضمون، اور تکرارِ بیان نہ ہو۔ مدت دراز تک اختتام کے لیے سامعین مشتاق
رہیں۔ دوم بجز مدعائے خوش ترکیب و مطالب کوئی مضمون سامعہ خراش
و مہمل درج نہ کیا جائے .... سوم لطافتِ زبان و فصاحتِ بیان۔ چہارم
عبارت سریع الفہم کہ واسطے فنِ قصہ کے لازم ہے۔ پنجم تمہید قصہ میں بجنسہ تواریخ
گذشتہ کا لطف حاصل ہو۔ نقل و اصل میں ہرگز فرق نہ ہو سکے۔"

اس میں چند کام کی باتیں کہہ دی گئی ہیں جو کہ داستان کی تکنیک میں
بہت اہم ہیں۔ اوّل ہی یہ خوبی بتائی ہے کہ داستان کو طول دیا جاتا ہے۔
قصہ در قصہ اور ضمنی کہانیوں کے ذریعہ داستان کو پیچیدہ کر دیا جاتا ہے۔
اسی میں ان کی دلچسپی کا راز ہے۔ سننے والوں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک

قصے کے بیشتر نام علامتی ہیں، مثلاً فقیر آرزو بخش ہے۔ جنگل کا نام فیضستان ہے۔ باغ کا نام محبت افزا یا جاں بخش ہے۔ شہر کا نام عشق آباد ہے۔ مقامات کے فرضی ناموں کے ساتھ خطا ختن اور بلخ جیسے شہروں کے داستانی نام بھی موجود ہیں۔ کوہ قاف بھی ہے اور اقلیم ہندوستان کا بھی ذکر ہے۔ بادشاہوں کے نام عادل شاہ، شاہ عالم، نجم عالم، منور شاہ، کرم شاہ ہیں۔ شہزادے مہر افروز اور نور عالم ہیں۔ شہزادیوں اور پریوں کے نام نوبہار بانو، گلزار بانو، دلبر بانو، دربا، آتش طا بالو ہیں۔ ملکہ جہاں آرا، گلچہرہ وغیرہ ہیں۔ اسی طرح وزیر جہاں دانش ہے تو وزیر زادہ نیک اندیش، ان کے علاوہ حیدری، دیو، دیو شیاں اور پریاں ہیں۔[25]

مرتب قصہ لکھتے ہیں کہ "قصہ مہر افروز کی ادبی حیثیت پلاٹ کی ندرت یا کردار نگاری سے زیادہ اس کے سادہ ادبی اسلوب میں ہے۔ اردو کے قدیم ادب میں اس سے زیادہ سہل اور سادہ عبارت نظم و نثر میں آج تک نہیں لکھی گئی پوری داستان بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہے بلکہ غالباً جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا لکھوائی گئی ہے۔ جملوں کا دروبست تحریر کا نہیں تقریر کا ہے۔ جملہ ادا کرتے وقت مصنف کو نہ مبتدا کی خبر ہے اور نہ خبر کی وہ "اور" اور "کہ" کی تکرار سے فقروں کا تسلسل قائم رکھتا ہے۔ عیسوی خاں کی ادبیت کے تمام ماخذ یا تو ان کا ذاتی مشاہدہ ہے جسے وہ دہلی کے روزمرہ میں بیان کرتے جاتا ہے یا ہندی شاعری کی وہ تشبیہات، تخیلات اور تلازمے ہیں جن کے سہارے وہ حسن کی مصوری اور عشق بازی کے مزے بیان کرتا ہے۔ قصے کے بہترین حصے وہی ہیں جہاں وہ کسی کا سراپا بیان کر رہا ہے یا ہندی شاعری کے

ریتی کال کی روایت شعر کے مطابق نکھ سکھ کا بیان کر رہا ہے۔[26]

سماجی نقطۂ نظر سے دیگر داستان کی طرح یہ قصہ بھی زوال آمادہ مغلیہ تہذیب کا ایک نگار خانہ ہے۔ شاہی جلوس کے مراتب، شاہی دسترخوان کے مزے (صرف پلاؤ کی دس قسمیں گنوائی ہیں) بزم کے ساتھ رزم کی نقش کشی، دیو اور دیونیوں کی تصویر کشی کرتا ہے تو رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ جلسہ و جلوس کی منظر کشی کرتا ہے تو متحرک کو ساکت بنا دیتا ہے اور کمال یہ ہے کہ ہر قسم کی مصوری وہ اس عہد کی دہلی کی ٹھیٹھ زبان میں کرتا ہے۔ وہ ہندو دیو مالا سے بھی بخوبی واقف ہے۔ وہ اپنی اکثر تشبیہیں (جنھیں وہ "اپمان" کہتا ہے) بلا تکلف ہندی شاعری سے لیتا ہے۔ اس کے اکثر فقروں پر سورداس، میرا بائی یا رحیم کے دوہوں کی چھاپ نظر آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خالص اسلوب کے نقطۂ نظر سے عیسوی خاں کی عبارت کو نکھ سکھ سے درست نہیں۔ شمالی ہند میں فارسی کے مقابلے میں جس زبان کو دربار نے ٹھکرا دیا تھا اور محمد شاہ کے عہد تک لائق اعتنا نہ سمجھا گیا ظاہر ہے اس میں ادبی تخلیق کرنا کس قدر دشوار طلب ہوگا۔ مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اور نہ اردو شاعری کے رچے ہوئے اسلوب کی داغ بیل پڑی تھی۔ اس کے پیش نظر یا تو فارسی داستانیں تھیں یا بھگتی اور ریتی کال کی شاعری کے وہ نمونے جو زبان زد خلائق ہو چکے تھے چنانچہ انہیں روایات سے وہ اپنے ادبی اسلوب کے تانے بانے مرتب کرتا ہے۔ داستانیں عام طور پر برمحل اشعار سے بھری پڑی ہوتی ہیں۔ قصہ مہر افروز اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں فارسی، اردو یا ہندی کا ایک بھی شعر یا

درج نہیں کیا گیا ہے۔ اُردو اشعار کی غیر موجودگی سے اس کی قدامت
اور مُسلّم ہو جاتی ہے اور یہ قیاس کہ یہ قصّہ محمد شاہ کے عہد کی تصنیف ہو سکتا ہے،
صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی
جا رہی تھی۔ البتہ فارسی اور ہندی اشعار سے اجتناب حیرت ناک ہے۔

قصّہ کی زبان اکھڑی اکھڑی ہونے کے باوجود تخیل کی بے پناہ قوت
رکھتی ہے جو زبان کو اسلوب کے نئے سانچوں میں ڈھالنے میں مصروفِ کار ہے۔
اس میں ندرت ہے، نظر ہے، گہرائی اور گیرائی ہے۔ سادگی اور توانائی ہے۔ مصنف جو
کہنا چاہتا ہے بے محابا کہہ جاتا ہے جو دکھانا چاہتا ہے دکھا جاتا ہے اور نوک پلک
سے درست نہ ہونے کے باوجود ہم مصنف کی قوتِ اظہار پر عش عش کر کے رہ جاتے ہیں۔
دراصل قصّہ کی زبان شمالی ہند میں پہلی بار اردو کا ادبی سطح پر وسیع استعمال ہے
اس لیے عیسوی خاں کی حیثیت ایک بانیٔ اسلوب کی ہے جسے پہلی بار بول چال
کی زبان کو ادبی سطح بخشنے کا موقع ملا ہے۔ اس اوّلین تجربہ میں اسلوبِ بیان کا
رچاؤ نہیں ملتا لیکن صداقت سے بات کہنے کی کاوش موجود ہے۔

اس قصّہ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ دوسری داستانوں کی طرح اس میں
مصنف مبلغِ اخلاق بن کر سامنے نہیں آتا۔ قصّہ میں عریانی بھی حیرت ناک حد تک
مفقود ہے۔ حالانکہ محمد شاہ کے عہد کی تمام داستانوں میں بالخصوص بوستانِ خیال
میں یہ رنگ بہت چوکھا ہے۔[۵]

اسی طرح سے تبلیغِ اسلام کا وہ جذبہ جو دیگر داستانوں کا جزوِ لازم ہے
اس قصّہ سے بالکل غائب ہے۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ قصّہ ایک ایسے
زمانہ میں لکھا گیا ہے جب لال قلعہ دہلی سے دورِ عالمگیر پرواز کر چکی تھی۔ میلان کی

ترکیب ہر چند کہ مصنف کی غیر ضروری معاشرتی تفصیلات اور قصّہ در قصّہ تشکیل[۴]
کی وجہ سے ڈھیلی ڈھالی ہو گئی ہے، تاہم اس میں داستان گوئی کے سارے
آداب ملتے ہیں۔ مصنف نہایت چابکدستی سے قصّہ کو شادی خانہ آبادی تک
پہنچا کر داستان کو روک کر مہر افروز اور دلربا کو ایک نئے ورطۂ مصیبت
میں گرفتار دکھاتا ہے تا آنکہ وہ منزلِ مراد اور مکمل آسودگی تک پہنچیں۔
قصّہ کی کردار نگاری میں زیادہ جان نہیں لیکن مصنف نے سراپا نگاری میں
کمال دکھایا ہے دیوتی کے سراپے کو جس زیادہ دلچسپ اور جاندار انداز میں شاید کسی داستان گو نے پیش کیا ہے۔

قصّہ کے ادبی اسلوب اور زبان کے بارے میں مجموعی طور پر یہ کہا
جا سکتا ہے کہ یہ قدمائی زبان کا پہلا ہیولیٰ یا زبانِ دہلوی کا پہلا ادبی نقش ہے۔
جس پر ایک طرف ہندی شاعری کی چھاپ ملتی ہے اور دوسری طرف فارسی
داستانوں کے جملوں کا دروبست پایا جاتا ہے۔ دہلی کے محاورے میں
دراصل اُردو میں قصّہ کہنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ مصنف اس تصنیف میں
اُردو نثر کے بنیادی اسلوب کی داغ بیل ڈال رہا ہے جس پر بعد کو میر امن
اور اُن کے رفقا نے جدید اُردو نثر کی عمارت کھڑی کی ہے۔

قصّہ کی قدامت کا تعین

قصّۂ مہر افروز کی قدامت کا تعین اس کی زبان کے تجزیہ سے بھی کیا
جا سکتا ہے۔ ایک طرف قصّہ کی زبان خسرو کے عہد کی زبانِ دہلوی کی ترقی یافتہ
شکل ہے جس میں پنجابی اور ہریانی اثرات زائل ہو چکے ہیں تو دوسری طرف
یہ جہانگیری عہد کے مصنف افضل کی "بکٹ کہانی" کی زبان سے ان معنوں میں

زیادہ جدید ہے کہ اس میں برج بھاشا کا پٹ کم پایا جاتا ہے۔ یہ شمالی ہند کے دو ہم عصر مصنفین فائز اور فضلی کی زبان سے بھی مختلف ہے اس لئے کہ یہ دونوں کتابی اور ادبی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے برعکس عیسوی خاں اس عہد کی بول چال کی زبان کو اپنے قصے کے لئے منتخب کرتا ہے۔ بکٹ کہانی کی زبان میں ٹھیٹ اردو کے محاورے کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔ اس کا مصنف ابھی تک ریختہ گوئی کی روایات کا تتبع کر رہا ہے۔ اس کے برعکس قصہ مہر افروز کی زبان 'ذرا بعد' دہلوی کا نقش ثانی ہے جو شاہجہاں کے ۱۶۴۸ء میں دار السلطنت آگرہ سے دہلی منتقل کرنے کے بعد متشکل ہوتا ہے۔ اردو کا مرکز ثقل ایک بار پھر برج بھاشا کے علاقہ سے ہٹ کر کھڑی اور ہریانی کے علاقے میں آجاتا ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس انتقال سلطنت کے دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ سترھویں صدی کے نصف آخر ہی میں جدید اردو کا وہ ڈول متعین ہوتا ہے۔ جس کے پہلے نمونے ہمیں دہلوی مصنفین فائز، فضلی اور عیسوی خاں کے ہاں ملتے ہیں۔ قصہ کی زبان سے قطع نظر، نصیحت نامہ میں سنجیدہ اردو نثر کا نقش اول بھی ملتا ہے۔ اس کا بھی انداز علمی نہیں عام بول چال کا ہے جیسا کہ ہمیشہ پہلی علمی کاوش کا ہوتا ہے۔

عیسوی خاں کے "نصیحت نامہ" کا ماخذ فارسی میں اخلاقیات کی تین مشہور آرا کتب یعنی "اخلاق ناصری" "اخلاق جلالی" اور "اخلاق محسنی" ہیں۔ ہر چند مصنف نے ان میں سے کسی تصنیف یا مصنف کا حوالہ نہیں دیا ان تینوں میں سے اس نے ملا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے جس کا چلن اس وقت ہندوستان میں بہت تھا۔ نصیحت نامہ نہ صرف ادبی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ سنجیدہ علمی موضوع پر یہ اردو میں پہلی منضبط تحریر ہے۔

بلکہ مغل تہذیب کے مورخین کے لیے اس عہد کی اخلاقی و سیاسی اقتدار اور حکمت عمل کا ایک لازوال خزانہ ہے۔ غرض قصہ مہر افروز دہلوی نثر کے اسی دور کا ایک مستند نمونہ ہے جب یہ زبان اپنی تشکیل کے ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد ادبی زبان کے مراحل میں داخل ہو رہی تھی جس پر بعد کو میر امن اور انشا نے جدید اردو نثر کی عمارت کھڑی کر دی۔

مولانا فضل علی فضلی

کربل کتھا (ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۹۶۵ء) کے مرتبین جناب مالک رام و مختار الدین مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "مولانا فضلی سے متعلق ہماری واقفیت کا ماخذ صرف یہی کتاب ہے اور کسی جگہ ان کا تذکرہ دیکھنے میں نہیں آیا وہ اپنا نام اور تخلص یوں لکھتے ہیں "المسمی بفضل علی و المتخلص بہ فضلی" ایک شعر میں نام اور تخلص دونوں آ گئے ہیں۔

نام اوس کا جو ہے سو فضل علی اور تخلص کرے ہیں وہ فضلی سے

اس کتاب کی تحریر کے وقت ان کی عمر ۲۲، ۲۳ برس کی تھی چنانچہ لکھتے ہیں:-

"ابتدائے سن رشد و تمیز سے تا اب کہ سن عزیز اس کے حدود عشرین سے دو تین منزل متجاوز کیا ہے۔"

مرتبین لکھتے ہیں کہ چونکہ یہ کتاب انہوں نے ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲-۳۳ء میں لکھی تھی اس لئے ان کا سال ولادت ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۱ء ہونا چاہیے۔ اور چونکہ انہوں نے اس پر ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں نظر ثانی کی کم از کم اس سال تک تقریباً ۳۸، ۳۹ برس کی عمر تک وہ ضرور زندہ تھے۔

"کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" کے محققین گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم مولانا فضل علی فضلی کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں:-

"کربل کتھا کے مترجم مولانا فضل علی فضلی کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ان کے ہمعصر تذکرہ نگاروں نے ان کا قطعی ذکر نہیں کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے زمانہ میں فضلی کی کوئی ادبی اہمیت نہیں تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں میں کریم الدین اور گارساں دتاسی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن فضلی کی سوانح کے بارے میں یہ دونوں بھی خاموش ہیں۔ صرف کربل کتھا واحد کتاب ہے جو اپنے مترجم کی سوانح پر تھوڑی سی روشنی ڈالتی ہے۔ ایک شعر میں فضلی نے اپنا نام اور تخلص اس طرح باندھا ہے:-

نام اُسکا جو ہے کا فضل علی ؛ تخلص کرے ہے وہ فضلی

فضلی نے اپنا تخلص کئی اشعار میں استعمال کیا ہے۔ انہوں نے کربل کتھا کے ترجمہ کی تاریخ ان اشعار سے نکالی ہے:-

یہ جو نسخہ بجا ہے جواب تصنیف ؛ بہر کسب ثواب و فیض بشر
چاہا تاریخ اس کی بولا سروش ؛ شیعیوں کی نجات کا "مظہر"

۱۱۴۵ھ

"ابتدائے سن رشید اور تمیز سے تا اب کہ سن عزیز اوس کے لئے حدود عشرین سے دو تین منزل تجاوز کیا ہے۔"

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ ترجمہ کے وقت فضلی کی عمر ۲۲ یا ۲۳ سال تھی چونکہ ۱۱۴۵ھ میں ترجمہ ہوئی اس لئے فضلی کی ولادت ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ع یا ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ع میں ہوئی غالباً اس ترجمہ میں فارسی اور عربی الفاظ و تراکیب کا استعمال زیادہ تھا۔

اس لئے کچھ عرصہ بعد فضلی کو ضرورت محسوس ہوئی کہ فارسی اور عربی الفاظ کو ہندی الفاظ سے بدلیں اور عبارت کو پہلے سے بہتر بنائیں۔ چنانچہ فضلی لکھتے ہیں:-

"اور اب کہ نظر ثانی کر بکیفیت و کیفیت مضامین و ہندی اصطلاحات و استعارات و رنگین اصلاح دیا۔ وہ تاریخ نے صفحۂ دل پر جلوہ کیا"

۲۹

ہر کس از من کند بہ نیکی یاد ؛ یہ جہان ناشس ہم بہ نیکی یاد

مولانا فضل علی محمد شاہ اور اس کے بیٹے احمد شاہ کے ہم عصر تھے۔ محمد شاہ "رنگیلے" کے عرف سے مشہور ہے۔ وہ اورنگ زیب عالم گیر (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ع) کا پرپوتا اور معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ع) کا پوتا تھا۔ اسے شاہ گر سادات بارہہ نے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ع میں تخت پر بٹھایا اور وہ تخت پر ہشتم ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ع تک حکمراں رہا۔ نادر شاہ نے ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ع میں اس کے عہد میں دلّی کو تاراج کیا تھا۔ مولانا فضلی نے محمد شاہ کا ذکر نثر اور نظم دونوں میں دیباچہ میں جو روایت اولیٰ میں بھی شامل تھا کیا ہے۔

مولانا فضلی نے جب ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ع میں اپنی کتاب پر نظر ثانی کی اُس وقت محمد شاہ وفات پا چکا تھا اور احمد شاہ سریر آرائے سلطنت تھا اس لئے کتاب کے دونوں ابتدائی ناقصوں میں اس نے نظر ثانی کے وقت اضافہ کیا اور احمد شاہ کا ذکر بڑھا دیا۔ چنانچہ فاتحہ نہم (رسنۂ اوّل) میں بطور دعا لکھتے ہیں:-

بعد از این از برائے ظل الٰہ ؛ بادشاہ بہادر احمد شاہ
بادشاہت کے تخت پر قائم ؛ کو سلطنت بخشش وہ رہے دائم

داستان تاریخ اردو کے مصنف تذکرہ شعرائے ہند سے فضلی کے دیباچہ کا کچھ حصہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دیباچہ کی تمام عبارت میں صرف دو فقرے "یہ بات آئینۂ خاطر میں منہ دکھائی" اور "تب آپ زبان اعجاز بیان سے فرمائے"۔

(ان میں پہلا جملہ اُن کی نقل کردہ عبارت میں موجود ہے اور دوسرا جملہ عبارت کے اس حصّہ میں سے ہے جو نقل نہیں کیا گیا) یہ دونوں محاورے خاص دکن کے ہیں اور اُس زمانہ سے دو سو برس بعد آج بھی دکن میں اسی طرح بولتے ہیں۔ دہلی و شمالی ہند میں یہ انداز بیان نہ جب تھا نہ اب ہے۔ یہ محاورے خصوصاً دوسرا محاورہ (آپ...... فرمائے) اس طرح کا ہے کہ جس کی بول چال میں شامل ہو اس سے چھوٹ نہیں سکتا۔ جیسا کہ حیدرآباد وغیرہ مقامات دکن کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی آج تک بولتے ہیں۔ جس شخص کا یہ روزمرہ نہ ہو اُس کی زبان و قلم سے کبھی نہ نکلے گا۔ اس سے قریب زمانے کے مصنفین دہلی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب وغیرہ کی نثر میں یہ انداز بیان نہیں پایا جاتا اور دکن کی تصانیف میں اس کے بہت بعد تک موجود ہے۔ دکن میں مولوی قادر علی نے ایک کتاب "مصباح الصلوٰت" کے نام سے ۱۸۱۶ء / ۱۲۳۲ھ میں تحریر کی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:۔

"صاحب مصباح الصلوٰۃ معتبر کتابوں سے لکھیا۔ جو شخص کو فرائض اور واجبات نماز کی نہیں جانتا نماز اس کی روایتیں شیخ ابوحفص کبیر فرمائے کا ذرّہ نعوذ باللہ منہا؟"

اس بنا پر مولانا فضلی کا دکنی الاصل ہونا لازم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فضلی دکن میں نہیں رہے۔ شمالی ہند میں رہ کر انہوں نے علم حاصل کیا۔ انشاپردازی سیکھی اور تصنیف و تالیف کی۔ اُن کے دیباچہ کی تمام نثر میں اور کہیں دکنی الفاظ، روزمرہ اور اسلوب بیان نہیں پایا جاتا۔ جبکہ دکن میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک الفاظ و زبان کی قدامت موجود ہے چنانچہ محمد عثمان حسینی کی کتاب (لازم الاسلام) مرتبہ ۱۸۴۵ء / ۱۲۶۱ھ کا ایک فقرہ یہ ہے۔

"پس جان تو پیدا کرنے ہارا سب عالم کا شاید کوئی دوسرا ہے۔"

اور اسی زمانے میں مصنف مولانا غوثی اپنی تفسیر غوثی میں لکھتے ہیں:

"اور بعضے کافران بولتے ہیں کہ حشر برحق ہے کہ ہمارے بتاں حشر کے روز ہم کو چھوڑا ینگے۔"

اس کے علاوہ مولانا فضلی کے دکن میں نہ رہنے کے متعلق مولانا احسن مارہروی کا یہ استدلال بھی بالکل درست ہے کہ فضلی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔ (لہٰذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمۂ فارسی زبان ہندی نثر نہیں ہوا استماع) حالانکہ دکن میں مولانا فضلی کے زمانہ میں اس سے پہلے بے شمار ترجمے ہوئے۔ فضلی دکن میں ہوتے تو ان ترجموں کا اُن کو ضرور علم ہوتا اور ایسا نہ لکھتے۔[۳۱]

کربل کتھا میں دکنی لہجہ بھی بہت نمایاں ہے۔ دکنی زبان کے متعلق بعض ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یہ بہت حد تک کھڑی بولی اور ہریانی سے متاثر ہے اور جو مماثلت دکنی اور پنجابی میں ملتی ہے وہ ہریانوی کے واسطے سے آئی ہے جو دراصل پنجابی کا ہی ایک روپ ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ مولانا فضلی کے ہاں بھی جو دکنی کی مثالیں ملتی ہیں وہ اصل میں اُن کی پنجابی سے واقفیت کا نتیجہ ہوں۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ کربل کتھا کی تالیف سے پہلے ۱۷۳۲ء / ۱۱۴۴ھ میں ولی کا دیوان دلی میں پہنچ چکا تھا اور گمان غالب ہے کہ فضلی نے بھی اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ اس کے مطالعہ کا بھی اُن کی تحریر میں اثر نمایاں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں مرتبین نے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔[۳۲]

مرتبین کربل کتھا نے لسانی اہمیت کے باب میں اس کے لسانی پہلو کا تجزیہ کرتے ہوئے کہ فضلی نے پنجابی کے الفاظ اور لہجہ استعمال کیا اور اس کی مثالیں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ سب ٹھیٹ پنجابی الفاظ ہیں اور

اور آج صدیاں گذر جانے کے باوجود بھی اسی طرح سے اور انہی معنوں میں مستعمل
ہیں۔ فضلی کے یہاں اُن کا استعمال ایسا برمحل اور برجستہ ہوا ہے کہ اس سے
یقین ہوتا ہے کہ وہ پنجابی ضرور جانتے تھے۔ ہندسوں میں خاص طور پر پنجابی کا
استعمال ہوا ہے۔[۳۱]

مولانا حامد حسن نے کربل کتھا میں دکنی محاورے ہونے کی وجہ سے اُن کو
دکنی الاصل بتایا۔ اس رُو سے وہ پنجابی بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا
ہے کہ اس میں پنجابی الفاظ بھی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ بقول مرتبین "کربل کتھا"
دہلی ایک ایسے مرکز پر واقع ہے جس کے چاروں طرف مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔
دلی کے شمال مشرق میں کھڑی بولی جنوب مشرق میں برج بھاشا شمال مغرب میں
پنجابی اور جنوب مغرب میں ہریانی رائج رہی تھی۔ اس لئے صوتیاتی ڈھانچہ اور
صرف نحو کے اعتبار سے اردو کھڑی بولی سے بہت قریب ہے لیکن دہلی کے گرد و
نواح میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی کچھ نہ کچھ خصوصیات اس میں موجود ہے۔

کربل کتھا کی لسانی اہمیت اور اردو زبان کی تاریخ میں اس کے نمایاں مقام
سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مرتبین کربل کتھا لکھتے ہیں یہ کتاب دہلوی زبان کا
پہلا نقش ہے اور اس وقت تک ہمیں یہاں کے کسی مصنف کی اس سے قدیم تر
نثری تخلیق دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب عوام کا تو کیا
ذکر بڑے بڑے امیروں کے گھروں میں بھی فارسی کا چلن کم ہونے لگا تھا اور
اردو کا رواج روز افزوں ترقی پر تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو اب کوچہ و
بازار، مجالس و دربار میں بخوبی سمجھی جانے لگی تھی۔ راعی اور رعایا، عالم اور عامی،
امیر اور فقیر اگر روز مرہ کی عام گفتگو میں اس کو ہر وقت استعمال نہ کرتے ہوں۔

جب بھی اسے آسانی سے سمجھنے سب تھے۔[۳۲]

کربل کتھا کا نام ہمارے علمی اور ادبی حلقوں میں بہت دنوں سے معروف
ہے۔ سب سے پہلے اس کا تذکرہ مولوی کریم الدین نے کیا جن کے پاس اس کا
ایک قلمی نسخہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"فضل علی نام تخلص فضلی محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وہ موجود تھا۔
اس نے [illegible] اردو زبان میں ابتدا کے محاورات پر لکھی۔ وہ خود کہتا ہے
کہ ان ایام میں میری عمر بائیس برس کی تھی۔ اور اس کتاب کا نام اس نے
کربل کتھا رکھا ہے۔ سبب تصنیف اس کتاب کا جو اس نے بیان کیا تھا بعینہ
اس کی عبارت بے کم و کاست لکھتا ہے۔[۳۳]"

اس کے بعد انہوں نے طویل اقتباس دیا ہے جو اس نسخہ کے صفحات
۳۰ تا ۴۱ پھیلا ہے۔ اس کے بعد مرتب فہرست وغیرہ کا اسپرنگر، قاسمی، محمد حسین
آزاد، فرزند احمد صفیر بلگرامی، احسن مارہروی، شمس اللہ قادری، نصیر حسین خاں
خیال، حامد حسن قادری غرض جس کسی نے بھی جو کچھ اس کتاب سے متعلق
لکھا طبقات شعرائے ہند کے اسی اندراج پر مبنی ہے۔[۳۴]

کربل کتھا کی تالیف سے متعلق خود مولانا فضلی کا بیان جس کو مرتبین "کربل کتھا" نے
مقدمہ میں پیش کیا ہے بہت مفصل اور مستند ہے۔ مولانا فضلی کے اسی بیان سے مرتبین
کربل کتھا نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کتاب کا صحیح نام کربل کتھا ہے
مذکورہ مجلس کریم الدین نے اس کا نام "وہ مجلس" اپنی طرف سے رکھا اور غلط رکھا۔

نیز اس بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی
کی تصنیف روضۃ الشہدا کا نہیں بلکہ اس کے اختصار یا تلخیص (خلاصہ روضۃ الشہدا)

... پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے ذی علم حضرات سے استفادہ کیا۔ بعد میں ہرات میں مقیم ہوئے۔ جہاں وہ حضرت جامی سے بھی مستفید ہوئے۔ وہ بلند پایہ عالم اور اچھے مصنف ہونے کے علاوہ خوش گفتار اور زبان آور خطیب بھی تھے۔ اُن کا مقام مذہبیات اور ریاضیات میں بہت بلند تھا۔ اُن کی تصانیف بیس سے زاید کتابیں بتائی جاتی ہیں۔ جن میں جواہر التفسیر، تفسیر حسینی، اخلاق محسنی، انوار سہیلی بہت مشہور و معروف ہیں۔ لیکن جس کتاب کی شہرت عوام تک پہنچی اور جس نے لاکھوں قلوب کو مسخر کیا وہ اُنکی کتاب روضۃ الشہدا ہے جو ایران اور ہندوستان میں مجالس عزا میں کثرت سے پڑھی جاتی ہے۔ کتاب کی مقبولیت کو دیکھ کر کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ روضۃ الشہدا ہندوستان کے مصنفین و شعرا کے نزدیک بھی بہت مقبول رہی ہے۔ غالباً سب سے پہلے گولکنڈہ کے ایک شخص ویلوری نے ۱۰۹۲ھ میں اس کا دکنی نظم میں ترجمہ کیا تھا اس کے بعد اردو کے بعض مصنفین اور شعراء نے روضۃ الشہداء کے طرز پر خود بھی کتابیں لکھی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب نے کاشفی کی کتاب سے استفادہ کیا۔ اس سلسلے کی ایک اہم اور قدیم کتاب فضل علی فضلی کی لکھی ہوئی کربل کتھا ہے۔

بیشک مولانا فضلی نے روضۃ الشہداء کے مضامین کو عام فہم اردو (ہندی) میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کی طرف مرتبین کربل کتھا کے علاوہ رام بابو سکسینہ صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ فضلی کی بڑی آرزو تھی کہ یہ کتاب نہایت سہل اور عام فہم زبان میں جو اُس وقت مروج تھی لکھی جائے۔ مگر چونکہ مذہبی کتاب تھی اور اُن کے (فضلی کے) سامنے اس سے پہلے کوئی نمونہ موجود نہ تھا لہذا انہیں اس کے قلمبند کرنے میں بہت پس و پیش تھا۔ تاہم فضلی کا یہ کارنامہ دہلوی نثر کی تاریخ میں اپنا مستقل مقام رکھتا ہے۔ قصہ مہر افروز کے مصنف اور اس کے زمانہ تصنیف کے بارے میں ابھی ہماری معلومات قطعی نوعیت کی نہیں۔ لیکن کربل کتھا یقینی طور پر ایک ایسی تصنیف ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی مطابق تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول میں دہلی کی بول چال کی زبان کا

نمونہ پیش کرتی ہے۔

مرزا رفیع سودا دہلوی

اس دور کے شعرا میں جنہوں نے اردو زبان اور اردو نثر کی طرف بھی توجہ کی۔ مرزا رفیع سودا بھی ہیں۔ جن کا تفصیلی ذکر مقالۂ ہذا کے پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ یہاں اُن کے صرف نثری کارناموں کا تذکرہ ضروری ہے۔ سودا کے متعلق محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ مرزا کی زبان کا حال نظم میں تو سب کو معلوم ہے اور وہ کبھی نثر بھی لکھتے مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ نقطہ معری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثر اردو ابھی بچہ ہے، زبان نہیں کھلتی۔ چنانچہ میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو نثر میں لکھا تھا جس کی عبارت سے واضح ہے کہ اردو ہے مگر مرزا بیدل کی نثر فارسی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مذکورہ اس وقت موجود نہیں لیکن ایک دیباچہ میں انہوں نے تھوڑی سی نثر لکھی ہے۔ تاہم یہ اردو نثر کی خوش بختی ہے کہ اس شاعر اعظم کے دیوان مراثی کا دیباچہ نثر میں لکھا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ وہ ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اُن کی طبیعت نے صرف غزل بلکہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہجو غرض ہر صنف کلام میں اپنے جوہر دکھائے۔ اس آگ نے انہیں نثر میں لکھنے پر مائل کیا۔ چنانچہ عام شاعروں کی عادت کے برخلاف انہوں نے اپنے دیوان مراثی کا دیباچہ اردو میں لکھا۔ شعر کی طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نثر میں بھی فارسی اساتذہ کے نمونے ان کے محرک بنے کیونکہ اس میدان میں بھی انہوں نے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ یہ چیز ان کے جابجا دروبست لفظوں کے انتخاب اور قافیہ اور سجع کے التزام سے واضح ہو جاتی ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے۔ جو طوطئ ناطقہ شیریں سخن ہو پس یہ چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ در یختہ۔ خامہ دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کروں، تا زبانی ان اشخاص کے ہمیشہ مورد تحسین دم فزوں رہوں ......"

"شعلۂ عشق" کے متعلق ناقدین کا خیال یہ ہے کہ شاید آزاد کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ سودا کی اس نثر کا وجود مشکوک ہے۔ کیونکہ سودا کی یہ نثری تحریر اہل اردو کے لئے بہت اہم تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ ہم عصر تذکرہ نگار اس کا ذکر نہ کرتے۔ علاوہ اس کے مثنوی سبیل ہدایت پر سودا نے ایک مختصر سا اردو دیباچہ بھی لکھا تھا جو مثنوی کے درمیان میں شامل ہے۔

غرض سودا کی نثر کے یہ مختصر نمونے دہلوی نثر کے اولین نمونوں میں شمار ہوتے ہیں۔

حکیم شریف خاں دہلوی متوفی ۱۸۰۷ء

مولانا حامد حسن قادری کے سوا کسی اور ادبی مورخ نے آپ کا ذکر نہیں کیا۔ آپ ملا علی داؤد برادر ملا علی قادر کی اولاد سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت خواجہ عبید اللہؒ سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب کے اجداد میں سے ایک بزرگ بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے اور حیدرآباد میں قیام کیا۔ حکیم شریف خاں کے دادا حکیم محمد واصل خاں آگرہ آکر سکونت پذیر ہوگئے۔ پھر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔

حکیم واصل خاں شاہ علیم اللہ کے خلیفہ تھے۔ ان کے بیٹے حکیم اکمل خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد سلطنت (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے طبیب خاص ہوئے اور "حاذق الملکؒ" کا خطاب پایا۔ ان کے بیٹے حکیم شریف خاں تھے جو ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علوم کی۔ بڑے مشہور و مستند عالم تھے فن طب میں ثانی بوعلی سینا سمجھے جاتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد (۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء تا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) میں شاہی طبیب تھے۔ "اشرف الحکماءؒ" کا خطاب ملا تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق رکھتے تھے ۱۱۹۴ھ/۱۷۷۹ء میں حدیث شریف کی کتاب "مشکوٰۃ" کا فارسی ترجمہ "کاشف المشکوٰۃ" کے نام سے کیا۔ "حاشیۂ نفیسی" "حاشیۂ شرح اسباب" "اشارِ نبوت" "شرح حمد اللہ" وغیرہ متعدد عربی و فارسی کی تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں انتقال کیا۔

رفتار اردو کے سلسلے میں حکیم شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمۂ اردو سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی مرحوم (متوفی ۱۹۳۶ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔ اس ترجمہ سے سورۂ فاتحہ کی صرف پہلی آیت کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

"جو تعریف کے اوّل سے آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے پالنے والا ہے۔ تمام عالموں کا بخشنے والا وجود کا آخرت میں"۔

یہ صرف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا ترجمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے باوجود ترتیب لفظی کے تشریحی ترجمہ کیا ہے۔ لفظ اَلْحَمْد کا ترجمہ اور مترجم "سب تعریف" یا "تمام تعریفیں" کرتے ہیں لیکن حکیم صاحب نے لکھا ہے۔

"جو تعریف کے اوّل سے آخر تک موجود ہے۔" اِسی طرح رَبُّ العالمین کے ترجمہ
میں "پالنے والا کے آگے" بخشنے والا وجود کا آخرت میں بھی بڑھا دیا ہے تاکہ
رَبّ کا مفہوم واضح ہو جائے۔ یعنی اِس عالم میں رُوح کی تربیت کے بعد
آخرت میں باقی مراتبِ روحانی کا طے کرانا بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں
شامل ہے۔ قرآن کا یہ قدیم ترجمہ اُردو نثر کے قدیم کارناموں میں اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا شاہ رفیع الدین محمّدؒ (مترجم قرآن مجید ۱۷۷۶ء)

شاہ رفیع الدین صاحبؒ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے
دوسرے صاحبزادے تھے ان سے بڑے شاہ عبدالعزیزؒ تھے اور ان سے
چھوٹے دو بھائی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ اِن
بلند پایہ علماء میں سے تھے جو صدیوں بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔[۲۳] آپ نے دہلی میں
رُشد و ہدایت کا کام اُسی وقت سے شروع کیا جب کہ شاہانِ مغلیہ کی عظمت
کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب کی مشہور و معروف تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" ہے۔
اِس میں انہوں نے احکامِ شریعت کے جو اسرار و معارف بیان کیے ہیں وہ
دنیائے اسلام میں ان سے پہلے کسی نے نہیں بیان کیے تھے۔ اِس اعتبار سے
اُن کا رتبہ امام رازیؒ اور امام غزالیؒ سے بڑھا ہوا ہے۔[۲۴] شاہ صاحب کی اس
تصنیف کے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ درحقیقت علم کلام کی رُوحِ رواں ہے۔[۲۵]
شاہ ولی اللہ صاحب نے علاوہ اور تصانیف کے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا
تھا۔ اِن کے دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدین صاحب نے اُردو ترجمہ
۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ میں کیا تھا۔ اِس ترجمہ کے متعلق مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں

"ترجمہ اس قدر لفظی اور بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانہ میں
کیا اس زمانہ میں بھی بول چال کی زبان ایسی نہ تھی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عربی زبان
کی وسعت اور بلاغت اور قرآن مجید کی معجز نما عبارت ترجمہ کی گرفت میں
نہیں آ سکتی اور شاہ صاحب جیسے بزرگ کو آیت آیت اور لفظ لفظ پر
یہ خیال تھا کہ ہماری طرف سے کوئی ایسی کمی و بیشی نہ ہو جائے جس سے مطلب
کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اِس لیے اُن کے نزدیک بہترین صورت یہ تھی کہ ہر لفظ اور ہر حرف
کا ترجمہ عربی کی ترتیب کے مطابق اس موقعہ پر لکھ دیا جائے خواہ وہ عبارت
محاورہ کے خلاف ہو جائے"[۲۶]

شاہ عبدالقادر صاحبؒ

اُس زمانہ میں دو تین سال بعد شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ
عبدالقادرؒ نے بھی قرآن مجید کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ یہ ترجمہ بھی سلیس اور
بامحاورہ نہیں۔ تاہم حامد حسن قادری صاحب کی رائے اِس ترجمہ کے متعلق
حسبِ ذیل ہے: "شاہ صاحب نے لفظ لفظ اور حرف حرف کا ترجمہ کرنے کے مقابلے
میں ادائے مفہوم اور وضاحتِ مطلب کو زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ اِس لیے اُن کا
ترجمہ پہلے ترجمے کی نسبت مختصر اور صاف ہو گیا ہے۔ اِس لیے نہایت مقبول ہوا اور
کثرت سے چھاپا اور پڑھا گیا۔ اِس سلسلے میں قادری صاحب نے شاہ صاحب کے
انہیں آیات کا ترجمہ نمونتاً پیش کیا ہے۔ جنہیں اُن کے بڑے بھائی کے بارے میں
نمونتاً پیش کیا گیا تھا۔ اور اِس حقیقت کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے کہ یہ
ترجمہ پہلے ترجمہ سے بقدر ایک سطر کے مختصر اور زیادہ سلیس ہے۔"[۲۷]

شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے ترجمہ پر تفسیری حاشیے بھی لکھے اور اسکا
نام موضح القرآن رکھا۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں " ناظرین کو اس ترجمہ کے
محاسن کا اندازہ خود مولوی نذیر احمد کی رائے سے بخوبی ہوگا جو اس بارے میں
ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی خود مترجم القرآن ہیں اور جو خوبیاں انکو
اپنے ترجمہ کے وقت اس ترجمہ میں نظر آئیں انہوں نے اپنے الفاظ میں اس کا اظہار کیا۔
ہے کہ یہ بزرگ زمانہ کے حالات پر کیسی وسیع نظر رکھتے تھے کہ سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں ان کے
والد بزرگوار نے فارسی ترجمہ کی ضرورت محسوس کی پھر سو نہیں، دو سو نہیں صرف
پچیس برس بعد ان کے بیٹے شاہ عبدالقادر کو معلوم ہوا کہ عام مسلمان فارسی کم سمجھتے
ہیں کہ سنہ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں انہوں نے اردو ترجمہ کیا جو موضح القرآن کے نام سے مشہور ہے
اور اردو کا بہتر سے بہتر ترجمہ سمجھا جاتا ہے اور فی الواقع اپنے وقت میں بہتر سے بہتر تھا۔

محمد حسین کلیم

محمد حسین کلیم میر تقی میر کے بہنوئی دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک سپاہی
پیشہ مرد تھے۔ نہ ان کی ولادت و وفات کے سنین معلوم ہو سکے، نہ خاندان کا پتہ
چل سکا اور نہ تعلیم و تربیت کے بارے میں علم ہو سکا۔ تاہم تذکروں سے اتنا پتہ
ضرور مل جاتا ہے کہ وہ دورِ محمد شاہ کے بعد جوان تھے۔ میر اور قائم کے تذکرے
لکھے جانے کے وقت نظم و نثر میں اتنا سرمایہ جمع کر چکے تھے کہ اس کی وجہ سے
معاصرین میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔

اکثر تذکرہ نگار ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ قائم
لکھتے ہیں کہ "صاحب التعظیم و تکریم محمد حسین کلیم متوطن دہلی است مراتب

دانش کسب کردہ و سرمایہ سخن برائی بدست آوردہ حاصل کلام چنین شاعر زبردست
است کہ اورا پہلوان سخن می توان گفت قریب بست ہزار بیت تحریر
و غزل بر وضع اشعار مرزا بیدل در حقیر خامہ و زبانش ترتیب یافتہ"

قائم کی اس تحریر کی بنا پر مصحفی کو لکھنا پڑا۔

"محمد قائم تعریفش در تذکرہ خویش بمبالغہ نوشتہ"

لیکن سچ پوچھئے تو ان کی تعریف میں یہ باتیں مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ وہ
ایک جامع کمالات اور بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ میر جیسے نازک مزاج اور سخت گیر
شخص تک ان کے اخلاق و عادات اور ان کی سخن سنجی، سخن فہمی، زورِ طبیعت
ذہنِ رسا اور طرزِ ادا سب کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ اخلاق کے بارے میں
فرماتے ہیں "اگرچہ مجھ سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں لیکن ویسے بھی مجھے ان سے
بے حد خلوص ہے اور مجھ ہیچمداں پر شفقت اور مہربانی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انکو
زندہ رکھے"

طرزِ تحریر، اندازِ بیان، شعر فہمی وغیرہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان
الفاظ میں کرتے ہیں "ان جیسا طرز کسی کا نہیں۔ اکثر مرزا بیدل کی زبان میں لکھتے ہیں۔
شعر فہمی میں بھی ان کی کوئی برابری نہیں کر سکتا۔ ان کی طبع رواں، سیلِ رواں کے
مانند اور فکر نہایت بلندی تک جاتی ہے۔ مصحفی نے ان کو صاحب تصنیف بسیار
لکھا ہے۔ انہوں نے محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم، اور دہ مجلس کا
منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اگرچہ بقولِ قائم بعض وجوہ کی بنا پر وہ فصوص کے ترجمہ کو
مکمل نہیں کر سکے تاہم یہی بات کیا کم ہے کہ جس کتاب کے معنی و مطالب کو اوسط
درجہ کے مولوی سمجھ نہیں سکتے، وہ اس پر اتنی قدرت رکھتے ہوں کہ اس کے ایک

حقہ کا نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ترجمہ کر دیں۔ مرزا لطف علی لطف لکھتے ہیں:۔
"کلیم نے عروض و قافیہ پر اردو میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں
شیفتہ لکھتے ہیں کہ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ طب بھی
جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک قصیدہ میں اپنے ہم عصر شعرا کا تذکرہ لکھا تھا، دیوان اور
مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔"

لیکن افسوس یہیں اس بات کا ہے کہ اتنے بڑے فاضل شخص کے حالات
ابھی نہ تذکرہ مشائخ" میں ملے اور نہ کسی کتاب میں۔ معلوم نہیں کس خاندان
میں پیدا ہوئے۔ کس سے تعلیم پائی۔ کس کی صحبت میں حقائق و معارف کا چسکا
پڑا۔ کس سے مشورہ سخن کرتے تھے اور کب وفات پائی۔

کلیم کی مذکورۂ بالا تصانیف اب نایاب ہیں اور کسی کتب خانہ میں اُن کی
موجودگی کا تذکرہ نہیں ملتا۔ حامد حسن قادری مرحوم نے نمونہ کے طور پر ان کی نثر کا
ایک فقرہ نقل کیا ہے۔ جس کے بارے میں لکھتے ہیں: "میر حسن نے کلیم کا صرف
ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی
فقرہ تبرک کے طور پر تمام مصنفین آب حیات، 'سیر المصنفین' 'دلی میں اردو'
وغیرہ میں دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے۔ وہ فقرہ حسب ذیل ہے۔

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے اور فقیر
ایسی دولت سے زنہار زنہار فاعتبروا یا اولی الابصار۔"

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں کہ یہی ایک دو جملے ہیں جو کلیم کی نثر کے نمونے کے
طور پر اب ہماری دسترس میں ہیں۔ کلیم شاعر بھی اچھے تھے۔ اکثر تذکرہ نویس
اُن کو اعلیٰ پایہ کا شاعر نہیں مانتے لیکن اُن کے اشعار سے اندازہ کر سکتے ہیں
کہ کلیم اپنے زمانہ کے منجھے ہوئے سخن سنج تھے۔

گارساں دتاسی نے ایک کتاب "روضۃ الشعرا" کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن
اس کے مصنف کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ حاشیہ میں مترجم نے اسے محمد حسین
کلیم کی تصنیف بتایا ہے۔ حاشیہ کی عبارت یہ ہے۔

"مصنف کو دھوکا ہوا ہے۔ یہ تذکرہ نہیں بلکہ کلیم کا قصیدہ ہے۔ جس کا
اوپر ذکر ہوا ہے۔"

سوا اس کے محمد حسین کلیم کی اور کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ کلیم کے
مندرجہ بالا ان دو جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کی نسبت شمالی ہند میں
عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا چلن زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف
دکن کی زبان سلیس اور عام فہم تھی۔ لیکن شاد عظیم آبادی کا یہ کہنا کہ ۱۸۵۵ء
تک کوئی نثر اردو کی کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری جس میں کوئی فن یا کسی
طرح کا قصہ بیان ہوا ہو۔ جا بجا اگلے وقت کی عبارتیں لکھی دیکھی ہیں۔
جن میں لغات غیر مانوس عربی فارسی کا جا بجا اور قافیوں اور ذو معنی
لفظوں کے چھوٹے نگینے بہت جڑ دیئے ہیں لیکن اب قصہ مہر افروز و دلبر
اور کربل کتھا کی دریافت کے بعد شاد صاحب کی رائے کو نظر ثانی
کرنا پڑے گا۔

مرزا جان طپش

ان کا اصلی نام مرزا محمد اسمٰعیل تھا۔ مگر مرزا جان کے نام سے مشہور
ہوئے۔ اُن کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ اُن کا سلسلۂ نسب
بخارا کے مشہور بزرگ اور صوفی سید جلال الدین المعروف بہ سید جلال

حصہ کا نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ترجمہ کر دیا۔ مرزا لطف علی لُطف لکھتے ہیں :۔

"کلیم نے عروض و قافیہ پر اردو میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں کہ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ طب بھی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک قصیدہ میں اپنے ہم عصر شعرا کا تذکرہ لکھا تھا۔ دیوان اور مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں"۔

لیکن افسوس ہمیں اس بات کا ہے کہ اتنے بڑے فاضل شخص کے حالات ابتک نہ "تذکرہ مشائخ" میں ملے اور نہ کسی کتاب میں۔ معلوم نہیں کس خاندان میں پیدا ہوئے۔ کس سے تعلیم پائی۔ کس کی صحبت میں حقائق و معارف کا چسکا پڑا۔ کس سے مشورہ سخن کرتے تھے اور کب وفات پائی۔

کلیم کی مذکورہ بالا تصانیف اب نایاب ہیں اور کسی کتب خانہ میں اُن کی موجودگی کا تذکرہ نہیں ملتا۔ حامد حسن قادری مرحوم نے نمونہ کے طور پر ان کی نثر کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔ جس کے بارے میں لکھتے ہیں "میر حسن نے کلیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی فقرہ تبرک کے طور پر تمام مصنفین "آبِ حیات" "سیر المصنفین" "نثر دہلی" اُردو وغیرہ میں دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے۔ وہ فقرہ حسب ذیل ہے :۔

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھا اور فقیر ایسی دولت سے زنہار زنہار فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں کہ یہی ایک دو جملے ہیں جو کلیم کی نثر کے نمونے کے طور پر اب ہماری دسترس میں ہیں۔ کلیم شاعر بھی اچھے تھے۔ اکثر تذکرہ نویس اُن کو اعلیٰ پایہ کا شاعر نہیں مانتے لیکن ان کے اشعار سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ کلیم اپنے زمانہ کے منجھے ہوئے سخن سنج تھے۔

گارساں دتاسی نے ایک کتاب "روضۃ الشعراء" کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے مصنف کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ حاشیہ میں مترجم نے اسے محمد حسین کلیم کی تصنیف بتایا ہے۔ حاشیہ کی عبارت یہ ہے۔

"مصنف کو دھوکا ہوا ہے۔ یہ تذکرہ نہیں بلکہ کلیم کا قصیدہ ہے۔ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے"۔

سوا اس کے محمد حسین کلیم کی اور کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ کلیم کے مندرجہ بالا ان دو جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کی نسبت شمالی ہند میں عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا چلن زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف دکن کی زبان سلیس اور عام فہم تھی۔ لیکن شاد عظیم آبادی کا یہ کہنا کہ ۱۸۵۵ء تک کوئی نثر اردو کی کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری جس میں کوئی فن یا کسی طرح کا قصہ بیان ہوا ہو۔ جا بجا اگلے وقت کی عبارتیں لکھی دیکھی ہیں۔ جن میں لغات غیر مانوس عربی فارسی کا جماؤ اور قافیوں اور دو دو معنی لفظوں کے چھوٹے نگینے بہت جڑ دیئے ہیں لیکن اب قصہ مہر افروز و دلبر اور کربل کتھا کی دریافت کے بعد شاد صاحب کی رائے کو نظر ثانی کرنا پڑے گا۔

مرزا جان طپش

ان کا اصلی نام مرزا محمد اسمٰعیل تھا۔ مگر مرزا جان کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کے آباو اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ اُن کا سلسلۂ نسب بخارا کے مشہور بزرگ اور صوفی سیّد جلال الدین المعروف بہ سیّد جلال

بخاری تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد مرزا یوسف بیگ سپاہی پیشہ
آدمی تھے۔ کسی تذکرہ نویس نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے والد کب
اور کس کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے۔ البتہ یہ محقق ہے کہ
طپش دہلی میں پیدا ہوئے۔ صرف ڈاکٹر نیلن کا قول ہے کہ طپش کی ولادت
۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں ہوئی۔ طپش نے دہلی میں نشو و نما پائی اور ان کے بچپن اور جوانی
کا بڑا حصہ علمائے دہلی کی صحبت میں گذرا۔ علم و ادب کے باکمالوں کے
ہاتھوں تربیت پائی۔ طپش نے عربی، فارسی کے علاوہ سنسکرت سیکھی
اور اس میں خاص مہارت بہم پہنچائی۔ منشی کریم الدین مؤلف طبقات الشعرائے
ہند کا بیان ہے کہ طپش کو فنِ بلاغت میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اور
اس کی تحصیل مرزا محمد یار بیگ سائل سے کی تھی اور دہلی میں پیدا
ہونے اور وہیں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے اہلِ دہلی کے مخصوص
محاوروں اور روزمرہ سے بخوبی واقف تھے۔ طپش ابتداً شاہ عالم
بہادر کے ولی عہد مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے دربار میں لازم
ہوئے۔ وہ موروثی سپاہی پیشہ تھے اور جہاندار شاہ کی فوجی خدمت
پر مامور ہوئے اور ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء کے اواخر میں ان کی معیت میں لکھنؤ آئے۔
اور غالباً ان کے انتقال ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۷ء تک وہیں رہے۔ مرزا جہاندار شاہ
کے انتقال کے بعد وہ تمام صحبتیں درہم برہم ہو گئیں اور طپش نے بھی بنارس
سے نکل کر تلاشِ معاش میں صوبۂ بنگال کا سفر کیا اور ڈھاکہ میں نواب
سید احمد علی خاں شمس الدولہ کے مصاحب مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں
نواب مذکور کے ایما پر اپنی کتاب "شمس البیان فی مصطلحاتِ ہندوستان"

لکھی۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۱۲ء تک
کلکتہ میں مقیم تھے اور غالباً اس کے بعد کلکتہ میں وفات پائی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے
لکھا ہے کہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء سے پہلے فوت ہو گئے۔

طپش کا یادگار اور گراں قدر کارنامہ "شمس البیان فی مصطلحاتِ
ہندوستان" ہے۔ یہ کتاب اردو محاورات اور روزمرہ پر ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں
شمس الدولہ رئیس ڈھاکہ کی ایما پر لکھی گئی اور ان ہی کے خطاب کی
مناسبت سے اس کا نام شمس البیان رکھا گیا۔ اس موضوع پر غالباً یہ
سب سے پہلی کتاب ہے اور موجودہ معلومات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے
کہ اس سے پہلے کسی شخص نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس سلسلہ میں
انشا کی "دریائے لطافت" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کتاب میں قواعد
زبان کے علاوہ اہل دہلی کے محاوروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مگر یہ بھی
اس کے بعد کی تالیف ہے اور اس کا سن تالیف ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء ہے۔ شمس البیان
۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں مرشد آباد سے شائع ہوئی۔ اس میں اردو محاوروں کے
معنی ... فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ لیکن ان کی مثالیں شعرائے اردو کے
کلام سے درج کی ہیں۔ اس زمانہ کی تصانیف کی اکثر یہی روش ہے کہ
اردو زبان کے متعلق کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھتے تھے۔ جیسے
انشاء اللہ خاں کی "دریائے لطافت"۔ نفسِ مضمون سے پہلے ایک فارسی
دیباچہ بھی ہے جو ادبی شان سے خالی نہیں اور یہ اس عہد کی فارسی
تحریروں کی طرح مقفیٰ طرز میں ہے۔

مؤلف نے نہایت محنت اور جانفشانی سے کام لے کر ۲۰۰ محاوروں کو

ردیف وار مرتب کیا ہے اور ہر ایک محاورہ کی سند میں حتی الامکان شعرائے
مشاہیر کے شعر دیئے ہیں۔ کہیں کہیں اپنے بھی شعر بطورِ سند پیش کیے ہیں
سندی اشعار میں سب سے زیادہ تعداد میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ
کے اشعار کی ہے۔ مؤلف نے سندی اشعار پیش کرنے میں اس تنگ نظری
سے کام نہیں لیا جس سے بعض اُردو کے نادان دوست اُردو کو صرف
دِلّی اور لکھنؤ کی چار دیواری تک محدود کر کے بات بات پر زبان پکڑا کی
چاہتے ہیں۔ مؤلف کا مولد و منشا شاہجہاں آباد ہونے کے باوجود اُس نے
نہایت آزادی اور وسعت کے ساتھ اُردو کی فطری آزادی کو پیش نظر
رکھ کر دکنی شعراء کے کلام سے بھی استناد کیا ہے[1] مولوی محمد یحییٰ تنہا مصنف
"سیر المصنفین" مولانا حامد حسن قادری مصنف "داستانِ تاریخ اُردو" اور
سیّد محمد مصنف "ارباب نثر اردو" اور محترمہ رفیعہ سلطانہ مصنفہ "اُردو
نثر کا آغاز و ارتقاء" نے نمونۃً وہی محاورے دیئے ہیں۔ ان میں سے صرف
ایک یہاں قلم بند کیا جاتا ہے۔ "انگاروں پر لوٹنا کنایہ از بیقراری کہ
در عالم رشک لاحق گردد ولی دکنی گوید؎

شعلۂ خوبی سے نظر آتا نہیں ٭ تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولیؔ

انشاء اللہ خاں انشاؔ

گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ انشاؔ کے
زمانے تک نثرِ اُردو اظہارِ خیال کے ادبی سانچوں کی حیثیت اختیار کر چکی
تھی۔ چنانچہ اکثر شاعروں نے شعر کے بجائے نثر کو اپنے خیالات کا ذریعہ

بنانا شروع کر دیا۔ انشاؔ ایک جدت پسند شاعر کی حیثیت سے اُردو ادب کی
تاریخ میں اس درجہ اہمیت نہیں رکھتے جس درجہ اُردو نثر میں اُردو زبان
کے بعض پہلوؤں کے مطالعہ کے سلسلہ میں اُن کی "دریائے لطافت" کو اہمیت
حاصل ہے۔ دریائے لطافت کا آخری حصّہ جو قتیلؔ سے منسوب ہے ایک
روایتی چیز ہے۔ لیکن قواعد زبان کا وہ حصّہ جس میں اُردو حروف اصوات
سے بحث کی گئی ہے وہ انشاؔ کے زمانہ کے لئے غیر معمولی چیز ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ اُردو حروف یا اصوات سے متعلق انشاؔ کے بعض نظریئے ہماری
موجودہ لسانی معلومات کے لحاظ سے ناقابلِ قبول ہیں۔ لیکن اس میں انشاؔ
کا قصور نہیں۔ ہمیں ان کے عہد کے علمی پس منظر میں ان کے کارناموں کا
جائزہ لینا ہوگا۔ انشاؔ کے یورپی معاصرین کے لسانی نظریوں کو بھی جدید دور کے
علماء اسی طرح مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ اصل چیز جو انشاؔ کی کوششوں میں دیکھنے
کی ہے وہ اُن کا تجزیہ پسند ذہن اور فکر کی اُپج ہے۔

اب تک انشاؔ کی جتنی نثری تصانیف دستیاب ہوئی ہیں اُن کی مجموعی تعداد
پانچ ہے (۱) دریائے لطافت (۲) لطائف السعادت (۳) رانی کیتکی کی کہانی
(۴) سلک گوہر (۵) ترکی روزنامچہ۔ یہ تمام تصانیف یمین الدولہ نواب سعادت علیخاں کے
زمانۂ ملازمت یا اس کے بعد کی ہیں۔[1]

دریائے لطافت

ان تصانیف میں سیّد انشاؔ کی سب سے بڑی یادگار اور قابلِ تعریف
تصنیف "دریائے لطافت" ہے۔ اس میں اُردو صرف نحو منطق عروض و قافیہ

معانی و بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کے مسائل اور موضوع کا تعلق اُردو زبان سے ہے۔ تذکروں میں بتایا گیا ہے کہ انشاءاللہ خاں نے یہ کتاب اپنے دوست قتیلؔ کے ساتھ مل کر لکھی تھی۔ اس کا دوسرا حصّہ جس کا تعلق معانی اور عروض سے ہے قتیلؔ کا ہے۔ زبان کے قواعد سے متعلق پہلا حصّہ انشاؔ کا لکھا ہوا ہے۔ اصل متن فارسی زبان میں ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۷ء / ۱۲۲۲ھ میں مکمل ہوئی۔ انشاؔ نے سعادت علی خاں کی رعایت سے اس کا نام "ارشادِ ناظمی اور بحرِ سعادت" تجویز کیا تھا۔ اور قتیلؔ نے "دریائے لطافت" اور "حقیقتِ اُردو"۔ لیکن مقبولیت جیسا کہ ظاہر ہے "دریائے لطافت" کو ہی حاصل ہوئی۔ اس بیان کو قبولِ عام کی سند خود انشاؔ اور قتیلؔ کے زمانہ میں ہی مل چکی تھی۔ چنانچہ ایک معاصر تذکرہ نگار نثار احمد علی خاں یکتا انشاؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"غوّاصِ بحرِ فصاحت صاحبِ دریائے لطافت"

"دریائے لطافت کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں اُردو کی صرف و نحو بلحاظ زبان لکھی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں عربی فارسی وغیرہ کی اندھی تقلید نہیں کی گئی۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ زبان کے اصول و ضوابط اُس کی فطرت اور ساخت کے مطابق مقرر کئے گئے ہیں۔

انشاؔ نے اس کتاب میں اس چیز پر بھی خاص طور سے زور دیا ہے جو لوگ لفظ کی فصاحت کی سند شعراء کے کلام سے لیتے ہیں غلطی پر ہیں۔ اور یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ شعراء دوسرے افراد کے مقابلے میں فصیح ہوتے ہیں۔ وہ بعض ایسے الفاظ ضرورتِ شعری سے مجبور ہو کر باندھ جاتے ہیں جو زبان کے خلاف ہیں۔ وہ تو ضرورتِ شعری کی بنا پر کرتے ہیں مگر ان کے شاگرد اور مقلد

اسے کلیہ سمجھ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ کتاب کی جان پہلا حصّہ ہی ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بعض اہلِ یورپ نے متعدد کتابیں اُردو قواعد پر لکھی تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہلِ زبان نے اُردو صرف و نحو پر لکھی ہے۔ بابِ اوّل کی پہلی فصل بعنوان "اُردو کی کیفیت" کے تحت اُردو کے مولد و منشاء اور مرکز کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اُردو کا مولد دِلّی ہے۔ کیونکہ ہر ملک میں یہ قاعدہ ہے کہ اس کے صاحبِ کمال اُس شہر میں اکٹھا ہوتے ہیں جس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے جس شہر کے رہنے والوں کی تحریر و تقریر دوسرے شہروں کے باشندوں سے مختلف و بہتر ہو جاتی ہے۔ دِلّی بیشتر مغل بادشاہوں کا دارالخلافہ تھی۔ فنونِ لطیفہ اور علومِ شریفہ کے تمام باکمال رہتے تھے۔ بے شک لاہور، ملتان، آگرہ اور الٰہ آباد بھی اپنے ذی شوکت حکمرانوں کی بدولت اس کے ہم چشم رہے۔ لیکن اُن کو اس کی سی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ دِلّی میں بادشاہت زیادہ عرصہ تک رہی اس لیے اس کے خوش بیانوں نے متفق ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے الفاظ منتخب کر کے بعض عبارتوں اور محاوروں میں تصرف اور پیچیدہ تمام زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی۔ یہی نئی زبان اُردو ہے۔

مذکورۂ بالا بیان سے اُردو کے آغاز کے متعلق انشاءؔ کی رائے بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بھی دوسرے قدیم ماہرینِ لسانیات کی طرح اُردو کو ایک کھچڑی زبان قرار دیتے ہیں۔ اُردو کے آغاز کے متعلق موجودہ محققین کے نظریوں کے

سامنے انشاؔ کا نظریہ بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔

وہ دلی کی تہذیب و شائستگی، نشست و برخاست اور تحریر و تقریر پر بہت زور دیتے ہیں۔ دہلی والوں اور بیرون جات کی زبان کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔

اردو کے اجزائے ترکیبی کے متعلق انشاء اللہ خاں کا یہ خیال ہے کہ اردو زبان کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے جیسے عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، پوربی اور برجی وغیرہ۔ اس کی انہوں نے ایک مدلل اور جامع مثال بھی پیش کی ہے۔ جس کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں اور اس میں مذکورۂ بالا تمام زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن بخوف طوالت ہم اسے یہاں نقل کرنے سے قاصر ہیں۔

دوسرے باب میں دہلی کے محلوں کی تمیز کے متعلق بڑی دلچسپ بحث کی ہے اور یہ تفصیل سے بتایا ہے کہ کس کس محلے کی زبان فصیح ہے اور کہاں کہاں کی غیر فصیح۔

انشاء اللہ خاں اس باب کی پہلی فصل میں دلی کے مختلف فرقوں کی زبان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ دہلی کی ہندو آبادی کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جن میں بعض کو مسلمانوں کی صحبت ملی اور بعض کو نہیں۔

اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ لیکن اختلاف کی بنا پر سارے شہر کی زبان کو فصیح کہنا غلط ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عامی اور بازاری بھی عام طور پر جاہل میں دوسرے شہروں کے شریفوں اور فصیحوں سے بہتر ہیں[۳۱]۔

انشاؔ لکھتے ہیں کہ دلی کی عورتیں سارے ہندوستان کی عورتوں سے زیادہ فصیح بولتی ہیں۔ ان کی زبان کا ایک خاص اور منفرد اسلوب ہے۔ ان کی زبان میں

جو لفظ مقبول ہوگیا اس کے اردو ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ لفظ فارسی، ہریانی، ترکی، پنجابی، پوربی، مارواڑی، دکنی، بندیل کھنڈی یا کسی اور زبان کا ہو اردو ہی کہلائے گا[۳۲]۔

انشاؔ نے علم صرف پر بحث کی ہے۔ لیکن یہ ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔ اس موضوع پر ہماری زبان میں صدہا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دریائے لطافت کا یہ حصہ اپنی حیثیت میں بڑی حد تک نامکمل اور ناتمام ہے۔ اس حصہ کا اطلاق ہماری موجودہ طرز تحریر و تقریر پر مشکل ہی سے ہوگا۔ اور اس کا نظرانداز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انشاؔ نے اس میں پنجابی، برج بھاشا، پوربی اور دوسری زبانوں کی قواعد ترکیبی اور افعال پر بحث کر کے الجھا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان زبانوں کے قواعد اس دور میں کسی کام نہیں آ سکتے۔ اس زمانہ میں یقیناً خاصہ کی چیز ہو گی جبکہ اردو کو پوربی، پنجابی اور دوسری زبانوں کے اشتراک کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور ریختہ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

اس حصہ کے متعلق مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ "اردو صرف نحو کی پہلی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے بھی تقدیم اور فضیلت ہے کہ یہ اول کتاب ہے جس میں اردو صرف و نحو بلحاظ زبان بیان کی گئی ہے اور عربی اور فارسی کی اندھوں کی طرح تقلید نہیں کی گئی اگر مابعد کے مؤلفین اس اصول کو پیش نظر رکھتے۔ اس وقت اردو صرف و نحو مکمل ہو جاتی"۔

یہاں مولوی عبدالحق سے غلطی سرزد ہوئی۔ ان سطور کے لکھتے وقت ان کے ذہن میں یہ بات مطلق نہیں رہی کہ کل کی ریختہ اور آج کی اردو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج کی اردو کا زیادہ تر سرمایہ عربی اور

فارسی لغات کا پابند ہے اور وہ اپنے مزاج میں ہندی نژاد ہونے کے باوجود بڑی حد تک ترکیبی اور نحوی سطح پر فارسی کے قریب آگئی ہے۔ اس کے لئے انشا کی محولہ قواعد یا اس انداز کی کوئی دوسری کتاب کارآمد نہیں ہوسکتی اور نہ اسے کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

دریائے لطافت کے موضوع پر احمد علی یکتا نے بھی ایک "دستور الفصاحت" کے نام سے لکھی تھی اور اس میں اردو کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ احمد علی یکتا، مرزا حسن قتیل کے تلامذہ میں سے تھے انہوں نے دلی ہی کی زبان کو سند ٹھیرا کر اردو کی لسانی خصوصیات پر بحث کی تھی۔ اس کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے اس کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انشا کی دریائے لطافت سے پہلے کی تصنیف ہے اب رہا یہ سوال کہ اسے وہ مقبولیت کیوں نہ حاصل ہوئی جو دریائے لطافت کو حاصل ہوئی تو یہاں یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ انشاء کی دریائے لطافت نواب سعادت علی خاں والئی اودھ کی خواہش اور ایماء پر لکھی گئی تھی۔ اس کے برعکس "دستور الفصاحت" کے مولف کے لیے اس کی اپنی ضرورت کا زیادہ دخل تھا جب تک انشاء کی دریائے لطافت گمنامی میں پڑی رہی اس وقت تک محض اس کو یہ درجہ حاصل نہیں ہوا جیسا کہ آج ہے بعینہٖ یہی صورت "دستور الفصاحت" کی ہے۔ اس صورت میں مولوی عبدالحق کا یہ دعویٰ نظر ثانی کا محتاج ہے کہ دریائے لطافت ہماری لسانیات پر پہلی کتاب ہے کیونکہ ہمیں اس کی موجودگی سے پہلے "دستور الفصاحت" کا وجود ملتا ہے۔

تاہم دریائے لطافت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انشاء لسانیات کے بنیادی اصول، زبان کی ساخت اور اس کی نشو و نما کے فطری وسائل سے پوری طرح آشنا تھے۔ اردو اور دوسری زبانوں کے باہمی ربط کو سمجھتے تھے۔ فارسی و عربی کے علاوہ متعدد دوسری زبانوں میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی مختلف زبانیں ان کے گھر کی لونڈی ہیں۔ ابھی پنجابی میں کھڑے ہیں ابھی پوربی میں بیٹھے باتیں کررہے ہیں ابھی برج بھاشائی ہیں ابھی مرہٹی ابھی کاشمیری ہیں ابھی افغانی اور سب زبانوں میں کچھ نہ کچھ کہتے ہیں۔

اسی طرح رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ ،۔ انشا فارسی عربی کے زبردست فاضل تھے۔ اس کے علاوہ ترکی پشتو پنجابی، مارواڑی، کاشمیری اور ہندی خوب جانتے تھے"

ان بیانات سے یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ زبان کے معاملے میں انشاء کی نظر بڑی وسیع تھی۔ علاوہ اس کے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی، فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اردو زبان کی حیثیت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں بھی تتبع کیا ہے۔ وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہیں بھولے۔ نیز اس کے الفاظ کے "تلفظ" پر مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا۔ ان سب کو بڑے لطف سے بیان کیا اور بعض بعض نکات ایسے بیان کیے ہیں جن کی قدر وہی کرسکتے ہیں جنہیں زبان کا ذوق ہے۔ وہ پرانی لکیر کے فقیر بننا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ ایک نئی ڈگر کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ تخیل و تفکر کو ادبی اصولوں اور لسانی بندشوں میں اتنا نہیں جکڑتے تھے جس سے تخیل

کی قوتوں کی طاقتِ پرواز سلب ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں اپنے قاعدوں
کی خلاف ورزی بھی کرنی پڑتی ہے۔

وہ اُردو کا تعلق ہندوستان کی تمام زبانوں سے سمجھتے تھے۔

مگر اُردو کی انفرادیت پر پہلے زور دیتے تھے وہ اُردو کو فارسی کا تابع بنانے
کے قائل نہیں تھے۔ اُن کا نظریہ یہ تھا کہ اُردو زبان کے اپنے قاعدے
اپنی تراکیب اور اپنے اُصول مرتب ہونے چاہئیں اس کے علاوہ الفاظ کا وہی
لب و لہجہ اُردو کے لئے صحیح ہے۔ جس طرح اُردو والے اسے بولتے ہیں۔

انشا کے ذہن میں اُردو کو ایک عام فہم اور ملکی زبان بنانے کا منصوبہ
تھا۔ اور اس کا ایک واضح تصور بھی اُن کے ذہن میں موجود تھا جس کا
ثبوت اُن کی تصانیف نظم و نثر میں ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کی سب سے کامیاب
کوشش رانی کیتکی کی کہانی ہے۔ اس کا سنِ تصنیف ۱۸۰۳ء ہے اور یہی وقت
سے اُردو نثر نگاری کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۸۰۰ء سے فورٹ ولیم کالج
میں اُردو نثر میں تصنیف اور ترجمہ کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا تھا۔ لیکن کالج
سے باہر ابھی کسی شخص کو اُردو نثر سے دلچسپی نہ تھی۔ کالج کے باہر کی تصنیفوں
میں صرف دو کتابیں ملتی ہیں۔ پہلی رانی کیتکی کی کہانی اور دوسری فسانۂ
عجائب۔ فسانۂ عجائب ادق و مسجع اور مقفیٰ عبارت کی وجہ سے فورٹ ولیم کالج
کی نثری تحریک کے منافی ہے۔ اس لحاظ سے صرف رانی کیتکی کی کہانی اور اسکے
چالیس سال بعد غالب کے خطوط کو اُردو کی نثری تاریخ کی اہم کڑیاں سمجھنا
چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کو سر سیّد احمد خاں کی علمی و
ادبی تحریک سے منسلک کرنے والے صرف انشا اور غالب ہیں۔ "رانی کیتکی"

اور دریائے لطافت کے علاوہ "لطائف السعادت" اور "ترکی روزنامچہ"
وغیرہ میں بھی اُردو کے جملے ملتے ہیں۔ اگرچہ وہاں اس کا خیال نہیں رکھا گیا ہے کہ
ہندوی چھٹ کسی بولی کی پُٹ نہ ملے۔ مگر پھر بھی یہ فقرے بہت سہل
ہیں۔ محض نثر میں نہیں انشاؔ نے نظم میں بھی اس قسم کی طبع آزمائی کی ہے۔ اب
ہم اُن کی اس مشہور تصنیف "رانی کیتکی کی کہانی" کی زبان و بیان اور اس کے
فن پر تبصرہ کریں گے۔

یہ داستان یا کہانی اُردو کی مختصر ترین طبع زاد داستان ہے
اور ۱۸۰۳ء کی تصنیف ہے اس طرح گویا یہ ہماری داستان گوئی کے دورِ
اوّل کے اس بیش بہا سرمایہ کا ایک حصہ ہے۔ جس میں فورٹ ولیم کالج کے
معروف ترجمے تحسین اور زرین کی نوطرز مرصع میر امن کی "باغ و بہار"
حیدری کی "آرائش محفل" مہجور کی "ہفت گلشن" وغیرہ
شامل ہیں۔ سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:۔

"لیکن جو بات پڑھنے والوں کو اپنی طرف سب سے زیادہ متوجہ
کرتی ہے۔ یہ ہے کہ جو کام فورٹ ولیم کالج کے مصنف اور مؤلف ایک باقاعدہ
منصوبہ کے تحت انجام دے رہے تھے۔ سیّد انشاؔ کی جدت پسند
طبیعت اور ذہانت اس کی محرک بنی۔"

کتاب کے ابتدائی دو صفحوں میں حمد، نعت اور منقبت کے چند کلمات
ادا کرنے کے بعد انشاؔ نے ایک عنوان قائم کیا ہے "ڈول ڈال ایک انوکھی بات کا"
اور اس عنوان کے تحت یہ بتایا ہے کہ یہ کہانی لکھنے کا خیال
ان کے دل میں کیسے پیدا ہوا۔ دیباچہ میں اس کی وجہ تصنیف

اِس طرح بیان کی ہے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات دھیان میں چڑھی کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے تب جا کے میرا روپ پھول کی کلی کی طرح کھلے۔"

اُس وقت جب کہ روزمرہ کے خطوط تک صرف فارسی میں لکھے جاتے تھے اور اُردو نثر کا کوئی نمونہ سامنے نہ تھا اِس قسم کے لسانی التزام سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا لیکن انشا نے اِس کے باوجود تحریر میں وہ صفائی و سادگی پیدا کی ہے کہ اُن کی ہندی بعض جگہ اُردو لکھنوی کی خاص اُردو سے جا ملتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:-

"جو دعویٰ انہوں نے کیا ہے پورا کر کے دکھایا ہے۔ عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہیں آیا اور پھر لطف یہ ہے کہ آج کل کی ہندی بھی نہیں۔ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا۔ اُردو والا بھی سمجھتا ہے۔ ہندی والا بھی"۔ اِس سلسلہ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کی رائے بھی بے محل نہ ہوگی لکھتے ہیں کہ اِس کہانی میں متعدد عربی اور فارسی کے الفاظ شعوری یا غیر شعوری طور پر آ گئے ہیں۔ ان الفاظ کے املا میں تصرف کر کے انشا نے انہیں ہندی کرنے کی کوشش کی ہے لیکن عربی فارسی کے الفاظ جن کو انشا نے بہر حال املا کی مدد سے ہندی بنا لیا ہے۔ چنداں اہمیت نہیں رکھتے اور کہا جا سکتا ہے کہ انشا نے جو دعویٰ کیا ہے۔ اُس کو پورا کر دکھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور عربی فارسی کے الفاظ کو ہندی بنانے کی کوشش اُن کی طباعی اور زباندانی پر دلالت کرتی ہے۔

انشا نے اپنے دعوے کو پورا کر دکھانے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا ہے اُنہوں نے قصہ کا پلاٹ ہندو علم الاصنام کی مدد سے تیار کیا۔ اس قصہ کے اُصول و فروع دونوں میں صرف قدیم ہندو معاشرت، رسم و رواج، مذہبی عقائد و اوہام اور تہذیب و تمدن کے عناصر کام کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس قسم کے قصہ کو عربی فارسی آمیز اُردو میں بیان کرنا مشکل تھا۔ اِس قصہ کو کسی ہندی زبان کی ضرورت تھی جو انشا نے استعمال کی یا۔ اُنکی زبان کے لئے ایسے ہی قصہ کی ضرورت تھی۔ جس کا انتخاب انشا نے کیا۔ بہرحال یہ انشا کی ذہانت ہے کہ اُنہوں نے زبان و مواد کو لازم و ملزوم بنا دیا اور اپنے دعوے کو بہرحال پورا کر دکھایا۔

زبان کے التزام کو قائم رکھنے کے لئے انشا نے دوسری ترکیب یہ نکالی ہے کہ عبارت میں ضرب الامثال و محاورات سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ چونکہ اُردو ضرب الامثال کا واقعاتی پس منظر اکثر ہندوستانی سماج سے متعلق ہے اس لئے اِس کہانی میں اُن کی کھپت کی بڑی گنجائش تھی محاورات میں چونکہ کسی نہ کسی فعل کا ہونا ضروری ہے اور اُردو کے افعال سارے ہندی ہیں اس لئے عربی سے بچنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا کہ محاورات سے زیادہ سے زیادہ مدد لی جائے۔ چنانچہ اِس مختصر سی کہانی میں بے شمار محاورے استعمال کئے اِس کے باوجود اُن کی تحریر پر محض محاورہ بندی کا گمان نہیں ہوتا۔

پوری کہانی ہندوستانی زبان میں لکھی ہے لیکن بیان کی دلکشی اور سادگی میں مشکل سے کہیں فرق آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انشا ہندی اور اُردو کے

الفاظ کے فصیح استعمال کا عجیب ملکہ رکھتے تھے۔ اُن کے استعمال کردہ الفاظ میں سے
کچھ ایسے سبک، دلنشیں اور فصیح ہیں کہ ناسخ کی منظم تحریک کے باوجود اُردو
سے خارج نہ ہو سکے اور کچھ ایسے ہیں جو اگرچہ متروک قرار دیئے گئے ہیں لیکن آج
بھی زبان میں شامل کرنے کے لائق ہیں کم از کم انشاء نے انہیں اس سلیقے سے
استعمال کیا ہے کہ وہ عبارت کی سادگی و فصاحت میں بہت کم حائل ہوتے ہیں۔
ان الفاظ میں اکثر آج بھی ہماری روزمرہ کی بول چال میں داخل ہیں اور گھریلو
زندگی میں ان الفاظ کے استعمال کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ اور بات ہے
کہ کوئی انہیں تحریر میں لانے سے شعوری طور پر گریز کرے۔ البتہ انشاء نے چند
الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جنھیں نہ اس وقت اردو میں گوارا کیا جا سکتا تھا
اور نہ آج اُن کی کھپت کی صورت ہے۔ مثلاً بھاؤ، تاؤ وغیرہ۔

رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی داستان بڑی سیدھی سادی
کہانی ہے۔ اس زمانہ کی داستان گوئی کے علاوہ عام اسلوب کے خلاف
ان میں نہ قصہ کو طول دیا ہے اور نہ خواہ مخواہ کی الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔
بقول ڈاکٹر گیان چند جین قصہ میں کچھ ندرت نہیں۔ فرسودہ ڈھنگ کا
مختصر سا قصہ ہے۔ فوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی ہے لیکن عام داستانوں سے
جدا یہاں دیو، پری یا جادوگر نہیں بلکہ ایک جوگی مہندر گیر اور اس کے ساتھی ہیں
جن میں فوقِ انسانی طاقتیں ہیں تاہم فوق فطرت کی بہتات نہیں۔ صرف سیدھے
سادے چند واقعے ہیں مثلاً آدمی کو ہرن بنانا، ایسا بھبوت جسے آنکھوں میں لگانے
سے دوسروں کو نظر نہ آنا، جوگی کا منہ میں گٹکے رکھ کر ہوا میں اڑنا، آخر میں اندر
اور دوسرے دیوتاؤں کا ذکر وغیرہ۔ ہندی کہانیوں میں دیوتاؤں کا ذکر فوق فطری

معلوم نہیں ہوتا۔ یہ مذہب کا اثر ہے۔[۵۹]

رانی کیتکی کی کہانی میں بنیادی اہتمام تو یہی ہے کہ عبارت میں ہندی کے
علاوہ کسی اور زبان کا (خاص کر فارسی عربی کا) کوئی لفظ نہ آئے۔ اس پابندی
اور التزام کو نبھانا کوئی مشکل بات نہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ قصہ ہندوانہ
زندگی اور معاشرت سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کے کردار عموماً ہندی ہی بولتے ہوں لیکن
چونکہ قصہ بیان کرتے وقت قصہ گو کو راوی کے فرائض انجام دیتے وقت بہت سی
تفصیلات خود اپنی زبان سے بیان کرنی پڑتی ہیں اس لئے اس بات کا امکان اور
اندیشہ بعید از قیاس نہیں کہ اس کی عبارت میں روزمرہ کی سادگی، سلاست
اور روانی باقی نہ رہے دیکھنے کی بات یہی ہے کہ سید انشاء بیان کے منصب کو کس
حد تک پورا کر سکے ہیں۔ قصہ کو اس نظر سے پڑھا جائے تو پڑھنے والے کا مجموعی تاثر
یہی ہوتا ہے کہ انشاء نے عبارت کے ہندوی پن میں سادگی سلاست اور
روانی بھی قائم رکھی ہے اور روزمرہ کے لطف میں بھی کمی نہیں آنے دی۔ قصہ کے
بعض حصے کو دیکھ کر اس کی خصوصیت کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی۔ اس لئے
چند مثالیں دیکھئے۔[۶۰]

قصہ کے حصہ میں پہلے ہی صفحہ پر یہ چند سطریں ہیں:-

"یہ کل کا پتلا جو اپنے اس کھلاڑی کی سدھ رکھے تو کھٹائی میں کیوں
پڑے اور کڑوا کسیلا کیوں ہو؟ اس پھل کی مٹھائی چکھے جو بڑوں سے بڑے اگلوں
نے چکھی ہے ...."

اس اقتباس کے متعلق وقار عظیم لکھتے ہیں کہ عبد و معبود کے رشتہ کو انشاء
نے بڑے حسن و لطف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہندی کے مانوس اور سیدھے سادے

لفظوں میں ایک بامعنی بات بڑی بے تکلفی سے ادا ہوتی ہے۔ اس کے بعد
کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور بقولِ انشاؔ کہانی کے ابھار کے ساتھ بول چال کی دلہن کا
سنگار شروع ہوتا ہے۔ کنور اُدے بھان بھولا بھٹکتا ہوا کئی لڑکیوں کے پاس پہنچتا ہے۔
...... کرکے ایک سے ایک اگلی تھیں لیکن ایک لاجواب تھی۔ انشاؔ کہتے ہیں کہ:

"ان سبھوں میں سے ایک کے ساتھ اس کی آنکھ لڑ گئی"

ہندی بھی ہے، روزمرہ کی سادگی بھی اور محاورہ کا بے تکلف صرف بھی۔

"کنور کو رانی کیتکی سے محبت ہو گئی۔"

"اس کے بھی جی میں اس کی چاہ نے گھر کیا۔"

یہاں بھی ہندی، روزمرہ اور محاورہ تینوں چیزوں کا بڑا موزوں ملاپ ہے۔
عورتوں نے کنور سے رکھائی اور بے مروتی کی باتیں کیں تو اس نے جواب دیا۔

"میں سارے دن کا تھکا ہوا ایک پیڑ کی چھاؤں میں اوس کا بچھونا کرکے
پڑا رہوں گا۔ بڑے تڑکے دھندلکے اٹھ کر جدھر کو منہ پڑے گا چلا جاؤں گا۔ کسی کا
لیتا دیتا نہیں۔"

الفاظ میں وہی سادگی اور بے تکلفی ہے۔ محاورہ کے صرف پر وہی قدرت
ہے اور ساتھ ہی ایک بےکس مسافر کے خیالات و جذبات کی صحیح ترجمانی۔
مسافر کی بے بسی پر رانی کو ترس آتا ہے اور وہ اپنی سہیلیوں سے کہتی ہے:

"ان سے کہہ دو جہاں جی چاہے اپنے پڑ رہیں، اور جو کچھ کھانے پینے کو
مانگیں انہیں پہنچا دو۔ گھر آئے کو کسی نے آج تک مار نہیں ڈالا۔"

صاف ایک رانی کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ اس کے رتبہ کی بڑائی کے
حامل بھی اور اس کے دل کی نرمی کے ترجمان بھی۔

قافیے کے التزام نے عبارت کو کس قدر پُر تصنع بنا دیا ہے۔ لیکن عبارت کا
یہ تصنع شکر ہے کہ رانی کیتکی کی کہانی میں بہت کم جگہ ہے۔ انشاؔ کو زبان پر جو
قدرت حاصل ہے اور ان کے ذہن کے خزانہ میں الفاظ کا جو بیش بہا اور خاصہ
بڑا سرمایہ ہے اس نے انشاؔ کے لئے مشکل سے مشکل بات کو آسان بنا دیا ہے۔
اس قادر الکلامی کا ایک پہلو ہے انشاؔ کی ذہانت نے اور جلا دی ہے یہ ہے کہ
ان کی عبارت میں کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو فرسودہ ہونے کے باوجود اس
قابل ہیں کہ انہیں اپنایا اور سینے سے لگایا جائے۔

بیشک تاہم ان کی عبارتوں میں بھی قافیہ پایا جاتا ہے۔ میرامن کی 'باغ و بہار' کے علاوہ
فورٹ ولیم کالج کی تصانیف بھی اسکا آئینہ ہیں۔ کیونکہ انشاؔ کی داستان کا زمانہ
قافیہ نگاری کے اسلوب کا زمانہ ہے۔ لیکن ایک بات جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے
اور بڑی حد تک انشاؔ کے فنکارانہ مزاج کا اندازہ بھی ہوتا ہے، یہ ہے کہ انشاؔ نے
اپنی کہانیوں میں قافیوں کی ریل پیل نہیں کی اور انہیں اس کثرت کے ساتھ
استعمال نہیں کیا کہ پڑھنے والے کو الجھن ہو۔ بلکہ کبھی کبھی عبارت میں ترنم پیدا
کرنے کے لئے قافیہ کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً

"پودوں نے رنگارنگ کے سہرے جوڑے پہنے، سو پاتوں دادیوں نے
توڑے پہنے، بری بوٹی کے پھول پھول کے گہنے جو بہت نہ تھے تو تھوڑے پہنے"

بقول ڈاکٹر گیان چند جین "اس قصہ سے مصنف کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے"
اس عہد میں اردو ہندی کے درمیان ایک ہندوستانی زبان کی تلاش ہے۔
انشاؔ نے ۱۸۰۳ء میں اس کی بنیاد ڈالی۔ ان کی کوشش شعوری تھی۔ اس
سلسلے میں انہوں نے بعض لفظ تراشے مثلاً ڈول ڈال یعنی بنیاد وغیرہ وغیرہ [59]

قصّہ کا مطالعہ فنّی نقطۂ نظر سے

زبان و بیان رانی کیتکی کی کہانی کے اسلوب و فن کا ایک پہلو ہے جس نے کہانی میں اکثر حسن و لطف اور کبھی کبھی تصنع اور بناوٹ پیدا کرنے کی خدمت انجام دی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو جو زبان و بیان کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہے کہ انشاؔ نے کہانی کہنے کے فن اور اس کے انداز کی دلنشینی کی طرف بھی توجہ دی ہے اور یہ بات برابر ذہن میں رکھی ہے کہ کہانی دوسروں کو سنانے اور انہیں اس کی تفصیلوں میں منہمک رکھنے کے لئے لکھی اور کہی جاتی ہے۔ کہانی کی ابتدا اور اس کی اٹھان اور خاتمہ ایسا ہونا چاہیے کہ سننے والا اسے برابر اشتیاق اور توجہ سے سنتا رہے۔ انشاؔ کی کہانی میں اس پہلو سے کئی باتیں ہیں جن کی طرف عموماً داستان گو کی پوری توجہ نہیں ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز جس پر پڑھنے والے کی نظر فوراً پڑتی ہے کہانی کے آغاز اور عنوان ہی میں لفظ "بچار" کی موجودگی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ استعمال کرتے وقت انشاؔ کے ذہن میں کہانی کے ارتقاء اور اس کے مختلف اجزاء کے درمیان مکمل ربط، ہم آہنگی اور تسلسل کا وہ نفسیاتی تصور اور نقطۂ عروج کی اہمیت کا وہ احساس موجود نہیں تھا جو آج کل کہانی کے حسن کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ انشاؔ نے یہ لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا تو ان کے ذہن میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ کہانی ابتداء سے انجام تک کچھ ایسی منزلیں طے کرتی ہے جس میں پڑھنے والا اشتیاق کے ساتھ یہ جاننے کا منتظر رہتا ہے کہ دیکھیں کہ اب کیا ہوتا ہے۔ انشاؔ نے کہانی کی

ساخت جس انداز سے کی ہے اور جس اسلوب سے اسے ترتیب دیا ہے اُس سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

کہانی کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ انشاؔ نے اسے واقعات کے اعتبار سے مناسب ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح کے عنوان ہمیں اکثر مثنویوں اور انشاؔ کے دور کی داستانوں میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان ٹکڑوں میں ربط اور تسلسل پیدا کرنے کی کسی واضح کوشش یا رجحان کا سراغ بہت کم ملتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہانی کے کچھ کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہاں کی یہاں ہی رہنے دو، آگے سنو۔" بس "آگے سنو" کے بعد کہانی بڑی نرمی اور آہستگی سے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن میں دھچکا لگائے بغیر دوسرا رُخ اختیار کرتی ہے۔

قصّہ گوئی

انشاؔ نے بیان کے اور التزامات کے ساتھ اپنی قصّہ گوئی میں ایک خاص چیز سے مدد لی ہے۔ وہ کہانی کہتے کہتے قاری یا سامع کے ذہن کو فوراً ماضی سے حال کی طرف اس طرح لے آتے ہیں کہ وہ اس تبدیلی کو محسوس بھی نہیں کرتا اور گذرے ہوئے زمانے کی بات آنکھوں میں اس طرح پھر جاتی ہے جیسے وہ ماضی کی نہیں حال کی بات ہے۔ مثلاً ذکر جوگی مہندر گر کا ہے" اس کا حال بیان کرتے کرتے انشاؔ اس جگہ پر پہنچتے ہیں جہاں انہیں یہ بتانا ہے کہ راجہ جگت پرکاش کا ایلچی جوگی کے پاس چٹھی لے کر پہنچتا ہے۔

واقعہ نگاری

انشاؔ نے اپنے دوسرے ہمعصروں کے برخلاف تفصیل کی بجائے اختصار کو کہانی کی دلچسپی اور دلکشی کے لئے زیادہ موثر جانا اور اسے مختلف طریقوں سے بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ لیکن جب

[illegible]

مقامی معاشرت کے فکری، تہذیبی اور جذباتی عناصر کی رنگ آمیزی کا ہو تو
اُن کا قلم کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اس خاص معاملہ
میں اُن کا تخیل پوری جولانی دکھانے اور کہانی کی فضا کو رنگین بنانے اور اُس
پر پوری طرح چھا جانے کا قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس مختصر سی داستان میں
ایک خاص منزل پر آ کر واقعہ نگاری کا رنگ کہانی پر اس طرح غالب آ جاتا ہے کہ
کہانی اِس کی تفصیلات میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر
قاری صاف صاف یہ محسوس کرتا ہے کہ کہانی اب ختم ہو چکی لیکن ایک مخصوص
تہذیب کی دل کش تصویریں۔ دیکھنے میں وہ اس درجہ منہمک ہو جاتا ہے کہ
اُسے کہانی کے ختم ہو جانے یا اس کے غیر معمولی طور پر طویل ہو جانے کی پروا تک
نہیں ہوتی۔

قصہ کا آخری حصہ اِس طرح کی رنگینیوں سے مالا مال ہے جس میں
تخیل کی پرواز تصور کی نادرہ کاری اور مشاہدہ اور مطالعے نے ایک سے ایک دلکش
تصویر بنائی ہے۔ ہر تصویر میں تخیل تو ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستانی
معاشرت اور تہذیب کا بڑا سچا۔ اور پکا رنگ بھی اس میں ہر جگہ گھلا ملا ہے۔
ہندو معاشرت کا بڑا گہرا رنگ انہوں نے اپنے تخیل اور مشاہدے سے ایک
انوکھے روپ میں پیش کیا ہے۔ رانی کیتکی کی کہانی بقول وقار عظیم اردو کی واحد
داستان ہے جس نے ہندو معاشرت و تہذیب کے مزاج کو ایک ایسا روپ
دیا ہے جس کی وجہ سے وہ زندہ ہو گئی ہے۔

کردار نگاری

انشا ایک آزاد مزاج آدمی تھے۔ اِس قصہ میں انہوں نے
آزادی اور بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ رانی کیتکی جب
پہلی بار کنور اودے بھان سے ملتی ہے دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔
کیتکی کے کردار میں صاف دلی، صاف گوئی اور راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری
ہے۔ وہ کنور کو دیکھنے کے بعد رات کو اپنی سہیلی کو جگا کر کہتی ہے۔

"اری تو نے کچھ سنتا ہے۔ میرا جی اُس پر آ گیا اور کسی ڈول سے نہیں تھم سکتا
...... اری یہ میرا جوڑا میرے اور اُس کے بنانے والے نے ملا دیا ہے میں اسی لیے
اِن امریوں میں آئی تھی"۔

اُسی وقت رانی کنور کے پاس آتی ہے اور بغیر کسی گھماؤ پھراؤ کے ایک
دوسرے کا تعارف ہو جاتا ہے اور خفیہ ڈھنگ سے شادی ہو جاتی ہے۔

جذبات نگاری

جب راجہ سورج بھان کنور اودے بھان کی شادی کا پیغام جگت پرکاش
کو بھیجتے ہیں تو جگت پرکاش اپنی بلند نسبی اور وقار خاندان کا اظہار کس طرح کے
انداز میں کرتے ہیں: —

"اُن کے ہمارے ناتہ نہیں ہونے کا۔ اُن کے باپ دادا ہمارے باپ دادا
کے آگے ہاتھ جوڑتے باتیں کرتے تھے۔ اور جو تیوری چڑھے دیکھتے تھے تو بہت ڈرا
کرتے تھے۔ کیا ہوا جو اب بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے اور جن کے ماتھے پر ہم
بائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ٹیکہ لگا دیں وہ مہاراجوں کا راجہ ہو جائے"۔

کنور اودے بھان اور رانی کیتکی پہلی ملاقات کے بعد جس جذباتی
ہیجان کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اس کی تصویر دیکھیے:

"کنور اودے بھان نے اپنی انگوٹھی رانی کیتکی کی انگلی میں اور کیتکی

اپنی انگوٹھی اُدے بھان کی انگلی میں ڈال دی اور ایک ویسی ہی چھلّی بھی لے لی۔"

انشاؔ کنور کے دولہا بننے کا حال بھی بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں اور اٹھتی ہوئی جوانی کو اس طرح سراہتے ہیں:۔

"ان کے اُبھار کے دنوں کا سہانا پن اور چال ڈھال کا اچھن بچھن اٹھتی ہوئی کونپل کی پھبن اور مکھڑے کا گدرایا ہوا جوبن جیسے بڑے بڑے ہرے بھرے پہاڑوں کی گود سے سورج کی کرن نکل آتی ہے یہی روپ تھا ان کی بھیگیں مسوں سے تیکھا پن ٹپکا پڑتا اور اپنی پرچھائیں دیکھ کر آپ اکڑتا تھا۔"

شاعری میں تو دوسرے لکھنوی شعراء کی طرح انشاؔ کا بھی سارا زور صرف حسن کے خارجی لوازم میں صرف ہوا ہے اور جذبات کی مصوری کے سلسلہ میں ان کے یہاں اس شعر سے

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

سے بہتر شاید اور کوئی مثال نہ مل سکے گی۔ لیکن اس کہانی میں انشاؔ نے لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک احساس کو نہایت عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔ مثلاً ایک موقع ہے کہ رانی کیتکی اُدے بھان کے حسن و جمال پر عاشق ہو کر پیچ و تاب میں مبتلا ہے۔ نسوانی شرم و حیا اظہارِ عشق سے مانع ہے لیکن جگر داری کا دعویٰ کس نے کیا جب دامنِ شکیب ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس واقعہ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:۔

"رانی کیتکی مدن بان سے بول اٹھی اری وہ تو نے کچھ سنا ہے۔ میرا جی اس پر آ گیا ہے اور کسی ڈول سے نہیں تھمتا۔ تو سب بھید دل کی جانتی ہے۔ اب جو ہونی [illegible] ساتھ چلی۔ تیرے پاؤں پڑتی ہوں

کوئی نہ سنے!"

رانی کیتکی اور مدن بان کی چھیڑ چھاڑ کا ایک نقشہ قابلِ توجہ ہے۔ رانی کیتکی مانجھے خانے میں ہے۔ اس کی سہیلی مدن بان بھی اس کے ساتھ ہے۔ دونوں کی باہم شوخی اور چھیڑ چھاڑ کو انشاؔ یوں قلمبند کرتے ہیں:۔

"اس گھڑی کچھ مدن بان کو رانی کیتکی کے مانجھے کا جوڑا اور انگوٹھیوں کا لجانا بھلا لگ گیا۔ رانی کیتکی کے تلوے سہلانے لگی۔ تب رانی کیتکی جھٹ سے دھیمی سسکی بھرکے ساتھ لے اٹھی مدن بان لوبائی میرے ہاتھ کے ٹھوکے وہ پاؤں کا چھالا دکھ گیا ہو گیا جو ہرنوں کے ڈھونڈ میں پڑ گیا تھا۔ اسی دکھتی چوٹ سے مسوس کر رانی کیتکی کہنے لگی۔ دکھ کا ٹانکا اتر آیا' چھالا پڑا تو پڑا پر نگوڑی تو کیوں میری جان پیچھے لا دی۔"

غرض انشاؔ نے نسوانی معاملات کو بڑے فطری انداز میں قلمبند کیا ہے۔ وہ کتابی علم و فن سے آشنا نہیں بلکہ ہندوستان کی عام سماجی اور خانگی زندگی سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ اور عورتوں کی گھریلو زبان، ان کے اندازِ گفتگو اور لب و لہجہ سے اس طرح واقف معلوم ہوتے ہیں جیسے دہلی کے محاورات سے ڈپٹی نذیر احمد۔

انشاؔ کے عہد میں فورٹ ولیم کالج سے جو کتابیں طبع ہوئیں ان میں زیادہ تعداد قصے کہانیوں کی ہے اور ان سب میں مافوق الفطرت عناصر کا اثر غالب ہے قصہ کہانی میں مافوق الفطرت عناصر کا دخل ضروری بھی لیکن اگر ان میں توازن قائم نہ کیا گیا تو قصہ کا سماجی رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس قصہ میں فوق الفطرت عناصر کی شمولیت میں انشاؔ نے بڑی ذہانت سے کام لیا ہے۔ صرف راجہ اندر اور

جوگی مہندر گیر کے کردار ایسے ہیں جن سے غیر معمولی کام انجام پاتے ہیں۔ راجہ اندر اور جوگی مہندر گیر دونوں ہندو علم الاصنام کی شخصیتیں ہیں۔ اکثر ہندو ان کے معتقد ہیں اور ان کے کارناموں کو معجزات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دونوں کردار ہندو سماج سے اسی قدر قریب ہیں جس قدر خود جگت پرکاش اور سورج بھان۔ لیکن جو لوگ ہندو علم الاصنام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے انکو یہ کہانی ہندو دیو مالا ایسی بوالعجبی کہانی نظر آتی ہے جس میں ماورائی کردار غالب اور انسانی کردار مغلوب نظر آتا ہے۔[61]

جزئیات نگاری

انشاء رانی کیتکی کی کہانی میں جزئیات نگاری کی مدد سے اپنے تبحر علمی کا رعب جماتے ہیں۔ اس کہانی میں انہوں نے "آتش بازی، باجے، کشتیوں اور رقص و سرود کے جو نام و اقسام پیش کئے ہیں اس سے انشاء کے علمی سرمایہ کا اندازہ ہو سکے گا۔ اس میں انشاء نے اپنے جدت خیال سے چار چاند لگائے ہیں۔ لیکن فرمان فتح پوری کا خیال ہے کہ اس میں معاشرتی شان کا تو کہیں کہیں ہاں جدت خیال کی طلسم سازی پوری طرح کارفرما ہے۔ انشاء کے جدت خیال نے معاشرتی پہلو میں چار چاند نہیں لگا دیئے بلکہ معاشرتی پہلو کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کہانی لکھتے وقت انشاء کے پیش نظر لسانی التزام کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ قصہ کے تناسب سے ہندو معاشرت کے بہت سے پہلو ضمنی طور پر روشن ہو گئے ہیں۔"[62]

رانی کیتکی کی کہانی اردو کی واحد داستان ہے جس نے ہندو معاشرت اور تہذیب کے مزاج کو یوں زندگی کا روپ دے کر زندہ کیا ہے .... زندگی کا یہ روپ جب ہی ملتا ہے کہ تصویر بنانے والا ان کے رنگ و ریشہ میں سما کر ان کے بھیدوں سے واقف ہو۔ اور ان بھیدوں پر اپنی ذہانت سے تخیل کا رنگ چڑھانے کی قدرت رکھتا ہو۔ زندگی سے صحیح ربط کے بعد مشاہدے کی اہمیت، احساس، اور پھر حقیقت پسندی اور شریت کی قدروں کو ایک جا کرنے کی عادت، انشاء میں یہ سب کچھ تھا۔ اس لئے "داستان رانی کیتکی" اور کنور اودے بھان" کی رسی بنی جیسی وہ ہے۔[63]

رانی کیتکی کی کہانی کو اردو والے بھی اپناتے ہیں اور ہندی والے بھی زبان کے لحاظ سے یہ ہندی کے بہت قریب ہے۔ یا کہئے کہ ہندی ہی ہے۔ لیکن چند باتوں سے اس کا اردو ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے شروع میں حمد و نعت منقبت ہے جو کہ اردو کا قاعدہ ہے۔ اس میں جتنے اشعار اور نظمیں ہیں وہ ایک جگہ کے علاوہ باقی سب اردو کی ہیں کیونکہ ان کی بحر فارسی ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں کچھ ایسا تجربہ کرنا اہمیت رکھتا ہے جن میں عربی فارسی کے الفاظ نہ آئیں۔ ہندی میں ایسے تجربہ کے کوئی معنی نہیں۔ وہاں تو آسانی سے ایسی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں جس میں بدیسی لفظ نہ ہوں محض زبان کی اشکال اور سادگی کا فرق رہتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انشاء کا ارادہ اس کہانی کو اردو میں شامل کرنے کا ہوگا۔ انہوں نے اسے اردو رسم خط میں لکھا۔[64]

محمد حسن قتیل

قتیل دہلی کے رہنے والے تھے اور کھتری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام

قبول کرنے سے پہلے دیوالی سنگھ نام تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد محمد حسن نام رکھا
قتیل کو فارسی زبان پر بڑا عبور تھا اور اپنے علم کے مقابلہ میں کسی کو خاطر میں
نہیں لاتے تھے۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ
"دریائے لطافت" انشاؔ نے ان کی شرکت کے ساتھ لکھی تھی۔ ان کی فارسی تصانیف
حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) نہر الفصاحت (۲) چار شربت (۳) دیوانِ شعر (۴) دریائے لطافت

دریائے لطافت کا وہ حصّہ جو منطق، عروض، قافیہ، بیان و معنی پر مشتمل
ہے قتیل ہی نے لکھا ہے۔ اس میں قتیل نے انشاؔ ہی کی طرح ظریفانہ انداز
اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً عروض میں بجائے مروجہ ارکان کے نئے
ارکان تراشے ہیں۔ مثلاً مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کے لئے انہوں نے

"بی جان پری خانم بی جان پری خانم"

اور فاعلن، مفاعیلن، فاعلن، مفاعیلن کی جگہ۔

"چت لگن پری خانم چت لگن پری خانم"

تجویز کئے تھے۔ یہ جدّت طرازی انہوں نے یقیناً انشاؔ سے سیکھی تھی۔ لیکن
انشاؔ کی بہت سی جدّتوں کی طرح قتیل کی یہ ادبی جدّتیں بھی لطائف بن کر رہ گئیں۔

مرزا قتیل نے علم بیان و بدیع کا حصّہ بھی خوب لکھا ہے۔ یہ علوم اُردو میں
غالباً سب سے پہلے اسی کتاب سے مرزا قتیل کے قلم سے مرتب ہوئے ہیں۔ امام
بخش صہبائی کا ترجمہ "حدائق البلاغت" اس سے بعد کا ہے۔ قتیل نے تمام
صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں اپنی طبع زاد نظم یا نثر میں لکھی ہیں۔ مشہور و معروف
صنعتوں کے علاوہ اور نئی نئی کاریگریاں نکالی ہیں۔ تعریف و تشریح فارسی

زبان میں ہے اور مثالیں اُردو میں لکھی ہیں۔ تحریر کا انداز یہ ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ضلع کی مثال میں دریا کی مناسب چیزیں بیان کرنے کے لئے دو صفحات
اُردو میں لکھے ہیں جن میں پانی کی اقسام، دریاؤں کے نام، دریائی جانور، کشتی اور
تیراکی کے الفاظ ضلع یا ایہام کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ شروع کے فقرے یہ ہیں:

"آپ کا بجرہ کچھ آج کھُل گیا ہے، ما شاء اللہ تمہاری بات پانی بہت مشکل ہے۔
ہمیں کل سے تیا چھوڑ گئے، ہر چند ضعف نالی کی، تو بھی رتھ میں جگہ ندی، ایک باؤلی رنڈی
کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اُٹھا دی۔"

ایک عبارت مرتب کی ہے جس میں حرفِ نون کہیں نہیں آنے دیا۔ لکھتے ہیں:۔

"جس کا جی چاہے پاس آئے، گھر ہے اُس کا اور جو کوئی آتا آتا گیا یکبارگی اڑ
جائے تو ہم کو کیا غرض۔ اگر یہ چاہے کہ ہم سا لے یا قت ابھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات
بہت مشکل ہے۔ اس واسطے کہ عاصی پُر از معاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس
گوشے ہی کے بیچ اسی طرح جا رہے کہ اگر ہزار بار دورۂ کامل فلک ہشتم کا کہ جس کو
خلقِ خدا کرسی کہتی ہے۔ سر پر گذر جائے تو بھی اس جگہ سے اُٹھ کر جو بہت
جائے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے سو بھی دیکھا چاہیئے۔ یہ بھی اس وقت کا
ایک ڈھل قافیہ ہے[٤٦]۔"

ایک عبارت موصل دو حرفی کی صنعت میں لکھی ہے یعنی دو دو حرف
ملے ہیں، نہ کوئی حرف الگ ہے نہ دو سے زیادہ ملے۔ فرماتے ہیں:۔

"چوٹی تو کاجی کی لڑکی کی گویا کالی ناگن ہے، پر جب جی چاہے۔ تب کاٹے
ہے۔ چچو جو خرابی حق نے کہ کا صاحب کی لڑکی کو دی ہے شاید تو شاید کو دی ہو تو دی ہو[٤٧]"

اس عبارت کے ضمن میں اُس زمانہ کی سوسائٹی کے اخلاق بھی قابل

ذکر و توجہ ہیں۔ انشاؔ، قتیلؔ اور رنگینؔ تینوں گہرے اور بے تکلف دوست ہیں۔ تینوں کو کسبی عورتوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ انشاؔ کی زبانی بی نورن کا ذکر بیان کیا جا چکا ہے۔ انشاؔ نے رنگینؔ کی بھی دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ قتیلؔ نے ان دونوں سے کم اپنی کم دلچسپی و وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے حقیقہ تالیف میں جتنی مثالیں دی ہیں اکثر میں رنڈیوں اور کسبیوں کا ذکر ہے۔ صنعتِ توضیح میں انہی عورتوں کے نام نکالے ہیں۔ معمّے انہی کے نام کے بنائے ہیں۔ اشعار اور عبارتوں میں انہی کا ذکر ہے اور اوزانِ بحر میں انہی کے نام رکھے ہیں۔ شاید اس زمانے کے لکھنؤ کی بھی رنڈیوں اور کسبیوں کے نام لکھ دئے ہیں۔ اس عہد کے لکھنؤ پر عیش و عشرت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تاہم یہ بات قابلِ داد ہے کہ وہ بزرگ بیباکی کے باوجود بےتکلفی و صاف دلی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ ممکن ہے بلکہ یقین ہے کہ اس زمانہ میں یہ ذکر انکا دسب کرتے تھے، حال و کردار سب کے ایسے نہ تھے۔ لیکن ہمارے زمانہ میں حال وہی ہے قال وہ نہیں۔

دریائے لطافت کے علاوہ مرزا قتیلؔ کی اردو نثر کی تحریر ان کے مجموعۂ مکتوبات میں بھی پائی جاتی ہے۔ مرزا کے شاگرد خواجہ امداد الدین نے اُن کے خطوط جمع کرکے ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں "معدن الفوائد" کے نام سے شائع کئے۔ اس میں مرزا قتیلؔ نے حمد و نعت عربی، فارسی، ترکی اور اُردو میں لکھی ہے۔ اُردو کا نمونہ یہ ہے:۔

"بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدا نے برتر نے اپنا پیغمبر کیا اور تمام فاضلوں اور عالموں اور عامیوں کو اس کی اُمت کیا۔ سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کا دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کو دکھلانے والا ہے اور سعادت کی منزل کا خضر ہے۔"

اس عبارت کے اسلوب پر فارسی کا اثر ہے۔ دریائے لطافت کے اقتباسات سلیس و فصیح روزمرہ میں۔ بہرحال مرزا قتیلؔ بھی ترقیِ اُردو کے کارپردازوں میں ہیں اور اُردو نثر کی ترقی میں ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سعادت یار خاں رنگینؔ

ان کے والد طہماسپ بیگ اعتقاد جنگ ایرانی نژاد تھے۔ وطن چھوڑنے کے کچھ دن بعد وہ لاہور میں رہے اس کے بعد دہلی چلے آئے۔ بہت جلد اپنی خداداد ذہانت سے دربار میں ہفت ہزاری منصب حاصل کیا اور جاگیر میں چوراسی گاؤں دئے گئے۔ رنگینؔ کی پیدائش ۱۱۶۸ھ سرہند میں ہوئی لیکن ان کی تعلیم و تربیت دلشو و نما دہلی میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد نظام کی فوج میں توپ خانہ کے افسر مقرر ہوئے اور پھر گھوڑوں کی تجارت شروع کی۔ حیدرآباد کی ملازمت ترک کرکے لکھنؤ آئے اور شہزادہ سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی۔ انشاؔ کے ساتھ اُن کے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ کریم الدین مصنف طبقات الشعرا نے رنگینؔ کا سنِ وفات ۱۲۵۱ھ بتایا ہے۔ لیکن نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور پروفیسر گارساں دتاسی نے ان کا سنِ وفات ۱۲۵۰ھ لکھا ہے۔

رنگینؔ میں ذہانت اور جدت طرازی کی خداداد صلاحیت تھی۔ انہوں نے اپنی جدتوں سے اُردو شاعری میں نئے سانچوں اور اسالیب کا اضافہ کیا۔ اُن کا نمایاں کارنامہ ریختی ہے اور انہوں نے اس فن کو اتنی ترقی دی کہ لوگ انہی کو ریختی کا موجد سمجھنے لگے۔

محترمہ رفیعہ سلطانہ نے پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی ایک بیاض کے نوٹ سے ان کی نثری تصنیف کا ذکر کیا ہے جس کا نام "محاوراتِ بیگمات" ہے۔ اس میں اردو محاوروں کی تفہیم اُردو میں کی گئی ہے۔ جس کے متعلق مولانا امتیاز علی عرشی صاحب کا خیال ہے کہ یہ سراج الدین علی خاں آرزو کی تصنیف ہے۔ اور "نوادر" کے نسخے کا چربہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ جنہوں نے نوادر الالفاظ کو حاشیہ کے ساتھ چھاپا ہے، لکھتے ہیں :-

"......... یہ رنگین کے مرتبہ محاورات سے بہت حد تک مماثل ہے۔"[67]

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب خواتین کے روزمرہ کی ترجمان ہے۔ ریختی میں بیگمات کی زبان اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے رنگین کو بیگمات کی زبان پر بڑی مہارت تھی۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی : آپ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پوتے اور شاہ عبدالغنی کے بیٹے تھے ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) میں پیدا ہوئے — آپ کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس لئے شاہ عبدالعزیزؒ نے آپ کو اپنے فرزندوں کی طرح پرورش کیا اور بہت اہتمام سے اُن کی تعلیم و تربیت کی۔ چنانچہ ۱۵-۱۶ سال کی ہی عمر میں تحصیلِ علم سے فارغ ہو گئے آپ نے علمِ معقول کی بیشتر کتب پر حاشیے تحریر کئے۔ ایک رسالہ منطق میں لکھا۔ ایک رسالہ "قرۃ العینین فی اثباتِ رفع یدین" تالیف فرمایا۔ اس طرح متعدد رسالے اپنی یادگار چھوڑے۔ ۱۸۲۲ء میں مکہ معظمہ کو حج کرنے کی غرض سے گئے اور اس مقدس فریضہ کو ادا کرنے کے بعد چھ سال تک ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کی۔

حج کو جانے سے پہلے مولوی سید احمد بریلوی سے بیعت کی تھی اور اُن سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ سفر کے دوران میں انہوں نے اپنے عقاید کی تبلیغ بھی کی یعنی غیر شرعی کاموں سے پرہیز کرنے کی نصیحت کرتے رہے۔ پھر دہلی واپس آئے۔ اُس وقت مولوی سید احمد کی جہاد کی تحریک زوروں پر تھی اور وہ سکھوں سے جنگ کرنے کے لئے پشاور کا قصد کر رہے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب کے ساتھ شریک ہوئے اور آخر کار مولوی صاحب کے ساتھ انکو بھی جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی نے کئی کتابیں اپنے عقائد کے متعلق اُردو میں لکھیں جن میں سے "تقویت الایمان" بہت مشہور رہی۔ اسی زمانے میں مولوی سید احمد کے اور مریدوں نے بھی بہت سی کتابیں اپنے عقائد کے سلسلے میں تبلیغ کی غرض سے اُردو زبان میں لکھیں۔ مثلاً "ترغیبِ جہاد"، "ہدایت المومنین"، "نصیحت المومنین" وغیرہ۔ ان کتب کے متعلق مولانا حامد حسن قادری مرحوم لکھتے ہیں "یہ کتابیں بھی اُردو کی ترقی کے سلسلے میں شامل ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی "تقویت الایمان" بہت صاف و سلیس زبان میں ہے۔ صرف کہیں کہیں ترتیب الفاظ اور اندازِ بیان میں قدامت ہے۔ "تقویت الایمان" کثرت سے شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصّہ کا انگریزی ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔"[68] رام بابو سکسینہ صاحب نے تقویت الایمان کے علاوہ اُن کی دوسری تصانیف رسالہ توحید، صراطِ مستقیم، تنویر العینین کا بھی ذکر کیا ہے۔[69]

دہلی کالج : دہلی کالج سرزمین دہلی کا وہ نامور ادارہ ہے جہاں اُردو کی علمی زبان بنانے کی پہلی منظم کوشش کا آغاز ہوا تھا۔

تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلیم گاہ یعنی مدرسۂ غازی الدین کی ابتدا سنہ ۱۷۹۲ء میں ہوئی اور سنہ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا۔ اس مدرسہ کو نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی خلف نواب نظام الملک آصف جاہ نے بنایا۔

اس زمانہ میں ایک عام رواج یہ تھا کہ اُمرا دینی اور دنیوی تعلیم کے لیے مدارس اور مساجد اور اپنے لئے مقبرے بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ نے بھی ایک خوبصورت عمارت انڈو سارسنک طرز پہ بنوائی تھی جہاں وہ ۱۷۱۰ء میں آسودۂ خاک کیے گئے۔ اس کی عمارت آج بھی موجود ہے لیکن زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں اتنی تبدیلیاں ہوچکی ہیں اور اس ادارے نے ترقی کی اتنی منزلیں طے کی ہیں کہ اس کے قدیم احوال کو سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

یہ مدرسہ احمد شاہ بادشاہ اور عالمگیر ثانی کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ غازی الدین ان سلاطین کے عہد کے اراکین سلطنت میں سے تھے۔ سرکار انگریزی نے اپنے دورِ حکومت میں اس کو طالب علموں کی تعلیم کے واسطے پسند کیا۔ چند مدرس عربی و فارسی اور شاستری اس میں مقرر کر دیئے۔ چند عرصہ کے بعد نواب فضل علی خاں اعتمادالدولہ بہادر وزیر بادشاہِ اودھ نے بھی اس مدرسہ کے خرچ کے واسطے ایک لاکھ ستر ہزار کا روپیہ اس غرض سے گورنمنٹ کے حوالے کیا۔ کہ اس کی آمدنی سے دہلی میں مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے واسطے ایک درسگاہ قائم کی جائے۔ اس کی تحویل وقف کی ہوگی۔ گورنمنٹ نے اس عطیہ کو نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ اس وقت ہندوستان پر زوال اور انحطاط کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کمزور ہوچکی تھی اور بقولِ حضرت شاہ ولی اللہ "از سلطنت بجز نام

نام باقی نہ ماند" اور وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے شاہانِ عجم اور شوکتِ روم حقیر معلوم ہوتی تھی نیست و نابود ہوگیا۔ شاہ عالم کی حکومت آخر پالم تک تھی لیکن اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت سمٹ کر قلعہ کی چار دیواری تک رہ گئی۔ یہ بساط بھی ۱۸۵۷ء میں درہم برہم ہوگئی۔

اس اقتصادی بدحالی اور سیاسی افراط و تفریط میں تعلیم کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ جہاں تک دہلی میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا تعلق ہے اس کا آغاز ۱۸۱۳ء میں ہوا۔ اس سال کے چارٹر کی رو سے یہ طے ہوا کہ ممالکِ محروسہ کے ہندوستانیوں کی تعلیم، ادب کی ترقی و احیاء اور سائنسی تعلیم کے اجرا کے لئے کم سے کم ایک لاکھ روپے سالانہ خرچ کئے جائیں۔ یہ شاہانہ رقم منظور تو ہوگئی لیکن دس برس تک ایک پیسہ بھی اس مد پر خرچ نہیں ہوا۔ اس وقت تعلیم کی طرف جیسے توجہ تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بنگال جو ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آچکا تھا جس کی ۱۸۰۵ء میں آبادی تقریباً تین کروڑ ستر لاکھ تھی اس کی تعلیمی ضروریات پر کمپنی بہادر کے صرف آٹھ ہزار روپے سالانہ خرچ ہوتے تھے جو ایک انگریز کلکٹر کی تنخواہ کی ایک تہائی رقم تھی اور تقریباً اتنا ہی روپیہ ہندوستانی تعیدیوں کی نگہداشت پر خرچ کیا جاتا تھا۔"

۱۸۵۲ء کے اختتام میں مجلسِ تعلیم عامہ نے ایک مطبوعہ گشتی چٹھی دہلی، آگرہ اور دوسرے مقامات کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کی جس میں ان اضلاع کے تعلیمی حالات دریافت کئے گئے تھے۔ نیز یہ بھی دریافت کیا گیا تھا کہ ان مقامات میں توسیع و ترقیِ تعلیم کے لئے کیا کیا وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ان سب امور کے بیان کرنے کے بعد یہ اطلاع بھی دی گئی کہ گورنمنٹ کا منشا دہلی میں

کالج قائم کرنے کا ہے۔ نیز کمیٹی نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اگر ان مقامات میں
ایسے اوقاف موجود ہوں جو تعلیمی اغراض کے لئے کام آ سکیں تو ان سے بھی مطلع
کیا جائے۔

دہلی کی مقامی مجلس نے جنوری ۱۸۲۴ء میں اپنا جواب بھیجا جس میں اُس نے
مختلف امور سے بحث کی ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہاں بہت سے خانگی
مدارس موجود ہیں اور جیسا کہ مسلمانوں میں دستور رہا ہے۔ یہ کارِ خیر سمجھ کر قائم کئے گئے
تھے۔ ان مدارس میں عربی فارسی کی تعلیم ہوتی ہے۔ طالب علموں کا بہت سا
وقت قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے اور فقہ کی تعلیم میں صرف ہوتا ہے۔ آبادی کے
مقابلہ میں طالب علموں کی تعداد بہت ہی کم ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کچھ نہیں حاضری
بے قاعدہ ہے اور جو تعلیم کہ ان مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ اس سے بہت ہی کم
فائدہ پہنچتا ہے۔ نیز پہلے جن درسگاہوں میں تعلیم دی جاتی تھی اب وہ نہایت
خراب و خستہ حالت میں ہیں اور ان کے مصارف کا انتظام سیاسی انقلاب
کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا ہے اور اب ان رقوم کا پھر سے حاصل کرنا ممکن نہیں
دہلی میں سرکاری درسگاہ کے قیام اور اس کی امداد کے لئے ساڑھے تین ہزار
روپے سالانہ کی گنجائش نکل سکتی ہے اور کچھ دنوں بعد اس میں اضافہ بھی
ممکن ہے۔ اس مجلس نے یہ بھی لکھا کہ دہلی جیسے آباد شہر میں ایسے لوگوں کی
خاصی بڑی تعداد ہے۔ جو کسی زمانہ میں بہت فارغ البال تھے لیکن سیاسی
انقلاب کی وجہ سے اب نانِ شبینہ کے لئے بھی محتاج ہو گئے ہیں۔ مگر اس پر
بھی کسی ادنیٰ پیشہ کو اختیار کرنا ننگ و عار کا باعث سمجھتے ہیں۔ اس لئے
اگر مجوزہ کالج قائم ہو گیا تو اس قسم کے بعض لوگ ضرور اس کی طرف راغب

ہوں گے تاکہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر معزز زندگی بسر کر سکیں۔ مجلس نے
یہ بھی تجویز کیا کہ یہ کالج بلا کسی تاخیر کے فوراً قائم کیا جائے اور درس و تدریس
کے لئے مولویوں کا تقرر کیا جائے۔ چونکہ یورپی علوم کی تعلیم اس کا خاص مقصد
ہے اس لئے بعض اعلیٰ درجہ کی کتابیں جو مشرقی زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔
اس کالج کے درس میں شامل کی جائیں۔ مجلس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ
طالب علموں میں تشویق دلانے کے لئے ایسے ذرائع استعمال کئے جائیں کہ طالب علم
خوشی خوشی اس کی طرف مائل ہوں۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ نے کچھ عطیہ بھی
دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

غرض ۱۸۲۵ء میں اس مجوزہ کالج کا قیام ہوا اور اس کالج کے خرچ
کے لئے ۵۰۰ روپے ماہانہ مقرر کئے گئے۔ مسٹر جے۔ ایچ۔ ٹیلر مقامی مجلس کے سکریٹری
مقرر ہوئے۔ ہیڈ مولوی کے علاوہ دو اور مولویوں کا بھی انتظام ہوا۔ طلباء میں
دلچسپی پیدا کرنے کے لئے وظائف بھی مقرر ہوئے۔ مجلسِ تعلیم عامہ کی خدمت
میں سالانہ رپورٹیں، مولویوں کی محنت اور امتحانات کے نتائج اور دوسرے
امور کے متعلق معلومات بھیجی گئیں۔

اس وقت اچھے استادوں اور کتابوں کی کمی تھی۔ اس لئے دہلی کالج کے
نصاب میں کوئی بڑی یا بنیادی تبدیلی ناممکن تھی۔ اسی وجہ سے اس کمیٹی نے
فقہ اور قدیم فلسفہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن علومِ مفیدہ کی تحصیل پر بھی زور دیا۔
مثلاً ریاضی و تاریخ۔ جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے اس نے ہندوستانی (یعنی
اُردو) فارسی اور عربی کے سیکھنے کی سفارش کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے
کہ دہلی کالج کا مقصد بھی اور مدارس کی طرح خصوصیت سے عربی زبان اور

اسلامی قانون کا سکھانا تھا۔ اس قسم کی تعلیم سے بہرہ مند لوگوں کی برطانوی عدالتوں میں بڑی کھپت تھی۔

۲۴ جولائی ۱۸۲۶ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال کے اندر اس کالج نے غیر معمولی ترقی کی اور آفاقی طلباء کی تعداد ایک سال کے اندر اندر ۱۲۰ تک ہو گئی۔ ۱۸۲۸ء میں طلباء کی مجموعی تعداد ۲۰۴ تک پہنچ گئی۔ ۱۸۲۸ء میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ ہیئت اور ریاضی کی تعلیم مغربی اصولوں کے مطابق دی جانے لگی اور انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔ لیکن اس سال کے امتحانات کے نتائج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں انگریزی کی تعلیم ثانوی حیثیت سے ہوتی تھی جس کا معیار بہت معمولی تھا۔ چنانچہ اہل دہلی کے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے جنرل کمیٹی نے انگریزی کی علیحدہ جماعتیں قائم کرنے کی سفارش کی اور انگریزی زبان، سائنس اور ادب کی تحصیل کے لیے آٹھ سو روپے ماہوار مقرر کئے گئے۔ گورنمنٹ نے بھی اس خیال کی تائید کی۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں قدیم دہلی کالج کی بغل سے ایک نیا ادارہ جس کو دہلی انسٹی ٹیوٹ یا دہلی کالج کا مغربی شعبہ کہنا بجا ہوگا وجود میں آیا۔ اس کی یہ مشرقی اور مغربی یا قدیم و جدید دونوں حیثیتیں آخر وقت تک قائم رہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں میں یہ بدگمانی پیدا ہو رہی تھی کہ ہمارے نوجوانوں کے مذہبی عقائد کو بگاڑنے اور اندر ہی اندر عیسائی مذہب کے پھیلانے کا جذبہ دہلی کالج کے پس منظر میں کارفرما ہے۔ یہ بدگمانی کچھ زیادہ بے جا بھی نہ تھی۔ بات یہ تھی کہ ابتداء میں بچے انگریزی مدرسوں میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے وہاں نئی نئی چیزیں دیکھیں اور پڑھیں تو وہ اس قسم کی واہی

تباہی کرنے لگے جس سے پرانے خیال کے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہونے کا موقع ملا۔ یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد انگریزی شعبہ میں بہت کم رہی جس کی طرف مولانا حالی نے بھی اشارہ کیا ہے۔

دہلی کالج انگریزوں کی اس تعلیمی پالیسی کی وجہ سے وجود میں آیا جس پر مشرقی علوم کے حامی (ORIENTALISTS) عمل پیرا تھے۔ اور اس وقت جنرل تعلیمی کمیٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ علاوہ اس کے یورپ میں ہندوستانی علوم کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ گوئٹے کے توصیفی اشعار، سر ولیم جونس کے تحقیقی مقالات اور ولیم رابرٹسن کے تہذیبی انکشافات اُن کی قدر و قیمت کو بڑھا رہے تھے۔ بعض برطانوی حاکم ہندوستانی علوم کی سرد بازاری پر آزردہ تھے اور اُن کا احیا چاہتے تھے۔ انگریز یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی حکومت تو مل گئی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کی ہمدردی حاصل نہیں ہوئی۔ اُن کو یہ بھی خیال تھا کہ اگر اُن علوم کی حمایت کی گئی جو ہندوالوں کو بہت عزیز ہیں تو وہ اُن کی نگاہوں میں سرخ رو ہو سکیں گے۔ اس لئے جنرل کمیٹی نے جو تعلیمی پالیسی بنائی وہ مشرقی علوم کی حمایت میں تھی اُس کے اراکین کچھ تو اپنے دامن کی تنگی کی وجہ سے اور کچھ عقیدتاً یہ سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم سوسائٹی کے اونچے طبقہ سے شروع کی جائے اور اس کے فوائد و برکات چھن کر طبقۂ ادنیٰ تک پہنچنے چاہئیں۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس طبقہ کو رفتہ رفتہ مغربی علوم سے آشنا کیا جائے۔ اس لئے کہ اچھے نتائج مشرق و مغرب کے آمیزہ ہی سے مرتب ہو سکتے ہیں اور شاید اس صورت میں ان ہندوستانی زبانوں کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے جو بعد میں ذریعہ تعلیم بنیں گی۔ دوسرے ہندوستان جیسے قدیم اور وسیع ملک میں مغربی آگاہیوں کی بنیاد صرف مشرقی علوم پر رکھی جا سکتی ہے۔

لیکن یہاں یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اُس وقت پورا ہندوستان نئی ضرورتوں یا نئی ایجادوں سے نا آشنائے محض تھا یا ہندوستان کے مخصوص حالات کو جنرل کی پالیسی کے ہمیز کرنے میں کچھ بھی دخل نہیں۔ اس قسم کا مفروضہ تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا۔ مغلوں کے دَورِ عروج کا ذکر نہیں جبکہ بابر (متوفی ۱۵۳۰ء) کا سفیر اسکو میں مقیم تھا یا اکبر (متوفی ۱۶۰۵ء) امریکہ کی دریافت سے واقف ہو چکا تھا۔ آخری زمانے میں اورنگ زیب کا امیر دانشمند خاں ڈیکارٹ کی تجرباتی سائنس کی ایجادات اور ہاروے کے دَورانِ خون کے نظریہ کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اُس نے برنیر کو گیسنڈی اور ڈیکارٹ کی کتابوں کے فارسی تراجم پر مامور کیا تھا۔ اِسی طرح سوائی جے سنگھ جس کا انتقال نادر شاہ کے حملے کے چار سال بعد ہوا۔ علم ہیئت اور جدید ریاضی سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا اور اِن شعبوں میں جو کچھ کام پرتگال اور یونان میں ہوا تھا اُس سے تراجم کے ذریعے واقف تھا۔ اٹھارویں صدی کے سیاسی انحطاط میں بھی ہندوستانی پیداوار کے طریقوں کا مقابلہ دُنیا کے کسی ملک سے کیا جا سکتا تھا۔ اور یہیں کے بحری جہاز نپولین کے خلاف جنگ میں استعمال ہوئے تھے اور یہیں کی تعلیم کا اوسط انگلستان سے کہیں زیادہ تھا۔

اُنیسویں صدی کی عام مایوسیوں میں بھی جب کہ ہماری بیڑیاں بہت بھاری ہو گئی تھیں، ہندوستان میں ایک مستثنیٰ یا محدود طبقہ موجود تھا جو انگریزوں کے نئے علوم سے واقفیت کو ضروری سمجھتا تھا۔ مثلاً مہاراجہ اپورو کرشن بہادر اور غازی الدین حیدر کے ملازمین میں انگریز انجینیر شامل تھے۔ وہ خود علم کیمیا، دخانی انجنوں، نئے قسم کے جہازوں اور جدید کتابوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ نصیر الدین حیدر (م ۱۸۳۷ء) نے ایک رصدگاہ بھی بنوائی تھی جس کی نگرانی ایک انگریز کرتا تھا۔

لکھنؤ کے شاہی پریس سے انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ ہو رہا تھا۔ اور ہندوستان میں انگریزی زبان کی تحصیل کا رواج روز بروز بڑھ رہا تھا۔ لارڈ بینٹنک نواب فیض محمد خاں سے انگریزی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ کپتان لا نے اپنے دونوں لڑکوں کو اس نیت سے انگریزی پڑھائی تھی کہ وہ نواب محمد خاں کے سیکریٹری مقرر ہوں گے۔[۲۱]

اس بحث کا مدعا یہ ہے کہ دہلی کالج کچھ ایسی "بے موسم" کی چیز نہیں تھا اور ایک طبقہ خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو ایسا ضرور تھا جو انگریزوں کے علم و فن کو جاننے اور سمجھنے کا خواہش مند تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ بہت جلد دہلی کالج کے مشرقی شعبہ کو زوال اور مغربی شعبہ کو ترقی حاصل ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء میں انگریزی کی جماعتوں میں طلبا کی تعداد ۱۶۰ تک پہنچ گئی اور انگریزی گرامر کے پچاس نسخے صرف ایک دن میں بکنے لگے اور مولویوں اور پنڈتوں کے لڑکے اب اُس پرانے نظریے پر ہنسنے لگے کہ زمین دُنیا کا ایک جامد مرکز ہے۔

دہلی کالج کا یہ پودا چونکہ صحیح وقت پر لگایا گیا تھا اس لئے اُس نے جڑ تو پکڑ لی لیکن اِسے نم موسم آنے سے پہلے بادِ سموم کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ جب کسی نئی تحریک کا آغاز ہوتا ہے جس کی وجہ سے مروجہ طریقِ زندگی میں انقلاب پیدا ہونے کا خطرہ معلوم ہو تو اُس کی مخالفت ہوتی ہے۔ لیکن مخالفت کی کمی یا زیادتی اس پر منحصر ہوتی ہے کہ اس تحریک کے لئے زمین کتنی ہموار یا ناہموار ہے۔ دہلی کالج اِس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

سترھویں صدی میں ہندوستانی تہذیب اہلِ یورپ کی نظروں میں حقیر نہیں تھی۔ لیکن سنہ ۱۸۱۳ء میں اُن کا اندازِ فکر اس ملک کے متعلق بدل گیا۔ وہ

اِس کی روایات کو فرسودہ .... اس کی رسموں کو بہیمانہ اور اس کے عوام کو سراسر وحشی سمجھنے لگے۔ اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں نے یہ بات پورے یورپ کے دل میں بٹھا دی تھی کہ اُن کی تہذیب تمام دوسری تہذیبوں سے اعلیٰ و ارفع ہے اِس لئے کہ یورپ نے ترقی کا راز جان لیا ہے۔ اور وہ راز ہے عقلیت۔ اس کی بدولت ایسی سائنسی ترقی ممکن ہے جس کی نظیر ماضی میں نہیں۔ اور اس کے ذریعہ سماج کی ایسی تشکیل کی جا سکتی ہے جس کی بنیاد انصاف پر ہو۔ صنعتی انقلاب بھی اسی سائنسی فکر کا زائیدہ تھا جس کی دولت آفرینیوں کے آگے قارون کے خزانے ہیچ تھے۔ اُنیسویں صدی میں اس مدرسۂ خیال سے انسان دوستی اور افادیت کی تحریکیں اُبھر آئیں تو انگلستان میں ایک دورِ اصلاح شروع ہو گیا اور ہندوستان کو اِس نئے فلسفہ کے بروئے کار لانے کا بہترین محل سمجھا جانے لگا۔ اِن افکار و خیالات سے متاثر انگریزوں (بینٹنگ، اور میکالے) نے جب ہندوستان میں ذات پات کی تفریق دیکھی تو اُن کی انسان دوستی کو ٹھیس لگی۔ اور جب یہاں کی رسمیں دیکھیں تو اُن کی عقل دوستی کو صدمہ پہنچا اور اُن کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی نجات صرف مغرب کی تقلید اور پیروی میں ہے۔ ٹھیک اُسی زمانہ میں یہ بحث چل رہی تھی کہ ہندوستانیوں کو کونسی تعلیم دی جائے اور اس کا ذریعہ کیا ہو۔ دہلی کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اِس میں اس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ عربی فارسی اور سنسکرت کی تعلیم تو خیر اردو میں ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے۔ اُن کی تعلیم کا ذریعہ بھی اُردو ہی تھا۔ لیکن سرکاری حلقہ میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو رہی تھی جسے مشرقی تعلیم کا تعصب پیش ہوا تو بازی اسی کے ہاتھ رہی۔

گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک نے اُس یادداشت کو منظور کر لیا۔ میکالے کی یہ تعلیمی یادداشت ۱۸۳۵ء ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اُس کی تعلیمی پالیسیوں نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ مشرقی علوم سرپرستی اور امداد سے محروم کر دیئے گئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زلزلہ آتا ہے اور مکان اور مکین سب دب جاتے ہیں لیکن ایک بچہ حسنِ اتفاق سے بچ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی دہلی کالج کے ساتھ ہوا۔ گو مشرقی علوم حاکم وقت کی سرپرستی اور امداد سے محروم کر دئے گئے لیکن دہلی کالج کو باقی رہنے دیا گیا ہے۔

دہلی ورنیکلر سوسائیٹی

دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اُس نے اُردو کے ذریعے مغربی سائنس، ہیئت، ریاضی، نیچرل فلاسفی کی تعلیم کا انتظام کیا اور شمالی ہند میں سب سے پہلے مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر کو سمونے کی کوشش کی۔ اِس طرح اِس کالج نے نہ صرف اُردو زبان میں تعلیم کی شاندار روایت قائم کی بلکہ ایک نئی فضا اور ایک نئی شورش جہت پیدا کی۔ تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت، مشرق و مغرب کا امتزاج اور وہ سائنسی اور سیکولر نقطۂ نظر جس پر آج ہم زور دے رہے ہیں اور جس کی مدد سے اِس زمانہ میں ہم اپنی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں، اِس کا اولین احساس دہلی کالج ہی نے پیدا کیا تھا۔ اِس کالج میں چونکہ ذریعۂ تعلیم اُردو تھا چنانچہ سیاسیات، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ اور سائنس سے متعلق انگریزی کی متعدد اہم کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنے کی ضرورت تھی اسی مقصد کے پیشِ نظر "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی"

یا "انجمنِ اشاعتِ علوم بذریعۂ السنۂ ملکی" کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کو حکام کی سرپرستی اور اساتذہ کا سرگرم تعاون حاصل تھا۔ یہ زیادہ عرصہ تک چل نہ سکی مگر جب تک قائم رہی اس نے مفید کام کیا۔

اس کا مقصد نام سے ظاہر ہے۔ اس کی غرض یہ تھی کہ ترجمہ یا جدید کتب کی تالیف کے ذریعہ سے ہندوستان کی زبانوں کی ترقی میں کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جو تدابیر اس انجمن نے اختیار کیں ان کا خلاصہ مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف "مرحوم دہلی کالج" میں بیان کیا ہے۔

اس انجمن کے بانیوں اور معاونوں میں ہندوستانی اور انگریز برابر کے شریک تھے چندہ دینے والوں کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معطیوں کی کل تعداد ۱۱۲ تھی جس میں ۷۵ انگریز تھے اور چندہ میں بھی تقریباً برابر شریک تھے۔ شاہ اودھ، ان کے صاحبزادوں اور ان کے وزراء و اُمراء نے بھی عطیے دیئے۔ اسی طرح حیدرآباد دکن سے امیر کبیر سر سالار جنگ، سراج الملک بہادر راجہ رام بخش وغیرہ نے چندے عطا کئے۔ مجلسِ انتظامیہ کے ارکان یہ تھے۔

ٹی۔ مٹکاف، سی۔ گرانٹ، ای۔ سی۔ ریونشا، ڈبلیو۔ سیمین کونٹن، دولار کا ناتھ ٹیگور، اور سکریٹری مسٹر بتروس پرنسپل دہلی کالج تھے۔

انجمن نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کیلئے چند قاعدے بھی وضع کئے تھے جنہیں ہم بخوفِ طوالت نظرانداز کرتے ہیں۔

ترجمہ کی ایک صورت یہ نکالی گئی کہ تین طالب علم جن میں ماسٹر رام چندر پیش پیش تھے، کالج کے کام کے بعد فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کرتے اور یہ پرنسپل بتروس ترجمہ پڑھ کر اصلاح دیتے۔ اس طرح

جب کتاب ختم ہو جاتی تو چھاپنے کو دے دی جاتی اور نیچے کی جماعتوں کے نصابِ تعلیم میں شریک کر دی جاتی۔

پرنسپل کی تحریک پر یا اس کے مشورے سے ہندوستانی مدرس اور شعبۂ انگریزی کی اعلیٰ جماعت کے طالب علم کسی انگریزی (مطبوعہ یا قلمی) کتاب کو اردو ترجمہ کے لئے انتخاب کرتے تھے انہیں یہ پہلے ہی بتا دیا جاتا تھا کہ اگر ان کے ترجمے اچھے ہوئے تو جہاں تک جلد ممکن ہوگا یہ ترجمے طبع کرا دیئے جائیں گے اور انہیں ترجمہ کی خوبی اور کام کی دشواری کا لحاظ کرکے فی صفحہ چھ آنے سے بارہ آنے تک کی شرح سے معاوضہ دیا جائے گا۔ طبع سے پہلے ترجمہ کی نظرثانی مترجم کے مراجعہ میں صدر مدرس یا پرنسپل کرتے تھے یا کوئی قابل اور اہل ہندوستانی مدرس اپنی فرصت کے اوقات میں اُسے دیکھ لیتے تھے۔ جب نظرثانی ختم ہو جاتی تو ترجمہ چھپنے کے لئے دے دیا جاتا تھا اور کوئی موزوں شخص (عام طور پر خود مترجم) اسکے پروف دیکھتا۔

مشرقی زبانوں کے ترجموں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ یہ ترجمے نظرثانی کے لئے صدر مدرس یا پرنسپل کی خدمت میں نہیں پیش کئے جاتے تھے بلکہ یہ کام جیسا موقع ہوتا کسی مولوی یا پنڈت کے تفویض کر دیا جاتا۔

مدارس کی درسی کتابیں جو اب تک دہلی کالج یا دوسری درس گاہوں کے استعمال کے لئے طبع ہوتی تھیں ان کے صرف ایک سو نسخے طبع کئے گئے تھے ان میں کی بہت سی کتابیں ختم ہو چکی ہیں اور بعض "مدرسہ" (یعنی دہلی کالج کے مشرقی شعبہ) میں جاری ہیں ان کتابوں کے متعلق یہ قرار دیا گیا تھا کہ مدرسین پڑھاتے وقت تمام غلطیوں اور مبہم جملوں وغیرہ پر جو ان کی رائے میں قابلِ اصلاح ہیں نظر رکھیں اور قلمبند کرلیں۔ بعد ازاں یہ مجوزہ اصلاحیں صدر مدرس یا پرنسپل

دکھائیں۔ اور اس کی پسندیدگی اور مشورے کے بعد دوسرے ایڈیشن میں درج کردی جائیں۔ چونکہ ہر بار کی ایڈیشن میں یہی طریقہ عمل میں لایا جاتا ہے اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ ہر ترجمہ گو وہ شروع میں کیسا ہی ناقص ہو آخر میں تمام غلطیوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔

جب کبھی انگریزی درسی کتاب کا اُردو میں اچھا ترجمہ ہو جاتا اور چھپ جاتا تو وہ "مدرسہ" میں بالکل اسی طرح کام آتی جیسے کالج کے انگریزی شعبہ میں اصل انگریزی کتاب۔ بعض اوقات کسی مولوی کو ایک ایسے نصابِ تعلیم کی بھی نگرانی کرنی پڑتی تھی جس میں ایک ایسی کتاب بھی داخل ہے جو انگریزی کا ترجمہ ہے اور ایک ایسے فن سے متعلق ہے جس سے مولوی صاحب ناواقف ہیں تو ایسی حالت میں خود بھی اس کتاب کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی پڑھاتے تھے۔ اگر کسی انگریزی ماسٹر کو جو اُردو اچھی طرح بول سکتا تھا ایک اچھی نصاب کی کتاب اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں دے دی جاتی تو وہ اُردو میں ایسی ہی آسانی اور خوبی سے تعلیم دے سکتا جیسے انگریزی میں۔ اس کے لئے اُسے یہ کرنا چاہئے وہ اُردو ترجمہ اپنے طالب علموں کو پڑھ کر سنائے یا جماعت کے کسی طالب علم سے پڑھوائے۔ چونکہ اس کے ہاتھ میں انگریزی کتاب ہوتی وہ آسانی سے ترجمہ سمجھ لیتا اور تھوڑی سی مشق کے بعد بغیر زیادہ دقت کے زبانی کتاب کے مطالب سمجھانے میں قادر ہو جاتا۔

۱۸۴۵ء میں جب مسٹر بتروس علالت کی وجہ سے اپنی خدمت سے علیحدہ ہو کر یورپ چلے گئے تو ان کی جگہ ڈاکٹر اسپرنگر کا تقرر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی اُسی شوق اور سرگرمی سے ترجمہ و تالیف کے کام کو جاری رکھا۔

جیسا کہ اُن سے پہلے ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ سوسائٹی غیر سرکاری اصحاب کی مدد سے چلتی تھی۔ تاہم گورنمنٹ بھی اس کی مدد کرتی رہتی تھی اور جو نئی کتاب شائع ہوتی تھی اُس کے متعدد نسخے خرید کر کالجوں اور مدرسوں میں تقسیم کرتی تھی۔ علاوہ اس کے اکثر ارکان سرکاری عہدہ دار تھے اور خود لفٹننٹ گورنر سوسائٹی کے سرپرست تھے۔ سرکاری امداد کا اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ پرنسپل صاحب نے یہ تجویز کی کہ ریاضیات، طبعی جغرافیہ، تحلیل ہندسہ اور مخلوط ریاضی پر کتابیں شائع کی جائیں تاکہ مشرقی طلبہ کو ان مضامین کے مطالعہ کا موقعہ ملے۔ گورنمنٹ سے امداد کی درخواست کی گئی اور گورنمنٹ کی خواہش پر لوکل کمیٹی تعلیم دہلی نے ان کتابوں کے اُردو ترجمہ کے چالیس نسخوں کے طبع کا تخمینہ بھیجا اور یہ تجویز کیا کہ اُن کا ترجمہ بالکلیہ ماسٹر رام چندر مدرس یوروپین سائنس کے تفویض کیا جائے جو کمیٹی کی رائے میں ریاضیات اور نیچرل فلاسفی کا بخوبی علم رکھتے تھے اور 'فوائد الناظرین' اور 'محبِ ہند' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بہت اچھا کام کر رہے تھے۔ کمیٹی نے اس امر کا اطمینان دلایا کہ ماسٹر صاحب ان کتابوں کا ترجمہ بہت اچھی طرح کریں گے۔ ان میں سے ہر کتاب کے چالیس نسخوں کے طبع کا خرچ ۸۰۰ روپے کیا گیا۔ لفٹننٹ گورنر نے اس تجویز کو منظور کیا۔ اور لوکل کمیٹی کے اطمینان دلانے پر کہ مترجم اس کام کا اہل ہے' اس رقم کے خرچ کرنے کا اختیار کمیٹی کو دیا۔

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اُردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدہ کے ساتھ عمل میں آئی۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۲۰ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جسے سوسائٹی نے ترجمہ یا تالیف کیا تھا۔ اس سے اس کے

قابلِ قدر کام کا صحیح اندازہ ہوگا۔

کالج کے اساتذہ

جدید تنظیم کے وقت جب ۱۸۲۵ء میں کالج کی صورت قائم ہوئی تو جے۔ ایچ۔ ٹیلر مجلسِ مقامی (جو کالج کی انتظامی کمیٹی تھی) کے سکریٹری اور کالج کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ مجلسِ مقامی نے ۱۸۲۷ء میں یہ تجویز کی کہ مسٹر ٹیلر کالج کے پرنسپل مقرر کر دیئے جائیں لیکن گورنمنٹ نے بعض حالات کی دریافت پر اس کو منظور نہیں کیا۔ تاہم کالج باقاعدہ چلتا رہا۔ ۱۸۴۱ء میں مسٹر ایف۔ بتروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر ہوا۔

مسٹر بتروس

یہ بہت قابل اور صاحبِ علم شخص تھے۔ انہوں نے مشرقی شعبہ میں مغربی علوم کی ترویج میں بڑی کوشش کی۔ یہ دیسی زبان میں ترجمہ کے ذریعے علم کی اشاعت کے بڑے حامی تھے۔ چنانچہ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام و ترقی میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہی اس کے سکریٹری تھے۔ مسٹر بتروس نے جس مستعدی اور حقیقی سرگرمی اور خلوص سے اس سوسائٹی کے ترقی دینے اور کتابوں کے ترجمہ کرانے میں کوشش کی وہ نہایت قابلِ قدر ہے اور ان کا احسان اردو زبان پر ہمیشہ رہے گا۔ دہلی کالج میں انہوں نے بہت سی اصلاحیں کی اور مشرقی شعبہ کی تعلیم کو قابلِ اطمینان حالت میں چھوڑا اور اس کو مغربی علوم کی تعلیم میں برابر کر دیا۔ کمی جو کچھ تھی وہ کتابوں کی تھی۔ بیماری کی وجہ سے ۱۸۴۵ء میں وہ اپنے وطن کو

واپس چلے گئے۔

اسپرنگر

بتروس کی جگہ ڈاکٹر اے۔ اسپرنگر ایم۔ ڈی اسسٹنٹ سرجن بنگال سروس کا تقرر ہوا اور کالج کو مسٹر بتروس کا نعم البدل مل گیا۔ ڈاکٹر اسپرنگر عربی زبان و ادب کے عالم تھے اور اس لئے دہلی کے مسلمان شرفاء اور اہلِ علم میں انہوں نے جلد اثر پیدا کر لیا۔ شہر میں وہ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے وہ روحِ رواں تھے۔ انہوں نے کالج کی ترقی اور اصلاح میں بڑی مستعدی اور شوق سے کام لیا۔ نصابِ تعلیم میں خاص کر مشرقی شعبہ کے نصاب میں معقول اصلاحیں کیں۔ چنانچہ نصاب کی خاطر تاریخ یمنی کو ایڈیٹ کرایا اور چھپوایا۔ حماسہ اور متنبی کے نسخے بہم پہنچائے اور عربی ادب کے نصاب میں شریک کرائے۔ انتظامی حالت بھی ان کے زمانہ میں بہت اچھی رہی۔ علاوہ اس کے وہ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سکریٹری بھی تھے۔ اور اسی جوش سے کام کر رہے تھے جیسے ان کے پیش رو مسٹر بتروس۔ لیکن فروری ۱۸۵۰ء میں ڈاکٹر صاحب کو گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے شاہِ اودھ کے کتب خانہ کی فہرست تیار کرنے کا کام تفویض کیا گیا۔ یہ فہرست ان کی بڑی یادگار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی غیر حاضری میں ہیڈ ماسٹر مسٹر ٹیلر ان کے قائم مقام ہوئے۔ لکھنؤ کا کام ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب ۱۸۵۰ء کے قریب پھر اپنی اصل خدمت پر رجوع کئے گئے لیکن اسی سال علیل ہو کر شملہ چلے گئے۔ اس کے بعد اسی سال ان کی خدمات بنگال میں منتقل کر دی گئیں تو پرنسپلی کی

خدمت پر مسٹر جے۔ کارگل کا تقرر ہوا۔

جے۔ کارگل کے چلے جانے کے بعد ۱۸۵۰ء میں مسٹر ٹیلر قائم مقام پرنسپل ہوگئے۔ یہ بہت پرانے استاد تھے اور شروع سے اُن کا تعلق کالج سے چلا آ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں یہی پرنسپل تھے۔ لیکن بڑی بے دردی سے مارے گئے جس کا قلق سب کو اور خاص کر اُن کے شاگردوں کو بہت ہوا۔ مسٹر ٹیلر دہلی کالج میں چالیس سال تک ہیڈ ماسٹر اور دو تین سال تک پرنسپل بھی رہے۔ وہ طلباء پر پدرانہ شفقت کرتے تھے۔ اُن کے اخلاق حمیدہ کا طلباء پر بہت گہرا اثر تھا۔ وہ اُن سے سچی محبت کرتے تھے۔ بعض طلباء (ہندو) نے تو ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر اپنا مذہب تک بدل دیا۔

مسٹر بتروس، ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر ٹیلر کالج کے یہ تین پرنسپل ایسے گذرے ہیں کہ انہوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی۔ طلباء اور اساتذہ پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ اور شہر والے بھی اُن کا بڑا ادب کرتے تھے۔ خاص کر مشرقی شعبہ کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بتروس اور ڈاکٹر اسپرنگر نے جو بے دریغ کوشش کی وہ بہت قابل قدر ہے۔

مولوی امام بخش صہبائی

مولوی صاحب دہلی کالج میں فارسی اور عربی کے بڑے روشن خیال اُستاد تھے۔ اپنی اخلاقی جرات اور فارسی زبان میں عبور کی وجہ سے طلباء میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ فنِ شعر میں اُستاد مشہور تھے۔ قلعہ کے اکثر شہزادے

اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ متعدد کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔

کالج کے بعض قدیم طلباء

اب ہم ایسے چند سپوتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے نام ہی اس بات کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ دہلی کالج کیا چیز تھا اور اس نے کیا کام کیا۔ ماسٹر رام چندر، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر ضیاء الدین، مولوی ذکاء اللہ۔ یہ ایسے مشہور و معروف بزرگ ہیں کہ اُن کے حالات بیان کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ اُردو داں اُن کے حالات اور اُن کے کارناموں سے بہت کچھ واقف ہیں۔ ہماری زبان پر اُن کے ایسے احسانات ہیں کہ ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔ مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وہ لوگ ہیں جن کی تصانیف اُردو زبان میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ مولوی ذکاء اللہ نے ریاضی کی تمام شاخوں پر ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ تک نیز تاریخ، جغرافیہ، اخلاق، طبعیات وغیرہ پر بیشمار کتابیں لکھی ہیں جو بجائے خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ہیں۔ مولوی ضیاء الدین بھی ایک بڑے عالم تھے اور کالج میں عربی کے پروفیسر ہوگئے تھے۔ افسوس کہ ان کی یادگار "ارمِ ہند" کے پہلے حصہ کے سوا کچھ اور موجود نہیں۔ لیکن اس میں بھی استاد کا کمال جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ ماسٹر رام چندر ان سب میں سینئر اور قابل شخص تھے۔ ریاضی اور سائنس کے بڑے اُستاد تھے اور ریاضی کے فن میں بڑا نام کیا۔ افسوس لوگ اُنہیں بھول جاتے ہیں۔ اسلئے یہاں ہم ان تمام قابل قدر ہستیوں کا مختصر تذکرہ کرینگے۔ کیونکہ دبستان دہلی کی نثر کو ترقی دینے اور اردو کو ایک علمی زبان کا درجہ عطا کرنے میں ان کی خدمات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

موتی لال دہلوی

ان کا تعلق کشمیری پنڈتوں سے تھا۔ کالج کے نہایت ممتاز طلباء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انگریزی زبان پر بڑی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ ایسی جگہ ملازم تھے جہاں تعلیم و تعلم کا چرچا نہ تھا۔ لیکن اُن کا علمی شوق ہمیشہ قائم رہا۔ پٹارک کے تذکرہ "سسرو" کا ترجمہ اُردو میں کیا جو ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوا۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک تذکرہ بنام تذکرہ شعرا لکھا تھا۔ تعلیم نسواں اور صغر سنی کی شادی پر انگریزی میں دو رسالے لکھے۔ دو کتابیں مسمیریزم کے موضوع پر انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیں۔ اُردو فارسی میں بڑی دستگاہ تھی۔ بسمل تخلص کرتے تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر دہلی کالج کو فخر ہے۔

بھیرول پرشاد

یہ بھی بڑے قابل طالب علم تھے۔ کالج کی رپورٹوں میں ہر جگہ ان کی تعریف پائی جاتی ہے۔ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے لالہ وزیر سنگھ کا وظیفہ (مالیتی ۱۲ روپے) مقابلہ میں حاصل کیا۔ بی۔ اے۔ کے امتحان میں پنجاب کے تمام طلباء میں اوّل رہے۔ ارنالڈ گولڈ میڈل حاصل کیا۔ کالج ہی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے۔ اپنے وقت میں بہت مشہور تھے۔

پنڈت من پھول یہ ذات کے برہمن تھے۔ دہلی ان کا وطن تھا۔ کالج کے قدیم طلباء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

غالباً مولوی ذکاء اللہ کے ہم جماعت اور ماسٹر رام چندر کے شاگرد تھے۔ کالج کی رپورٹوں میں بھی ان کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی ہوگئے تھے۔ انہی کی کوشش سے مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کو سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر کے دفتر میں ملازمت ملی تھی۔

ماسٹر پیارے لال

یہ بھی دہلی کالج کے طالب علم تھے۔ ماسٹر صاحب کو مولانا صہبائی اور ماسٹر رام چندر کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سررشتہ تعلیم میں ہی ملازمت اختیار کی۔ گڑگانواں اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے بعد دہلی نارمل اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر مامور ہوگئے۔ ۱۸۶۷ء میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو کے کیوریٹر ہوئے اور جب بکڈپو ٹوٹا تو مدارس انسپکٹر کے عہدہ پر فائز کئے گئے۔ ۱۸۶۰ء میں دہلی میں ایک علمی اور ادبی انجمن "دہلی سوسائٹی" کے نام سے قائم ہوئی جس کے قیام میں ماسٹر صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ جب تک دہلی میں رہے وہی اس کے سکریٹری رہے۔ اس انجمن میں علوم و فنون، معاشرت و قانون وغیرہ پر لکچر اور مضامین پڑھے جاتے تھے۔ جب آپ پنجاب بکڈپو کی ملازمت پر مامور ہوگئے تو روانگی کے وقت سوسائٹی کی جانب سے آپ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا جس پر دہلی کے معزز اور وہ عمائد (مثلاً مرزا غالب وغیرہ) اور سوسائٹی کے ارکان کے دستخط تھے۔ اُردو، فارسی، انگریزی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار، معاملہ فہم اور حلیم الطبع تھے۔ رواداری اور بے تعصبی اُن کا شعار تھا۔ جس زمانہ میں میجر فلر سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے اُس وقت ماسٹر صاحب کی

کوشش سے مولانا آزاد کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ .... خواجہ حالی بھی ماسٹر صاحب ہی کی سعی اور توسط سے لاہور بکڈپو پہنچے۔ اس کے علاوہ مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، مولوی اتو جان دلی، منشی درگا پرشاد نادر، مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، ارشد گورگانی وغیرہ وغیرہ کو لاہور لانے کے ماسٹر صاحب ہی باعث ہوئے۔ اور ان بزرگوں نے اردو کی جو خدمت کی اس کی تاریخ گواہ ہے۔

ماسٹر صاحب باوجود گوناگوں معروفیتوں کے علمی و ادبی خدمت بھی کرتے رہے۔ چنانچہ ذیل کی کتابیں ان کی تصنیف و تالیف سے ہیں۔

(۱) قصصِ ہند: حصّہ اوّل (۲) قصصِ ہند: حصّہ سوم

(۳) رسوم ہند کا ابتدائی نصف حصّہ (۴) تاریخ انگلستان (کلاں)

(۵) دربار قیصری ۱۸۷۷ء تالیف مسٹر ویلر کا ترجمہ (۶) رسالہ اتالیق کے اکثر مضامین

رسالۂ اتالیق پنجاب کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

شری رام۔ ایم۔ اے

یہ بھی اسی کالج کے طالب علم تھے۔ پہلے سررشتۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ اس کے بعد ریاست الور میں برسوں دیوان یا وزیر اعظم رہے۔ بہت اچھے منتظم اور نیک نام تھے۔

حکیم چند

یہ بھی دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار ذہین اور قابل طالب علموں

میں ہوتا تھا۔ امتحانات میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کی۔ ایم۔ اے کے امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ حیدرآباد دکن میں ملازم ہوگئے تھے اور اعلیٰ خدمت پر فائز ہوئے۔ قانون میں ان کی قابلیت مسلّم تھی۔ ان کی تالیف RES JUDICATA نے بہت شہرت حاصل کی۔

منشی نند کیشور

یہ بھی دہلی کالج کے متعلم تھے۔ پنجاب میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ سے پنشن لی۔

ماسٹر کیدار ناتھ سابق سیشن جج

یہ بھی اسی کالج کے طالب علم تھے۔ بڑے عہدہ پر پہنچے۔ لیکن اس سے بڑھ کر ان کی سب سے بڑی اور قابل تعریف یادگار مجیس کالج ہے جو بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ تعلیمی معاملات میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔

ماسٹر کیدار ناتھ

انہوں نے بھی دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔

پیرزادہ محمد حسین ایم۔ اے (سیشن جج)

یہ بھی اسی کالج کے طالب علم تھے اور بہت شہرت حاصل کی۔ پیرزادہ صاحب کا ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ قابل قدر چیز ہے۔ اس پر جابجا انہوں نے نوٹ بھی لکھے ہیں۔ ان سے ان کی وسعت نظر اور علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خواجہ محمد شفیع ایم ۔اے (وظیفہ یاب جج سمال کاز کورٹ)

یہ بھی بڑے ذہین طالب علم تھے۔ انہوں نے بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

میر ناصر علی

میر ناصر علی ایڈیٹر "صلائے عام" بھی دہلی کالج ہی کے طالب علم تھے۔ اس مقالہ کے پانچویں باب میں ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مدن گوپال (ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بھائی)

دہلی کالج ہی کے طالب علم تھے۔ لیکن کالج ٹوٹنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے ایم ۔اے ۔ پاس کیا۔ الہ آباد سے سندِ وکالت (ہائی کورٹ) بھی حاصل کی۔ دہلی میں وکالت شروع کی اور پھر ولایت جاکر بیرسٹر ہو کر آئے۔ لاہور میں وکالت شروع کی۔ اپنے وقت میں پنجاب کے چوٹی کے وکلا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کئی قانون کی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

(۱) پنجاب ٹیننسی ایکٹ (۲) ریونیو ایکٹ

اور پروفیسر جیوانس کی منطق کا اردو میں ترجمہ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے قیام میں ڈاکٹر لائٹنر کے بڑے معین و معاون تھے۔

ماسٹر جانکی پرشاد

یہ ذات کے برہمن تھے۔ بعد میں عیسائی ہو گئے۔ ان کے نام کے ساتھ "ریورنڈ" لکھا جاتا تھا۔ برسوں سینٹ سٹیفن ہائی سکول دہلی میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ بڑے لائق تھے۔

پنڈت دھرم نارائن (ابن پنڈت بشن نرائن)

کالج کے نہایت قابل اور ذہین طلبا میں سے تھے۔ "پولیٹیکل اکانامی" (معاشیات) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ کچھ حصّہ تاریخ انگلستان کا بھی ترجمہ کیا۔ دونوں کتابیں اس زمانہ میں سوسائٹی نے چھاپ دی تھیں۔ رائے بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ اندور کے میر منشی رہے۔ سر سید احمد خاں کی سائنٹیفک سوسائٹی کے لیے مِل کی پولیٹیکل اکانامی کا انتخاب "سیاستِ مدن" کے نام سے کیا جسے سوسائٹی نے چھاپ کر شائع کیا۔

شیوا نارائن

یہ بھی کالج کے بہت ہونہار اور قابل طالب علموں میں سے تھے۔ تذکرہ دیماسس تھینیز (اپلوٹارک) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ ہندوستان کا ایک جغرافیہ اردو میں لکھا۔ اور ارنسٹ کے رسالۂ علم طبیعات کا ترجمہ بشرکت سروپ نارائن کیا۔

مولوی کریم الدین :۔ مولوی صاحب کا ذکر آگے آئے گا۔

شمالی ہند میں ذہنی بیداری اور جدید علوم و فنون سے دلچسپی پیدا کرنے میں دہلی کالج نے جو اہم رول ادا کیا اس کا اندازہ بہت کچھ اس دور کے اخبارات، تصانیف اور یادداشتوں سے ہو سکتا ہے۔ یہاں کی علمی محفلیں، جماعت کے خاص اسباق، تحریر و تقریر کے مقابلے دہلی کالج کے پڑھے لکھے لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن گئے تھے۔ اخباروں میں کالج کی اہم خبریں خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ کوئی نیا سائنسی تجربہ ہوتا تو اُسے اخباروں میں مشہور کیا جاتا

اور شہر کے لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا کہ وہ کالج میں آکر خود اپنی آنکھوں سے سائنس کے عجیب و غریب کرشمے دیکھیں۔ کالج کے پرنسپل اسپرنگر نے "قران السعدین" کے نام سے ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا تھا جس میں مغربی ممالک کی خبریں، سائنس کے موضوعات پر کالج والوں کے مضامین، دوسرے اخباروں کے اقتباسات اور انگریزی سے تراجم شائع کئے جاتے تھے۔ انگریز اساتذہ کے ساتھ ساتھ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی امام بخش صہبائی جیسے برگزیدہ حضرات بھی اس ادارہ سے وابستہ تھے۔ آزردہ طلباء کا امتحان لینے کے لئے آیا کرتے تھے مضمون نگاری کے مقابلہ میں اوّل آنے والے طالب علم کو ان کی طرف سے ایک طلائی تمغہ بھی دیا جاتا تھا۔ صہبائی کالج کے شعبۂ علومِ مشرقی میں فارسی کے استاد تھے۔ علمی تجربے کے باعث یہاں اُن کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

ان حضرات کی دلچسپی کے طفیل وہ لوگ بھی جن کے ذہن کی تربیت قدیم ماحول میں ہوئی تھی اور جو مغربی اقدار کو سراسر الحاد سے تعبیر کرتے تھے، دہلی کالج کے نئے علمی و تہذیبی مرکز کے زیر اثر نئے ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور تھے۔ دہلی کالج کے اس نئے وقار سے متاثر ہو کر اُمراء بھی اپنے بچوں کو یہاں بھیجنے لگے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند میں مشرق و مغرب کی اعلیٰ اقدار کو یکجا کرنے کی پہلی کوشش دہلی کالج میں کی گئی۔ اس نقطہ پر قدیم و جدید اب مرتکز ہونے لگے۔ یہاں کی خوشگوار علمی فضا میں نسل و رنگ، زبان و معاشرت اور وضع قطع کا فرق تحلیل ہو رہا تھا۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات عام طور پر استوار رہتے تھے۔ کالج کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اُسے جن انگریزوں سے واسطہ پڑا وہ جابر حکام نہیں شفیق اور وسیع القلب اساتذہ تھے اُن کا رویہ دوستانہ تھا۔

اس لئے ہندوستانی طلباء و اساتذہ اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔

کالج شہر کی ہماہمی سے دُور رہنے کے باوجود کوئی جزیرہ سا نہیں بن گیا تھا بلکہ شہر کے لوگوں سے اس کا گہرا رابطہ تھا۔ علمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں کالج کے حضرات نمایاں حصہ لیتے تھے اور اُن کے علم و فضل کی بناء پر دہلی والوں کی نگاہوں میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ کالج کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہیں آنے والے دور کے چند اعلیٰ ترین ذہنوں کی ساخت و پرداخت ہوئی جنھوں نے قومی زندگی میں مختلف طریقوں سے نمایاں حصہ لیا۔ مذہبی عقائد میں لچک اور وسعت کی ضرورت پر زور دیا۔ اور ہر جگہ فراخ دلی اور وسیع النظری کو اپنا شعار بنایا چنانچہ نذیر احمد نے کالج کے فیضان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا:-

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، اثار لشن گورنمنٹ کی پکی خیر خواہی، اجتہاد، اعلیٰ بصیرت یہ چیزیں ہیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں ثمرۂ زندگی ہیں، اُن کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط......" [۸۱]

۱۸۵۷ء میں دہلی کالج کو اتنا زبردست نقصان پہنچا کہ پھر اس کی حالت نہ سنبھل سکی۔ ہندوستانیوں نے یہ سمجھا کہ یہ ادارہ اور اس کے متعلقین بیرونی حکومت کے طرفدار ہیں۔ کالج میں انگریز پرنسپل اور اساتذہ کی موجودگی، انگریزی زبان اور مغربی علوم پر زور، طلباء اور اساتذہ کی طرف سے مغربی سیاسی نظریات اور نظام کی حمایت اور اخبارات اور رسائل کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں اس کا پرچار...... دو پرانے طلباء رامچندر اور چمن لال کا قبولِ عیسائیت۔ یہ سب

باتیں کالج کی تباہی کے لیے کافی تھیں۔ دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد کالج کی عمارت کو لوٹا گیا۔ پرنسپل مسٹر ٹیلر (TAYLOR) جو جان بچا کر بھاگ نکلے تھے پکڑے گئے اور ختم کر دیئے گئے۔ رامچندر تو چند دن چھپے رہنے کے بعد بچتے بچاتے انگریزوں کے کیمپ میں صحیح سلامت پہنچ گئے مگر چمن لال کو قتل کر دیا گیا۔ دہلی اُردو اخبار کے وقائع نگار نے اپنی آنکھوں سے کالج کے لٹنے کا منظر دیکھا "جانب مدرسہ جو نظر کی تو دیکھا کہ تمام اسباب میز و کرسی و تعداد ہزار ہا ہزار روپے کے آلات و ادویات تجربہ اور ہزار ہا روپے کا کتب خانہ انگریزی و فارسی و لقمہ گا سب لوگ لوٹے لئے جاتے ہیں۔ انجام کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ شطرنجی وغیرہ سے فرش زمین یعنی چوکہائے سنگ اور چوکھٹ و دروازے تک نکال لئے گئے۔ غرض کہ تمام حالات بدیدۂ عبرت دیکھتا ہوا حقیر غریب خانہ آیا۔" بغاوت رفع ہو جانے کے بعد کالج پر انگریزوں کا غضب نازل ہوا۔ پرنسپل کی موت کا ذمہ دار ہندوستانی اساتذہ کو ہی سمجھا گیا تھا۔ اس لئے اس کی سزا کا مستحق بھی کالج ٹھہرا۔ حکومت کی توجہ رفتہ رفتہ اُدھر سے ہٹنے لگی اور کالج کی پرانی حیثیت ختم ہو گئی۔ نیا علمی مرکز لاہور قرار پایا اور ۱۸۷۷ء کے بعد کالج بند کر دیا گیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد کالج جیسا بھی رہا بہرحال چل رہا تھا اور لوگوں کو اب بھی اس سے اُمیدیں باقی تھیں۔ دہلی کالج ہندوستانی علم و تہذیب کا ایک مشہور و معروف مرکز رہ چکا تھا۔ اس لیے دہلی کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی کالج بند ہونے کی خبر پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ بمبئی کے اخبار مخبر سرو نے اس سلسلہ میں ایک طویل مضمون شائع کیا۔ اور کالج کو بند کرنے کے لئے حکومت نے جو عذر پیش کئے تھے اُن کے جوابات دیئے۔ مگر اب کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو حکومت کی مرضی کو

بدل سکتی۔ ملک پر مکمل قبضہ کے بعد ہندوستانی تہذیب کی بیخ کنی کی منظم کوششوں میں اضافہ ہو گیا۔ سرکاری مدرسوں کے ذریعہ ایسے اذہان ڈھالنے کی کوشش شروع کی گئی جو آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ہوں اور سامراجی نظام کے استحکام میں مددگار ثابت ہوں۔ ایسے حالات میں دہلی کالج جیسے ادارہ کا جہاں "جسم ہندی میں جانِ انگریزی" ڈالنے کی بجائے اس میں رہنے والی جان کو توانائی عطا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی' بری طرح متاثر ہونا لازمی تھا۔

یہ ہے مختصر روئداد مرحوم دہلی کالج کی۔ کالج نہیں رہا بلکہ اُس کا کام زندہ ہے۔ اُردو زبان و ادب کو سنوارنے اور بنانے میں جو خدمات اُس نے کی ہے۔ وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتی ہم اپنی زبان کو اس وقت جس ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں اس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا بہت کچھ اثر ہے۔ یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغربی علوم کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعہ دی جاتی تھی ایک صدی پہلے اس کا خیال آنا اور اس پر عمل کرنا غیر معمولی ہمت کا کام تھا۔ اُردو نثر کی تاریخ میں قدیم دہلی کالج کا جو اہم حصّہ ہے اس کی طرف ابھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

اُردو نثر کی تاریخ میں دہلی کالج' علی گڑھ تحریک اور فورٹ ولیم کالج کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کالج اور اس سے متعلق حضرات کی بدولت "چند اعلیٰ" روایات کی داغ بیل پڑی۔ اور ادب میں جمود اور بالیدگی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج سے یہ اس بنا پر ممتاز تھا کہ یہاں ہندوستانیوں کو اُردو کے ذریعہ مغربی علوم و ادب سے آشنا کرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جب کہ فورٹ ولیم کالج کا اصل مقصد حکومت کی ضروریات کے پیش نظر انگریزوں کو مشرقی علوم و ادب اور زبانوں سے واقفیت بہم

پہنچاتا تھا۔ یہ فرق ان دونوں اداروں سے شائع کی ہوئی کتابوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ علی گڑھ کالج اور دہلی کالج میں کوئی بنیادی اختلاف نہ ہونے کے باوجود ایک اہم فرق یہ تھا کہ علی گڑھ کالج میں مغربی علوم کی تدریس کا ذریعہ انگریزی ہی کو بنایا گیا۔ جب کہ دہلی کالج نے اردو کو بطور ذریعۂ تعلیم تسلیم کیا اور اس زبان کے ذریعہ ہندوستان میں مغربی علوم کی اشاعت کو ترجیح دی۔ دہلی کالج میں پہلی بار مختلف موضوعات سے متعلق منتخب اور اعلیٰ پایہ کی تصانیف کو اردو میں منتقل کر کے انہیں کالج کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ ترجمہ کا کام اس سے پہلے اردو میں بہت کم ہوا تھا۔ خصوصاً علمی مضامین لکھنے یا ترجمہ کرنے کی روایت تقریباً مفقود تھی۔ اس لئے انہیں اردو تراجم کی ابتدائی شکل سمجھنا چاہیے۔ پھر بھی اصطلاحات اور ہم معنی الفاظ وضع کرنے کی طرف توجہ، انگریزی زبان سے مناسب اور موزوں الفاظ مستعار لینے کی کوشش اور لفظی ترجمہ کی بجائے اظہارِ مفہوم کی اہمیت کا احساس قابلِ ستائش ہے۔ دہلی کالج سے پہلے اردو نثر کا بیشتر حصہ داستانوں اور قصے کہانیوں پر مشتمل تھا مذہبی موضوعات پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھا جاتا تھا۔ مگر ان کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی۔ دہلی کالج کے حلقے نے اردو میں متنوع علمی مضامین کے ایک بیش بہا ذخیرہ کا اضافہ کیا۔ یہی مضامین شمالی ہند میں ذہنی بیداری کے آغاز کا سبب بنے۔

ماسٹر رامچندر

رامچندر اُن لوگوں میں سے تھے جو ہندوستان پر برطانیہ کے اقتدار کو ہی اپنے ملک کی نجات کا ضامن سمجھتے تھے۔ جن حالات میں انہوں نے

آنکھ کھولی اُن کے پیشِ نظر ملکی نظام سے ناامیدی کچھ بے جا نہ تھی۔ برطانیہ کے سیاسی اور معاشی نظام اور اُس کی نظریاتی بنیاد کو وہ کہیں زیادہ قوی مستحکم سمجھتے۔ یہ محض کسی بھٹکے ہوئے ذہن کی کج فہمی نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے متعدد وجوہ تھے۔ جن کا اظہار انہوں نے کئی بار کیا۔ وہ وجوہ بڑی معقول تھیں۔ دراصل یہ دو مختلف النوع نظام ہائے زندگی کا فرق تھا۔ ایک جاگیردارانہ نظام جو کمزور ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ اس پیدا ہونے والے نئے صنعتی دور کے پروردہ سامراجی نظام کے سامنے ماند پڑ رہا تھا اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ ایک بہتر اور ترقی یافتہ نظام کا کمتر اور کہنہ نظام کی جگہ لے لینا تاریخ کا اٹل قانون ہے غدر کے بعد رامچندر کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ لیکن وہ برطانوی نظام کی اپنی نوعیت پر بہت زیادہ غور نہ کر سکے۔ برطانوی حکومت سے تعاون رامچندر کے نزدیک قوم پرستی اور حب الوطنی کا تقاضا تھا۔ وہ ملکی مفاد اور بیرونی اقتدار میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ہندوستان برطانیہ کا سہارا لئے بغیر قدامت کی تاریکی سے نکل نہیں سکتا۔ اُن کے نزدیک انگریز حکمراں کو تعلیم سے بہرہ مند، مسیحی اخلاق کا حامل اور ترقی یافتہ شعور کا مالک ہونے کی بنا پر فطرتاً رحمدل اور نیک باطن ہونا چاہیے تھا۔ وہ انگریزوں کے اقتدار کا اصل منشا ہندوستان کی ترقی اور اصلاح سمجھتے تھے۔ برطانیہ کے اپنے مفادات پر انہوں نے غور اس لئے نہیں کیا کہ کسی ترقی یافتہ قوم کو وہ خود غرض یا ظالم تصور نہیں کر سکتے تھے۔ انگلستان کے سیاسی نظام نے انہیں خاص طور پر متاثر کیا تھا اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اہلِ انگلستان کے اقتدار کے ساتھ آزادیِ فکر و عمل حکومت کے کاموں میں عوام کا دخل، ترقی یافتہ سماجی و معاشی ادارے اور تمام اعلیٰ صفات ان کے

ملک میں بھی آجائیں گی جن کی بنا پر یورپ والے ہندوستان اور دوسرے
ایشیائیوں سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ وہ یہ بھی امید رکھتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں
کی تربیت کرنے کے بعد رفتہ رفتہ تمام اہم کام اُن کے ذمہ کر دیں گے اور وہ
وقت آئیگا جب ہندوستانی ہی اپنے ملک کے اصل حاکم ہو جائینگے۔

رامچندر کے نزدیک حکومت پر اختیار حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہی تھا کہ
ہندوستانی باشندے انگریزی زبان اور جدید نظام حکومت کے آئین و
قوانین سے واقفیت حاصل کر کے حکومت میں زیادہ سے زیادہ جگہیں حاصل
اور حکام کے ساتھ مکمل تعاون کریں تاکہ انگریز اپنے بزرگانہ فرائض کو صحیح طور پر
انجام دے سکیں۔

دراصل دہلی کالج کے ماحول اور وہاں کی تعلیم و تربیت نے رامچندر کے
دل میں انگریزوں کی قدر بڑھا دی تھی۔ وہ انگریزی حکمرانوں کو بھی اپنے انگریز
اساتذہ ہی کی مانند مخلص سمجھنے لگے تھے اور اسی لئے انہیں پورا بھروسہ تھا۔
۱۸۵۷ء کے بعد انگریز ہندوستان پر مکمل قابض ہو گئے تو شاید رامچندر کو بڑی
مایوسی ہوئی اور انگریز حکومت ان اخلاقی اور مذہبی معیاروں پر پوری نہ اتر سکی
جنھیں وہ صرف انگریزوں سے مخصوص سمجھتے تھے۔ شاید اسی لئے وہ بغاوت
و ناکامی کے بعد اپنے سیاسی و سماجی نظریات کی تبلیغ میں پہلے کی طرح
منہمک نہ رہ سکے اور رفتہ رفتہ وہ عیسائیت کی تبلیغ میں محو ہو گئے۔ تعلیمی کاموں
میں بھی وہ مرنے سے چند سال پہلے تک مصروف رہے مگر اس کے باوجود سماجی
سرگرمیوں میں پہلے سا جوش و خروش نہیں رہ گیا۔ اُن کے اخبارات
کا ناساز گار حالات میں بند ہو جانا اور عیسائیت کی تبلیغ کی طرف بڑھتی ہوئی

دلچسپی بھی اس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں جناب صدیق الرحمٰن قدوائی کا
قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی وجہ نہ تھی کہ رام چندر جیسے سرگرم عمل شخص کے
فکر و عمل کے لئے زنجیر ثابت ہوتی۔ سماجی و سیاسی سرگرمیوں کے قطعی ترک ہو جانے کا
سبب شاید انگریزی حکومت سے اُن کی مایوسی ہی تھی۔ اُن کے اس خطبہ
جو انہوں نے انگریزوں کے رویّے کی شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا ظاہر ہوتا ہے
کہ مسیحی روحانیت کا جو تصور انہوں نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ بیرونی
حکومت کے احوال سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ دہلی کی آبادی بے خانماں اور شہر کی
عمارتوں کو مسمار ہوتا دیکھ کر اُن کے خوابوں کے محل منہدم ہو گئے اور شاید اسی لئے
انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد خاموشی کو ہی مناسب سمجھا۔

اُن کے یہاں انگریزی زبان کی اہمیت اس کی علمی حیثیت کی بنا پر تھی۔
اُن کے نزدیک یہ سرکاری ملازمت اور معاشی ملکیات سے زیادہ فروغ علم اور
تہذیب ذہن کا وسیلہ تھی۔ وہ انگریزی زبان و علوم کے فوری فائدہ و دور رس
نتائج سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو کے فروغ
کے لئے بھی کوشاں تھے وہ مادری زبان کو زیادہ فطری اور قدرتی ذریعہ تعلیم
سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ انگریزی زبان کا سارا علمی سرمایہ اُردو میں منتقل
کر دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے عملی طور پر جو خدمت انجام دی وہ اُردو زبان
کی تاریخ میں کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

اُن کے نزدیک انگریزی زبان کا اس وقت تک سہارا لینا ضروری تھا
جب تک کہ خود اُردو زبان اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ جدید فلسفہ اور علم کی
درس و تدریس کا ذریعہ بن سکے۔ اور اس کا طریقہ صرف یہی تھا کہ اُردو داں

حضرات کا ایک بڑا طبقہ انگریزی سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے بعد تراجم کے ذریعے مغربی علوم کو اُردو میں پیش کرے اور یہی اُن کے نزدیک انگریزی زبان کا سب سے بڑا فائدہ تھا۔

رامچندر کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے خود متعدد اقوام کے عروج و زوال کے اسباب کا غائر مطالعہ کیا تھا" فوائد الناظرین" اور "محبِ ہند" اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ تاریخ کے متعلق رامچندر کا نقطۂ نظر اپنی انفرادیت کی وجہ سے بڑا اہم ہے جس کی روشنی میں انہوں نے اپنے ملک کے سیاسی اور سماجی مسائل پر واضح اور متعین رائیں پیش کیں۔ رامچندر کے خیال میں جدید کو قدیم کے مقابل میں قدرتی طور پر بہتر ہونا چاہئے کیونکہ جدید کے خزانے میں قدیم سرمایہ بھی محفوظ ہوتا ہے اور وہ اضافے بھی شامل ہوتے ہیں جو عہد بہ عہد ہوتے رہتے ہیں جدید و قدیم ایک ہی سلسلہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ جو آج قدیم ہے وہ کسی وقت جدید تھا۔

صنعتی دور میں پیدا ہونے والے معاشی نظریئے اور ادارے جو مغرب میں نشو و نما پا رہے تھے ہندوستان کے لئے خاص طور سے اہم تھے۔ لیکن یہاں کے قدیم جاگیردارانہ نظام کے ڈھانچے میں سرمایہ دارانہ نظریات اور جدید خیالات اس وقت تک بس نہیں سکتے تھے جب تک کہ یہاں کے سماجی ڈھانچہ میں تبدیلی نہ ہو۔ مگر دوسری اقوام کی طرح ہندوستانیوں کے لئے بھی صنعتی دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور انہیں پورا کرنا ضروری تھا۔ رامچندر کو ان سب باتوں کا پورا علم تھا چنانچہ انہوں نے بینک جیسے بنیادی معاشی ادارہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے قیام پر زور دیا اور بیاج کے

قدیم مہاجنی طریقے کی برائیاں بیان کیں۔ اس سلسلہ میں اُن کا مضمون جس کا عنوان تھا "کوڑی مرافد کی اس صورت میں جب وہ واسطے قرض دینے روپے کی مقرر ہو" اور جو "فوائد الناظرین" میں شائع ہوا تھا جدید ضروریات پر اُن کی گہری نظر کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اُن کے نزدیک محنت اخلاقی و معاشی دونوں پہلوؤں سے مفید اور قابلِ قدر تھی اُن کے خیال میں محنت بہ نفسِ خود اگر اس کے واسطے انعام نہ ہو سستی سے بہتر ہے۔ وہ ملک کے معاشی نظام میں زبردست تبدیلی چاہتے تھے اور اس کے لئے دو بنیادی اُصول لازمی سمجھتے تھے۔ پہلے تو تمام مال لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیئے دوم حقِ مال محفوظ رہے۔ سماجی اصلاح سے متعلق رامچندر کے خیالات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے اخبار و رسالہ کا بڑا حصہ سماجی اور اخلاقی مضامین کے لئے وقف تھا۔ اور عملی طور پر بھی وہ اس راہ میں زندگی بھر سرگرم رہے۔ اس سلسلہ میں اُن کے علم و فضل کے ساتھ اُن کے ذاتی تجربات کو بڑا دخل ہے۔ اُن نقصانات سے جن سے کہ وہ خود یا اُن کے اعزہ دوچار ہو چکے تھے وہ دوسروں کو بھی آگاہ کرنا چاہتے تھے اور اس لئے انہوں نے ایسے موضوعات پر مفصل و مدلل شواہد سے بھرپور تلخ، ترش اور طنز آمیز مضامین لکھے ہیں جن کی اہمیت آج بھی کسی اعتبار سے کم نہیں۔

سماجی اصلاح کے لئے عورتوں کی تعلیم و تربیت بھی ضروری تھی۔ عورتوں کی تعلیم مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے قدیم نظام میں غلط سمجھی جاتی تھی اور عورتیں عام طور پر زندگی بھر [illegible] کرتی تھیں۔ رامچندر اس رواج کے سخت مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر تحصیلِ علم سے درستیٔ اخلاق اور

زیادتیٔ عقل کے واسطے مردوں کے موثر ہے تو وہ بے شک واسطے عورتوں کے بھی موثر ہوگی۔ مگر یہ حقیقت عام طور پر نظر انداز کی جاتی تھی اور بڑے بڑے علماء و فضلاء تعلیم نسواں کو ناجائز سمجھتے تھے۔ رام چندر ان حالات سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے تعلیم و تربیت کے رائج الوقت طور و طریق پر سخت تنقید کی اور اپنے مضامین کے ذریعہ بچوں کی نفسیات اُن کے فطری میلانات و ضروریات اور والدین کے فرائض سے اُن کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اِن مضامین میں اُنہوں نے بچوں کی تربیت کے جو اصول سو سال پہلے پیش کئے اُن کی اہمیت کا احساس اَب شروع ہوا ہے۔

فکری اعتبار سے رام چندر اس اصلاحی نقطۂ نظر کے حامل تھے جس کا راجہ رام موہن رائے نے پہلے پہل پرچار کیا اور جسے سرسیّد نے اُنیسویں صدی کے آخر میں پھیلایا۔ اصلاحی تحریک ہندوستان میں مغربی خیالات کے آثار کے ساتھ وجود میں آئی اور اس وقت تک جاری رہی جب تک برطانوی حکومت کے ارادے پوری طرح واضح نہ ہوگئے۔ اس دَور میں اس اصلاحی تحریک نے اہم سیاسی و سماجی خدمات انجام دی۔ ہندوستانی قوم پرستی کا آغاز دراصل اسی کی بدولت ہوا۔

رام چندر اس وسیع تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ ہونے کے باوجود راجہ رام موہن رائے اور سر سیّد احمد خاں سے ایک لحاظ سے مختلف تھے راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک کا مقصد خاص طور پر ہندوؤں کی سماجی اصلاح تھا۔ جب کہ سرسیّد خصوصاً مسلمانوں سے مخاطب تھے۔ اس کا ایک سبب دونوں مفکرین کا مذہبی رُجحان بھی تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی

توہم پرستی سے نالاں تھے اور اپنے مذہب کی تعبیر نے حقائق و مشاہدات کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے دونوں کا اپنے ہم مذہبوں سے علیحدہ علیحدہ مخاطب ہونا قدرتی امر تھا۔ مگر رامچندر جس تحریک سے متعلق تھے وہ بنیادی طور پر ایک تعلیمی ادارے سے متعلق تھی اور ملک کے مشترک سماجی و سیاسی مسائل سے سروکار رکھتی تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی پستی کو ملک کی عام ذہنی پستی کا نتیجہ سمجھتی تھی۔ یہی سیکولر نقطۂ نظر رامچندر کو بھی دوسرے اصلاح پسند مفکرین سے ممتاز کرتا ہے۔ سائنس کی تعلیم اور مادی ضروریات کے ادراک نے اُنہیں مذہب کا نیا نقطۂ نظر عطا کیا۔ وہ مذہب پر عقل اور منطقی اعتبار سے غور کرتے تھے۔ خدا کے وجود کے سوا عقیدے، رسم و روایات کو وہم سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک تمام ہندوستانی مذاہب خواہ وہ ہندو دھرم ہو یا اسلام، ذہنی پسماندگی کے سبب ناقابلِ تسلیم ہو چکے تھے اور اُن کی اصلاح کا طریقہ صرف یہ تھا کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو جدید فلسفہ و علم کی طرف مائل کرنے کی یکساں اور مشترک کوشش کی جائے۔ جس دَور میں قوم پرستی کا تصوّر تشکیل پا رہا تھا ملک کے مسائل کا یہ شعور غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہے۔

قبولِ عیسائیت کے بعد رامچندر کی مذہبی مشغولیات اس قدر بڑھ گئیں کہ پھر اُنہیں ملک کے دوسرے مسائل پر یکسوئی کے ساتھ غور کرنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ جوش و خروش جو فوائد الناظرین اور محبِ ہند کے مضامین میں ملتا تھا ماند پڑ گیا۔ فوائد الناظرین کا اجراء ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ ۱۸۵۲ء میں وہ محبِ ہند کے ساتھ ہی ساتھ بند ہوگیا۔ اس طرح اُن کی زندگی کا یہ اہم دَور ۲۴ سال کی عمر سے صرف ۳۱ سال کی عمر تک رہا اور جوانی کا جوش پختگی کی

عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی دوسری راہ پر لگ گیا۔"

رام چندر کی تالیفات، رسائل و اخبارات

طبیعات اور ریاضی سے متعلق رامچندر کی کتابیں زمانۂ طالب علمی ہی سے شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ "فوائد الناظرین" کے شائع ہونے کے بعد وہ سماجی سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر مضامین لکھنے لگے۔ مگر ان پر باقاعدہ کتاب [illegible] میں "عجائباتِ روزگار" کے نام سے شروع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چند ماہ ہی میں شائع ہوا۔ چند ماہ کے اندر کسی کتاب کا دوبارہ شائع ہونا آج بھی غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس زمانہ میں جب کہ ناظرین کا حلقہ آج کے مقابلہ میں بہت محدود تھا یہ بات حیرت انگیز تھی۔ حقیقت میں اس کتاب کے مضامین کی نوعیت ہی اس کی مقبولیت کی ضامن تھی۔ اس کتاب میں نصیحت آموز اور تاریخی عنوانات پر مضامین کے علاوہ مختلف ممالک کی عمارتوں، نئی ایجادوں اور عجیب و غریب جانوروں اور درختوں سے متعلق معلومات کو یکجا کر دیا گیا تھا جس سے اردو داں طبقہ عام طور پر ناواقف تھا۔ اس کتاب کا پہلا باب عجیب و غریب چیزوں مثلاً آتشی پہاڑوں، ملکِ مصر کے میناروں، روضۂ تاج محل، مختلف حالاتِ انسانی کی اشکال، مختلف جانور اور خوردبین وغیرہ کا حال درج تھا۔ دوسرا باب نصیحت آموز مضامین مثلاً قناعت، عبادت، سخاوت، سستی، غرور، حسد، صبر و اعتدال کے فوائد اور نقصانات کا ذکر ہے۔ تیسرے باب کا عنوان تھا "مختلف حالاتِ تواریخِ ہند جو قابل جاننے کے ہیں"۔ اس ضمن میں انگریز ٹیپو سلطان کے ساتھ سکندر اور

نپولین پر بھی مضامین شامل تھے۔ اس کے بعد ایک تتمہ بھی تھا جس میں تار برقی سے متعلق ایک مضمون "نقشہ جہاد و زندگی انگلستان کا" پیش کیا گیا تھا۔ ایک سو اٹھتر صفحات کی یہ کتاب سینتالیس مضامین پر مشتمل ہے اور جا بجا تصویروں، شکلوں اور خاکوں سے مزین تھی۔

تذکرۃ الکاملین

اس کتاب کو مصنف نے [illegible] میں شائع کیا۔ وہ ہندوستانی جو انگریزی زبان سے ناواقف تھے انھیں کچھ حالات، مسائل وغیرہ فاضلوں کو کا[illegible] یونان و روم قدیم اور انگلستان اور ممالک مشرقی سے واقفیت بہم پہنچانے کی غرض سے مرتب کی گئی تھی۔

تذکرۃ الکاملین میں ۲۰ مضامین شامل ہیں۔ ۷ سوانح پر ہیں باقی مضامین میں یونان، روم، فرنگستان اور ہندوستان کی مختصر داستانیں پیش کی گئیں۔ کتاب کے صفحات کی کل تعداد دو سو ہے۔

مصنف نے ریاضی دانوں، ہیئت دانوں اور ماہرینِ طبیعات کے حالات پر شاعروں اور بادشاہوں پر ترجیح دی۔ بادشاہوں کے حالات میں زور ظلم انصاف پسندی، رحمدلی اور دلیری کا بیان ہے اور صرف انہی بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ان خصوصیات کی بنا پر مشہور ہیں۔ فلسفیوں کا ذکر ان کے افکار و اعمال دونوں کو مدِنظر رکھ کر بیان کیے گئے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو تذکرۃ الکاملین میں اہلِ کمال کی سوانح سے زیادہ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی زندگی کے صرف ایسے واقعات نقل کیے گئے ہیں جن

اُن کے کارناموں کی اہمیت واضح ہوتی ہے مگر ناظرین کی دلچسپی کو بھی قطعاً نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بعض مضامین میں مختصر کر دیا گیا ہے، بعض میں کسی ایک ہی اہم پہلو یا واقعہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری باتوں کا ذکر یا تو برائے نام ہے یا بالکل نہیں۔

مضامین کے ساتھ ساتھ اشخاص کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ عبارت کو دلچسپ بنانے کے لئے کہیں کہیں اشعار، لطائف اور دلچسپ واقعات سے کام تو لیا گیا ہے مگر بہت کم۔ سائنسدانوں سے متعلق مضامین سوانح نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔ شخصیات سے عقیدت ہونے کے باوجود راجچندر اِس کی رَو میں بہہ جانے سے بچ گئے ہیں۔ کسی بھی شخصیت کو انہوں نے بُرا سرار بنا کر پیش نہیں کیا۔ ناظرین کو مرعوب یا محظوظ کرنے کے لئے انشا پردازی کے جوہر دکھانے پر زیادہ محنت نہیں کی گئی ہے۔ کہیں کہیں مبالغہ کی آمیزش ضرور مل جاتی ہے۔

راجچندر سائنس سے بے پناہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اِس لئے سائنس دانوں پر انہوں نے جو مضامین لکھے وہ دوسرے مضامین سے بہتر ہیں۔ کتاب کو پڑھتے وقت وقت کہیں کہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ماہرین سائنس کے علاوہ بعض شخصیات کا ذکر محض تذکرے کو مکمل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ مصنف نے مضامین کے لئے مواد حاصل کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا اور ہر لکھی ہوئی بات یا ہر پُرانی روایت کو بغیر سوچے سمجھے تسلیم نہیں کر لیا۔ جہاں تحقیق نہ ہو سکی وہاں مواد کو قیاس اور عقل کی معیاروں پہ پرکھنے کے بعد خامہ فرسائی کی ہے۔

تذکرۃ الکاملین میں مصنف کی توجہ سوانح پر زیادہ تھی اور ایک اچھے سوانح نگار کی طرح انہوں نے بھی اپنے معیاروں کے مطابق شخصیات اور اُن کے کارناموں کا

تجزیہ تو کیا ہے مگر اشخاص کے انتخاب اُن کی زندگی کے واقعات و کارناموں کے انتخاب اور اُن کی قدر و قیمت کی جانچ پرکھ سے بالواسطہ طور پر مصنف کے ذہنی رُجحان کا پتہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تذکرۃ الکاملین کے ذریعہ انچند کے افکار و نظریات کا پتہ لگانا بھی مشکل نہیں۔

تذکرۃ الکاملین اس زمانہ کی کتابوں میں ایک اہم اضافہ تھی جس وقت ہندوستان میں تذکرے صرف شاعروں کے اور سوانح مذہبی بزرگوں یا بادشاہوں کی لکھی جاتی تھی، ماہرین سائنس کے کارناموں کو بادشاہوں کی فتوحات اور بزرگوں کی کرامات کے برابر جگہ دینا اور اُن کی اہمیت کو جتانا ایک قابلِ قدر بات ہے۔ عجائبات روزگار کی طرح تذکرۃ الکاملین بھی اپنے ذخیرۂ معلومات کی بنا پر مقبول ہوئی اور ملک کے ہر گوشہ میں پہنچی۔

بھوت نہنگ

اِس کتاب کا مقصد ہندوستانیوں کو بھوت پریت پر عقیدہ رکھنے سے باز رکھنا ہے۔ یعنی حال یہ کہ یورپ میں لوگ اِس قسم کی ارواح سے حقیقی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں، ہندو لوگ یورپین اور عیسائی خیالات سے متاثر ہو کر اپنے ہم وطنوں کو اِس عقیدہ کے رکھنے سے روکنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں۔ صدیق الرحمٰن صاحب کا کہنا ہے کہ یہ کتاب اُن کو حاصل نہ ہو سکی۔

اُصول گورنمنٹ

یہ کتاب مسٹر جی۔ نورٹن (G. NORTAN) کے انگریزی لکچروں کا ترجمہ ہے۔

جیسے رامچندر اور ستیمبر نے مولوی سیّد محمد (مدرس دوم شعبۂ فارسی) کی اصلاح سے
مرتب کیا۔ اور پنڈت موتی لال سے دہلی اردو اخبار میں شائع کرایا۔ کتاب کی تالیف
کے وقت دونوں مترجمین کالج کے سینئر اسکالر تھے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ
سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ کتاب میں ۱۲۱ صفحات اور پانچ ابواب ہیں۔
اس کتاب کا قابلِ ذکر حصہ وہ "لغت نامہ" (GLOSSARY) ہے جس میں
انگریزی زبان کے سیاسی و آئینی اصطلاحات کے اردو مترادفات پیش کئے گئے ہیں۔

اُصول جبر و مقابلہ

رامچندر کی یہ کتاب ۱۸۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سات ابواب
اور ۸۰۴ صفحات ہیں۔ اخیر میں چار صفحے کا ایک غلط نامہ بھی شامل ہے۔ دوسری
سائنس کی کتابوں کی طرح اس میں بھی شکلیں اور خاکے نظر آتے ہیں۔

اُصول علمِ حساب جزئیات و کلیات

اس کتاب کا علم "فوائد الناظرین" ۲۹ دسمبر ۱۸۴۵ء (نمبر ۲) میں شائع شدہ
ایک اشتہار سے ہوتا ہے۔

علمِ طبیعی

"فوائد الناظرین" ۵ جنوری ۱۸۵۱ء (نمبر اول جلد ششم) میں ایک
اشتہار سے اس کتاب کا علم ہوتا ہے۔ جناب صدیق الرحمٰن قدوائی کو یہ کتاب
حاصل نہ ہو سکی۔ مذکورہ اشتہار سے انہوں نے اس کے متعلق صرف

چند باتوں کا ذکر کیا ہے کہ اس کتاب کے کل آٹھ باب ہیں اور ان کا تعلق
علی الترتیب ادوات، علم ہیئت، علم آب، علم ہوا، مناظر و مرایا، (MIRAGE)
الکٹرسٹی، میگنٹزم اور حرارت کے حال سے ہے۔

رسالہ اُصول کلوں کے باب میں

یہ رسالہ ٹی۔ ٹیٹس (T-TATES) کی کتاب ELEMENT, OF MECHANISM
کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اعلیٰ درجہ کے ٹائپ میں چھپی ہوئی ہے۔ کتاب کی کل ضخامت
۲۴۷ صفحات ہے۔ جا بجا شکلوں، خاکوں، تصویروں اور نشانوں کے ذریعہ مسائل اور
ان کے حل پیش کئے گئے ہیں۔ سرورق پر مصنف کا نام یسوع داس رامچندر لکھا
ہوا ہے۔ کتاب کی عبارت کے متعلق ڈاکٹر صدیق الرحمٰن لکھتے ہیں کہ اس کی عبارت بہت رواں
اور عام فہم ہے۔ سائنس کے مسائل کو سمجھانے کے لئے بہت ہی سلجھا انداز بیان اور
کم الفاظ میں اچھی تلی مگر واضح بات کہنے کا سلیقہ اس کتاب میں نمایاں ہے۔ اس
سائنسی کتاب کو رامچندر ہی نے اردو میں متعارف کرایا اور ایک بلند معیار تک
پہنچایا۔ طرز تحریر سے کہیں بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہ رسالہ کسی انگریزی تصنیف کا
ترجمہ ہے۔ اس ضمن میں بطور نمونہ مثال کے لئے حرکت، رفتار کے متعلق رامچندر
کے بیان قلمبند کئے ہیں۔

رسالہ مسائل کلیات جزئیات

رامچندر کی اس اہم کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۵۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔
اس کے چھپتے ہی مختلف علمی حلقوں میں رامچندر کے چرچے ہونے لگے۔ اس پر تنقیدیں

ہوئیں، خصوصاً کلکتہ ریویو نے اِس کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے رامچندر کو سخت صدمہ
ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں جب رامچندر خود کلکتہ گئے تو انہوں نے کلکتہ ریویو کی تنقید سے
پیدا ہونے والے نامناسب اثرات کو دور کرنے کے لئے تمام اعتراضات کا ایک جواب
لکھا جو "انگلش مین" (ENGLISHMAN) میں شائع ہوا۔ مسٹر بیتھون (BETHUNE)
کے توسط سے یہ کتاب یورپ کے ماہرین ریاضی پاس بھیجی۔ ۱۸۵۹ء
میں یہ کتاب پروفیسر ڈی مارگن کے اہتمام میں لندن سے شائع ہوئی اور اس کی اہمیت
کے پیش نظر کورٹ آف ڈائرکٹرز اور حکومت دہلی کی طرف سے انہیں خلعت
و انعام سے نوازا گیا۔ پروفیسر مارگن نے اپنے طویل مقدمہ میں رامچندر کے حالاتِ
زندگی کے ساتھ ساتھ ان وجوہ کو بھی پیش کیا جن کی بناء پر مصنف اور اسکی
تصنیف کو اس اعزاز کے قابل سمجھا گیا۔ اس مقدمہ میں انہوں نے لکھا تھا "میں نے
رامچندر کی کتاب کو اطمینان و استعجاب کے ملے جلے احساس کے ساتھ پڑھا۔
جس میں چند منٹ کے غور و فکر کے بعد کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ مجھے اس میں
ہندو فکر و فلسفہ کی پو پھٹتی ہوئی دکھائی دی" رسالہ کا یہ لندن ایڈیشن
ہارڈنگ لائبریری دہلی میں موجود ہے۔

تفرقی احصاء کا نیا طریقہ

۶۲ صفحات کا یہ مختصر رسالہ کلکتہ کے ملٹری آرفن پریس سے ۱۸۴۲ء میں
شائع ہوا تھا اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔ اس کے دیباچہ میں
رامچندر نے اسے "رسالہ مسائل کلیات و جزئیات" TREATISE سے
اس کی عملی حیثیت کی بناء پر مختلف قرار دیا ہے۔ اور لکھتے ہیں کہ اگر یہ رسالہ

صحیح ثابت ہوا تو بہت مفید ہوگا۔ پرانے طریقوں میں جو مشکلات ہیں۔
انہیں دور کرنے کے لئے یہ نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

پروفیسر مارگن کے علاوہ کیمبرج کے مسٹر رے نالڈز (REYNOLD) اور
ایڈنبرا کے پروفیسر کیلنڈ (PROF. KELLAND) نے اِس کتاب پر تبصرے
لکھ کر بھیجے جو رامچندر نے اس رسالہ میں بھی شامل کئے۔ ان سب حضرات نے
مصنّف کے اختراع پسند ذہن کی تعریف کرتے ہوئے اِس بات کو تسلیم کیا
کہ رامچندر نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یقیناً نیا ہے۔ گو کہ اس کے ذریعہ انہوں نے
جو نتیجہ نکالا ہے وہ نیا نہیں ہے۔ اِس رائے سے رامچندر کو بھی اتفاق ہے۔

اعجاز القرآن

یہ کتاب پہلی مرتبہ اس وقت شائع ہوئی جب رامچندر ریاست پٹیالہ
میں ڈائرکٹر تعلیمات کے منصب پر فائز تھے۔ یہ کتاب ۱۵۰ صفحوں، ۵ فصلوں،
دیباچہ، تتمہ پر مشتمل ہے۔

مسیح الدجّال

اس کتاب میں رامچندر نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق عیسائی
اصل ایمان والے ہیں نہ کہ مسلمان۔ انجیل و قرآن دونوں کے مطابق آنحضرتؐ
(نعوذ باللہ) دجال ہیں۔ "کارساں دتاسی" نے اس کتاب کے اقتباس کے ساتھ
مرزا فتح محمد بیگ کے اس محققانہ ریویو کا ذکر کیا ہے جس میں مرزا صاحب نے
عیسائی مبلغوں کے ادھ کچے علم کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں اور حیرت ظاہر کی ہے۔

کو راجندر جیسے عالم نے اس راستہ کو کیوں اختیار کیا۔ اور بعد میں راجندر کے
استدلال کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہے اور ان کے اس دعوے کو غلط
اور بے بنیاد ثابت کر دیا ہے کہ قرآن شریف اور انجیل میں مطابقت پائی جاتی
ہے اور مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ انجیل کے دو حصوں میں متاخرین نے کیا کیا تغیر کیا۔

رسالۂ تحریف القرآن

مولوی حامد حسین صاحب شیعہ لکھنوی نے "استقصاء الافحام" کے نام سے
ایک رسالہ شیعہ اور سنی کے جھگڑوں کے متعلق لکھا تھا۔ راجندر نے اس سے
فائدہ اٹھایا اور اس کی بنیاد پر قرآن میں تحریفات ثابت کیں۔ دہلی کے
جس اخبار میں اس کتاب کی اشاعت کا تذکرہ ملتا ہے اس سے یہ بھی پتہ
چلتا ہے کہ راجندر کے اس رسالۂ تحریف قرآن کے غالباً دو سو جواب تیار ہوئے
مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے تحریف قرآن کے جواب میں "تعریف القرآن"
کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔

اعتراض قرآن :-

اس کتاب میں ماسٹر صاحب نے اسلامی عقائد پر تنقید کی ہے۔

بدعت عیسائی مذہب :-

اس کا نام راجندر کی مذہبی تصانیف کے سلسلے میں MEMORIS
میں ملتا ہے۔

راجندر کے اخبارات :-

ان کا تذکرہ مقالہ ہذا کے باب ہفتم میں درج ہے۔

میر امن

میر امن اردو نثر کی تاریخ میں اپنی تصانیف 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی'
کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا۔ جس کی اہمیت کا
اندازہ اس وقت کے حالات کے پس منظر میں ہوگا جنھیں ہم بخوف طوالت
بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اگرچہ اس کا قیام انگریز حکمرانوں کے ہاتھوں کچھ سیاسی
اغراض اور حکومت کے کاموں میں آسانی پیدا کرنے کے لیے ہوا تھا۔ لیکن ضمنی طور پر
اس کے قیام سے اردو زبان و ادب کو جو فائدہ پہنچا ہے اس کا اعتراف کرنا نہ صرف
علمی رواداری ہے بلکہ تاریخی تقاضا بھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چند ایسی
چیزیں بھی ہیں جو ملک و زبان کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوئی ہیں۔ مثلاً
ملک کی زبان کو میر امن اور للو لال جی کا سہارا لے کر دو ایسی شاخوں میں بانٹ
دیا جس میں سے ایک کو فارسی آمیز کہا گیا اور دوسری کو سنسکرت آمیز کر کے پہلی
سے بالکل الگ کر دیا۔ اور ایک نئی زبان ہندی اس طرح پیدا کر دی اور ملک کے
سامنے لسانی اعتبار سے ایک اہم سوال پیدا کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد
ان دو شاخوں کی تین شاخیں ہو گئیں اور وہ سیاسی چال بالآخر کامیاب رہی
جس کے پیش نظر یہ کام کرایا گیا تھا۔

میر امن کے حالات گارساں دتاسی، کریم الدین، عنایت اللہ، سید محمد اور
مولوی عبدالحق مرحوم وغیرہ نے اپنی اپنی تصانیف میں بیان کیے ہیں لیکن ان کی
بنیاد اسی مواد پر ہے جسے خود میر امن نے 'باغ و بہار' یا 'گنج خوبی' میں بیان کیا ہے۔
کہنے کا منشا یہ ہے کہ ان میں سے کسی بزرگ نے بھی ان کے خود نوشتہ حالات
میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

ان کا اصلی نام میر امان اور امن تخلص تھا۔ مگر وہ میر امن ہی کے نام سے مشہور

ہوئے۔ ان کا مولد و وطن وہی ہے جو اُردو کا بھی خیال کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ دہلی
کے خاص باشندے تھے۔ اُن کی تصانیف خاص کر باغ و بہار کے پیش نظر ہم
بلا خوف و خطر سید محمد صاحب کے اس قول کو دہرا سکتے ہیں کہ اُن کو دِلّی پیار اور
دِلّی کو اُن پر ناز ہے۔ آپ کے آبا و اجداد خاندانِ مغلیہ کے دُوسرے فرمانروا ہمایوں شاہ
کے عہد میں ہندوستان میں وارد ہوئے اور آگرہ میں قیام پذیر ہوئے۔ ہمایوں شاہ
سے لے کر عالمگیر ثانی تک اِن کا خاندان شاہانِ مغلیہ کی خدمت میں رہا۔ اعلیٰ خدمات
کے عوض جاگیر و منصب بھی ملی اُمرائے مغلیہ میں اُن کا شمار ہونے لگا۔

میر امن کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ دہلی ہی میں نشو و نما پائی اور علمائے
دہلی کی صحبت اٹھائی اور اُن سے ہی علوم متداولہ حاصل کیا۔ بچپن سے تیس
چالیس سال کی عمر اسی اُجڑتی بگڑتی دہلی میں گذری کیونکہ اُن کے بچپن اور جوانی
کا سارا زمانہ سلطنتِ مغلیہ کے انحطاط و زوال کا دَور تھا۔

دِلّی پر کچھ اس طرح کی تباہی و بربادی چھائی کہ اچھے اچھے گھرانے تباہ و
برباد ہو گئے۔ لوگوں نے امن و سکون کی تلاش میں دِلّی چھوڑ کر جہاں جہاں پناہ
و سکون ملا اُدھر کا رُخ کیا۔ میر امن بھی خاندانی منصب اعزاز کھونے کے باوجود ایک
زمانہ تک دلی میں رہے اور آخر کار مجبوراً انہیں دہلی چھوڑنا پڑا۔ سراسیمگی کی حالت
میں اِدھر اُدھر قیام کرتے کلکتے پہنچے جہاں اُن دنوں فورٹ ولیم کالج کے لیے لائق ادیبوں
اور منشیوں کی ضرورت تھی۔ میر امن کے دوست منشی میر بہادر علی حسینی اِس
کالج کے میر منشی تھے چنانچہ میر امن اُن کے وسیلے سے ڈاکٹر گلکرائسٹ تک
پہنچ گئے۔ اور انہوں نے ان کی لیاقت اور زباندانی سے متاثر ہو کر اُن کو
کالج میں ملازم رکھ لیا۔

سید محمد صاحب اپنی تصنیف "اربابِ نثرِ اُردو" میں لکھتے ہیں کہ میر امن کی
نہ تاریخ پیدائش معلوم ہے اور نہ تاریخ وفات لیکن اتنا یقین کے ساتھ
کہہ سکتے ہیں کہ وہ اوائل ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت میں داخل ہوئے۔
جہاں اُن کی علمی خدمات کا سلسلہ کس سن تک جاری رہا نہیں کہا جا سکتا۔
ان کی موجودہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء کے آخر تک پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں۔
اس کے بعد انہوں نے کیا کام کیا اور کونسی کتابیں لکھیں یہ حال نہیں معلوم ہوا۔
البتہ قیاس یہ ہے کہ ۱۸۰۲ء کے بعد سے تصحیح و نظر ثانی کتب اور قدیم اساتذہ کے
دواوین وغیرہ کے انتخاب کا کام کیا ہوگا کیونکہ کالج کی طرف سے بہت سی
نظم کی کتابیں اور دواوینِ اساتذہ کے انتخابات نہایت صحت اور اہتمام کے
ساتھ شائع کیے ہوئے ہیں۔

میر امن صرف دو کتابوں کے مترجم یا بہ الفاظ دیگر مولّف ہیں کیونکہ ان کی
دونوں کتابوں میں تالیف کی شان پائی جاتی ہے اور وہ نرے ترجمے نہیں ہیں۔
اُن کی اوّل کتاب باغ و بہار ہے۔ اس کی تالیف سنہ ۱۲۱۵ھ میں شروع ہوئی اور
سنہ ۱۲۱۷ھ میں انجام کو پہنچی۔

باغ و بہار قصۂ چہار درویش کا آزاد اُردو ترجمہ ہے جس کے مصنف
حضرت امیر خسروؒ تھے۔ میر امن لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس قصّہ کو ٹھیٹ ہندوستانی
گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص و عام
آپس میں بولتے چالتے ہیں بیان کیا ہے یہ کتاب انہوں نے حسبِ ایمائے
جان گلکرسٹ لکھی۔

میر امن سے کئی سال پہلے اٹاوہ کے ایک صاحب سید محمد عطا حسین خاں

تحسین نے بھی اسی قصہ کو "نوطرزِ مرصع" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بالکل مقبول نہیں ہوا۔ اس کے صرف دو یا تین ایڈیشن بمبئی اور کانپور سے شائع ہوئے۔ اب حال ہی میں ایک اور ایڈیشن دلی سے شائع ہوا ہے۔ تحسین کی نوطرزِ مرصع کو میرامن کی 'باغ و بہار' سے کوئی نسبت نہیں۔ اول تو تحسین میرامن کی طرح "دلی کے روڑے" اور اردو کے دھنی نہیں۔ میرامن خود لکھتے ہیں: "میں دلی (شاہجہاں آباد) کا روڑا ہوں اور یہیں کا پرورش یافتہ ہوں"۔ تحسین کی زبان گنجلک اور تعقید سے بھری ہوئی ہے اس پر انہوں نے بجائے فصیح اور سلیس اردو کے 'مرصع اور مقفیٰ دار فقرے' استعمال کئے ہیں اور عبارت آرائی میں بے حد تکلف سے کام لیا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر گلکرائسٹ نے میرامن سے دوسرا ترجمہ کرایا۔

لیکن مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ یہ فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ قصہ وہی ہے مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اردو کی کتاب نوطرزِ مرصع ہے[90]۔ اور اپنے اس بیان کو دلائل سے استوار کرتے ہیں۔ تعجب اس بات کا ہے کہ میرامن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمہ کا ذکر کیا مگر 'نوطرزِ مرصع' کا ذکر صاف اڑا گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے ان تینوں کتابوں کے بعض مقامات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرکے اپنے بیان کی پوری تصدیق کی ہے۔

لیکن 'نوطرزِ مرصع' اور 'باغ و بہار' کے طرزِ بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نوطرزِ مرصع کی عبارت نہایت رنگین اور سرتاپا تشبیہات اور استعارات سے مملو ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے۔ باغ و بہار سے اسے کچھ نسبت نہیں۔ باغ و بہار اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس

زبان میں لکھی گئی ہے۔ میرامن خاص دلی کے رہنے والے ہیں ان کی زبان ٹھیٹ دلی کی زبان ہے اور ان کا کہا سند ہے[91]۔

محمد عوض زرین نے بھی چہار درویش کو نثرِ اردو میں لکھا ہے۔ اس کا نام بھی 'نوطرزِ مرصع' ہے اور ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس کی تاریخ بھی زرین نے باغ و بہار سے نکالی ہے۔ اس میں سیدھی سادی عبارت میں چند قصے بیان کر دیئے ہیں۔ میرامن کے پاس چاروں درویشوں کی جو مفصل داستانیں ہیں وہ اس میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ ذیلی حکایتوں کے حذف کے بعد بیان ہوئی ہیں۔ اس کا طرزِ بیان صاف اور بے تکلف ہے مگر میرامن کے ترجمہ اور زبان کی خوبی مطلق نہیں۔

میرامن کی 'باغ و بہار' کو جو بے انتہا مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی وہ ان تمام ترجموں میں کسی کو نہ ہو سکی۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور لاطینی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ اردو میں متعدد شاعروں نے نظم کیا۔ میرامن کی زبان و بیان کو ہر ہندوستانی اور یورپین نے سراہا۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں بار بار 'باغ و بہار' کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی خوبیاں بیان کی ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے: "اس کتاب کو پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد بات یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات سے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اعلیٰ ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی"[92]۔

باغ و بہار کی خصوصیات اور اسکی شہرت کے اسباب

(۱) اُردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔ باغ و بہار کے لکھے ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی زبان و بیان کے اعتبار سے پرانے پن کا اظہار بہت کم ہوتا ہے۔ کچھ ہی الفاظ ایسے ہیں جو موجودہ نثر میں متروک قرار دیئے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی باغ و بہار کے بیشتر محاورے آج تک اسی حسن و خوبی اور جامعیت کے ساتھ جوں کے توں استعمال کیے جاتے ہیں۔[۹۳] اس سے مصنف کی زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرامن نے ہر موقع پر اسی کی مناسبت سے ٹھیٹ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اُن کی سادگی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت سادہ ہونے کے باوجود بھی عامیانہ پن نہیں پیدا ہوتا۔ وہ سادگی کے ساتھ ساتھ فصاحت اور لطفِ بیان کو بڑی خوبی سے قائم رکھتے ہیں۔

(۲) ہماری زبان فارسی الفاظ اور ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں میں ایسی رچی ہوئی ہے کہ ان سے بچنا مشکل ہے۔ لیکن میرامن نے اس میں بڑا اعتدال برتا ہے۔ وہ بدیسی لفظوں اور چیزوں کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر دیسی سادہ اور میٹھے لفظوں کو نہیں بھول جاتے اور قدیم فارسی تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ ساتھ اپنے بے تکلف اور لطیف استعارے اور تشبیہیں بھی استعمال کرجاتے ہیں جو بڑا لطف دے جاتی ہیں۔ مثلاً گلکرسٹ صاحب کو دُعا دیتے ہیں کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے یہاں دجلہ و فرات اور جیحوں و سیحوں کے بدلے گنگا جمنا کے لفظ کیسے بھلے معلوم

ہوتے ہیں۔ ایسے فقرے کتاب میں بڑی کثرت سے ملیں گے۔

(۳) وہ ہر حالت اور موقع کے لئے الفاظ کا انتخاب نہایت مناسب اور صحیح کرتے ہیں اور کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زبان کوتاہی کرتی ہے۔ جب کہیں گفتگو یا مکالمہ کا موقع آتا ہے حفظِ مراتب اور موقع و محل کے لحاظ سے اسی قسم کی زبان لکھتے ہیں۔ موقع موقع سے ہندی لفظ اس حسن و خوبی سے کھپاتے ہیں کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن کہیں تصنع یا تکلف نام کو بھی نہیں ملتا۔

شروع ہی میں خدا کی حمد و ثنا جو ایک پامال مضمون ہے اُسے ایسی جدت سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے سے اس کا تعلق رکھتا ہے "سبحان اللہ! کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں پیدا کیں! باوجود دو رنگ کے ایک گورا ایک کالا ...... کروڑوں خلقت میں جس کو چاہیے پہچان لیجئے۔"

(۴) اگرچہ میرامن قصّہ روم و شام چین و ایران لکھتے ہیں جب موقع آتا ہے تو ہمارے مرثیہ گو شاعروں کی طرح آداب و رسوم اپنے ہی دیس کے بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب میں بیسیوں جگہ ایسے موقع آئے ہیں جہاں میرامن نے اپنے ہی ان کے ساز و سامان کھانے پوشاک اور رسم و رواج کا ذکر کیا ہے جس کے پڑھنے سے اُس زمانہ کی بہت سی ایسی باتیں اور چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو اب معدوم اور مٹتی جا رہی ہیں۔

(۵) زبان کے لحاظ سے تو اس کی فصاحت اور خوبی میں کوئی کلام ہی نہیں سینکڑوں محاورے اور الفاظ ایسے ملتے ہیں جو آج کل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے۔ بعض تو ایسے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں

جو آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور رواج اُٹھ جانے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے
اب ضرورت ہے کہ باغ و بہار کے ایسے الفاظ جو آڑے وقت پر کام آنے والے
ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے گمنامی سے
نکال کر کام میں لایا جائے۔[94]

(۶) اُس کی زبان کے علاوہ طرزِ بیان میں بھی ایسی دلکشی اور دلفریبی
ہے کہ فقروں کے طویل ہونے اور قصّہ کے بیچ میں تقریر کے آجانے کے باوجود طبیعت
اُکتاتی نہیں اور جی یہی چاہتا ہے کہ کتاب ختم کیے بغیر نہ رکھی جائے۔ فورٹ ولیم
کالج کے نثر نویسوں میں کسی کے طرزِ بیان میں یہ دلکشی نہیں۔

(۷) میرامّن کے طرزِ بیان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ محاورہ اور
روزمرّہ کے آگے قواعدِ زبان کی پابندی کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ بول چال کی
زبان کو ترجیح دیتے ہیں اور حشو و زوائد کے حذف کرنے میں بڑی دریا دلی سے
کام لیتے ہیں۔ قصّے کی کتابوں میں اس کی سخت ضرورت ہے۔ قصّہ اوّل تو کوئی
ٹھوس علمی چیز نہیں ہوتا کہ اس میں نفسِ مضمون پر زیادہ نظر رکھی جائے اور
زبان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی جائے۔[95]

جب میرامّن کی کتاب شائع ہوئی تو سب سے پہلے کلکتہ سے ان کے
طرزِ بیان کے خلاف ایک آواز اُٹھی پھر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں اس کا مذاق
اڑایا گیا۔ رجب علی بیگ سرور نے بائیس برس بعد "فسانۂ عجائب" کے
دیباچہ میں مضحکہ آمیز الفاظ میں اُن کے اسلوب کا خاکہ اُڑایا۔ دلّی والوں نے
بھی اس طرزِ نگارش کو نظروں سے گرا دیا اور سر چڑھانا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ یہاں
بھی اردو نثر اپنے پرانے ڈھنگ میں لکھی جاتی رہی۔ انتہا یہ ہے کہ مرزا غالب نے

جو تقریظیں لکھی ہیں ان میں اسی پرانی طرز کو اپنایا ہے۔ اور سرسیّد نے جو بعد
میں سلیس نگاری کے امام ہو گئے جب آثار الصنادید لکھی ہے تو اسی مقفیٰ اور
مسجع اسلوب میں لکھی ہے۔ لیکن ان دونوں حضرات نے بہت جلد محسوس کر لیا
کہ میرامّن کا اندازِ بیان جاندار اور دیرپا ہے۔ اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ خیالات
کو زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ نیز یہ کہ ترقی یافتہ زبان
بننے اور اس کے ہمہ گیر ہونے کے لیے ایسے ہی اسلوبِ بیان کی ضرورت ہے چنانچہ
بہت جلد اس طرز کو اپنا لیا گیا۔[96]

ان مصنّفین میں جنھوں نے ان کے طرز کی تقلید کی مولوی نذیر احمد دہلوی
خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی "توبۃ النصوح" باغ و بہار ہی کو پیشِ نظر
رکھ کر لکھی گئی ہے اور دونوں کی زبان کا مقابلہ کیا جائے تو سو برس میں جو
تبدیلیاں ہوئی ہیں ظاہر ہو جائیں گی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں میں
کس قدر یکسانیت ہے۔ مولوی نذیر احمد کے مقلدین مولوی راشد الخیری اور بشیر احمد
دہلوی میں بھی میرامّن کے طرز کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔[97]

باغ و بہار کا مطالعہ فنّی نقطۂ نظر سے

اس کا مؤلف دلّی کی شاہی تہذیب کا ایک رکن ہے جس کے آبا و اجداد
پشت ہا پشت سے سلطنت سے وابستہ چلے آتے تھے۔ امّن نے باغ و بہار میں
جو دیباچہ لکھا ہے۔ اس کی کئی اسباب سے اہمیت ہے۔ اس میں امیر خسرو والی
بے بنیاد روایت بھی موجود ہے۔ باغ و بہار اس روایت کی شہرت کا خاص
طور پر ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد امّن نے اپنی مختصر سوانح عمری دی ہے۔ اور

اس کے بعد اُردو زبان کی تاریخ ہے۔ امّن نے اس اصول کو معلوم کر لیا ہے۔
جس کے ماتحت ہیں زبان کا وجود ہوا۔ اس زمانہ میں اُردو کی اصل کے بارے
میں کوئی تحقیقاتی کام انجام نہیں پایا تھا۔ پھر میرامن کوئی تاریخ نہیں لکھ رہے تھے
ضمنی طور پر اُردو زبان کا ذکر آگیا اور ضمنی طور پر ہی اُس کی تاریخ لکھ دی گئی۔

آرائشِ محفل کی طرح باغ و بہار کے پلاٹ میں وحدت نہیں۔ ایک بادشاہ اور
چار درویشوں کے قصّے ہیں جنھیں تمہید اور خاتمہ کے ذریعہ دونوں سروں پر ملا دیا
گیا ہے تو ہیں۔ اس کا تصوّر بقیہ پانچ قصوں کے نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
باغ و بہار کے پانچ ہیرو ہیں چار درویش اور پانچواں خواجہ سگ پرست ...
بادشاہ کا قصّہ در اصل سگ پرست کا قصّہ ہے۔ یہ پانچوں سرگذشتیں
ضمنی کہانیاں ہیں۔ بنیادی قصّہ تمہید و خاتمہ میں ہے باوجود اِس انتشار کے
قصّہ کے لحاظ سے باغ و بہار کسی دوسری داستان سے پست نہیں رہتی
اس کے بنیادی پلاٹ میں دوسری داستانوں کی تقلید نہیں۔ ابتدا ضرور
مقررہ ڈھنگ پر ہے کہ ایک بادشاہ کی اولاد نہ ہوتی تھی لیکن یہاں فرزند
قصّہ کے شروع میں نہیں، آخر میں ہوتا ہے۔ قصّہ کا ہیرو۔ یہ شہزادہ نہیں
بلکہ بادشاہ آزاد بخت ہے۔ اتفاقیہ اُسے چار فقیر مل جاتے ہیں جن کی سرگذشت
وہ سنتا ہے۔ بادشاہ کے اولاد ہونے میں ان فقیروں کی دعا کا کوئی دخل نہیں
اسی وجہ سے فنّی لحاظ سے درویشوں اور سگ پرست کی کہانیاں ضمنی کہانیاں
ہیں حالانکہ قصّہ کی جان یہی ہیں۔ یہ پانچوں قصّے فرداً فرداً بڑے مکمل ہیں۔ ان
میں سے ایک ایک کو اپنی جگہ لے کر دیکھئے۔ پلاٹ کی سادگی اور وحدت
سب کچھ موجود ہے۔ پہلے درویش کی کہانی تو نئے طرز کی مختصر کہانی کی طرح ہے۔

چار درویشوں کے قصّے فقط عشق کی تفسیر ہیں لیکن باغ و بہار کا بنیادی قصّہ
عشقیہ نہیں نہ آزاد بخت کی زندگی میں عشق کا کوئی مقام ہے۔

چار درویش کے قصّہ میں کوئی قابلِ اعتراض عنصر نہیں۔ صرف اُس کی
جزئیات پر بعض جگہ حرف گیری ہو سکتی ہے۔ نیمروز کا شاہزادہ ہر سال ایک
غلام کے ہاتھ مرتبان کی نمائش کرتا ہے اور پھر اس بے گناہ کو قتل کر دیتا ہے۔
اس دستور کی کوئی وجہ نہیں۔ غلام جانتا ہے کہ مرتبان دکھانے کے بعد اسے
قتل کر دیا جائے گا لیکن مصنف نے اس کے بیان میں کوئی پس و پیش نہیں کیا
شہزادہ کی سرگذشت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ فاتر العقل یا شقی القلب
ہے۔ درویش جب اس کا تعاقب کرتا ہے تو شہزادہ کہتا ہے ......،
کیوں اپنا خونِ ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے اور مجھے گنہگار بناتا ہے لیکن
غلام کے معاملہ میں اُسے خونِ ناحق کا خوف نہیں ہوتا۔ بے وجہ غلام کی جان
لینا اس دل شکستہ عاشق کے شایانِ شان نہیں۔ باغ و بہار میں جغرافیائی
علم کی بہت کمزوری پائی جاتی ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اِس کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اس قصّہ کے آخر میں خواجہ سگ پرست کی شادی وزیرزادی سے
ہو جاتی ہے۔ سگ پرست کی عمر پچاس برس کے قریب بتائی گئی ہے۔ وزیرزادی
کی گڑیاں کھیلنے کی عمر ہے۔ خواجہ خود کو اس کا بوڑھا باپ کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن آخر
میں عمر کے لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر مصنف کی زبردستی یہ بے جوڑ شادی کروا
دیتی ہے۔ خواجہ اپنے دو بھائیوں کو پنجروں میں قید کر کے کتّے کا جھوٹا کھلاتا ہے۔
یہ تعجب کی بات ہے کیا شہر میں کوئی قانون کوئی حکومت نہ تھی۔ ایک شخص
کس طرح کھلے عام دو انسانوں کو دائم الحبس رکھ سکتا ہے۔ تیسرا درویش

ورنگ کے بارہ پلٹے پل کو جون پور کے پُل کے برابر بتاتا ہے۔ یہ مقابلہ بے موقع معلوم ہوتا ہے کہاں عجم کا شہزادہ کہاں جون پور کا پُل۔ کتاب کے آخر میں ہر ایک کو اپنا محبوب مل جاتا ہے لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ کتنے وقفے کے بعد؟ کم از کم سات برس بعد چاروں درویش جب بادشاہ کے یہاں جمع ہوتے ہیں اسی وقت شہزادہ بختیار پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ سات برس کا ہوتا ہے۔ اُس وقت درویشوں کی ملک شہ پال سے ملاقات ہوتی ہے اور ان کا مقصود بر آتا ہے۔ دُوسرے درویش کو بصرے کی شہزادی سے جُدا ہوئے کم از کم بارہ برس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس نے نیم روز کے شہزادے سے رخصت ہو کر اوّل پانچ برس صحرا گردی کی پھر خودکشی کا ارادہ کیا۔ افسانہ نگار یہ نہیں بتاتا کہ اس سات برس سے زیادہ عرصے میں ان شہزادیوں پر کیا گزری ایک کے علاوہ سب جنوں یا جادوگروں کے قبضے میں تھیں۔ مصنف نے یہ غور نہیں کیا کہ وہ غیروں کے پاس اتنی مدت تک کس طرح محفوظ رہیں۔

باغ و بہار میں فوقِ فطرت اجزاء کم ہیں۔ پانچوں کہانیوں میں فوقِ فطری واقعات خاص طور پر صرف دو جگہ ہیں۔ نیم روز کے شہزادے اور چوتھے درویش کی سرگذشت میں۔ اس کے بعد خاتمہ میں جنوں کا بادشاہ ملک شہ پال ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایک پُر زور منصف شہنشاہ ہے۔ جو زیر دستوں کی فریاد کو پہنچتا ہے اور مفسدوں کو سزا دیتا ہے۔ وہ کسی فوقِ فطرت کے کارنامے کے لئے داخلِ منظر نہیں کیا گیا۔ باغ و بہار میں فوقِ فطرت عنصر مبالغہ کے لئے نہیں لایا گیا بلکہ اس سے پلاٹ کو مؤثر طریقہ پر آگے بڑھانا مقصود ہے۔ بیان میں کوئی کمی نہیں۔ امّن نے جس شے کا ذکر کیا ہے تفصیل کے اعتبار

لگا دیئے ہیں۔ امّن نے شعوری طور پر اپنے قصے میں دلّی کی معاشرت کے نقوش کو جابجا محفوظ کر دیا ہے۔ نوکر ملازم عورتوں کی فہرست دیکھئے۔

"کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور اردا بیگنیاں، قلماقنیاں، ترکنیاں، حبشیاں، ازبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جڑی عہدے لئے کھڑی ہیں۔"

یہ نام، یہ عہدے مغلوں کے ایجاد کئے ہوئے ہیں۔ اتنا کہنا ہی پڑتا ہے کہ امّن نے بیرونیوں کو ہندوستانی جامہ عطا کیا ہے۔ خواجہ سگ پرست جب پہلی بار نیمہ آستین پہنے ملتے ہیں۔ بصرہ کی شہزادی اور اُس کی بہنیں سولہ سنگھار اور بارہ ابھرن بال بال گج موتی پرو کر بادشاہ کے حضور میں جاتی ہیں۔ دو جگہ ہندی گیت بھی ہیں جن میں سے ایک شہزادی بصرہ کے منہ سے ہے۔ چونکہ یہ شہزادی بالکل ہندوستانی شہزادی کی طرح دکھائی گئی ہے اس کے منہ سے ہندی گیت بھی ادا کر دیا گیا ہے۔

داستان گو اظہارِ علم کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ جس شے کا ذکر کیا جائے اس کی جنس کے زیادہ سے زیادہ نام گنا دیئے جائیں۔ یہی بات پرانے قصوں میں ان کا انبار ہوتا ہے۔ امّن نے اس کا بہت خیال رکھا ہے۔ کھانوں اور سامان کی قسمیں تو انہوں نے بہت تفصیل سے گنائی ہیں۔

چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغاباز، ٹکر بھاگ، خدمت گار، بھیلے، ڈھلیت، خاص بردار، آبدار خانی، دائی، دوا، چھو چھو، انّا، دودھ پلائی۔

دربان، روہیلے، میوڑے، باری دار، یساول، چوبدار، ان کے علاوہ آتش بازی، شکاری جانوروں، بحری سواریوں وغیرہ کی تفصیلیں ہیں۔ امّن کی معلومات کا

بحرِ ذخّار دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

باغ و بہار میں بھی شراب کا عام رواج ملتا ہے۔ اُمرا میں مردوں میں تو اس کا عام رواج تھا لیکن غضب یہ ہے کہ دوشیزہ شہزادیاں بھی اس کی عادی دکھائی گئی ہیں۔ شام، سراندیپ اور فرنگ کی شہزادیاں کئی بار مختلف موقعوں پر شراب پی کر نشے میں ڈوب جاتی ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کے خلاف ہے۔

افسانہ میں بعض مقامات پر مذہب کی تبلیغ بھی ہے۔ شہزادۂ فارس جب ملکۂ بصرہ کو نامۂ شوق لکھتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ بادشاہی کا غرور کرنا عبث ہے اس واسطے کہ سب آدمی آپس میں فی الحقیقت ایک ہیں لیکن فضیلتِ دینِ اسلام کی البتہ ہے۔ آخری جملہ سے داستان نگار کا مذہبی رجحان معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب افسانوں کے ہیرو مسلمان ہوتے ہیں۔ خواجہ سنگ پرست اور آذر بائیجانی جوان کے قصوں میں بت خانوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان بت خانوں کے دستور عام مندروں سے علیحدہ ہیں۔ خدا معلوم مصنف نے یہ تخیل کس طرح قائم کیا ہے۔ اُس نے سراندیپ والوں کے معبود لات و مناۃ کو قرار دیا ہے۔ دائی کہتی ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مسلمان ہے اور لات و منات کا دشمن ہے۔ لات و منات عرب کے بت تھے۔ انہیں مندروں سے کیا واسطہ۔ سراندیپ میں شہزادی وغیرہ سب بار بار بڑے بت کا ذکر کرتے ہیں یہ خلاف واقعہ ہے غیر تو بیشک کہہ سکتا ہے لیکن ہندو کبھی بت نہ کہے گا بلکہ جس دیوتا کا وہ بت ہوگا اس کا نام لے گا۔ بڑا بت تو عرب کے بتوں کا ہم شکل معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال سراندیپ کے بت خانوں کی جو رسوم بیان کی گئی ہیں۔ وہ خواہ کسی زمانہ میں کسی مندر میں رہی ہوں کہ نہیں افسانوی لحاظ سے دلچسپ ہیں۔

"چہار درویش" محمد شاہ کے عہد میں لکھا گیا۔ اُردو ترجمہ میرامّن نے کیا۔ انہوں نے بھی دلّی کا دربار دیکھا تھا۔ دہلی کا یہ روڑا عمائد کی تہذیب کے ہر پہلو سے واقف تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں تفصیل سے اس تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ قصوں کا سین ایران و عراق میں ہے لیکن معاشرت دلّی کے مغلوں کی ہے۔ یہ بلاغت کے خلاف ہے۔ اس کی صفائیاں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن وہ عذر لنگ ہیں۔ مرثیہ گویوں اور داستان نویسوں نے اپنی معاشرت کا اس لئے بیان کیا ہے کہ وہ ایران و عراق کی معاشرت سے واقف نہ تھے۔ نہ اسکے بیان پر قادر تھے۔ باغ و بہار میں ہندوستانی تہذیب کچھ بے موقع نہیں معلوم ہوتی کیونکہ عام طور پر انہوں نے خالص ہندی رسوم کا بیان نہیں کیا بلکہ ساز و سامان دلّی کے بادشاہوں جیسا ہے۔ شاہانہ ساز و سامان میں ہندوستان، عراق میں زیادہ فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ بیان کتنے مکمل ہیں اور میرامّن نے ان میں جزئیات کا خیال کہاں تک رکھا ہے۔ یوسف جوہری کی ضیافت کے لئے ذیل کا انتظام کیا ہے۔

تمام حویلی میں فرش تکلف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں بھی لگی ہیں، پان دان، گلاب پاش، عطردان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں میں رنگ ترے، کنوترے، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوس اُدھر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے عہدوں پر مستعد ہیں۔ باورچی خانہ

میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ آب دار خانہ کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری
ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیاں پر صافیوں سے بندھی اور بجھروں سے ڈھکی رکھی ہیں۔
آگے چوکی پر ڈونگے کٹورے بہ معہ تھالی سرپوش دھرے ہیں۔ برف کے آبخورے
لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔ غرض سب اسباب شاہانہ
موجود ہے اور کنچنیاں، بھانڈ بھگتیے، کلاونت، قوال اچھی پوشاک پہنے سازے
سُر ملائے حاضر ہیں۔

نرگسی، بادامی، روغن جوش اور روٹیاں کئی قسم کی باقرخانی، تنعی،
شیرمال، گاؤدیدہ، گاؤزبان، نانِ نعمت، پراٹھے اور کباب گولتے کے مرغ کے
ناگیند، المغفور، شب دیگ، دم پخت، حلیم، ہریسا، سموسے، ورقی، تنبولی، فرنی،
فرنی، شیر برنج، فلائی، حلوا۔ فالودہ، بیرنی بھتا، نمش، آب شورہ، ساقِ عروس،
لوزیات، قرنا، اچار دان، دہی کی قلفیاں۔ یہ نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی۔ جب
ایک ایک نوالا ہر ایک سے لیا پیٹ بھی بھر گیا۔ تب ہاتھ کھانے سے کھینچا۔
—— جب دسترخوان اٹھا زیرانداز کا ثانی مخمل کا منقشی بچھا کر چلمچی
آفتابہ طلائی لا کر بیسن دان میں سے خوشبو بیسن دے کر گرم پانی سے
میرے ہاتھ دھلائے۔ پھر پان دان جڑاؤ میں گلوریاں سونے کی کپھوٹوں میں
بندھی ہوئیں اور چوگھڑوں میں گلوریاں اور کلپی سپاریاں اور لونگ
الائچیاں روپے کے ورقوں میں کڑھی ہوئی لا کر رکھ دیں۔"

ان کھانوں سے وہی واقف ہو سکتا ہے جس نے مغل دربار دیکھا ہو۔
مصنف چہار درویش کو فرنگیوں کے بارے میں بھی تھوڑی سی معلومات ہیں۔
آذربائیجانی نوجوان جب بت پرستوں کے طلسماتی شہر کے باہر پہنچتا ہے تو

وہاں ایک شخص اہلِ فرنگ کی پوشاک پہنے کرسی پر بیٹھا ملتا ہے۔ وہ کھانے
میں میز کے اوپر باوردی مسکہ، نمکین کباب اور شراب پیش کرتا ہے۔ یہاں تک تو
ٹھیک ہے لیکن اس میں بھی کچھ قباحت نکل آئی ہے۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص
مسلمان ہے۔ ایک بت پرست اسلام دشمن شہر میں مسلمان کا عہدہ دار ہونا خلافِ
واقعہ ہے۔ پھر اس شخص کا لباس اور طریق اہلِ فرنگ جیسا ہونے کا تو کوئی موقع ہی نہیں۔
اس شہر کے باشندے اپنے بت کو سجدہ نہ کرنے والوں کو مار ڈالتے ہیں خواہ مسلمان ہو،
خواہ فرنگی۔ جزیرۂ فرنگ کا ذکر تیسرے درویش کی سیر میں ہے۔ یہ جزیرہ صرف فرنگ کے
نام کا گنہ گار ہے ورنہ وہاں کوئی شخص فرنگی نہیں اچھا خاصہ اسلامی شہر ہے۔ شہزادی
کا نام مہر نگار، دارو غہ کا نام بہزاد خاں، کشتی پر تھے اوڑھے تسبیح ہاتھ میں لٹکائے
آتی ہے۔ داستان گو صرف ملکوں کے ناموں کی تلاش میں سراندیپ، سنگلدیپ،
نیمرباد، قسطنطنیہ، چین، فرنگ کو لے آتا ہے۔ شروع کے تین ناموں سے
اس کی مراد بت پرستوں کا شہر ہوتا ہے اور بعد کے ناموں سے اسلامی ملک۔
انہیں اس سے مطلب نہیں کہ چین بدھ ملک ہے۔ قسطنطنیہ یوروپی شہر ہے۔
اور فرنگ دوسری ہی دنیا۔ داستان گو جغرافیائی محل وقوع اور بادشاہوں کی
تاریخ سے بے نیاز ہے۔ اس کی نظروں میں اوپر کے سب شہر ایک دوسرے
کے آس پاس واقع ہیں اور کسی کو بھی آسان کے ساتھ ایک ملک سے دوسرے ملک
میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

باغ و بہار کی مقبولیت کا خاص سبب اس کی زبان اور اسلوب
بیان ہے۔ امن کا صاحبِ طرز ہونا ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ بعض جگہ تمام مروج
الفاظ کی جگہ اپنا کوئی مخصوص لفظ لے آتے ہیں۔ جس سے حسن دوبالا ہو کر معنی میں

لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

گنجِ خوبی

بقول گارساں دتاسی نے گنجِ خوبی سب سے پہلے ناگری رسم الخط میں ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد وہ اردو میں طبع ہوئی۔ مطبع کا نام احمدی تھا اور نستعلیق ٹائپ کے ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں فہرستِ ابواب شامل کی گئی ہے جس سے مخطوطہ خالی ہے۔ اس میں اُن رموزِ اوقاف کی پابندی کی گئی ہے جن کا مخطوطہ کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور ڈ، ٹ، ڑ کے لیے مخطوطہ کی طرح 'د، ت، ر' پر ایک چھوٹی سی لکیر کھنچی ہے۔

گنجِ خوبی کا تیسرا ایڈیشن اردو رسم الخط میں بمبئی سے ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔ سیر المصنفین میں اس کی کمیابی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا: (میر امن) نے باغ و بہار کے علاوہ اخلاقِ محسنی کا بھی اردو میں آزاد ترجمہ کیا۔ جو ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ لیکن کمیاب ہے اور گنجِ خوبی کے نام سے مشہور ہے۔ ارباب نثر اردو کے موئلف نے تو اسے بالکل ہی تحت الثریٰ میں گاڑ دیا۔ لکھتے ہیں: گنجِ خوبی میر امن کا دوسرا مگر بالکل غیر معروف کارنامہ ہے۔ اس کا صرف نام ہی سنا جاتا ہے مگر اس کی تفصیل نظر سے نہیں گذری اور نہ یوروپ کے کسی کتب خانہ میں اس کے قلمی یا مطبوعہ نسخہ کا پتہ چلا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ یہ بیان صحیح نہیں۔ حال ہی میں [illegible] گنجِ خوبی کو ترتیب کے طبع کیا ہے جو انگلستان کے قلمی اور میر امن کے خود نوشت نسخے پر مبنی ہے۔ اسی طرح فورٹ ولیم لائبریری کا قلمی نسخہ بھی ہے جو محفوظ ہے جو ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذرا ہے۔ گارساں دتاسی نے

گنجِ خوبی کے ایک اور مکمل قلمی نسخہ کا ذکر کیا ہے جو پہلے SANDFORT ARROT کی ملک تھا اور اب اُس کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس کا یہ بھی قیاس ہے کہ میر امن صاحبِ دیوان شاعر تھے اور مسٹر روم کے پاس ایک مخطوطہ ہے جس میں میر امن کے بہت سے اشعار مندرج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ یہ بھی گنجِ خوبی ہی کی طرف اشارہ ہے۔

سید محمد صاحب کی صراحت کے برخلاف گنجِ خوبی کے مطبوعہ نسخے لندن، حیدرآباد، مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں موجود ہیں۔ سید محمد صاحب نے بھی مطبع محبوب بمبئی کے نسخہ سے جو ۱۸۶۸ء میں چھپا ہے ذرا سا اقتباس نقل کیا ہے۔ لیکن اسے بہت پرانا اور بوسیدہ دیکھ کر زیادہ لائقِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اسی طرح ارباب نثر اردو کے موئلف کی یہ رائے بھی نظرِ ثانی کی محتاج ہے کہ گنجِ خوبی بالکل غیر معروف کارنامہ ہے کیونکہ ۱۸۵۵ء تک اس کے اقتباسات اخباروں میں نقل ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر کسٹیڈ صاحب نے اخبار الحقائق و تعلیم الخلائق کے پرچے جو آگرہ سے مسٹر فیلن کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا تھا اُس کے ۱۵ مئی ۱۸۵۲ء اور ۱۹ مئی ۱۸۵۵ء کے شماروں کا ذکر کیے ہیں جن میں گنجِ خوبی کی حکایتیں نقل کی گئی ہیں۔ یہی کیفیت ۱۸۵۲ء کے قران السعدین کی ہے۔

جو شہرت اور مقبولیت میر امن کی 'باغ و بہار' کو نصیب ہوئی وہ اُن کی گنجِ خوبی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ باغ و بہار کی زبان کی فصاحت اور سلاست نے گنجِ خوبی کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے یہ کہ گنجِ خوبی ایک اخلاقی صحیفہ ہونے کی وجہ سے اس میں وہ دلچسپی نہیں جو باغ و بہار میں ایک داستان ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ گنجِ خوبی بہت کم چھپی

اور کم بھی۔

گنجِ خوبی 'اخلاقِ محسنی' کا ترجمہ ہے۔ اخلاقِ محسنی کی نثر دقیق اور مشکل ہے۔ اس میں جا بجا قافیہ پیمائی کا اہتمام ہے۔ میر امن نے اُسے بھی اُردو میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور بعض جگہ اس میں باغ و بہار کی شادابی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن باغ و بہار کے مقابلے میں اس کے مضامین و مقاصد مختلف تھے اس لئے یہ ترجمہ ہر جگہ تخلیق کی اعلیٰ سرحدوں کو نہ چھو سکا۔ اس پر وہ محنت بھی نہ ہو سکی، جو مثال کے طور افلاطون نے اپنے بعض مکالمات پر کی ہے کہ پہلے پیراگراف کا مسودہ ستر ستر دفعہ لکھا ہے۔ تاہم اس میں "خاص و عام" کی دہلوی بول چال کے نمونے " بہ طرزِ سہل " مل جاتے ہیں اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

میر امن کی نثر اردو کے ارتقا کا وہ نقطہ ہے جس کو اردو کی تاریخ عرصہ سے طے کر رہی تھی۔ ان سے پہلے "سب رس" "کربل کتھا" "قصۂ مہر افروز و دلبر" اور "قانون النساء" لکھی جا چکی ہے۔ "قانون النساء" ایک نامعلوم مصنف کا نثری رسالہ ہے جس کا عکس ٹیوب گن سے حاصل ہوا ہے جو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی طرف سے چھپ رہا ہے۔ اس میں اُن رسموں اور عقیدوں کا بیان ہے جن پر عورتوں کا اعتقادِ کلی ہے اور جنہیں وہ واجبات سے بڑھ کر سمجھتی ہیں[1]۔

اُس کے مقابلے میں میر امن کی نثر ترقی یافتہ ہے لیکن قدامت سے خالی نہیں ہے۔ میر امن نے گنجِ خوبی میں روزمرۂ دہلی کو اس سلیقہ سے صرف کیا ہے کہ بعض جگہ باتیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نثر نے ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں اور اس میں برگ و بار پیدا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے

گنجِ خوبی میں اخلاق و نصیحت اور داستان کا رنگ شیر و شکر کر دیا ہے۔ جو ان کا قابلِ فخر کارنامہ ہے اور یہیں وہ مُلّا حسین واعظ کاشفی سے سبقت لے گئے ہیں۔ انہوں نے فارسی متن کو اپنے محاورے میں بیان کیا ہے اور جس طرح شیخ سعدی شیرازی کی "گلستان" بہ سبب پنج فارسی کے مکتب میں پہلے کام آتی ہے ویسے ہی میر امن نے اُردوئے معلیٰ کی زبان کو جیسے بادشاہ سے لے کر اُمرا اور ان کے ملازم برتتے ہیں تحریر میں استعمال کیا ہے۔

گنجِ خوبی اخلاقی کتاب ہے۔ اسلامی اخلاق اپنی ترقی یافتہ شکل میں بہت سے عناصر کا مجموعہ ہیں۔ اس میں ظہورِ اسلام سے قبل کی عربی روایتیں شامل ہیں۔ اس پر ایران، ہندوستان اور یونان کے فلسفوں کا نقش ہے۔ اسی کی رنگ دیپ میں قرآن مجید، احادیثِ نبوی اور صحابہ کی سیرت کا اثر ہے تصوّف کی تحریک نے اس کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخش دیا ہے۔ غرض اس کے عناصرِ ترکیبی مختلف اخلاقی نظاموں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ یہ مختلف عناصر ایک ہی جگہ ملتے ہیں۔ انہیں کوئی آویزش و پیکار نہیں۔

اُردو نثر کے ارتقا میں میر امن کا حصّہ

ڈاکٹر فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ ہماری تاریخوں میں فورٹ ولیم کالج اور میر امن کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ان کے سلسلے میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں وہ بھی کچھ غیر متوازن سی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس کالج کے مخاطب ہندوستانی نہیں انگریز تھے اور ان کے مقاصد جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ادبی اور تہذیبی نہیں بلکہ انتظامی اور سیاسی تھے۔ اس سے

اُردو کو جو کچھ فائدہ پہنچا وہ صرف ضمنی طور پر۔ وہ اس کا مقصدِ حقیقی نہیں ہے
پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس دور کے عالم اور ادیب کمپنی بہادر کی ملازمت
کو حمالی اور عزت و افتخار سے کچھ گرا ہوا سمجھتے تھے۔ اس کالج میں جو لوگ تھے ان میں
سے بعض درجۂ اوّل کے لوگ نہیں تھے۔ لطف نے یہاں تک لکھا ہے کہ بعض
جاہلان "خوشنویس" تھے۔ نثر گوشۂ گمنامی میں پڑی تھی اور نثر لکھنے والوں کو ابھی
تک ادبی تاریخ میں کوئی بڑی جگہ نہیں مل سکی تھی۔

باوجود اس کے اُن کی "باغ و بہار" لافانی کتاب ہے اور اس کو جو مقبولیت
اور شہرت حاصل ہوئی وہ اُردو کی کسی اور داستان کو نصیب نہیں ہوئی
عوام اور خواص دونوں میں یہ داستان تصنیف کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی بڑی
دلچسپی سے پڑھی اور سنی جاتی ہے۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں کو باغ و بہار کی کوئی
داستان اور چہار درویش کی کہانیوں میں ایک یا دو کہانیاں یاد ہوں
تو وہ قصّہ بکا اور تیر کا دیتی، میٹھی اور مزیداری سے کہانیاں سناتی ہیں۔ بعض پرانے
گھروں میں یہ رواج ابھی ختم نہیں ہوا کہ مریض کے پاس بیٹھ کر "چہار درویش"
کی داستان پڑھ کر سنائی جائے کہ اس سے مرض میں افاقہ ہوتا ہے۔ باغ و بہار
کی سادگی، سلاست اور فصاحت کا ذکر کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے لکھا ہے
کہ "باغ و بہار کی سادگی سپاٹ نہیں۔ اس میں ناگوار یک رنگی نہیں اور یہاں
سادگی اور پُرکاری بیک وقت جمع ہیں"۔ زبان و بیان کی اس پُرکاری کی
وضاحت کرتے ہوئے کلیم صاحب نے لکھا ہے کہ "میر امن کی عبارت میں ایک خاص
آہنگ ہے، اور اس کے جملوں کی ساخت، ترتیب اور حرکت میں باریکی،
تناسب اور جاذبیت ہے"۔

مولوی عبدالحق صاحب نے باغ و بہار کی فصاحت و سلاست
کے بارے میں کہا ہے کہ وہ "اس کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے کتاب کے
کسی حصے میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں"[12]

اوّل سے آخر تک کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا ہر لفظ، ہر فقرہ،
ہر ٹکڑا سلیس و فصیح ہے اور اس سلاست و فصاحت سے عبارت میں ایسی
روانی پیدا ہوتی ہے کہ پڑھنے والا قصہ کی دلچسپی سے قطع نظر خود اس کی روانی
میں گم ہو جاتا ہے۔ میر امن کی سادگی محض سادگی کی حدوں سے گذر کر اپنا
رشتہ خوش بیانی سے جوڑتی ہے اور کبھی ارادے یا کوشش کے بغیر سادگیٔ بیان
کو انشا پردازی کا ہم نوا بناتی ہے۔ اس سادگی میں بلندی و عظمت ہے اور شکوہ
و وقار۔ اس عظمت و بلندی، شکوہ و وقار کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس
لفظ لفظ پر مصنف کے مزاج اور شخصیت کی مہر ثبت ہے۔ اس مزاج کی
جس نے فصاحت و سلاست کی فضا میں پرورش پائی ہے اور اس شخصیت
کی جس کی زبان حلاوت اور گھلاوٹ کے ماحول میں پروان چڑھی ہے۔ میر امن
کی سادگی، سلاست و فصاحت میں دلی کی گلیوں میں رہنے بسنے اور وہاں کے
محل سراؤں اور قلعۂ معلی کی شہ نشینوں میں پرورش پانے والی روایت
کی سجاوٹ اور رچاؤ بھی ہے اور ان کے رنگِ طبیعت کی لطافت اور ستھرا پن
بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اس سلاست و فصاحت کا زور کم ہوتا ہے نہ اس کا
رنگ پھیکا پڑتا ہے اور ہر زمانہ کا پڑھنے والا اس کی سادہ پُرکاری سے
متاثر ہوتا ہے۔ اس کے مزے لیتا ہے۔ میر امن کی قدامت کے باوجود
اُسے سراہتا اور عزیز رکھتا ہے۔

میرامن کے طرزِ بیان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کسی قصے کو جہاں سے چاہیے پڑھ لیجیے۔ بس میں یہی سادگی، یہی روانی، یہی سلاست و فصاحت، یہی لطافت، حلاوت و گھلاوٹ اور یہی وقار ملے گا۔ عبارت کا وہ آہنگ جس کی طرف مولوی عبدالحق اور کلیم الدین احمد نے اشارہ کیا ہے۔ ہر جگہ کانوں کی راہ دل کی گہرائیوں میں جگہ بناتا ہے۔ جملوں کی ساخت، الفاظ کی باہمی ترتیب اور ان کے انتخاب کے تناسب اور حسن نے عبارت میں ایسی دلکشی پیدا کی ہے جو نغمے کے لطیف تاثرات سے ملتی جلتی ہے اور لطف یہ ہے کہ میرامن نے یہ ساری خوبیاں ایسے ذرائع سے حاصل کی ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی معمولی ہیں۔

باغ و بہار کے اسلوب میں سادگی، روانی، سلاست اور فصاحت کے ساتھ ساتھ عبارت کے "آہنگ"، "ترنم" اور توازن و تناسب کی جو خوبیاں ہیں وہ ایک طرف تو میرامن کی متوازن شخصیت اور ان کے رچے ہوئے دہلوی مذاق کا نتیجہ ہیں اور دوسری طرف ان بیشمار چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا ہو گئی ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ طرزِ بیان کی یہ خصوصیت میرامن کو ضمناً حاصل ہو گئی۔ اور وہ اس طرح کہ میرامن میں غالباً بہت سی باتیں موجود ہیں جو ایک اچھے داستان گو میں ہونی چاہئیں تاہم کسی اہلِ علم نے کبھی باغ و بہار یا فورٹ ولیم کالج کی دوسری درسی کتابوں کو بطور ادب کے نہیں پڑھا۔ خود میرامن نے بھی باغ و بہار کے دیباچہ میں اپنے نئے محاورے کے متعلق معذرت خواہی کی ہے۔ اس لئے یہ کالج بھی صرف "زبان دانی" کا کالج ہو کر رہ گیا اور اس کا اثر بھی طرز و اسلوب کی سرحد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے

اسے ایک "جزیرہ" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں تک بیرونِ کالج کے مصنفین کا تعلق ہے (بعض دہلوی مصنفین کو چھوڑ کر) ان کے طرز پر بھی فارسی کا گہرا اثر تھا۔ وہ بدستور ظہوری اور بیدل کی نثر کے دلدادہ تھے اور حد یہ ہے کہ پرائیویٹ خطوط میں بھی "محمد شاہی روشیں" کو برتنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن جب نئی ضرورتوں کی صبح طلوع ہوئی اور یہ صبح ذرا دیر میں طلوع ہوئی تو رات کا یہ غازہ اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ ڈھل گیا۔ میرامن کے متعلق ان کے معاصرین (جیسے رجب علی بیگ سرور) کی رائے کچھ بہت ہمت افزا نہیں تھی۔ یہ اعتراض صرف ایک فرد کا اعتراض نہیں، پورے ایک معاشرہ کا اعتراض ہے۔

بلاشبہ میرامن نے وہ نثر ایجاد کی جس کے جملے آج مصری کی ڈلیاں اور شربت کے گھونٹ ہیں لیکن اُس وقت یہ انداز شان و شکوہ کے منافی تھا۔ ہماری ادبی روایت اور تمدنی وراثت تو یہ تھی کہ لوگ اکبر کی تلوار سے زیادہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتے تھے۔ انگریز اجنبی ملک سے آئے تھے۔ ان کی ضروریات مختلف تھیں، ان کا علمی مزاج الگ تھا۔ چنانچہ میرامن نے بھی ہر جگہ ان ہی کی ضروریات کو ملحوظ رکھا۔

الغرض میرامن نے ایک نئی زبان بنائی ہے اور اس سلسلے میں انہیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آگے چل کر یہ اتنی مقبول ہوئی کہ مرزا غالب کے خطوط کی اساس بنی۔ لیکن ایک زمانہ تک وہ اس میں لکھنا شکوہِ سخنوری کے منافی خیال کرتے تھے۔ لیکن آخر کار مرزا غالب کو کسی موقع پر رجب علی بیگ سے یہ کہنا پڑا کہ فسانہ عجائب میں لطف زبان نہیں۔ ایک تک بندی

اور بھٹیارخانہ ہے۔ دراصل میرامن ایسے محاورے لکھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

چوتھا باب

غالب اور معاصرین غالب

۱- غالب سے پہلے اردو نثر کے اسلوب بیان کا مختصر جائزہ
۲- غالب کی نثر
غالب کی خطوط نویسی کے خصوصیات
۳- معاصرین غالب کی نثر

۱- سید محمد صالح
۲- محمد بخش مہجور
۳- لالہ گوبند سنگھ
۴- مفتی صدرالدین آزردہ
۵- سید باقر حسین
۶- سید فضل علی
۷- نواب قطب الدین خاں
۸- سید ظہیرالدین
۹- خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان
۱۰- مولوی ضیاء الدین
۱۱- ظہیرالدین دہلوی
۱۲- مولوی کریم الدین

اُردو نثر مرزا غالب سے پہلے

اُردو نثر کی تاریخ میں مرزا کی نثر کی قدر و قیمت اور اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے غالب سے پہلے کی اُردو نثر اور نثر نگاری کے مروجہ اصناف و اسالیب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اُردو میں مربوط اور مستقل تصانیف کا آغاز نویں صدی ہجری کے آغاز سے ہی ہوا۔ اور گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) میں قدیم نثر کا شاہکار یعنی ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" وجود پذیر ہوا۔ سب رس کے بعد اُردو نثر کا اگلا شاہکار "نوطرز مرصع" ہے۔ "نوطرز مرصع" کے قریبی زمانہ ہی میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اگرچہ فورٹ ولیم کا قیام انگریز حکمرانوں کے ہاتھوں کچھ سیاسی اغراض اور حکومت کے کاموں میں آسانی پیدا کرنے کیلئے ہوا لیکن ضمنی طور پر اس کے قیام سے اُردو زبان و ادب کو جو فائدہ پہنچا اس کا اعتراف کرنا نہ صرف علمی رواداری بلکہ تاریخی تقاضہ بھی ہے۔ اس کالج کے منتظمِ اعلیٰ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ بڑے علم دوست انسان تھے اور اُردو سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ اُردو زبان پر خود کام کرنے کے علاوہ انہوں نے اطراف و جوانب سے اُردو کے مشہور ادیبوں، انشاء پردازوں اور شاعروں کو کھینچ لیا۔ لکھنے والوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ مشکل پسندی سے پرہیز کیا جائے۔ عام فہم سلیس و رواں زبان استعمال کی جائے۔ الفاظ و محاورات عام بول چال کے اور ٹکسالی ہوں۔

اسی طرح اُردو نثر میں سلیس نگاری کا آغاز ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کی

نثری تخلیقات کے بعد مرزا کے خطوط منظرِ عام پر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا مدت کو ڈاکٹر سید عبداللہ تین منازل میں تقسیم کرتے ہیں: ایک وجہی سے 'نوطرز مرصع' تک، دوسری 'نوطرز مرصع' سے فورٹ ولیم کالج تک۔ تیسری فورٹ ولیم کالج سے غالب تک۔ مرزا غالب کے خطوط سے نثر اردو کی چوتھی منزل شروع ہوتی ہے

اسی منزل سے اُردو میں سنجیدہ اور رواں نثر نویسی کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ اہم منازل کے درمیان سودا کی نثر، مولانا فضلی کی 'دہ مجلس' عیسوی خاں کا قصہ مہر افروز و دلبر اور انشاء کی داستان رانی کیتکی چھوٹے چھوٹے ارتقائی مقام ہیں۔

مرزا غالب کے پیش نظر نثر نگاری کے دو انداز تھے۔ ایک پُر تکلف انداز جو فارسی انشاء پردازی کا چربہ تھا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ نثر میں شاعرانہ وسائل سے کام لینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ فقرے عموماً مقفیٰ و مسجع لکھے جاتے تھے صنائع و بدائع کا استعمال بکثرت ہوتا تھا۔ موضوع سے متعلق بحث واقعیت اور اصلیت سے دور اور خیالی ہوتی تھی۔ معانی پر الفاظ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس پُر تکلف انشاء کے اسالیب نے تین صنفی شکلیں اختیار کی تھیں۔ پہلی صفت نویسی غالباً عربی سے فارسی میں مروج ہوئی۔ دبستان ہرات کے نثر نگاروں نے نظم و نثر کے ذریعہ اس کو مقبول بنایا۔ اُردو کے مصنفین نے فارسی کے تتبع میں یہ انداز اختیار کیا۔ صفت نویسی میں اشیاء و مناظر کا وصف خیالی ہوتا تھا۔ انشاء کی دوسری قسم (مکتوب نگاری) کئی وجوہ سے نہایت اہم تھی جس کی وجہ سے قدیم نظام تربیت میں اس کے اصول و قواعد پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ مکتوب نویسی میں اگرچہ مکتوب نگار مدعا کو نظر انداز تو نہیں کر سکتا تاہم اس میں مدعا نویسی کو

اُصولی اور مرکزی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ بلند پایہ انشا پردازوں کے ذاتی خطوط میں بھی مدعا کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی خواہش سے کہیں زیادہ یہ جذبہ کارفرما ہوتا تھا کہ مکتوب الیہ کو خیال انگیزی کے ذریعہ محظوظ کیا جائے۔ تیسری قسم "تقریظ نویسی" ہے۔ یہ بظاہر تبصرہ نگاری کی ایک نوع ہے مگر ایسے تبصرے ہوتے تھے جس میں کتاب کے نفسِ مضمون پر بہت کم بحث ہوا کرتی تھی۔ عموماً تحسین کا پہلو مدِنظر رکھا جاتا تھا اور کتاب کے محاسن پر خیالی بحث کی جاتی تھی۔ پُرتکلف انداز کے علاوہ مرزا کے پیشِ نظر وہ سادہ طریقہ تھا جس کو فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں نے رائج کیا۔ اس کے بڑے نمائندے میر امنؔ، حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس تھے۔ ان ادیبوں کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نثرِ اردو کو اسالیبِ پُرپیچ سے (یعنی بنے بنائے نمونوں کی تقلید سے) آزاد کرتے ہوئے اسلوب میں انفرادیت کے اظہار کے لئے عام راستہ صاف کیا۔ اس طرح پہلی مرتبہ نثری ادبی تخلیق میں عام قاری کی رعایت کا عنصر داخل ہوا۔ فورٹ ولیم کالج والوں نے اظہارِ خیال کے بنے بنائے کتابی سانچوں کی بجائے عام بول چال کی زبان کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر ادب کو ایک عام قاری کے لئے قابلِ فہم بنایا۔ مگر یہ کمی رہی کہ انہوں نے اپنے زمانہ کی زندگی کی عکاسی نہیں کی تاہم وہ زبان استعمال کی جو عام آدمی کی زبان تھی۔ لیکن اس کالج کے نثر نگار ادب کو اجتماعی تجربات اور ذاتی مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ نہ بنا سکے۔ انہوں نے اپنے زمانہ کی زبان میں ماضی کی داستانیں بیان کیں واقعیت کی طرف انہوں نے قدم نہیں بڑھایا اور نہ اپنی ذات اور اپنے عصر کے تجربات کی کسی طرح ترجمانی کر سکے۔ ہر چند کہ ان ادیبوں نے بے ضرورت فارسی عربی ترکیبوں کے بوجھ سے اپنی نثر کو آزاد کیا...... مگر ان کی تحریریں

فارسیت سے کلیۃً خالی نہ تھیں۔ وہ کسی حد تک صنائع بدائع کا استعمال بھی کرتے تھے اور مسجع نگاری میر امنؔ سمیت سب کی نثر میں موجود ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں کی نثر نگاری سے اردو نثر میں ایک نئے انداز کا آغاز ہوا۔ لیکن قدیم طرز کے مقبولِ خاص و عام ہونے کی وجہ سے اسے فوراً قبولِ عام نصیب نہ ہو سکا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ سلیس نگاری کی اس تحریک کا آغاز اردو کے دو بڑے مرکز دہلی اور لکھنؤ کے بجائے ان سے دور کلکتہ سے ہوا تھا۔ علاوہ اس کے وہ زمانہ تھا جس کی امتیازی اور بنیادی خصوصیت تکلف آورد اور طمطراق تھی۔ اس کے سامنے سادگی اور سلاست کا چراغ کیس طرح جل سکتا ہے جب کہ اس کے روشن کرنے والے دلّی کے تھے نہ لکھنؤ کے۔ ممکن ہے کہ یہ رقابت سادہ نگاری کی تحریک میں حارج ہوئی ہو۔ اس کا ثبوت 'فسانۂ عجائب' کا دیباچہ ہے جس میں مصنف نے مضحکہ آمیز الفاظ میں امنؔ کے اسلوب کا خاکہ اڑایا ہے۔ اگر مرزا غالبؔ اردو نثر کو اپنے اظہار کا ذریعہ نہ بناتے تو سلیس نگاری کا مستقبل یقیناً تاریک تھا۔ خود مرزا کے عہد کے دوسرے ادیب مثلاً غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث بےخبر اور یہاں تک کہ سر سیّد نے جو بعد میں سلیس نگاری کے امام کہلائے جب 'آثار الصنادید' لکھی ہے تو اسی مقفّیٰ و مسجع عبارت میں لکھی ہے۔ الغرض اگر مرزا غالب کے خطوط منظرِ عام پر نہ آتے تو قدیم طرزِ تحریر کے زوال میں بہت تاخیر ہو جاتی۔ مرزا نے فارسی کی بجائے اردو زبان کو اپنی خطوط نویسی کا ذریعہ بنا کر اس کو ایک زندہ، دیرپا اور دلکش اسلوب سے روشناس کرایا۔ اسلوب میں بیک وقت قدیم و جدید طرزِ تحریر کی بیشتر خصوصیات نظر آتی ہیں

یہ وہ اسلوب ہے جس میں الفاظ اور معانی اس طرح باہم یک جان ہو گئے ہیں جس طرح پھول میں رنگ و بو جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ نثر ہے جو اپنے مصنف کی ترجمان ہے۔ اردو نثر نگاری میں مرزا کو جو بلند مرتبہ حاصل ہوا اور ان کی نثر میں جو لطف و اثر پایا جاتا ہے۔ اس کے وجوہ و اسباب مجملاً یہ ہیں:

(۱) نثر کی مختلف انواع کے تقاضوں کا مرزا غالب کو پورا پورا احساس تھا۔

(۲) نثر خصوصاً خطوط میں "ابلاغ" کی اہمیت کا احساس اور مخاطب کی دلچسپی کا خیال

(۳) بے ساختگی کے باوجود حسن و زیبائش کا بے تکلف اظہار۔

(۴) اثر آفرینی اور خیال انگیزی کے مختلف طریقے۔

(۵) مرزا غالب کا فکری توازن، اپنی نثر کو شدید اور غیر معتدل جذباتیت سے بچانے کیلئے شوخی و ظرافت کا استعمال۔

مرزا غالب کی اردو نثر کا کل سرمایہ ان کے خطوط میں ہے۔ ان خطوں کے ذریعہ انہوں نے اسلوب کو شخصیت کا آئینہ بنایا۔ ان کی شاعری سے ان کی شخصیت کے صرف چند پہلو نمایاں ہوتے ہیں مگر خطوط کے ذریعے ان کی شخصیت کے سب پہلو ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ ان کی شاعری سے ہمیں ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر ان کے خطوط سے ہمارے دل میں ہمدردی، محبت و عقیدت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ ہر چند ان کی شاعری خود عظیم ہے۔ لیکن اسے مقبول بنانے میں ان کے خطوط کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی شاعری سے ہم کسی حد تک غالب کی شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان کے اپنے خطوط میں مرزا غالب چلتے پھرتے ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔

غالبؔ اور ان کے خطوط

غالبؔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام اسد اللہ بیگ خاں عرف مرزا نوشہ تھا۔ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطابات تھے۔ انہوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ ترکوں کا ایک مشہور خاندان تھا۔ اس خاندان کا پیشہ سپہ گری تھا۔ وہ ہمیشہ سے یہی کام کرتے آئے تھے۔ لیکن یہ امر اردو زبان اور ادب کے لئے بہت ہی مبارک ثابت ہوا کہ غالبؔ نے اپنے خاندانی پیشہ کو ترک کرکے اردو زبان و ادب سے دلچسپی لی۔ لیکن ایک سپاہی میں جو بھی صفات پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ایک عام آدمی پر اس کو ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ ہر گھڑی غالبؔ کی حرکات و سکنات سے عیاں ہیں۔ وہ ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کے والد اور پھر ان کے چچا کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ننھیال خاصی فارغ البال تھی چنانچہ ان کی زندگی اور ان کے ادبی سرمایہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی اور اس کے بدلتے ہوئے حالات .... کو سمجھا۔ اس سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ زندگی کے بڑے گہرے نباض تھے۔ اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہرائی کے ساتھ پڑتی۔ حرکت اور عمل کی خصوصیات ان کی شخصیت میں خاصی نمایاں تھی۔ کسی چیز کی نامحرومی سے وہ اداس اور غمگین تو ضرور ہوتے لیکن اسے حاصل کرنے کی انتھک کوشش کرتے۔

اگرچہ ان کا زمانہ انحطاط اور زوال کا زمانہ تھا لیکن یہ انحطاط اور زوال

میر اور سودا کے زمانہ کے انحطاط سے مختلف ہے۔ ان کے زمانہ میں انحطاط کے باوجود
انگریزوں کی عملداری کی وجہ سے میر و سودا کے زمانہ کی افراتفری نہیں تھی جس کی وجہ سے
دلی میں ایک علمی و ادبی فضا قائم تھی اور شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا
سید احمد بریلوی، مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے عالم اور شیفتہ، مومن و ذوق جیسے
شعراء کی وجہ سے علمی و ادبی فضا قائم تھی۔ وہ اس علمی ماحول سے بھی متاثر ہوئے،
اس سے دلچسپی لی۔ اسے سمجھنے کا انہیں شعور تھا۔ انہوں نے اس معاملات میں
اجتہادی شان پیدا کی۔ اجتہاد کے ساتھ جدت اور اُپج تو وجود میں آنی ہی
چاہیئے۔ چنانچہ غالب کے یہاں جدت اور اُپج اسی صورت حال کے نتیجہ میں
پیدا ہوئی ہے۔

علم و عمل کے اس ماحول نے غالب کی شخصیت میں شگفتگی اور جولانی کی خصوصیات
کو بھی پیدا کیا ہے اور اسی شگفتگی اور جولانی کا یہ اثر ہے کہ غالب کے مزاج میں
لطیفہ سنجی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی بات بات میں لطف ملتا ہے۔ غالب فطرتاً
بھی بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ ماحول کی اس کیفیت نے اس بذلہ سنجی اور شگفتہ
مزاجی کو کچھ اور بھی نکھارا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت کے نقوش ان کی نثر میں
اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ان کی حالات، اُن کے اخلاق و عادات،
اُن کے افکار و خیالات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

غالب کی اُردو نثر اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نثر ان خطوط پر
مشتمل ہے جو غالب نے وقتاً فوقتاً اپنے احباب کو لکھے۔ غالب کی زندگی کا ہر پہلو
اور اُن کے مزاج کی ہر خصوصیت ان خطوط میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض
اعتبار سے یہ خطوط اُن کی شاعری کے مقابلہ میں بھی بلند مرتبہ ہیں۔ مولانا حالی نے

ٹھیک لکھا ہے کہ "مرزا کی عام شہرت جس قدر ان کی اُردو نثر کی اشاعت
سے ہوئی ویسی نظم اُردو اور فارسی سے نہیں ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ
ہے کہ ان خطوں میں غالب چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، ملتے جلتے، شاگردوں کے
کلام پر اصلاح دیتے، علمی و ادبی بحثوں میں شریک ہوتے اور زمانہ کو دیکھتے
اور سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

غالب کے خطوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۱۔

خطوطِ غالب کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے
اُردو خطوط کو جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خاں میرٹھی کو پیدا ہوا۔
چنانچہ اُنہوں نے چودھری عبدالغفور سرورؔ اور خواجہ غلام غوث بےخبرؔ کے توسط
سے کچھ خطوط جمع کئے۔ ان کے ساتھ چند تقریظیں بھی جمع کیں اور ان سب کا
مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۸۶۸ء میں شائع کر دیا۔
مرزا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "اردوئے معلیٰ" کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔
یہ اُردوئے معلیٰ کا پہلا حصہ تھا۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا حالی کی فرمائش پر مطبع
مجتبائی سے پہلا اور دوسرا حصہ یکجا کر کے شائع کیا گیا۔ ایک اور مجموعہ "مکاتیب
غالب" کے نام سے امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے ۱۹۳۷ء
میں شائع کیا۔ مکاتیب غالب میں مرزا کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے والیانِ
رام پور کو لکھے تھے۔ مرزا کے خطوط کا ایک مجموعہ "نادراتِ غالب" کے نام سے
۱۹۴۹ء میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں آفاق حسین صاحب دہلوی نے وہ
وہ خطوط جمع کئے ہیں جو غالب نے منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی کے نام
لکھے تھے۔ منشی ہیش پرشاد کو بھی غالب کے ان تمام خطوط کو یکجا کرنے کا

خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اُن کی مرتب کی ہوئی پہلی جلد "خطوطِ غالب" کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد سے شائع ہوئی۔ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔

حالی کے خیال کے مطابق مرزا غالب سنہ ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور "مہرِ نیم روز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اس وقت اُن کو بہ ضرورت اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔" لیکن شیخ محمد اکرام اور مولانا غلام رسول مہر کو اس سے اختلاف ہے۔ اکرام صاحب کا خیال ہے کہ "غالب کے خطوط کی نسبت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو یہ شان گمان نہ تھا کہ کبھی ان کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے اُن کے بارے میں تو یہ خیال صحیح ہے لیکن بعد کے خطوط کے بارے میں نہیں۔" اس سلسلے میں انہوں نے غالب کے اس خط کا ذکر کیا جو انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا، اور جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ "رقعات کے چھاپنے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اس میں خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔" اکرام صاحب نے اس خط کی روشنی میں یہ خیال قائم کیا ہے:۔۔۔

"اس کے بعد جو رقعات مرزا نے لکھے ہوں گے اُن کی اشاعت کو وہ ضرور ممکن الوقوع سمجھتے ہوں گے اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں فرق ہے۔

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے کی نسبت بعد میں بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے ہیں۔"

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا حالی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے: "مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں، اس لئے کہ اوّل "مہر نیم روز" کوئی بڑی کتاب نہیں جس کی ترتیب میں غالب کا بیشتر وقت صرف ہوا ہو گا۔ یہ کتاب انہوں نے کم از کم دو برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے کل ۱۰۰ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باعتبارِ اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ ۵۵...۶۰ صفحات لکھتے رہے۔ اور یہ غالب جیسے قادر الکلام اور مشاق نثر نگار کیلئے کوئی بڑا کام نہیں تھا جس کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو خط و کتابت کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں اُردو نثر کو اہلِ علم چنداں وقیع نہیں سمجھتے تھے، اس لئے وہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔ بعد میں جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا غالب فارسی کی بجائے زیادہ تر اُردو میں خط لکھتے رہے۔" علاوہ اس کے مولانا مہر نے (مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے) یہ قیاس ظاہر کیا کہ سفرِ کلکتہ کے موقع پر وہ مغربی ادب کے رجحانات سے روشناس اور متاثر ہوئے ہوں گے۔ سادہ نگاری بھی شاید اسی اثر کا رہینِ منت ہے۔ جس طرح میر تقی میر اپنی شاعری کے سلسلہ میں کہتے ہیں ؎

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا ٭ وہی آخر کو ٹھیرا فن ہمارا

غالب نے اپنے خطوط میں خود بھی اپنی مکتوب نویسی کے محرکات کا تقریباً اسی انداز میں ذکر کیا ہے۔

ان میں کون سا خیال صحیح ہے؟ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ غالب نے خط لکھے اور ۱۸۵۰ء کے بعد تو مستقل طور پر اردو خط و کتابت کی لیکن ان خطوں کو چھپوانے کا خیال ان کے دل میں کبھی بھی پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ جن احباب نے چھاپنے کی کوشش کی غالب نے انہیں منع کیا۔ منشی شیو نارائن پہلے شخص ہیں جنہوں نے غالب کے خطوط شائع کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ان سے اجازت مانگی۔ اس کے جواب میں غالب نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن بعض خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعد میں ان کو چھپوانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اور جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ خطوط شائع ہوں گے تو وہ دل لگا کر اور قلم سنبھال کر لکھنے لگے تھے۔ لیکن اس خیال نے ان کے خطوط کو ان خصوصیات سے محروم نہیں رکھا جو ان کے خطوط میں پائی جاتی تھیں یعنی بے تکلفی اور بے باکی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں دورنگی نہیں تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک خلوص تھا، ایک صداقت تھی، ایک بے تکلفی تھی، ایک بیباکی تھی، ایک برجستگی تھی۔ چنانچہ یہ خصوصیات ان خطوں میں بھی پائی جاتی ہیں جو نجی ضرور تھے لیکن جن کو لکھتے وقت یہ خیال ان کے پیش نظر تھا کہ وہ چھپیں گے ضرور!

غالب کے خطوط کی یہ بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بے پناہ خلوص اور بے اندازہ صداقت ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو کسی راز کو چھپا نہیں سکتا۔ جس میں مبالغہ آرائی نام کو نہیں تھی۔ تکلف جسے چھو بھی نہیں گیا تھا۔ تصنع سے جس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں ایک اور ہی فضا ملتی ہے ایک دلکش ماحول نظر آتا ہے اور غالب نے جو باتیں کی ہیں وہ کسی نہ کسی نسبت سے ہمیں اپنی باتیں

معلوم ہوتی ہیں۔ جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اپنے خیالات نظر آتے ہیں۔ ماحول کی جو تصویریں بھی پیش کی ہیں وہ اپنی تصویر دکھائی دیتی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب جن لوگوں کو خطوط لکھتے ہیں ان سے حد درجہ قریب ہو جاتے ہیں اور ان کی شخصیت میں اس درجہ گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی یہ بات دلوں کو بہت بھاتی ہے اور ہر شخص ان سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس آئینہ میں اسے اپنی صورت نظر آنے لگتی ہے۔

خطوط غالب کے موضوعات متنوع اور مختلف ہیں۔ ان خطوں میں ان کی شخصیت سے متعلق عام باتیں موجود ہیں۔ پیدائش کے وقت سے لیکر وفات تک کے واقعات کا ان خطوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ بچپن کے حالات، تعلیم و تربیت، شادی اور اس کے اثرات، احباب اور متعلقین، مالی الجھنیں اور پریشانیاں اور پھر اس سلسلے میں دور دراز علاقوں کا سفر، پنشن اور اس کی ساری تفصیل، دلی کی حالت، قید کا واقعہ، غدر اور اس کے مفصل حالات ——— ان تمام موضوعات پر ان موضوعات کی صرف تفصیل ہی خطوط میں درج نہیں ہے۔ غالب نے ان سب پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے ذہنی رجحان اور افتاد طبع کو بھی سامنے رکھا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں وہ ایک صاحب رائے دکھتے ہیں اور اس کا اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت اور ان کا نظریۂ حیات ان خطوط میں پوری طرح بے نقاب ہے۔

غالب کے ان خطوط سے اس زمانہ کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی احوال کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کی دلی میں لوگ کس طرح رہتے تھے؟ اس کے آداب اور طور طریقے کیا تھے؟ ان کی الجھنیں اور پریشانیاں

کس قسم کی تھیں؛ پرانی روایات کے ساتھ ساتھ نئی روایات کا اثر معاشرت پر
کس طرح چھانے لگا تھا؛ افراد زندگی کے بارے میں کیا سوچتے تھے؛ ماحول نے
اُنہیں کس طرح اسیر کر لیا تھا؛ مختلف طبقوں اور فرقوں کے تعلقات آپس
میں کیسے تھے؛ اُن کا نظریۂ حیات کیا تھا؛ معاشی بدحالی اخلاق کو کس طرح بگاڑ
رہی تھی؛ بے عملی نے کس طرح معاشرت میں گھر کر لیا تھا؛ اُمراء اور شرفاء کی
زندگی کس طرح وبالِ جان بن گئی تھی؛ لوگ کس طرح ایک دوسرے سے
ملتے تھے؛ درباروں کی حالت کیا تھی؛ درباروں نے زندگی کو کس طرح بگاڑا
تھا؛ مغلوں کی کمزوری اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے کیا صورت
پیدا کی تھی؛ سیاسی تبدیلیوں نے معاشرتی زندگی کو کن راہوں پر لا کر کھڑا کر دیا
تھا؛ کن سے حالات اور افکار و خیالات زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال رہے تھے؛
کون سی علمی ادبی اور سیاسی تحریکیں تھیں جن کا اثر زندگی اور معاشرت پر ہو رہا
تھا؛ کون سے ادبی مباحث تھے جن کا ان دنوں چرچا تھا؛ شاعرانہ ماحول کی
کیا خصوصیات تھیں؛ کون کون سے شاعر تھے جن کا اثر ماحول قبول کر رہا تھا؛
یہ اور اسی طرح کے سینکڑوں معاملات اور مسائل ہیں جن کی صحیح تصویریں
غالب کے خطوط پیش کرتے ہیں۔

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے
نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے
بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی۔" یہ خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ جس وقت
مرزا غالب نے یہ خطوط لکھے ہیں اس وقت عام طور پر فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے
اردو بولنے کا رواج عام تھا لیکن لکھنے کی زبان فارسی تھی۔ فارسی میں جو خطوط

لکھے جاتے تھے وہ رقعاتِ بیدل اور انشائے مادھو رام کو معیار بنا کر لکھے
جاتے تھے اس لئے فارسی خطوط نویسی میں کسی نمایاں تبدیلی کی توقع کم تھی۔ مرزا نے
نہ صرف فارسی میں خطوط لکھنے کی روایت کو توڑا بلکہ اردو خطوط کو نئے اور نرالے
انداز سے آشنا کیا۔ غالب کی بڑائی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ اگر اس
طرح کے خطوط سامنے نہ آتے تو ممکن تھا کہ اردو نظم نے جہاں فارسی نظم کی پیروی
کی تھی وہاں اردو خطوط بھی رقعاتِ بیدل یا انشائے مادھو رام کے طرز پر
لکھے جاتے۔

غالب کے زمانہ میں خطوط نویسی کا جو معیار تھا اس میں القاب و آداب کو
خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ خط کا ایک اچھا خاصہ حصہ القاب و آداب پر مشتمل
ہوتا تھا۔ لیکن یہ بڑے بڑے اور لمبے لمبے القاب و آداب بے مقصد معلوم
ہوتے تھے۔ ان کے استعمال کرنے کے لئے خاص عبارت آرائی کرنی پڑتی تھی۔
غالب نے اس کو چھوڑا اور ایک زیادہ فطری اور زیادہ حقیقی طریقہ اختیار
کیا۔ بقولِ حالی: "انہوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور
بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں قرار دے رکھا تھا،
مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں، اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی
برخوردار، کبھی بھائی، کبھی مہاراج، کبھی اور کسی مناسب لفظ سے آغاز کرتے تھے
اور اس کے بعد مطلب لکھتے تھے۔ اکثر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا
شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اپنے خطوط سے یکسر
القاب و آداب کو خارج کر دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ القاب کہیں کہیں استعمال
ضرور کرتے ہیں۔ لیکن وہاں جہاں استعمال کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور رتبہ کی مناسبت

استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہی خیال القاب و آداب کے استعمال کرنے کا باعث بنا ہے۔ جب وہ اپنے سے بڑے کو خط لکھتے ہیں تو القاب و آداب ضرور استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً نوابانِ رام پور کے خطوط کو انہوں نے ہمیشہ "حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت" سے شروع کیا ہے۔ اور نواب میر غلام بابا جان کو "جمیل المناقب عمیم الاحسان" لکھ کر مخاطب کیا۔ لیکن ویسے ان کا عام انداز یہی ہے کہ بغیر کسی القاب کے خط شروع کرتے ہیں۔ بہرحال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے روایتی القاب و آداب کے استعمال سے احتراز کیا اور جو القاب آداب استعمال کئے ہیں اُن میں کچھ جدتیں پیدا کی ہیں، اور اسی وجہ سے اُن کے القاب و آداب بھی خود دلچسپ بن گئے۔

اُن کے خطوط میں بات کرنے کی ایک فضا ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سامنے موجود ہے اور غالب کے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ باتیں کرنے کی فضا غالب کے خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ ڈرامائی انداز سے غالب کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔ اُن کے خطوط میں شوخی و شگفتگی مزاح پیدا کرتی ہے اور لطافت اس مزاح کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے جس میں وہ منفرد اور بے مثال ہیں کہ رنج و غم اور تعزیت کے ایسے نازک موقع پر بھی وہ خط لکھتے ہوئے اپنے اس مخصوص رنگ کو قائم رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط دلوں میں گھر کر لیتے ہیں اور ان کا لطیف اندازِ ظرافت روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے۔

غالب کے فکر و خیال کی پرواز بہت اونچی تھی۔ وادیٔ خیال کو مستانہ وار

طے کرنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ لیکن وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے بھی تھے۔ اُس کی گہرائیوں تک پہنچنا اور اصل حقیقت کو معلوم کرنا اُن کی شخصیت کا جزو تھا۔ لیکن مشاہدۂ حق کی گفتگو وہ بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ یہ خصوصیت اُن کے خطوط میں بھی نمایاں ہے۔ ان میں جگہ جگہ تخیل کی بلند پروازی نظر آتی ہے اور تخیل کی اس بلند پروازی کے سہارے وہ زندگی کے بنیادی حقائق تک پہنچتے ہیں لیکن ان حقائق کو بادہ و ساغر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر اُن کے خطوط میں حد درجہ شاعرانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کا وہ خط ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے مدوجزر کو پیش کیا ہے اور خانہ داری کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کے تخیل کی پرواز بہت بلند تھی اور اس تخیل کی پرواز کے ذریعہ اُن کے انداز میں تمثیل نگاری کی خصوصیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اُن کے خطوط میں موجود ہے اور یہ کہ وہ زندگی کا شعور رکھتے تھے زندگی کے بنیادی حقائق پر اُن کی نظر رہتی تھی۔ لیکن اس کو وہ بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کرتے تھے۔ غالب کی زندگی کی تصویر اس بیان سے جس خوبی سے اُبھر کر سامنے آتی ہے اس کی مثالیں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ غالب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ اُن کے خطوط میں اکثر جگہ اس خصوصیت کے اثرات جھلکتے ہیں اور اسی کا اثر ہے کہ اُن کے خطوط میں ایک "رفعت ملتی ہے" ایک گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور ایک پرپیچ ہوئی کیفیت نظر آتی ہے۔

پنڈت کیفی کا خیال ہے کہ مرزا نے جس طرزِ خاص کو ایجاد کیا وہ حقیقت سے زیادہ اُن کی انانیت اور منفرد شخصیت سے تعلق رکھتا ہے۔

مرزا کے خطوط کی وجہ سے اُردو نثر میں نہ صرف ایک مخصوص اندازِ تحریر اور
اسلوب کا اضافہ ہوا بلکہ اُردو نثر کی تاریخ ایک نئے راستے سے روشناس
ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے سانحے کے بعد ہماری سیاسی و سماجی زندگی میں جس رفتار سے
تبدیلی ہو رہی تھی اس رفتار سے ہمارے یہاں ادبی تصورات نہیں بدل رہے
تھے۔ سیاسی و سماجی زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے اظہارِ خیال کی
ضرورت پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ خیال کی اشاعت نثر ہی سے ہو سکتی ہے۔
لیکن اُس وقت شاعری کا چرچا تھا۔ نثر سے غفلت برتی جا رہی تھی
جو کچھ نثر کا سرمایہ تھا اس پر تکلف، تصنع اور دبیز پردے پڑے ہوئے
تھے۔ عبارت آرائی کے شوق سے اصل مقصد کا خون کر دیا جاتا تھا۔ اگرچہ میرامن
سے اردو میں سادہ نثر کا آغاز ہوا لیکن میرامن کے قصے اور کہانیاں اوّل ترجمے
ہیں۔ دوسرے فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں جو نثر لکھی گئی وہ بعض سیاسی
مصلحتوں کے اثر سے وجود میں آئی اور کوئی باقاعدہ تحریک نہ بن سکی۔ ادبی
حیثیت سے سرسید سے قبل اگر کوئی نثر قابلِ وقعت اور لائقِ پیروی ہے تو
مرزا کی نثر ہے۔ نثر کے حقیقی مقصد یعنی وضاحت و صراحت کو پہلی مرتبہ کام میں
لایا گیا۔ گویا نثر کی حقیقی خوبی سادگی اور صفائی جو اب تک تکلف و تصنع سے دبی
ہوئی تھی، اُن خطوط کی بدولت اُبھر آئی۔ غالب کی نثر سرسید کی توسط سے
حالی کے حصے میں آئی جسے انہوں نے مختلف اور متنوع مضامین لکھ کر بہت آگے
بڑھایا اور اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر رنگ کو ادا کرنے پر قادر ہو گئی۔ یہ
قدرتِ بیان انہیں ورثے میں غالب سے ملا۔ مرزا کے خطوط پر نظر ڈالیے تو اس
میں ایک رنگا رنگی ملتی ہے جس میں زندگی کے ہر جذبہ کی ترجمانی نظر آتی ہے۔

اُردو نثر کی روایت میں غالب کے خطوط امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط نے
اُردو نثر کو ایک نیا انداز دیا ہے۔ اُس کو نئی راہیں دکھائی ہیں اور اُن راہوں پر
اُس کو گامزن بھی کیا۔ اُردو ادب میں غالب کے خطوط کی ایک نمایاں حیثیت
ہے۔ ان سے غالب کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُس ماحول کے تمام پہلوؤں
کی تصویر نظر آتی ہے جس میں غالب نے پرورش پائی اور جس نے اُن کے اسلوب
کو پیدا کیا۔ یہ اسلوب بھی ان خطوط میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔
یہ مختصر جائزہ ہے اُن امتیازی خصائص کا جن کی بدولت مرزا غالب کی
نثر اردو ادب کے بہترین شاہپاروں میں شمار ہوتی ہے مولانا حالی نے
صحیح فرمایا ہے کہ اُردو نثر نے مرزا غالب کے بعد بہت ترقی کی ہے۔ مگر خطوں کے
محدود دائرہ میں ان کے بعد بھی بہ لحاظ دلچسپی اور لطف کے اُن کی نثر کی
نظیر نہیں مل سکتی۔ مثلاً مرزا کا انداز منفرد ہے۔ اُن کے عام اسلوب میں برجستگی
اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ اُن کی طبیعت میں جدت و ندرت بدرجۂ اتم موجود ہے
وہ ہر معاملہ میں ایک منفرد روش رکھتے تھے چنانچہ اسلوب میں بھی یہی اُن کے
مدِ نظر تھا۔ مگر رنگینی و شیرینی اور لطافت و حلاوت کا جو اجتماع اُن کی اُردو نثر
میں ملتا ہے وہ اُن کی فارسی نثر میں نہیں ہے۔

مرزا نے پہلی بار اُردو نثر کو حقیقت سے رُوشناس کرایا۔ اس
میں متانت، سادگی اور سلاست پیدا کی۔ اُردو میں سنجیدہ ظرافت و طنز کی
داغ بیل بھی انھوں نے ڈالی۔ اُن کے خط مکالمہ اور جزئیات نگاری کے بارے
میں آنے والے ناول نگاروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ اُن کے بعض
خطوں پر شخصی مقالات کا دھوکا ہوتا ہے۔ اُن میں وہی لچک، وہی گفتگو کا انداز

وہاں گو علمی موضوع اسی طرح کی بے تکلف ساخت اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص
نقطۂ نظر جس کے پیچھے کوئی نہ کوئی جذباتی تحریک موجود نظر آتی ہے۔۔۔۔ ان سب
خصائص کی بنا پر غالب کے خطوط شخصی انشائیوں کا رنگ ڈھنگ رکھتے ہیں۔ اس
معاملہ میں غالب آنے والے مقالہ نگاروں کے پیش رو ثابت ہوتے ہیں۔[۱۲]

معاصرینِ غالب

سید صالح محمد دہلوی

سید صاحب کی زندگی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، البتہ آپ کی
کتاب "اتالیق الصبیان" کا نمونہ "تاریخ اردو نثر" سے نقل کیا جاتا ہے جس کے
مطابق یہ کتاب ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء کی تصنیف ہے۔

"جان تو جو نیک بخت کرے تجھ کو اللہ تعالیٰ بیچ دونوں جہان کے کہ
اس فقیر پر تقصیر نے بیچ اس رسالہ کے صفت ایمان کی اور عقیدے اور فرض
اور واجب اور سنت اور مستحب اور مسائل ضروری نماز اور روزے اور حج
اور زکوٰۃ کے کتابوں سے چن کر اور مختصر کر کے خاص و عام کے فائدہ اٹھانے
کے لئے لکھے اور ترجمہ کے لئے آسانی سے جلد سمجھنے کے لئے عورتوں اور مردوں و
اَن پڑھ کے نظم نہ کیا۔ یعنی بیتوں میں نہ لکھا اور اوپر ایک مقدمہ اور پانچ
باب اور ایک خاتمہ پر منقسم کیا جاتا ہے۔ اور ہر ایک باب میں کئی کئی فصلیں اور
ہر ایک فصل میں کتنے کتنے مسئلے ہیں۔ اور نام اس کا "اتالیق الصبیان" رکھا گیا۔
اور بعد تمام ہونے کے ضعیف و نحیف نے واسطے دور ہونے شک کے جو بعض

مسئلوں میں رکھا گیا اور خوف آخرت کے سے کہ یہ مقدمہ دینی ہے۔ شاید کہیں
غلطی یا کہ زیادتی نہ ہوئی ہو اوّل سے آخر تک اس رسالہ کو پہنچے ہوئے فاضلوں اور
پیشوا عالموں مولوی محمد اسحٰق صاحب یعنی نواسے جناب شاہ عبداللہ صاحب کو
سلامت رکھے۔ اللہ ان کو جو ساتھ علم اور حلم اور اخلاق کے تعریف کئے گئے
ہیں سنایا اور انہوں نے اوّل سے آخر تک خیال دل سے سن کر جس جگہ شک
اور غلطی تھی اصلاح فرمائی.........[۱۳]

سید صاحب کو ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ اردو عبارت صاف ہو۔ اُن کا
مقصد مذہب کے ضروری مسائل کو اردو میں ترجمہ کرنا تھا یعنی لوگ عربی کے
بجائے اردو میں پڑھیں۔ اس قسم کی عبارت انہیں سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔
بہت ممکن ہے کہ اُس زمانہ کے لوگ اس قسم کی اردو بخوبی سمجھتے ہوں گے۔[۱۴]

محمد بخش مہجور

آپ کا تعلق شرفائے دہلی سے تھا۔ علوم متداولہ میں اچھی مہارت حاصل کی
شاعری کا صحیح ذوق رکھتے تھے اور جرأت کے شاگرد تھے۔ انہوں نے میر و سودا
کا عہد دیکھا تھا۔ "گلشن بہار" اُن کی یادگار ہے۔ مقفیٰ طرز انہیں پسند تھا۔
اُس زمانہ کے ایک گمنام مصنف میں "داستانِ تاریخ اردو" سے اُن کی عبارت کا
نمونہ قلمبند کیا جا رہا ہے:۔

"حمد و سپاس و ثنائے بے قیاس اُس کریم کارساز بے نیاز بے انباز
بندہ نواز بے چون و بے چگون کو کہ جس نے ساتھ ابر کرم اور بہار قدرت گلہائے
گوناگوں انسان ضعیف البیان سے گلشن تکوین کو سرسبز و شاداب کر کے اپنے تئیں

ہر غنچہ و گل جلوہ گر کیا ہے۔

لالہ گوبند سنگھ

آپ کا وطن شاہجہاں آباد (دہلی) تھا۔ لیکن عمر کا بیشتر حصّہ لکھنؤ اور پھر کلکتہ میں گذرا۔ ۱۲۶۱ھ میں کلکتہ میں "نغمۂ عندلیب" کے عنوان سے ایک قصّہ تصنیف کیا جس کو چودھری نبی احمد نے دوبارہ ترتیب دیا۔ کچھ عرصہ پہلے سلطانیہ بک ایجنسی نے لکھنؤ سے شائع کرایا۔ قصّہ کا طرز تحریر اسی زمانہ کا مروجہ ہے۔ اس کے بہت سے محاورے اب متروک ہوگئے ہیں مثلاً طوطیا باندھنا، تہمت لگانا، پیٹ مارنا (اب پیٹ کاٹنا کہتے ہیں) وغیرہ وغیرہ۔ قصّہ کا موضوع بھی وہی داستانوں کا خاص موضوع جنات، جادو وغیرہ۔

مصنّف سرالمصنفین نے اس کتاب کے دیباچہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں اردو زبان کو 'ہندی' کے نام سے یاد کرتے تھے[۱۴]۔

مفتی صدرالدین آزردہ

مفتی صاحب کا شمار اپنے زمانہ کے جید عالموں میں ہوتا تھا۔ آپ مولوی لطف اللہ صاحب کشمیری کے فرزند تھے ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا شاہ عبدالقادرؒ، مولانا محمد اسحٰق، مولانا فضل امام خیرآبادی اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے علوم عقلی و نقلی کی تحصیل کی ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریز گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں صدرالصدور اور مفتی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ پر جہاد کے فتوے کا الزام لگا کر گرفتار

کرلیا گیا اور جائیداد ضبط کی گئی۔ لیکن چند روز بعد جب آپ کی بے گناہی ثابت ہوئی تو رہا کر دیئے گئے اور جائداد کا حصّہ بھی بحال کیا گیا۔ مفتی صاحب کا تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ ہمیشہ شاگردوں کا مجمع رہتا تھا۔ مفتی صاحب کے شاگردوں میں مولانا نواب یوسف علی خاں (رامپور)، سر سیّد احمد خاں اور نواب صدیق حسین بھوپالی وغیرہ تھے۔ آپ کی یادگار عربی و فارسی کی چند تالیفات اور فتاوےٰ ہیں۔ شاعری کا بڑا صحیح مذاق تھا۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا۔ اردو میں شاہ نصیرؔ، میر مجنوں اور میاں مجرم سے مشورہ کرتے تھے۔ انہوں نے اردو زبان کے شعراء کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں مرتب کیا تھا جو اب ناپید ہے۔ مرزا غالبؔ، نواب شیفتہؔ اور امام بخش سے تعلقات تھے اور ان احباب سے اردو میں خط و کتابت بھی کرتے تھے[۱۵]۔

سیّد باقر حسین

آپ سید علی خاں کے بیٹے تھے اور آپ کا وطن دہلی تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں نے ایک قصّہ "عجائب و قصص" تصنیف کیا تھا۔ آپ نے اس کا اردو ترجمہ کیا فخرالدین حسن نے اس کا دیباچہ لکھا۔ مترجم اور دیباچہ نویس دونوں کی عبارت کا نمونہ تاریخ اردو سے نقل کیا جاتا ہے[۱۶]۔

دیباچہ کی عبارت:-

"بعد حمد ایزد منان اور نعت و منقبت رسول آخرالزماں کے بجد خوان و دبستان دانش و شعور مستعد بزیل رسول الثقلین محمد فخرالدین حسین نقش پرداز اس دیباچہ کا بیچ بیان سبب تالیف اس کتاب فیض نصاب کے

گذارش کرتا ہے اور بر خاطر خطیر ارباب عقل و تمیز کے پوشیدہ نہ رہے کہ بہ تحریک سلسلۂ
انجام اس کام کی بوساطت دست و قلم سیادت مرتبت نجابت منزلت سید باقر حسین
خلف رشید سید علی نقی خاں کے عمل میں آئی ۔۔۔۔۔۔
کتاب کی عبارت :۔

نامہ اسکندر بنام والدۂ خود۔

'یہ نامہ ہے بندۂ خدا پر ترسے اسکندر کی طرف سے کہ مدت اندک اور
اور زمانہ قلیل میں اہل زمین کے ساتھ بے حد ملاقات کی اور اب زمانہ ہائے دراز اور
قرنہائے بے شمار مجاورت اہل آخرت کرے گا۔ بوسے والدہ کے سوائے غربت
ہر گز اصلیت اور ملازمت اس کی سے متمتع نہ ہوگے ۔۔۔۔۔۔'

سیّد فضل علی

آپ کے اسلاف کا شمار دہلی کے قدیم باشندوں میں سے ہوتا ہے۔
شہزادوں کے درس و تدریس کا کام آپ کے بزرگوں کے سپرد تھا۔ آپ کے
برادر بزرگوار کا نام سید شاکر علی تھا۔ آپ کی یادگار صرف ایک کتاب "مفید الاجسام"
ہے۔ جس کا سن تصنیف ۱۲۵۱ھ ہے۔ کتاب کے عنوان سے ہی معلوم ہوتا
ہے کہ اس کے موضوع کا تعلق فن جراحی کے متعلق مفید معلومات کے بیان سے ہے۔

مولوی قطب الدین دہلوی

آپ مولوی محمد محی الدین اماری کے خلف رشید تھے۔ آپ کا شمار شہر
دہلی کے بڑے عالموں، محدثوں میں سے ہوتا تھا۔ آپ صاحب ارشاد و تزکیہ بھی

تھے۔ مولانا محمد اسحٰق دہلوی حضرت شاہ عبدالعزیز سے علوم ظاہری و باطنی کی
تحصیل کی۔ آپ کی یادگار حسب ذیل تصانیف ہیں۔

(۱) ظفر جلیل۔ اردو ترجمہ 'حصن حصین' مصنف قاضی القضاۃ
شمس الدین محمد جزری) مولوی صاحب نے اس کا تاریخی نام رکھا۔ اس سے
سال تالیف ۱۲۴۲ھ نکلتا ہے۔ حصن حصین درفن حدیث مشہور و معروف ہے۔
(۲) مظاہر حق۔ اردو ترجمہ و شرح مشکوٰۃ المصابیح۔ اس کا نام بھی تاریخی
ہے۔ اس سے سن ۱۸۳۸ء نکلتا ہے۔ یہ مولانا قطب الدین دہلوی کا بہت اہم
بالشان کارنامہ ہے۔ یہ ایک مبسوط کتاب ہے جو بڑی تقطیع کی چار جلدوں
میں منقسم ہے اس کے صفحات کی تعداد دو ہزار ہے۔ اردو زبان میں یہ پہلی جامع
اور مکمل حدیث شریف ہے۔ مولوی صاحب نے جابجا قدیم اسلوب کی پیروی کی ہے۔
فائدوں کے اسالیب قاعدے ہیں ہیں لیکن الفاظ کی ترتیب زیادہ صاف اور باقاعدہ
ہے۔ ہندوستان کے بہت سے مشہور اور نامی علماء آپ کے شاگرد تھے۔ مولانا
رشید احمد گنگوہی اور شاہ عبدالقادر نے بھی آپ سے علم و فیض حاصل کیا۔

سیّد ظہیر الدین حسین

ابو ظفر سراج محمد بہادر شاہ کے وزیر اعظم حکیم احسن اللہ خاں نے 'قصۂ ممتاز'
کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کا دیباچہ سید ظہیر الدین تخلص ظہیر نے
لکھا۔ قصہ کے متعلق مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں کہ "بعض صاحبان اس قصہ کی بے حد
مدح و ثنا کرتے ہیں۔ اس کی زبان کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ اس کے محاورات
و قافیوں کو بہت سراہتے ہیں۔ لیکن اس ہیچمدان کے نزدیک یہ قصہ شروع سے

آخر تک بلحاظ زبان اور بلحاظ خیالات اور کیا بلحاظ قوافی اس قابل نہیں جس کا مقابلہ فسانۂ عجائب سے کیا جاتا۔ تاہم بعض صاحبان کے اصرار پر اس قصّہ کو دیکھا گیا۔ اور کچھ انتخاب بھی بطور نمونہ پیش کیا گیا۔ ورنہ مذاقِ سلیم کو اس کی عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ضرور ناگوار ہو گی۔

" غواصان ساحر بیان و شناوران عمان بے کران اس داستان کے بحر تفکر میں غوطہ زن ہو کر گوہر مقصود کو دیں کفِ مطلوب میں لاتے ہیں۔ سخن آبدار دُر شاہوار صدف دہن بحر معدن نکال کر سامعین و شائقین کو اس طرح سناتے ہیں۔ جب دمساز سراپا گداز حال پر اختلال شہزادہ ممتاز بچشم خود معائنہ کرے....[۲۳]

خواجہ امان دہلوی

آپ کا نام خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں" غالب کے ہم جد ہیں یعنی تیسری ہی پشت میں سلسلہ مل جاتا ہے[۲۴]۔ مرزا غالب خواجہ امان کی تصنیف کے سلسلہ میں دوستوں کو اس کی خریداری کی فرمائش کرتے ہوئے۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں: میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستانِ خیال کا اردو میں ترجمہ کیا۔ میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ آپ کو پسند آئے یا اور اشخاص خرید نا چاہیں تو چھ روپے قیمت اور محصول ذمہ خریدار ہے[۲۵]"

خواجہ امان [illegible] میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خواجہ امان کی نشو و نما تعلیم و تربیت۔ دہلی میں ہوئی اور وہیں [illegible] میں اس دنیا کو خیر باد کہا۔ اردو اُن کے گھر کی زبان تھی۔ علاوہ اس کے فارسی اور ترکی اپنے والدین سے سیکھی۔

حکیم مومن خاں مومنؔ سے اُن کے خاص تعلقات تھے۔

خواجہ امان کا تعلق ریاست الور سے تھا۔ راجہ شیو دان سنگھ بہادر کے حکم سے "بوستانِ خیال" کی پندرہ جلدوں کے ترجمہ کرنے کا قصد کیا۔ بوستانِ خیال" کے مصنف میر تقی گجرات کے باشندے تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں انہوں نے دہلی کا سفر کیا۔ اس زمانہ میں داستانِ امیر حمزہ کے چرچے تھے۔ صاحب موصوف نے اس کے جواب میں بوستانِ خیال" کی تصنیف کی۔ چونکہ امیر حمزہ تاریخ اسلام کے ایک مایہ ناز کردار تھے اس لئے بوستانِ خیال کے مصنف نے بھی حضرت امام جعفر صادق کی اولاد میں سے شہزادہ معزالدین ابو تمیم کو اپنی داستان کا ہیرو چنا۔ مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ خواجہ امان پندرہ جلدوں میں سے صرف پانچ جلدوں کا ترجمہ کر سکے۔ باقی کے لئے عمر فانی نے وفا نہ کی[۲۶]۔ لیکن مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں کہ خواجہ امان مرحوم کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے بوستانِ خیال کی سات جلدوں کا ترجمہ کیا۔ تاریخ یا تذکروں سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امان نے اس ترجمہ کے کام کو کب شروع کیا لیکن مولوی صاحب کا خیال ہے کہ غدر سے پہلے انہوں نے یہ کام شروع کیا ہوگا۔ مترجم نے دو باتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ ایک یہ کہ محاورہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور بے کم و کاست فارسی عبارات ترجمہ میں آ گئی ہے۔

" بوستانِ خیال" کی پہلی جلد کا ترجمہ [illegible] " حدائق الانظار" کے نام سے اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ دوسری جلد کا ترجمہ" ریاض الابصار" مطبع مرزائی دہلی سے نکلا اور [illegible] تک پانچ جلدیں شائع ہوئیں۔ چھٹی جلد بھی جلد ہی شائع ہوئی لیکن ساتویں جلد کا مسودہ چوری ہو جانے کی وجہ سے خواجہ صاحب کو

پھر نئے سرے سے ترجمہ کرنا پڑا۔ ترجمہ پر نظرثانی بھی نہیں کی تھی کہ انتقال کر گئے۔ ان کے فرزند خواجہ قمرالدین نے [illegible] میں اس پر نظرثانی کی اور آٹھویں جلد کو بھی مکمل کیا۔ منشی نول کشور نے خواجہ امان کے انتقال کے بعد ان کے ورثا سے "بوستانِ خیال" کی جلدوں کا حقِ ترجمہ خریدنا چاہا لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ منشی جی نے دوسرے اصحاب سے ان جلدوں کا ترجمہ کرایا لیکن خواجہ امان کے ترجمہ کے مقابل میں قابلِ اعتبار نہیں۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا نے خواجہ صاحب کے اُن اصولوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو خواجہ امان کی رائے میں ایک افسانہ نگار کو افسانہ لکھتے وقت پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

خواجہ امان نے تمہید میں مقفیٰ عبارت لکھی ہے اور عربی فارسی سے کام لیا ہے۔ عبارت میں فارسی الفاظ زیادہ ہیں مگر وہی جو اس زمانہ کے انشا پرداز استعمال کرتے ہیں۔ عبارت اور ترجمہ دونوں کسی قدر صاف و پاکیزہ ہیں موقعہ بموقعہ برجستہ الفاظ بھی ادا کئے گئے ہیں۔ بیشک اس زمانہ کے لحاظ سے کہیں کہیں "میرے قیاس میں نہیں آنے کا" جیسے فقرے آگئے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ایسی شگفتہ عبارت لکھنے والے موجود تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے آپ کی انشا کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے۔

"ساری عبارت میں کہیں وہ رنگ نہیں ہے جو آج کل ہماری اردو پر چھایا ہوا ہے۔ نہ تو اس میں الفاظ جو جس نے "جس کو" "تو" وغیرہ کی بھرمار ہے اور نہ عبارت میں کوئی اُلجھن اور پیچیدگی ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔ کاش کوئی اپنی اردو درست کرنے کے بجائے "بوستانِ خیال" جیسی کتاب کو پڑھے۔ اگر اور کچھ حاصل نہ ہوگا تو کم سے کم یہ تو سمجھ میں آجائیگا کہ

اردو کیا ہے[25]

مولوی ضیاءالدین

آپ شیخ غلام حسن خاں جاگیردار رسیدپور دادا پور کے بیٹے تھے۔ اپنے وطن کو ترک کر کے دہلی میں رہائش اختیار کی۔ مدرسہ تعلیم المعلمین (نارمل اسکول) میں مدرس مقرر ہوئے۔ علم طبیعات (فزکس) سے خاص دلچسپی تھی۔ میجر فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات پنجاب کی فرمائش پر علم طبیعات کے متعلق ایک کتاب "مخزن الطبیعات" مرتب کی جس کے دو حصے ہیں۔ یہ کتاب [illegible] میں لاہور سے طبع ہوئی۔ اُس کی عبارت کا نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

"ارباب بصیرت پر ظاہر ہو کہ جن اجسام میں کششِ اتصال اس قدر کم ہے کہ ان کے اجزا بغیر محسوس ہونے مزاحمت کے متحرک ہو سکتے ہیں ان کو سیال کہتے ہیں۔ اجسام سخت اور اجسام سیال میں بڑا فرق یہی ہے کہ اجسام سخت کے اجزا کو اتصال متصل اور پیوستہ رکھتی ہے"[26]

ظہیر دہلوی

مصنف "میرامن سے عبدالحق تک" کے سوا کسی اور مورخ اردو ادب نے آپ کا ذکر نہیں کیا۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کے سانحہ سے متاثر ہو کر ایک کتاب نثر میں لکھی جس کا نام "داستانِ غدر" ہے۔ علاوہ اس کے "شہر آشوب" (نظم اور غزل کی صورت میں) بھی آپ کی یادگار ہے۔ آپ استاد ذوق دہلوی کے شاگرد تھے اور اسی نسبت سے شاہ ابوالمظفر آخری تاجدارِ مغلیہ سے بھی

آپ کو شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:۔ "اُن کی (ظہیر دہلوی کی) نثر اُن کی شاعری سے زیادہ جاندار ہے۔ ظہیر کی اس نثری کتاب کے عنوان سے ہمیں مغالطہ ہو سکتا ہے کہ یہ صرف غدر کی داستان ہے۔ لیکن اُن کے درج ذیل الفاظ سے اس کی صراحت ہو گی کہ اس کتاب کی حیثیت تاریخی اور سوانحی ہے:۔

...... اور تمامی سرگذشت بطورِ سوانح عمری روزِ ولادت سے تا بہ زمانہ تحریر صحت راست راست بلا کم و کاست...... قلمبند داشتہ تحریر میں لائے۔

(داستانِ غدر۔ مطبع کریمی)

۱۸۵۷ء کا حادثہ نہ صرف سیاسی لحاظ سے اہم ہے بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی کچھ کم نہیں کیونکہ اسی سال قدیم و جدید خیالات و رجحانات ایک دوسرے سے منہ موڑ کر اپنے راستوں کو پہچان لیتے ہیں۔ ادب برائے زندگی کا رجحان پہلی مرتبہ اُردو والوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور ناول و سوانح کا آغاز بھی ہوا۔ اسی طرح اُردو زبان میں آپ بیتیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ اُردو میں غالب کے خطوط اگرچہ کہ آپ بیتی کے مواد کے حامل ہیں تاہم غالب کا مقصد آپ بیتی نہیں بلکہ مکتوب نگاری تھا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اُردو کی اوّلین بے قاعدہ اور باقاعدہ آپ بیتیاں ۱۸۵۷ء کے عہد ہی میں تصنیف ہوئیں۔

ہمارے زمانہ میں فنِ آپ بیتی میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں چونکہ مصنف کے پیشِ نظر آپ بیتی کا کوئی نمونہ نہ تھا اور اُس گیرودار کے عالم میں احتساب کا خوف یقینی اور بدیہی بات تھی۔ تاہم اس تمیاتِ صغریٰ کے تجربات اور حوادث کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اُن کو سینے ہی میں محفوظ

رکھنا انسان کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ غم جب زیادہ ہو جاتا ہے تو انسان کسی نہ کسی شکل میں اُس کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اِس وجہ سے اِس زمانہ میں کئی لوگ ایسے تھے جو چھپ چھپا کر روزنامچے لکھتے رہے یا ان حوادث کو دوسرے تجربات میں جذب کر لیا اور پھر موقع ملنے پر دوسری صورتوں میں ظاہر کیا۔ مثلاً نذیر احمد دہلوی کا ناول "ابن الوقت" بھی اسی قسم کی پردہ داری کی ایک مثال ہے۔ غالب کی شاعری کے بعض اجزا، حالی کی مسدس کا اندرونی جذبہ مسبّب اسی حادثہ کے مظاہر خارجی ہیں۔ ان ہی حالات میں ظہیر کی کتاب "داستانِ غدر" (وقائع) لکھی گئی۔[1] ظہیر دہلوی کی یہ تصنیف صرف غدر کے واقعات پر ہی حاوی نہیں ہے بلکہ اس میں اُن کی آپ بیتی بھی ہے۔ لیکن واقعاتِ غدر کی مکمل روداد نہیں۔ تاہم یہ داستانِ غدر بھی ہے اور آپ بیتی بھی۔ جیسا کہ اُردو کی اولین...... آپ بیتی نہ بھی کہا جائے تب بھی اِس کو چند اوّلین آپ بیتیوں میں ضرور شامل کیا جا سکتا ہے۔[2]

مصنف لکھتے ہیں کہ اس میں آپ بیتی کا حصہ حقیقت نگاری کے لحاظ سے جیسا کچھ بھی ہو اس میں مجلسی روابط اور سماجی احوال کی بڑی معلومات افزا اور سبق آموز داستان ملتی ہے۔ خصوصاً دہلی اور قلعۂ معلیٰ کی معاشرت کے دلچسپ نقشے نظر سے گذرتے ہیں۔ اسلامی دور میں ابتدائی تعلیم و تربیت کے طریقوں، ایک طالبِ علم کے لئے عمدہ اور ضروری پابندیاں اور ان میں تہذیبی اور دینی رسوم کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ ظہیر کے ماں باپ انہیں چار سال کی عمر میں روزہ رکھواتے ہیں۔ اور پھر ان کے پہلے روزہ کے افطار کی رسم منائی جاتی ہے۔ اسی طرح مکتب میں

اُن کا داخل ہونا، قرآن مجید پڑھنا، سعدی کا پندنامہ اور گلستان و بوستان
کی تعلیم کا ذکر، بارہ سال کی عمر میں رسمی تعلیم کو ختم کرکے شعر گوئی کی ابتدا کرنا،
والد کا شعر گوئی سے منع کرنا مگر شہر میں شاعروں کی کثرت، شاہ نصیر کے
مکان پر خصوصی مشاعرے، دہلی کے اکابر شعرا مثلاً غالب، آزردہ، شیفتہ وغیرہ
کا ذکر اور غدر کے بعد ان ادبی مجالس کے درہم برہم ہونے کے تذکرہ کو بڑے
دردناک پیرائے میں لکھا ہے۔ علاوہ ہیں کے اس زمانہ کی شہری زندگی کے
متعلق بھی اچھا خاصا مواد ملتا ہے۔ گویا ظہیر نے آپ بیتی کے نام سے تہذیب دہلی
کی سرگزشت لکھ ڈالی ہے۔ ظہیر نے اپنے بچپن اور لڑکپن کی تفریحات اور کھیلوں
کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر اس آپ بیتی میں سب سے زیادہ دلچسپ اور پُراز معلومات
شاعروں اور ادبی تفریحوں کے متعلق ہے اور اس سے اُس زمانہ کے ذوق
و میلان پر تیز روشنی پڑتی ہے ۔

غدر کے الم انگیز واقعات جس طرح دہلی کی تاریخ میں اہم اور انقلابی
ہیں اسی طرح اُن کی زندگی میں بھی انقلابات کا باعث بنے جس کی وجہ سے
انہیں دہلی چھوڑنا پڑا اور در در کی خاک چھاننی پڑی۔ ظہیر کو سب سے زیادہ رنج
دو باتوں سے ہوا۔ اوّل تو مظلوم بادشاہ بہادر شاہ کی مجبوری و بے کسی،
دوسرا دہلی کے اہلِ کمال کا بیدردی سے قتل کیا جانا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ ظہیر کی یہ آپ بیتی کوئی مکمل و مفصل آپ بیتی
نہیں تاہم آپ بیتی لکھنے کے لئے جس دل و دماغ اور قلم کی ضرورت تھی وہ سب
قدرت کی طرف سے ظہیر کو عطا ہوا تھا۔ ظہیر کو بیانیہ نگاری پر بھی اچھی خاصی قدرت
تھی۔ وہ جزئیات کے حسنِ ترتیب سے عمدہ مرقع بنا لیتے ہیں اور ایک اچھے

فنکار کی طرح انہیں یہ فن بھی آتا ہے کہ آپ بیتی کو دلکش اور خیال انگیز کہانی
کس طرح بنایا جاسکتا ہے اور کہیں کہیں تو انہوں نے ایک ایک فقرہ سے
اشخاصِ متعلقہ کی ذہنی حالتوں کی تصویریں بڑی عمدگی سے کھینچی ہیں۔ مثلاً
خون آشام ساندڑس کا انسان تو انسان بے زبان حیوانوں سے بھی ناخوش
ہونا وغیرہ وغیرہ۔[29]

مولوی کریم الدّین

مولوی صاحب شاہجہاں آباد (دہلی) میں پیدا ہوئے اور اپنی
اہم تصنیف "طبقات الشوائے ہند" سے کافی شہرت حاصل کرلی۔ یہ کتاب
انہوں نے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں مکمل کی۔ ڈاکٹر فیلن نے ایک انگریزی اردو لغت تحریر
کی ہے۔ اس میں بھی انہوں نے بڑی مدد کی۔ اس تذکرہ میں انہوں نے ۴۴۹ شاعروں
کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں کہ: " فضول باتیں
بہت کم ہیں۔ زیادہ تر مفصل اور مفید حالات درج ہیں۔ اس تذکرے کے
دیباچہ میں اردو زبان کی مفصل تاریخ بھی بیان کی گئی ہے اور حتی الامکان
پوری تحقیقات کو مدِ نظر رکھا ہے۔ جس قدر کتابیں اب میسر آگئی ہیں اُس
وقت اِن اصحاب کی دسترس سے باہر تھیں۔ لہٰذا اردو زبان کی مفصل تاریخ
ان کے بس کی بات نہ تھی۔" تنہا صاحب کا خیال یہ ہے کہ "پروفیسر آزاد نے
ضرور اس تذکرہ کو دیکھا ہوگا۔ پس جو کچھ آبِ حیات میں انہوں نے اردو کی
تاریخ بیان کی ہے اسے اِس تذکرہ کی بیان کردہ مفصل تاریخ اردو سے کچھ
زیادہ ہی سمجھنی چاہیے ...." انہوں نے "موضح اللسان" حصہ اوّل بھی
۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں تحریر فرمائی۔

پانچواں باب

سرسید اُن کے رُفقاء و معاصرین

۱- سرسید
۲- آزاد
۳- نذیر احمد
۴- حالی
۵- شبلی
۶- ذکاء اللہ
۷- سید احمد
۸- ناصر نذیر فراق
۹- ناصر علی
۱۰- میر بشارت علی۔

۱- سرسید کے تصنیفی رجحانات کا ارتقاء اور ناتمام تحقیقی کوشش۔

۲- سرسید کا اثر اُردو ادب پر

۱- سرسید سے پہلے کا اُردو ادب۔
۲- سرسید کی چند اہم دینی تصانیف
۳- سرسید کو تاریخ سے دلچسپی
۴- سیرت و سوانح سے متعلق اُن کی رائے۔
۵- سرسید اور ڈرامہ
۶- سرسید اور تنقید
۷- سرسید کی صحیفہ نگاری
۸- سرسید کی مضمون نگاری
۹- سرسید کا اسلوب
۱۰- سرسید کی نثر

سر سیّد احمد خاں

سر سیّد کے تصنیفی رُجحانات کا ارتقاء

سر سید کے پہلے اور ثقہ سوانح نگار مولانا حالیؔ نے اپنی تصنیف حیات جاوید میں سر سید کی ادبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:۔

(۱) ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک (۲) ۱۸۵۷ء سے سفر انگلستان ۱۸۶۹ء تک اور (۳) سفر انگلستان سے وفات ۱۸۹۸ء تک۔

سیّد صاحب کی تصنیفی زندگی کے پہلے دَور کو بھی ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔[1] کیونکہ اس میں بھی دو الگ الگ رنگ صاف نظر آرہے ہیں۔ دَورِ اوّل کے پہلے حصّہ میں سر سیّد قدیم اور روایتی رنگ میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور دوسرے حصّہ میں انگریزوں سے میل جول کی بناء پر مغربی طرز کی زندگی اور جدید خیالات کا اُن پر کچھ نہ کچھ اثر دکھائی دیتا ہے۔ مگر ابھی یہ اثر سطحی اور ہلکا ہے۔

سر سیّد کو ریاضی اور تصوّف کا مذاق اپنے خاندان سے ورثہ میں ملا تھا تاریخ نگاری کا ذوق بھی ایک لحاظ سے قدیم ماحول کا عطا کیا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ عہدِ مغلیہ میں متعلقین دربار کا ایک عام فن تھا ان کے علاوہ ان کی تصنیفی زندگی کے دَورِ اوّل میں ان کی تحریروں میں مناظرہ و تقابل مذاہب کا رُجحان بھی پایا جاتا ہے۔ جو حقیقت میں اس صدی کا محبوب شغلہ تھا۔ جس کی عیسائی مشنریوں اور غیر ملکی فرمانرواؤں نے بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس عام

فضا کے زیر اثر اس دَور میں سر سیّد نے بھی اس قسم کی بحثوں میں نمایاں حصّہ لیا۔ ان نزاعات میں سر سیّد صاحب کو حضرت سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تعلیمات سے خاص شغف تھا۔ دورانِ ملازمت میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی تصنیفی سرگرمیوں سے واقف ہونے کے بعد انہیں تاریخی تحقیق و تدقیق سے بیش از بیش دلچسپی پیدا ہوگی۔ تدوین (ایڈیٹنگ) اور ترتیب کا وہ ڈھنگ سیکھا جو آئینِ اکبری اور تزکِ جہانگیری میں نظر آتا ہے۔ اس دَور میں سر سیّد کا نقطۂ نظر علمی اور خالصتاً دینی تھا۔ زندگی کی مادّی قدروں کی پوری اہمیت ابھی ان پر منکشف نہ ہوئی تھی۔ وہ مسائلِ حاضرہ کی بجائے تاریخ کی طرف متوجہ اور مجرد حقائق اور محض علمی تصورات کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں مناظرہ اور عقائد ان کی جستجو کے خاص میدان تھے۔ اگر کبھی اس کوچے سے باہر قدم رکھا بھی تو وہ آثارِ قدیمہ کی طرف متوجہ ہوئے گویا ابھی وہ اجتماعِ انسانی کے مادّی مسائل سے بہت دُور تھے۔ اُن کے اس دور کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جامِ جم (فارسی)۔ ۱۸۳۹ء کے اس رسالہ میں امیر تیمور صاحبقران سے لیکر ابو ظفر بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا مختصر حال ہے۔

۲۔ انتخاب الاخوین: ۔ یہ رسالہ اپنے بھائی کی اعانت سے لکھا اس میں قواعد منصفی بیان کئے ہیں۔ سر سیّد نے اسی زمانہ میں خود منصفی کا امتحان دیا تھا۔

۳۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب ۱۲۵۵ھ ۔ مجالس مولود میں جو رسائل پڑھے جاتے ہیں ان میں صحیح روایتیں کم ہوتی ہیں۔ سیّد صاحب نے اس کمی کو

پورا کرنے کے لئے اُس زمانہ کے خیالات کے موافق صحیح روایتوں کو جمع کر کے اسے رسالہ کی شکل دی۔

۴۔ **تحفۂ حسن** ۱۲۶۰ھ :— تحفۂ اثنا عشریہ کے باب ۱۰، ۱۲ کا اردو ترجمہ جس میں شیعہ مسلک کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۵۔ **تسہیل فی جر الثقیل** ۱۸۴۴ء :— بو علی کے ایک فارسی رسالہ 'معیار العقول' کا اردو ترجمہ جس میں جر ثقیل کے پانچ اصول بیان کئے گئے ہیں۔

۶۔ **آثار الصنادید** ۱۸۴۷ء :— اس میں انہوں نے دہلی کی عمارت کا حال لکھا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۴۷ء والے ایڈیشن کا اسلوب بیان پُر تکلف ہے۔........ دوسرے ایڈیشن میں آسان اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ جس کے متعلق ہمارے زمانہ کے جدید مورخ اس پر متفق ہیں کہ یہ ایڈیشن جدید اردو نثر کا نقطۂ آغاز ہے۔

۷۔ **فوائد الافکار فی اعمال الفرجار** :— یہ ان کے ماما کی بعض نامکمل تحریرات کا ترجمہ ہے جو انہوں نے پرکار متناسبہ کے اعمال پر لکھی تھیں۔

۸۔ **قول متین در ابطال حرکت زمین** :— یہ رسالہ زمین کی گردش کی تردید اور آسمان کی گردش کی حمایت میں لکھا ہے (یہ خیال سید صاحب نے بعد میں تبدیل کر لیا تھا اور بعد میں وہ حرکت زمین کو یقینی مانتے تھے)

۹۔ **کلمۃ الحق** ۱۸۴۹ء :— یہ رسالہ پیری مریدی کے طریقۂ مروجہ کے خلاف لکھا۔

۱۰۔ **راہِ سنت و ردِ بدعت** ۱۸۵۰ء :— یہ طریقۂ محمدیہ کی تائید میں لکھا۔ جس میں اہل تقلید کے مروجہ عقائد و رسوم کی مخالفت کی۔ اس میں

وہابی اثرات غالب نظر آتے ہیں۔

۱۱۔ **نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ** ۱۸۵۲ء (فارسی) :— تصور شیخ کی حمایت میں بعض دلائل ایک فرضی خط میں پیش کئے ہیں۔

۱۲۔ **سلسلۃ الملوک** ۱۸۵۲ء :— دہلی کے ۲۰۲ بادشاہوں کی فہرست جو پہلے "آثار الصنادید" کے دوسرے ایڈیشن کے باب اوّل کے ساتھ تھی بعد میں الگ شائع کی گئی۔

۱۳۔ **کیمیائے سعادت** :— غزالی کے چند اوراق کا اردو ترجمہ ۱۸۵۳ء

۱۴۔ **تاریخ ضلع بجنور** :— ۱۸۵۵ء میں سرسید صدر امین ہو کر دہلی سے بجنور میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وہاں انہوں نے حکم کے زیر ہدایت اپنے ماتحت ضلع کی تاریخ قلمبند کی تھی جو غدر میں تلف ہو گئی تھی۔

۱۵۔ سرسید نے اسی زمانہ میں "آئین اکبری" کی تصحیح و اشاعت کا کام شروع کیا لیکن اس کے بعد غدر کا ہنگامہ ہو گیا چنانچہ دوسری جلد بھی اس کی نذر ہو گئی۔ اب اس کی پہلی اور تیسری جلد موجود ہے۔

سرسید کی تصانیف کا دوسرا دور اپریل ۱۸۵۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی تصانیف کے مطالعہ سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے اس زمانے کی تصنیفی کاوشوں کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں کو غدر میں شرکت کے الزام سے بچانا تھا۔ اس لیے ان میں ایک خاص قسم کا معذرتی میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے زیر اثر انہوں نے ایک طرف تو ایک نئی سیاسی حکمت عملی کی بنا ڈالی اور دوسری طرف دینی نقطۂ نظر میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی چنانچہ اسی زمانہ میں انہوں نے اپنے خاص نقطۂ نظر کے ماتحت جدید علم الکلام کی بنیاد

رکھی اس علم الکلام کا اہم اصول یہ تھا کہ عیسائیوں (انگریزوں) اور مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی مصالح کی بنا پر بلکہ دینی بنیادوں پر بھی ایک دوسرے کے قریب لایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دینی نظریہ سرسید کے سیاسی پروگرام کیلئے نہایت ضروری تھا۔ ان اسباب کی بنا پر اسی پروگرام کے تحت انہوں نے مذہب کی تعبیر و توجیہ ایک نئے انداز سے کی۔ جس کا مقصد مادی اور عقلی تقاضوں کو خاص طور سے ابھارنا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں خالص "عقلی" اور "نیچرل" نقطۂ نظر ان کی تحریروں میں نمودار ہو چکا ہے۔ اگرچہ ابھی وہ اس زاویۂ نگاہ کی طرف پورے طور پر جھکے نہیں تھے اس دور کی تصانیف کی فہرست یہ ہے:

۱۔ **تاریخ سرکشی بجنور:** — سید صاحب نے بجنور میں واقعات غدر کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔ مراد آباد میں آکر انہوں نے اپنی معلومات کو ترتیب اور شائع کیا۔ اس رسالہ میں مئی ۱۸۵۷ء سے لیکر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے واقعات درج ہیں۔

۲۔ **اسباب بغاوتِ ہند:** — ۱۸۵۸ء۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس رسالہ میں بغاوتِ ہند کے اسباب سے بحث کی ہے۔ کرنل گراہم نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۳۔ **رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا:** — ۱۸۶۰ء میں جاری ہوکر ۱۸۶۱ء میں بند ہوگیا۔ یہ اخبار کی طرح کی چیز تھی۔ ان مسلمانوں کے حالات بیان کئے جاتے تھے۔ جو ابتلائے غدر میں انگریزوں کے طرفدار رہے۔ یہ پرچہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔

۴۔ **تحقیق لفظ نصاریٰ:** — اسی زمانہ میں سید صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ حکومت لفظ 'نصاریٰ' کے استعمال کو بغاوت کا مترادف سمجھتی ہے اور ان مسلمانوں کو جو اپنی تحریروں میں اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں سزائیں دے رہی ہے تو انہوں نے انگریزوں کی غلط فہمی رفع کرنے کے لئے قرآن و حدیث اور لغت کی روشنی میں اس لفظ کی تشریح کی اور بتایا کہ اس کا استعمال اصولاً کسی جذبۂ نفرت یا شائبہ مخالف کا حامل نہیں۔

۵۔ **تاریخ فیروز شاہی:** — مصنفہ ضیاء برنی، یہ کتاب سلاطین ہند کی مستند تاریخ ہے۔ مصنف سلطان محمد تغلق اور فیروز شاہ کا معاصر تھا۔ سید صاحب نے اس کو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فرمائش پر ایڈیٹ کیا۔ اس کے شروع میں ایک دیباچہ لکھ کر شائع کیا۔

۶۔ **تبیین الکلام:** — یہ کتاب مراد آباد میں شروع ہوئی اور غازی پور میں تکمیل تک پہنچی۔ اس میں انجیل اور قرآن مجید کی اصولی وحدت ثابت کی گئی ہے اور جہاں دونوں میں اختلافات نظر آتے ہیں وہاں ان میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۷۔ **علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ:** — سید صاحب نے غازی پور کے قیام کے دوران میں 'سائنٹفک سوسائٹی' قائم کی تھی اس کے زیر اہتمام تراجم کا کام بہت سرگرمی سے ہوا۔ ۱۸۶۶ء میں سید صاحب نے علی گڑھ سے ایک اخبار نکالا جس کا نام 'سائنٹفک سوسائٹی اخبار' رکھا۔ جس کے وہ خود ایڈیٹر تھے بعد میں اسی اخبار کا نام 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' رکھا تھا۔ اس میں شروع شروع میں سیاسی مضامین لکھے جاتے تھے جن کا مقصد انگریزوں

اور ہندوستانیوں کو متحد کرنا تھا۔

۸۔ رسالۂ احکام طعام اہل کتاب ۱۸۶۸ء :- اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔

تیسرے دور میں اُن کے مصلحانہ خیالات میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ اُن کی طبیعت میں ایک طرح کا..... آشفتہ نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے ان کے لہجے میں نرمی اور ملائمت تھی۔ اب وہ اظہارِ خیال میں نڈر اور بے باک معلوم ہوتے ہیں اور پبلک کی مخالفت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ سرسید کی زندگی کا ایک دور وہ تھا جس میں وہ تصوّرِ شیخ کے دقیق اور نازک خیالات میں گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ مگر اس نئے دور میں انہیں معراجِ رسولؐ کا جسمانی امکان بھی ناممکن معلوم ہونے لگا۔ تب تو وہ وہابیت اور حنفیت کی نظریاتی اُلجھنوں میں پھنسے ہوئے تھے مگر اب دین و مذہب کی ناقابلِ تغیر جزئیات کے اثبات کے لئے بھی عقل و فکر کی سند کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سیاسی اور تعلیمی مسائل میں بھی اُن کا نقطۂ نظر اب وہ نہ رہا جو پہلے تھا۔ اُن کے ذہن پر جدید اندازِ فکر نے غلبہ پا لیا یہ اُن کی فکری زندگی کا وہ اہم دور ہے جس کے رجحانات اس دور کی جملہ تصانیف میں موجود ہیں۔ اس دور کی تصانیف یہ ہیں :-

۱۔ سفرنامۂ لندن :- انگلستان سے واپس آ کر سیّد صاحب نے اپنے سفرِ انگلستان کے مشاہدات و تاثرات قلمبند کرنے شروع کئے تھے۔ اس کی کچھ اقساط سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئیں مگر پبلک کی مخالفت کی وجہ سے

اس سلسلہ کو بہت جلد بند کرنا پڑا۔

۲۔ خطباتِ احمدیہ :- یہ سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے اعتراضات کا جواب ہے۔ اس میں حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کو ہر عیب سے مبرّا قرار دیا ہے۔ ان خطبات میں سیّد صاحب نے اپنی تحقیق و جستجو کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ پوری کتاب بارہ خطبات پر مشتمل ہے۔

۳۔ تہذیب الاخلاق :- یہ پرچہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہونا شروع ہوا اور تین دفعہ نئی زندگی پائی۔ اس میں سرسید صاحب کے علاوہ اُن کے بیشتر رفقا مضمون لکھا کرتے تھے۔ سرسید کے مضامین قومی دکان ایڈیشن کی دو بڑی جلدوں میں ہیں۔ ان کے علاوہ آخری مضامین الگ شائع ہوئے۔

۴۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو :- ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے 'OUR INDIAN MUSSALMANS' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمان مذہباً و سیاستاً انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہیں اور انگریزی حکومت کو ان سے کسی حالت میں اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اس خیال سے کہ مسلمان اور انگریزوں کے تعلقات پہلے ہی سے خوشگوار نہیں سرسید کو یہ خیال گذرا کہ اس کتاب سے اُن کے مزید ناخوشگوار ہونے کا ڈر ہے۔ اس وجہ سے اُنہوں نے اس کتاب پر سخت نکتہ چینی کی۔ اور ہنٹر کی خیال آرائی کی بدلائل تردید کی۔ یہ ریویو پہلے پاینیر میں چھپا پھر اُردو میں ترجمہ ہو کر سوسائٹی اخبار کی ۲۴ نومبر ۱۸۷۱ء سے ۲۳ فروری ۱۸۷۲ء تک کی چودہ اشاعتوں میں شائع ہوا۔

ناتمام تصنیفی کوششیں :- اس باب میں مولوی عبدالحق اپنی تصنیف

سرسید احمد خاںؒ میں لکھتے ہیں کہ سائنٹیفک سوسائٹی جس کے روح رواں سرسیّد تھے اس کا ایک اہم مقصد علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ تھا۔ چنانچہ اس کے تحت ۴۰ علمی اور تاریخی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ اس سلسلہ میں دو کتابوں کی تالیف کا ذمہ خود سرسیّد نے لیا تھا۔ ان میں ایک، اُردو نظم و نثر کی تمام مطبوعہ کتابوں کی فہرست (بطور مواد تاریخ زبان اُردو) کی ترتیب تھی جس میں امور ذیل کی صراحت مدنظر تھی۔

نام کتاب، نام مصنف مع مختصر حال، زمانہ تصنیف، کچھ عبارت بطور نمونہ طرز بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ (مگر سرسیّد کو اس فہرست کی ترتیب میں فرصت نہ ملی) اس فہرست کے علاوہ ایک اُردو لغات کی تدوین بھی سرسیّد کے پیش نظر تھی۔ انہوں نے اس کے چند ورق بطور نمونہ لکھا کر علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپ بھی دیئے تھے مگر دوسری مصروفیات نے انہیں اس کام کی طرف متوجہ ہونے نہ دیا۔ اس لغات کے لئے سیّد صاحب نے مخففات کی جو فہرست تیار کی تھی وہ یہ ہے۔

اسم = س	ظرف مکان = ظ م
مذکر = م	ظرف زمان = ظ ز

اس لغات کے متعلق سروری صاحب کی یہ رائے ہے کہ اس میں ایک خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس میں لفظوں کے اشتقاق اور اصل سے بحث نہیں کی گئی یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ کوئی خاص لفظ کس زبان کا ہے اور اصل زبان میں اس کی صورت کیا ہے۔

سرسیّد کی مذکورۂ بالا تصانیف کے تذکرہ کے بعد اب ہم اُردو ادب پر اُن کے اثرات کا ذکر کریں گے۔

سرسیّد کا اثر اردو ادب پر

سرسیّد کے ادبی ورثہ کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے اُن سے پہلے کے اُردو ادب کا جائزہ ناگزیر ہے۔

سرسیّد کے زمانہ سے پہلے (شاعری کو چھوڑ کر) اُردو ادبیات کا دائرہ مذہب، تصوّف، تاریخ اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا۔ علوم طبعی کا مذاق بہت کم تھا اور ریاضیات اور فنون کی طرف توجہ کرنے والے بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مذہبیات میں عموماً منقولات اور روایات سے مواد حاصل کیا جاتا تھا اور مذہب کی اُن قدروں پر خاص زور دیا جاتا تھا جو زندگی کے اجتماعی اور مادی پہلوؤں سے دور لے جانے والی ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی دینی تحریک میں اقتصاد (معاش) اور اقتراب (معاد قرب اللہ) کے عناصر کا حیات بخش اجتماع پایا جاتا ہے مگر اس تحریک کی ترقی بہت مدھم اور اس کی رفتار بہت سست تھی۔ تاریخ میں سرسری واقعہ نگاری ہی کو مؤرخانہ کمال سمجھا جاتا تھا اور اجتماع انسانی کی تنظیم و تربیت کے اصول علی العموم مدنظر نہ رکھے جاتے تھے۔ تصوّف جو عمل اور فکر دونوں سے عبارت ہے اپنی ساری اثباتیت کھو چکا تھا اور اس کے یہ دونوں پہلو منفیت، مجہولیت اور انفعالیت کے کارندے اور ہتھیار بن گئے تھے۔ اُردو میں اور اس سے پہلے فارسی میں تذکرہ نگاری کا بڑا چرچا رہا اور بعض کامیاب تذکرے بھی لکھے گئے مگر اکثر تذکرے تنقیدی اور علمی بلندیوں تک پہنچنے سے قاصر رہے اور جہاں تک اُردو کی ادبی نثر کا تعلق ہے وہ ابھی ارتقاء کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی اور اظہار و بیان کی

اُن سہولتوں کی تلاش میں تھی جن کے طفیل وہ زندگی کے حقائق اور کائنات کے مسائل کی ترجمان بن سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج کی سلیس نثر، دہلی کالج کی علمی نثر اور مرزا غالب کی شخصی کوششوں کو جو مکاتب کی شکل میں ملتی ہے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر ان سب کارناموں کا دائرہ اثر محدود اور دامن تنگ تھا۔ اردو ادب (خصوصاً) نثر کے اس جائزے کے بعد اس علمی اور ادبی سرمائے پر نظر ڈالئے جو خاص سرسیّد کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ سرسید کی تصانیف کی فہرست کو دیکھئے ان میں عنوانوں اور موضوعوں کا کتنا تنوع ہے اور صرف تنوع ہی نہیں فکر کا انداز کتنا انوکھا اور نیا ہے۔ اور ان دونوں باتوں کے باوجود بیان کا طریقہ اپنے پچھلے دور سے کتنا مختلف ہے غرض اس ادبی سرمائے کو دیکھ کر فی الفور یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ الگ دور کا ادبی سرمایہ ہے۔

سرسیّد ہی وہ پہلے مفکر و ادیب ہیں جنہوں نے فکر و ادب کی روایتی اور تقلیدی دنیا سے الگ ایک نئی ادبی دنیا تخلیق کی جس کے عناصر اربعہ مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری ہیں یہی وہ نمایاں اور اہم رجحانات ہیں جو ادب اردو میں سرسیّد کا فیض خاص سمجھے جاتے ہیں۔ جدید تقاضوں کے کچھ معنوی ردعمل سے قطع نظر یہی رجحانات آج تک اردو ادب کے رگ و پے میں جاری و ساری ہیں۔ ہمارے عہد کی ترقی پسند تحریک اپنی اساس کے لحاظ سے انہیں رجحانات کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

سرسیّد نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اپنے زمانے کے مصنفوں اور ادیبوں کو فکری اور تنقیدی خیالات دئے۔ جن سے سرسیّد کے رفقائے خاص

ان سے اکثر باتوں میں ہم خیال ہیں۔ شبلی، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، چراغ علی محسن الملک ان کے ہم کار اور رفیقِ سفر تھے۔ ان کی تحریروں میں سرسیّد کے افکار و خیالات کے نقوش قدرتی طور سے زیادہ ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکثر کے یہاں مزاج اور فکر کی انفرادیت بھی ملتی ہے جن کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ اردو ادب کے ان جلیل القدر راہنماؤں کے نقشِ قدم پر چلنے والے بیشمار مصنفوں اور ادیبوں کے یہاں سرسیّد کے مکتبِ فکر کے واضح اثرات مل جاتے ہیں جنکے اجتماعی عمل کو آسانی کی خاطر علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد رکھتے ہیں جو نہ صرف ایک علمی یا سیاسی تحریک تھی بلکہ ایک حیثیت سے فکری، تہذیبی، علمی اور ادبی مکتب اور علمی دبستان ہے۔ جس سے متاثر اور وابستہ ادیبوں کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر نام یہ ہیں۔

مولانا وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک، مولانا عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر مولوی عنایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا طفیل احمد منگلوری، مولانا ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عزیز مرزا، پروفیسر رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریاآبادی، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر سر رضا علی، حکیم احمد شجاع، ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، قاضی تلمذ حسین، الیاس برنی وغیرہ۔

یہ فہرست مکمل نہیں اور اس میں اضافہ ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اس فہرست میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جن کو علی گڑھ کی مخالف تحریکوں سے متعلق بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی جو سرسیّد سے زیادہ شبلی کے مسلکِ فکر سے وابستہ ہیں مگر جب خود شبلی کی تمام سنجیدہ اور

باقاعدہ علمی سرگرمیوں کا مرکز ومنبع علی گڈھ ہے تو پھر شبلی والوں کو بالواسطہ علی گڈھ سے اثر پذیر اشخاص میں شامل رکھنے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں شبلی کے علمی کارناموں کو سرسید کے احسانات سے بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کے اس خیال سے کلیۃً اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ ہم شبلی کو علی گڈھ تحریک کا رکن خاص سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے تلامذہ بلکہ ان کے دار المصنفین کو بھی اسی دریا کی ایک موج قرار دیتے ہیں۔ اردو ادب پر سرسید کے اثرات کی نشاندہی ہم مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کرتے ہیں۔

دینی: درج ذیل مذہبی اور دینی تصانیف کا تجزیہ سرسید کے دینی رجحانات اور نظریات کے سمجھنے معاون ثابت ہوگا۔

خطبات احمدیہ

سرسید کی تمام تصانیف میں سے خطبات کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس تصنیف کی تحریک کا سرچشمہ ان کی عقیدت رسول اور بے پناہ جذبہ محبت ہے۔ اس کتاب سے سرسید کی کوئی ذاتی یا سیاسی غرض وابستہ نہیں کی جا سکتی اس میں سر ولیم میور کے ان اعتراضات کا جواب ہے جو انہوں نے اپنی کتاب LIFE OF MOHAMMAD میں آنحضرتؐ پر کئے تھے۔ سرسید نے یہ کتاب انگلستان میں بیٹھ کر لکھی اس کی تصنیف کے لئے انہوں نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل ان کے اس خطوط سے معلوم ہوگی جنھیں انہوں نے لندن سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب اس زمانہ میں تصنیف ہوئی جب سر ولیم میور صوبے کے

حاکم اعلیٰ تھے۔ اس حاکم کا خوف کسی طرح مانع نہیں آیا۔ خطبات کی تالیف میں صرف خدمت علم کا مقصد کم ہے۔ غیرت اور عقیدت کی اطاعت زیادہ ہے۔ اسی حمیت اور خلوص کے سبب ہم اس کتاب کو ان کی سب تصانیف میں بلند درجہ دینے پر مجبور ہیں۔

یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں سوانح (بارہ برس تک) کے علاوہ دوسرے مباحث مثلاً عرب کا جغرافیہ، انجیل کی بشارتیں، معراج وغیرہ کی حقیقت بھی موجود ہیں۔ اس میں سیرت (آنحضرتؐ کی حیات پاک) کے اصول سے عالمانہ بحث ہے۔ جدید زمانہ میں باقاعدہ طور پر شاید سب سے پہلے سرسید ہی نے سیرت کے اصول اور مبادی پر نظر ڈالی ہے۔ یہ بھی اردو میں انکی اولیات میں سے ہے۔ سرسید نے خطبات احمدیہ لکھ کر جن علمی اصولوں کی بنیاد رکھی یا جن رجحانات کو ترقی دی ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ سیرت کے مآخذ کی تنقید اور چھان بین۔
۲۔ انجیل وغیرہ سے قرآن کی صداقت کے ثبوت پیش کرنا۔
۳۔ عرب کے جغرافیائی حالات اور نسلی معلومات کی تحقیق۔
۴۔ تحقیق علمی میں مغربی مصنفوں کی کتابوں سے فائدہ اٹھانا۔
۵۔ اسلام کی تمدنی حیثیت کا مطالعہ۔

سرسید کی اس کوشش نے علم کے دائرہ میں مشرق اور مغرب کے فاصلہ کو کم کیا۔ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب پر بھی ہمدردانہ نظر ڈالنے کی دعوت دی اور حقائق تک پہنچنے کیلئے عقل اور مشاہدہ کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی۔ خطبات میں روایات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ عقل و دلائل سے زیادہ۔

حدیث و قرآن کی سند لاتے ہیں۔

سرسید کا طریق بحث اس کتاب میں بھی مناظرہ نہیں، حق پسندانہ ہے۔ نیچر سے دلچسپی کے آثار اس کتاب میں بھی کافی ہیں۔ دین کے تعقلی اصولوں پر بھی بحث و تبصرہ کیا گیا ہے[۳۵]

تبیین الکلام

اس کے ذریعے انہوں نے تقابلِ مذاہب کی منصفانہ اور حق پسندانہ تحریک کی بنا ڈالی۔ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں پر معترضانہ نظر ڈالنے کے مروجہ طریقہ کو یکسر بدل دیا اور بتایا کہ تمام مذہبی کتابیں اصولی لحاظ سے ایک ہی سرچشمۂ فیض سے جاری ہوئی ہیں۔

ہجری اور عیسوی سنوں اور مہینوں کے درمیان مطابقت دکھا کر ایک ضمیمہ میں اُن کی تقویم پیش کی ہے۔ ان سب کوششوں سے سرسید کے ذہن کی دشوار پسندی اور خارا شگافی کے ثبوت ملتے ہیں۔

ان کی دوسری تصانیف کی طرح اس تصنیف میں بھی وہی فکری روح کارفرما ہے۔ البتہ اس میں وسیع مشربی اور وسیع الخیالی کی لہر کچھ زیادہ تیز ہے۔ اس میں احول سے مصالحت کا جذبہ بھی کچھ زیادہ کارفرما ہے اور عقل و فطرت پر اعتماد بھی زیادہ۔

تبیین الکلام کی علمی اہمیت یہ ہے کہ اسکے ذریعہ قدیم جغرافیہ و تاریخ کے مطالعہ کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ بائبل کے اشخاص اور مقامات کی چھان بین کا یہ فائدہ ہوا کہ قرآن مجید کے مقامات کی چھان بین کی طرف بھی توجہ ہوئی ہے۔

چنانچہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "ارض القرآن" اسی تحریک کی مرہونِ منت ہے۔ سید نواب علی کی کتاب "صحف سماوی" اور ندوۃ المصنفین اور اسی طرح کی چند کتابیں اسی خیال کا ردِ عمل ہیں۔

ادبی لحاظ سے تبیین الکلام کی یہ خصوصیت نظر آتی ہے کہ اس کے فقرے بہت لمبے ہیں جن میں دلیل کے طویل سلسلے بڑے منظم طریق سے باہم مربوط کر دیئے گئے ہیں۔ حروف ربط اور عطف و اتصال کے حروف شرط و استدراک کا بڑا استعمال ہے۔ اس تصنیف میں سرسید کا ذہن بڑی فکری تنظیم اور منصوبہ بندی سے چلتا ہے۔ اس میں دماغ کا عمل اور ورزش بہت زیادہ ہے[۳۶]

تفسیر القرآن

یہ سرسید کی آخری تصنیف اور اُن پختہ خیالات و رجحانات کی ترجمان ہے جو سید صاحب اپنی آخری عمر میں پہنچ کر قائم ہو گئے تھے۔

اس تفسیر میں اس جذبہ کی کارفرمائی ہے کہ دین میں صرف قرآن مجید یقینی ہے، باقی سب کچھ (حدیث، اجماع اور قیاس) اصولِ دین میں شامل نہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام کا کوئی مسئلہ عقل اور اصولِ تمدن کے خلاف نہیں۔ اس تفسیر میں سرسید نے قرآن مجید کے جغرافیائی اور تاریخی عقدوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان مسائل کو جن کے متعلق دورِ جدید کو کچھ اعتراضات تھے عقل، فطرت اور تمدن کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ سرسید نے ناسخ منسوخ، معراج جسمانی، جہاد، سود، غلامی، تعدادِ ازدواج، آدم و ابلیس کی کہانی، ملائکہ اور جنات، وفاتِ مسیح، رویتِ باری وغیرہ کے متعلق جمہور کی رائے سے اختلاف

کیا ہے۔ اس تصنیف نے آگے چل کر تحریک مطالعۂ قرآن اور عام افکارِ دینی
پر بڑا اثر ڈالا۔ یہ ایک انقلاب آفریں تصنیف ہے جس نے آئندہ کے رجحانات
کے بدلنے اور ڈھالنے میں بڑا حصہ لیا۔ سید صاحب کی دوسری کتابوں کی
طرح اس تفسیر نے دینی بحث و نظر کو روحانی سمت سے ہٹا کر عقلی سمت کی طرف
متوجہ کیا ہے اور اس رجحان کو ترقی دی ہے کہ زندگی کی مادی قدریں ہی قابلِ
اعتنا ہیں، باقی جو کچھ ہے ضمنی ہے۔

سرسید کے اس نقطۂ نظر سے اُن کے اپنے رفقا نے بھی اختلاف کیا۔
چنانچہ مولوی چراغ علی کے سوا ان کے اکثر ہم کار شبلی، محسن الملک، نذیر احمد،
مولوی سمیع اللہ وغیرہ اُن سے الگ رائے رکھتے تھے۔ سرسید کے اس نقطۂ نظر کا
قوی ترین مخالفانہ ردِ عمل علامہ اقبال کے تصورات کی صورت میں ہوا جن کی
بنیاد اس خیال پر ہے کہ حقائق کا حل اور ادراک عقل سے نہیں بلکہ وجدان اور
حاسۂ مذہبی ہی سے ممکن ہے۔

تفسیر القرآن میں انھوں نے بائبل کے بیانات سے فائدہ اٹھا کر مذاہب کے
تقابلی مطالعہ کی تحریک کو ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ جس میں شبلی،
چراغ علی، نذیر احمد اور محسن الملک نے برابر کا حصہ لیا اور اہم تصانیف یادگار
چھوڑیں۔ یہ سب سرسید کے علم الکلام سے اثر پذیر ہوئے ان میں سرسید کی
فکر سے قریب چراغ علی تھے۔ اردو میں چراغ علی کے کچھ رسالے موجود ہیں۔
تعلیقات، اسلام کی دنیوی برکتیں، قدیم قوموں کی تاریخ، بی بی ہاجرہ، ماریہ
قبطیہ، تعلیق نیاز نامہ۔ تہذیب الاخلاق کے مضمون نگار کی حیثیت سے بھی
چراغ علی اردو کے مصنفوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ چراغ علی کا نقطۂ نظر

سرسید سے کہیں زیادہ عقلی اور تمدنی ہے۔ وہ سرسید کے اُن پُرجوش حامیوں
میں سے ہیں جو اختلافی مسائل میں اپنے پیشوا سے بھی زیادہ انتہا پسند ہو جایا
کرتے ہیں۔

محسن الملک نے بھی اپنے پیر و مرشد سید صاحب کی طرح نیچر کی ہمہ گیری
پر اصرار کیا ہے۔ سرسید بعض اوقات جوش کے عالم میں اپنا مقصد بیان نہیں
کر سکتے تھے اور جذبات کی رَو میں بہہ جاتے تھے۔ ان کے بیانات کی بہترین اور
واضح تشریح محسن الملک نے کی۔ تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون "مذہب و علم"
میں انھوں نے نیچر کے متعلق سرسید کے نقطۂ نظر کی نہایت عمدہ توضیح کی ہے۔

سرسید کے عقلی افکار کے اثرات قبول کرنے والوں میں محسن الملک
کو اوّلین مقام حاصل ہے۔ یہی نہیں اگر سرسید کو عقلی تحریک کا دل کہا جائے تو
محسن الملک کو یقیناً اُن کی زبان و دماغ کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ مذہب
میں سرسید سے متاثر گروہ میں نذیر احمد اور شبلی بھی شامل ہیں۔ مگر اصولاً ان
بزرگوں کو اس رجحان کا نمائندہ کہنا چاہیے جس کا اظہار محسن الملک کی عقل
پسندانہ تحریروں میں ہوا۔

رفقائے سرسید میں ایک ایسا شخص بھی موجود جو سرسید سے متاثر ہونے
کے باوجود اُن کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی بھی ہے یعنی شبلی۔
شبلی کا درجہ عقل پسندی کی تحریک میں وہی ہے جو معتزلہ اور متکلمین
میں امام ابوالحسن الاشعری کا ہے۔ شبلی نے سرسید کی ہمہ گیر عقل پسندی کو
معتدل بنانے کی کوشش کی اور عقل و وجدان کے درمیان ایک معقول رابطہ
پیدا کرنے کی سعی کی۔ سرسید اگر امام غزالیؒ کے افکار کی تجدید تک محدود رہتے تو

ان کے اور شبلی کے درمیان فکری اختلاف کی خلیج وسیع نہ ہوتی۔ مگر ہوا یہ کہ
سرسید امام غزالیؒ سے دور ہو کر مغرب کی ارتیابی اور متشککانہ تحریکوں کے
قریب ہوتے گئے۔ واقعہ یہ ہے شبلی امام غزالیؒ کے موقف سے الگ ہو کر امام
ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سطح نظر کی طرف بڑھتے گئے۔ شبلی
کے تصورات میں ان دونوں بزرگوں کے افکار کا اجتماع ہے۔

سرسید کے دینیاتی افکار آج خود (علوم طبعی کے موقف کے بدل
جانے کی وجہ سے) اگرچہ اپنا اثر بہت کچھ کھو چکے ہیں، مگر دینی تصورات میں
عقلی تجربہ کی تحریک آج بھی جاری ہے اور اس میں سرسید کے شعوری اور
غیر شعوری اثرات آج بھی نظر آ رہے ہیں۔ بلکہ نیاز فتح پوری اور غلام احمد
پرویز وغیرہ بعض عقاید میں سرسید سے بھی کچھ قدم آگے ہیں......

سرسید کو تاریخ سے دلچسپی

سرسید کی طبیعت ان کا ذہن اور ان کی تحقیقی و تدریسی صلاحیتیں
تاریخ نگاری کے لئے موزوں تھی۔ لیکن حالات اور واقعات نے انہیں
قومی و ملکی مسائل میں مصروف رکھا۔ انہوں نے اپنے اسی شوق کی خاطر گبن کی
کتاب "زوال روما" کا ترجمہ اردو میں کرایا تھا۔ خطبات احمدیہ کے علاوہ
بائبل اور قرآن مجید کے تاریخی حصوں کی ترتیب سے ان کی اس دلچسپی کا اندازہ
ہو سکتا ہے مگر یہ بات ماننا پڑتا ہے کہ وہ تاریخ کی تعمیری اہمیت اور افادیت
پر پورا پورا یقین نہ رکھتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے اس دیباچہ سے ہوتا ہے
جو انہوں نے "المامون" شبلی کی اشاعت ثانی کے لئے اکتوبر ۱۸۸۹ء میں

لکھا۔ تاریخ کو احیائے قومی کا ذریعہ بنانے کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ
بزرگوں کے قابلِ یادگار کارناموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا
پھل دیتا ہے۔ ان کا یہ خیال روایات کے متعلق ان کے عام نقطۂ نظر کے
عین مطابق ہے۔ سرسید تاریخ نگاری میں بھی مقاصد اور جزویات وقتی کی
احتیاط کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے شبلی کو الفاروق کی تصنیف
سے روکا تھا۔ وہ جزئیات اور تفصیلات کو منظم و مرتب کرنے کا فن خوب
جانتے تھے اور ان کی فراوانی سے کبھی نہیں اکتاتے تھے۔ جس کا اظہار ان کی
اہم ترین تاریخی اور آثاری تصنیف "آثار الصنادید" میں بھی ہوا ہے جو ان کے
اولین کارناموں میں سے ہے۔

آثار الصنادید (۱۸۴۷ء)

آثار الصنادید میں دہلی اور مضافات دہلی کی عمارتوں کا مفصل
حال ہے۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ سرسید نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی
تکلیفیں اٹھائیں اور بڑی مشقتوں سے اس کے لئے مواد جمع کیا۔

سرسید جس زمانہ میں اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں مصروف
تھے مولانا امام بخش صہبائی اس زمانے میں ان کے ساتھ رہتے تھے اس وجہ سے
بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آثار الصنادید کی ترتیب میں مولانا صہبائی کا
بڑا دخل ہے۔ لیکن سرسید کی تحقیقی و تدقیقی صلاحیتیں اس امر کی متقاضی
ہیں کہ اس صورت میں بھی شریک غالب سرسید ہی تھے۔

آج جبکہ ہمارے ملک میں آثار و عمارات قدیمہ کے متعلق بہت سی

بلند پایہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر ماہرینِ فن اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے
کہ آثار الصنادید انیسویں صدی میں شہر دہلی کے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔
جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ سرسید کے معاصرین نے
اس کو انتہائی وقعت کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ اس کو مختلف زبانوں میں منتقل کرنے
کی ایک سے زیادہ کوششیں ہوئیں۔ گارساں دتاسی جس نے اس کا فرنچ
زبان میں ترجمہ کیا ہے اپنے خطبات میں اس کا ذکر بہت شاندار الفاظ میں کیا
ہے۔ افسوس ہے کہ رابرٹس، جو آثار الصنادید کی تصنیف کے وقت دہلی کے کلکٹر تھے
اس کا انگریزی ترجمہ مکمل نہ کرسکے۔ انہوں نے سرسید کے ساتھ مل کر اس کام کی ابتدا کر دی
تھی مگر مکمل نہ ہو سکی۔ اسی زمانہ میں ایڈورڈ ٹامس جو دہلی کے سیشن جج تھے اس امر کے
محرک ہوئے کہ کتاب کے پہلے ایڈیشن میں اصلاح و ترمیم کی جائے۔ چنانچہ سرسید
نے انہی کے مشورے سے دوسرا ایڈیشن تیار کیا۔ آثار الصنادید یورپ میں بہت مقبول
ہوئی۔ چنانچہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۴ء میں سرسید کو اسی کتاب کی
بنا پر اپنا اعزازی ممبر مقرر کیا۔

آثار الصنادید کے دونوں ایڈیشنوں میں زبان و بیان کا بڑا فرق نظر آتا
ہے، اس سے اردو نثر کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۴۷ء میں
اردو نثر پر سہ نثر ظہوری اور انشائے ابوالفضل کا گہرا سایہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن سات سال
بعد یعنی ۱۸۵۴ء میں ہم اسے انگریزی نثر اور انگریزی انشا پردازی کے اثرات
سے متاثر پاتے ہیں۔ اب بے ضرورت تکلف، رنگینی اور لفاظیت کی بجائے نثر میں
سادگی، سلاست اور بےساختہ پن صاف دکھائی دیتا ہے۔ غرض آثار الصنادید کی
دونوں اشاعتوں کے درمیان نثر کے اسلوب میں یکایک جو تبدیلیاں رونما ہوئیں

اُن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں گو ناگوں اندرونی اور بیرونی
اسباب کی وجہ سے اردو نثر کے قدم جلد جلد آگے بڑھ رہے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو تاریخ نگاری پر سرسید کا اثر بظاہر کچھ زیادہ معلوم نہیں
ہوتا کیونکہ یہ میدان بعض سیاسی اور ملکی واقعات کی بنا پر ان کے ہاتھ سے نکل کر
رفتہ رفتہ شبلی کے ہاتھ میں چلا گیا جنہوں نے تاریخ نگاری میں عقلیت کی بجائے
ایک احساساتی عنصر کو داخل کر دیا تھا۔ مگر گہری نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس کیا جا سکتا
ہے کہ دبستانِ شبلی کی تاریخ نگاری کی اصل تحریک بھی سرسید کے ماحول سے ہی
پیدا ہوئی اور جہاں تک خود شبلی کا تعلق ہے اُن کی تمام تاریخی تحریروں میں اور
باتوں کے علاوہ چند باتیں ایسی بھی ہیں جن کو ہم خاص سرسید کا اثر قرار دیتے ہیں۔
سرسید کے رفقا میں شبلی کے بعد اگر کوئی شخص مورخانہ امتیاز کا مالک
ہے تو وہ مولوی ذکاء اللہ ہیں۔ اُن کا بڑا کارنامہ تاریخ ہندوستان ہے جس کے
مقدمہ میں سرسید کے مذکورہ بالا خیالات کے واضح اثرات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔
ذکاء اللہ کے نزدیک تاریخ کی اصل قدر و منزلت یہ ہے کہ اس نے علم معاشرت و تمدن
کو توضیح و تفصیل سے بیان کیا۔ اور دوسری قوموں کی سوانح عمری اس طرح بیان کی
کہ ان میں تمدنی معاشرت کے باہمی مقابلہ کے اسباب مل سکیں تاکہ آنے والے
زمانہ کے لئے اُن کے عہد کے قرائن کا پتہ مل جائے۔

سیرت و سوانح:-

اردو ادب کا یہ شعبہ ایک مدت تک تحریک سرسید سے متاثر رہا۔
یہ اس طرح کہ اس دور میں جتنی بھی سوانحی تصانیف وجود میں آئیں اُن کا

مقصد قومی ترقی تھا جو سرسید کی تحریک کا بنیادی اصول ہے۔ جس کے تحت
اُس عہد کا سارا اُردو ادب افادی اور منفعتی بن کر اجتماعی مقاصد کا آلۂ کار
بن رہا۔ مولانا حالی کی اجتماعی سوانحی تصانیف سادہ اور ادبی سوانح عمریاں
ہیں۔ مگر ان دونوں میں قومی خدمت کا جذبہ پیشِ نظر ہے۔ ان میں انہوں نے
قوم کے لئے خوش طبعی، ظرافت اور زندہ دلی کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ مگر
جو ایسا ہم اس سے اجتماعی اخلاق کی اصلاح مقصود ہے۔

سرسید اور ڈرامہ:-

سرسید اور اُن کے رفقائے کار نے یوں تو ڈرامہ اور سٹیج کی طرف توجہ
نہیں کی مگر قومی تھیٹر کے نام سے ۲ فروری ۱۸۹۴ء کو انہوں نے مدرسۃ العلوم کیلئے
چندہ جمع کرنے کی خاطر اس رسم کی ابتدا بھی کر دی تھی۔ اگرچہ جس کو انہوں نے "مسخرگی"
اور "مسطرفی" قرار دیا۔ مگر جس سنجیدہ انداز سے وہ اور اُن کے رفقائے کار نے یہ تماشہ
دکھایا اُس سے یہ سند ضرور مل گئی کہ ڈرامہ اور تھیٹر بھی شاعری اور ادب کی دیگر
اصناف کی طرح اجتماعی مسائل اور حیاتِ قومی کا علاج بن سکتا ہے۔ اسی طرح
اگرچہ افسانے کا فن سرسید کی توجہ کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکا مگر اُن کے
رفقائے کار نے اس کو اپنا لیا۔ اس صنفِ ادب کی صلاحیتوں سے بعد کے
تمام افسانہ نگار متاثر ہوئے۔

سرسید اور تنقید:-

مولانا حالی کا "مقدمہ شعروشاعری" تقریباً انہی خیالات کی زیادہ

منظم اور مربوط تفسیر ہے۔ جن کی تلقین سرسید نے کی۔ طرزِ ادا میں سادگی کی اہمیت
بے تکلفی اور مدعا نگاری کی ضرورت شاعری کا مفید ہونا اس کی افادیت وغیرہ
یہ سب امور سرسید کے ارشادات کی صدائے بازگشت ہیں۔ اگرچہ شبلی کے
تنقیدی نظریات میں بظاہر مجتہدانہ اور مجددانہ رنگ نظر آتا ہے مگر غور کرنے سے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی سرسید کی روح کار فرما ہے۔ ہمارے ترقی یافتہ عہد
میں تنقیدی ادب کا مطالعہ زیادہ وسیع اور گہرا ہو گیا ہے مگر اسلوب میں سادگی اور سلاست کی
روش کا نشانِ اول "تہذیب الاخلاق" کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ شعروادب کے
متعلق کچھ اسی قسم کے خیالات سرسید سے پہلے محمد حسین آزاد نے بھی ظاہر کیے تھے۔
مگر اردو ادب کی رفتار کو آزاد کے خیالات نے بہت کم متاثر کیا ہے۔ سرسید کے
خیالات ایک جامع تحریک کا حصّہ تھے۔ اس لیے وہ ہر طرف چھا گئے۔ انہی
خیالات کے زیرِ اثر شاعری میں سب سے بڑی اور نمایاں خدمت حالی نے
انجام دی۔ جن کی شاعری خصوصاً مسدس گویا "تہذیب الاخلاق" کی منظوم شرح ہے۔
یہ شاعری سے بڑھ کر ایک تہذیبِ گذشتہ کی داستان اور ایک تہذیبِ
جدید کا خیر مقدم ہے۔ جس میں وہ سب کچھ ہے جو سرسید کو مطلوب تھا۔

سرسید کی صحیفہ نگاری:-

اُردو میں صحیفہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کی ابتدا میں ہو چکا تھا۔
"اُردو اخبار" (۱۸۳۶ء) اُردو کا پہلا مکمل اخبار تھا۔ "شمس الاخبار" (۱۸۲۲ء)
پہلا اُردو فارسی کا اخبار تھا۔ خالص اُردو کا دوسرا اخبار "سید الاخبار"
(۱۸۳۷ء) تھا جو سرسید کے بھائی سید محمد خان کی ادارت میں نکلتا تھا۔

اس اخبار میں سرسید بھی لکھا کرتے تھے۔ سرسید کے لئے یہ ابتدائی تجربہ بیحد مفید ثابت ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بعد میں بہت سے مفید صحافتی کارنامے انجام دیئے۔ غازی پور میں انہوں نے جو سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی اس کے نام سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی بھی جاری کیا۔ "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" بھی اسی کی بدلی شکل تھی۔ ان سب کوششوں میں اہم اور نمایاں درجہ "تہذیب الاخلاق" کو حاصل ہوا کیونکہ اس میں اخباریت کم اور علمیت زیادہ تھی۔ اس کے مضامین طویل اور مسلسل ہوتے تھے اور عام اور علمی اخباری دلچسپی سے زیادہ قوم کے گہرے ذہنی انقلاب کا مقصد پیش نظر تھا۔ یہ اخبار کم اور مجلّہ زیادہ تھا۔ مجلّہ سے یہاں مراد علمی رسالہ ہے۔

سرسید کی صحافت میں دو باتیں بڑی چمک اور تابانی رکھتی ہیں اوّل اُن کے صحائف کی دیدہ زیبی، ٹائپ کا حسن اور کاغذ کی عمدگی۔ اس لحاظ سے اُن کے اخبار موجودہ ترقی یافتہ یورپ کے اعلیٰ اخباروں اور رسالوں سے کسی طرح کم نہیں۔ دوم ان اخبارات کی معقولیت، اخبارات میں واقعات و معاملات پر بےلاگ رائے جس میں بڑی عافیت بینی، وسعت معلومات اور تعمیری نقطۂ نظر جھلکتا ہے۔ یہی اُن کے تبصروں کی خصوصیت ہے اور مضامین علمی میں سرسید کی مخصوص معقولاتی اسپرٹ اور حیات قومی کی تشکیلِ جدید اور زندگی کی تمدنی اساس کا پورا پورا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ عقلی اور تجزیاتی اصول صحافت سرسید کی اخبار نویسی کے خاتمہ کے بعد آج تک اردو اخبار نویسی میں پیدا نہ ہو سکا۔ "تہذیب الاخلاق" تین بار مختلف عرصہ سے شائع ہوتا رہا۔ ہم اسکے تینوں ادوار پر مختصر تبصرہ کریںگے۔

اس پرچہ کا پہلا دور نہایت شاندار اور عملی نتائج کے اعتبار سے بڑا کامیاب رہا جس کے اعلیٰ انقلابی مضامین نے تمام ملک میں ہلچل مچادی اور سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگا دیا۔ اس زمانہ میں جب کہ سرسید بنارس میں برسر ملازمت تھے اور اُن کو فرصت میسّر تھی یہ پرچہ نہایت آب و تاب اور پورے التزام و اہتمام کے ساتھ پونے چھ سال تک نکلتا رہا۔ لیکن جب سرسید نے پنشن لی اور علی گڈھ آگئے تو وہ خود اور اُن کے وہ دوست جو اس پرچہ کے سرگرم مضمون نگار تھے زیادہ اہم علمی اور تنظیمی کاموں میں معروف ہو گئے۔ مسلمانوں پر جو عام جمود و خمار چھایا ہوا تھا اس میں کافی حرکت پیدا ہو چکی تھی اس طرح یہ پرچہ اپنا مشن بہت کچھ پورا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے بادل ناخواستہ اسکو بند کرنا پڑا۔

اس پرچہ کے دوسرے دور میں جس کی مدّت عمر تقریباً دو سوا دو سال ہے، سرسید کی زیادہ تر توجہ کالج کے معاملات اور قرآن شریف کی تفسیر لکھنے کی طرف منعطف رہی اور ان کے معاونین کو بھی اس کام میں ہاتھ بٹانے کی مہلت نہ ملی۔ لہٰذا یہ دور پہلے دور کے برابر درخشاں اور اتنا ثمرآور ثابت نہیں ہوا۔

اس پرچہ کا تیسرا دور اور بھی پھیکا رہا۔ اس مرتبہ کسی دوسرے شخص نے کوئی علمی اعانت نہیں کی اور سرسید نے بھی اپنا کوئی مستقل مضمون نہیں لکھا چنانچہ دو سال دس ماہ کی کسمپرسی کے بعد یہ پرچہ اپنا قالب تبدیل کر کے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں منتقل ہوا جہاں ۱۲ ماہ حالت احتضار میں گزارنے کے بعد اس کا خاتمہ ہوا۔

تہذیب الاخلاق میں صرف مسلمانوں سے متعلق مفید مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔

تہذیب الاخلاق کے مضمون نگار تو بہت لوگ تھے لیکن سرسید، نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں، نواب اعظم، مولوی چراغ علی خاں، نواب وقار الملک سید مشتاق حسین، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا ذکاء اللہ، مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی، جو فار قلیط کے نام سے اپنے مضامین چھپواتے تھے، اور جسٹس سید محمود ان میں خاص طور پر ممتاز و نمایاں تھے۔ ان تمام صاحبوں کے مضامین زیادہ تر مذہب یا وقتی مسائل کے بارے میں ہوتے تھے۔ لیکن خود سرسید مذہب، اپنی اصلاحی تحریکات اور ہنگامی معاملات کے علاوہ اخلاق، معاشرت اور تمدن پر بھی بیشتر مضامین لکھتے تھے۔

چونکہ یہ پرچہ برصغیر ہند کے تنزل یافتہ اور زوال پذیر مسلمانوں پہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو عام رجحانات اور معتقدات کے برخلاف تھی اور وہ صدائیں بلند کرتا تھا جن سے ان کے کان اب تک بالکل ناآشنا تھے اس لئے ابھی صرف دو یا تین ہی نمبر اس کے نکلنے پائے تھے کہ تمام عالم ملت میں کھلبلی پڑ گئی جس سے موقع پا کر غرض مندوں نے اپنی تن پروری کے لئے فائدہ اٹھانا چاہا اور ہزاروں افترا اور بہتانوں سے ان فتنہ پردازوں نے اس پرچہ کو بدنام کر کے مسلمانوں میں ایک عام سوء ظن پھیلا دیا۔

تہذیب الاخلاق ایک نہایت اعلیٰ معیار کا گرانقدر سوشل رسالہ تھا۔ اس کے اجرا کا منشا ہر چند مذہبی اصلاح نہ تھا مگر جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ اکثر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں، اس لئے اس میں

مذہبی بحثیں کرنی لازم تھیں۔ اس پرچہ کے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے سرسید، سید مہدی علی اور مولوی چراغ علی نے خاص طور پر عمدہ مضامین بکثرت تحریر کئے۔ اور ان میں صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر محققینِ اسلام کی تصنیفات سے استنباط کر کے لکھا۔ اس کے علاوہ اخلاق، معاشرت اور تمدن کے متعلق یورپ کے مشہور مصنفوں کے خیالات سے بھی جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے مضامین میں استفادہ کیا۔

اس پرچہ میں ہر ایک بات بڑی سنجیدگی اور نرمی سے بیان کی جاتی تھی۔ کسی خاص شخص کی جانب روئے سخن بہت کم ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کی عام حالت پر بطور دلسوزی کے نہ بطور طعن و تشنیع و تقبیح کے بحث کی جاتی تھی۔ آپس میں ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی تھی مگر نہ اتنی زیادہ کہ تلخ ہو کر گلوسوز بن جائے۔ مخالفوں کے شکوک بے جا اعتراضات حتیٰ کہ افترا اور بہتان کے جوابات بھی کسی ضرورت کے سوائے نہ دیئے جاتے تھے اور یہی وجہ ہے یہ پرچہ بحث و مباحثہ اور جواب در جواب کی آلودگیوں سے منزہ اور مبرا تھا۔ اس کے جاری کرنے کے اغراض و مقاصد یہی تھے اور مفید باتیں بطور صلاح کہنا، لاولا میں ڈالنا نہ کہ سب و شتم سے مرعوب کر کے زبردستی منوانا تھا۔

مضمون نگاری:-

اردو میں مضمون نگاری کی صنف کے بانی بھی سرسید ہی تھے۔ ادب کی یہ صنف جس کا انگریزی نام ESSAY ہے یورپ ہی سے مستعار ہے۔ یورپ میں

اس کو ادبی نوع بنانے والا ایک اطالوی ادیب مان تان تھا۔ انگلستان میں اس کو مقبول بنانے والے کئی ادیب تھے جن میں بیکن اور ڈرائڈن اور آگے چل کر ایڈیسن اور اسٹیل بھی تھے جن کے دو صحیفے "سپیکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" دنیائے ادب میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ سر سید نے مرقومہ الذکر دو ادیبوں سے بڑا اثر قبول کیا چنانچہ تہذیب الاخلاق کے مقاصد کی تفصیل بیان کرتے وقت انہوں نے ان کا خاص ذکر کیا ہے۔

سر سید صاحب نے انگریزی زبان کے ان نامور مضمون نگاروں کے طرز کی تقلید کی کوشش کی۔ چنانچہ کچھ مضامین ایسے بھی لکھے جن کو انگریزی کا ترجمہ یا چربہ سمجھنا چاہیے۔ سید صاحب اس تقلید میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں اتنا بہرحال مسلم ہے کہ تہذیب الاخلاق کے اجرا کی تحریک انہی مذکورہ بالا پرچوں کے ذریعے ہوئی۔

سر سید کے مضامین تین طرح کے ہیں:۔

اوّل — خالص مذہبی اور دینی مضامین۔

دوم — سیاسی مضامین

سوم — اصلاحِ اخلاق و معاشرت سے متعلق مضامین۔

سید صاحب کے سارے مضامین باقاعدہ ESSAY کی حد میں داخل نہیں ہو سکے مگر مضامین کی کافی تعداد ایسی ہے جن کو اس صنف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تہذیب الاخلاق کے مندرجۂ ذیل مضامین۔

تعصب، تعلیم و تربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، بحث و تکرار، سولزیشن، اپنی مدد آپ، سمجھ، گذرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، رسم و رواج کے

نقصانات، عورتوں کے حقوق، انسان کے خیالات، آزادیٔ رائے، تربیتِ اطفال، سراب حیات، خود غرضی اور قومی ہمدردی ان سب مضامین میں اُن کا اختصار قدرِ مشترک ہے جو ایک باقاعدہ مضمون کا بنیادی وصف ہے۔

بایں ہمہ سید صاحب کے اکثر مضامین میں بعض کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اوّل تو ان کے عام مضامین طویل ہوتے ہیں پھر ان میں علمی و اصطلاحی معلومات کی بھرمار اس حد تک ہوتی ہے اور منصوبہ بندی اتنی سخت ہوتی ہے کہ مضمون پر لطف نہیں رہتے۔ علمی مقالات یا علمی بحث کے اعتبار سے ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مگر مضمون کی سی شگفتگی ان میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے علاوہ سر سید کے مضامین میں بے حد سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اکثر مضامین میں ان کی حیثیت معلمِ اخلاق کی ہے، ادیب کی نہیں۔ وہ اخلاقی اقدار کو سارے منطقوں اور مفروقوں کے حوالے سے پیش کرتے ہیں، وہ انسانی ضمیر کے حاسۂ اخلاقی کو ابھار کر نیک و بد کا امتیاز نہیں سکھاتے، اور زندگی کی وہ تصویریں پیش نہیں کرتے جن کو دیکھنے کے بعد وجدان خود ہی فیصلہ کر دے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔

سر سید کے مضامین میں جو فلسفۂ اخلاق پیش ہوا ہے اس کی غایت "عملیت" اور "مقصدیت" ہے۔ ان کے نزدیک جو شے دنیاوی طور پر مفید نہیں وہ اچھی بھی نہیں۔ تہذیب نفس اور مجلسی شائستگی ان کے ضابطۂ اخلاق میں ایک اہم قدر ہے۔ سر سید کے اخلاقی خیالات پر امام غزالیؒ کی تعلیمات کا بھی عکس پڑا ہے مگر وہ امام غزالیؒ کی صرف منطق اور عقلی تطبیق کے مداح معلوم ہوتے ہیں۔ غزالیؒ کی روحانیت سے انہیں کوئی خاص دلچسپی معلوم نہیں ہوتی۔ اس منطق پسندی نے اُن کے مضامین کو خشک بنا دیا۔

سرسید کے مضامین میں تصورات اور معقولات کا جذبہ ہے اور زندگی کی خوش نما اور دلچسپ تصویریں کم ہیں۔ وہ زندگی کے خیال انگیز اور دلچسپ مناظر کم پیش کرتے ہیں۔ اعمالِ انسانی اور اُن کے مادی فوائد و نقصانات کی فہرستوں یا اُن کی معقول توجیہات پر بہت زور دیتے ہیں وہ ہر چند نیچر کے دلدادہ ہیں اور استدلال میں اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں مگر نیچر کے وسیع مرغزاروں کی سیر نہیں کراتے۔

ان سب باتوں کے باوجود سرسید اردو کے اوّلین مضمون نگار ہیں۔ اوّلین اس معنی میں کہ انہوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر مضمون یا ESSAY کی صنف کو اختیار کیا اور براہِ راست انگریزی زبان کے مضمون نگاروں سے اثر قبول کیا اور آنے والے مضمون نگاروں کے لئے شاہراہیں متعین کیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنے پرچے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ ہندوستان کے تعلق سے (خصوصاً اردو کی سادہ نثر کی ترویج کے معاملہ میں) تقریباً ویسی ہی خدمات انجام دیں جیسی انگلستان میں اڈیسن اور سٹیل نے اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کے ذریعہ انجام دی تھیں۔

سرسید کی نثر :-

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی نثر کا رواج اور اس کے بہترین نثر پاروں کا زمانہ ماضی قریب سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو کا خمیر جتنی ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے اُٹھا ہے ہندوستان کی کوئی دوسری زبان کا نام اس سلسلے میں نہیں لیا جا سکتا۔ یہ کہنا سراسر گمراہ کن ہے کہ اردو ہندی کا

ایک اسلوب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی کے بہت سے الفاظ اور محاورے اردو میں رچ بس گئے ہیں لیکن اس کے قواعد عروض اور ادبی اسالیب عربی اور فارسی کی دین ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ الفاظ اور دوسرے فنی وسائل نے زبان کے بنیادی سانچے میں ضم ہو کر اپنا الگ روپ نکال لیا ہے۔ اردو نثر کے بنیادی اسٹائل سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس میں صرف فارسی یا صرف ہندی الفاظ کی مناسب ترتیب کو کام میں لایا جائے بلکہ یہ کہ مختلف اجزا کا ایسا تناسب اور توازن برقرار رکھا جائے جو زبان کی فطانت سے میل کھائے۔ یوں تو اردو نثر کے ابتدائی نمونے ہمیں دکنی ادب میں بھی ملتے ہیں لیکن دراصل "باغ و بہار" کو ہم نثر میں ادبی رتبہ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ نثر کی تمام بنیادی خصوصیات کی حامل نہیں۔ یہ بات کچھ کم قابلِ غور نہیں ہے کہ اردو میں اچھی نثر کے نمونے بہت کم ملتے ہیں اور عام طور پر نثر میں شاعری اور جذباتیت کا رنگ غالب رہا ہے۔ یہی حال فارسی نثر کا ہے۔ جس سے اردو براہ راست متاثر ہوئی ہے۔

سرسید کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نثر کو شاعرانہ نثر ہونے سے بچا لیا۔ غالب اور سرسید نے اپنے اپنے طور پر نثر کا جو آہنگ تیار کیا تھا اس کا تکملہ ہمیں حالی کے بیان سے ملتا ہے۔ حالی کے یہاں نثر کی بیشتر خوبیاں ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں منطقی سانچہ بھی ہے اور معروضیت بھی اور ہمواری، سبک روی اور روانی بھی۔ جو بات انہیں سرسید سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید کی تحریروں میں انفرادی جوہر کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر اس حد تک عقلی ہے کہ شخصیت کا آب و رنگ کہیں بھی ظاہر ہونے نہیں پاتا۔

اردو ادب میں سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں نثر لکھی۔ ان سے پہلے جس چیز کو نثر کہا جاتا ہے وہ نظم سے صرف ان معنوں میں مختلف ہوتی ہے کہ اس میں عروض کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ شروع میں سرسید نے بھی اسی قسم کی نثر لکھی چنانچہ ان کی "آثار الصنادید" کا رنگ بالکل پرانی نثر کا رنگ ہے اور جدید نظریات کے مطابق نثر کا رنگ نہیں ہے۔ مگر "تہذیب الاخلاق" سے انہوں نے نہ صرف اپنی نثر نگاری کی ابتداء کی بلکہ اردو نثر نگاری کے لیے ایک صحیح اور سیدھا راستہ کھول دیا۔ اپنے عمل سے انہوں نے یہ واضح کر دیا کہ نثر نگاری کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ ان کا کمال اسی امر میں ہے اور اسی کمال کی وجہ سے وہ اردو نثر نگاروں کے سرتاج رہیں گے۔

"تہذیب الاخلاق شروع کرنے سے پیشتر ہی ان کو کامل طور پر یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نظم اور نثر کے طرز میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ چنانچہ مقاصد اجرائے تہذیب الاخلاق" کے سلسلے میں اسٹیل اور ایڈیسن کے پرچوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ طرز ادا کی بابت لکھتے ہیں: "ان پرچوں کے مذاقِ تحریر اور خیالات کے رنگ ڈھنگ نے بڑی تحریروں کے اسباب کو بتا دیا اور بھونڈی عبارت اور لغو انشاء پردازی کو جو کسبیوں کے بناؤ سنگار کی مانند تھی اور رنڈیوں کے ٹھٹھے یا لونڈوں کی سی کلام گلوچ کو تحریروں میں تمیز کرنا اور سنجیدہ و متین نکتہ چینی اور تحقیقات کا شوق پیدا کیا۔ ذہانت اور متانت دونوں کو ترقی دی اور تحریر میں مناسبت اور تہذیب کا خیال لوگوں کے دل میں بٹھا دیا......"

سرسید کا اسلوب :-

اردو میں سرسید سے پہلے اسلوبِ نثر کے کم و بیش دو بڑے نمونے موجود تھے۔

۱- فارسی کے تتبع میں پُرتکلف اندازِ بیان۔

۲- فورٹ ولیم کالج کے اردو مصنفوں کا سادہ اور سلیس طرز۔

اردو میں پُرتکلف اندازِ بیان دکنی نثر میں بھی مل جاتا ہے۔ لسانی اعتبار سے دکن کی نثر کی کچھ جُداگانہ خصوصیات بھی ہیں۔ ان میں بڑی خصوصیت مقامیت اور لہجہ کی بدویت ہے۔ اس کے باوجود دکنی دور کی بہترین کتاب "سب رس" (مصنفہ "وجہی") اسلوبِ بیان کے اعتبار سے فارسی اسالیب کے کامل تتبع کا پتہ دیتی ہے۔ دکنی نثر کے بعد فورٹ ولیم کالج تک جتنی نثری کوششیں ہمارے سامنے ہیں ان میں عموماً فارسی کا پُرتکلف انداز ہی غالب نظر آتا ہے۔

یہ سرسید احمد خاں کا کارنامہ خاص ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو اپنی زندگی کا ہی نہیں بلکہ اس وسیع معاشرہ کا ترجمان بھی بنایا جس کے وہ ایک مقتدر فرد تھے۔ اس لحاظ سے سرسید ہی رہنمائے دور رہے۔

سرسید نے "تہذیب الاخلاق" کے ایک مضمون میں قدیم اسلوب کی برائیوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علم و ادب و انشاء کی خرابی صرف لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کی تُک ملانے اور دور دراز کے خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں..........................

.... کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا۔

جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے مندرج نہ ہو۔ پس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے اور ہم کو

بھونڈی اور بناوٹی تحریر کا عادی بنا دیا ہے۔ (مضامین تہذیب الاخلاق: ج ۲، صفحہ [illegible] - قومی دکان ایڈیشن - لاہور)

سرسید کے یہ خیالات قدیم طرز نگاری کی تنقید بھی ہے اور نئے اسلوب بیان کے لئے دستور العمل بھی۔ ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب میں کن کن باتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ یہی بحث کو انہوں نے ایک جگہ خود بھی واضح کر دیا ہے۔ سرسید کی اس تحریر سے اُن کے تصور اسلوب کے ساتھ ساتھ اُن کے اپنے اسلوب بیان پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بہرحال ان کے خیالات کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ

۱- تحریر سادہ ہونی چاہیے۔

۲- لطف مضمون میں ہو نہ کہ ادا میں۔

۳- جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ یعنی وہی مضامین ادا کئے جائیں جن میں سچائی ہو۔

مولانا حالی نے سرسید کی تحریر کی ان خصوصیات سے طویل بحث کی ہے۔ اُن کے نزدیک سید صاحب کی نثر کی اہم بنیادیں تین ہیں: سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی اور مدعا نویسی انہی اوصاف کے مجموعہ کو انہوں نے نیچرل طرز بیان سے تعبیر کیا ہے یعنی ایسا طرز بیان جو مصنف اور قاری دونوں کی طبیعت کے لئے مانوس ہو اور اس میں آورد، تکلف اور بناوٹ کو دخل نہ ہو۔

سرسید کے اس طرز بیان کے بنیادی محرکات دو ہیں: اول ان کا تصور اسلوب (جس کے بدلنے میں مرزا غالب کی نثر کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے ادبی نمونوں اور مغربی نظریات نے کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے) دوم اُن کا عظیم الشان مقصد زندگی یا سیاسی اور تعلیمی مشن۔ ان دونوں اثرات کے ماتحت

اُن کی تحریروں میں وہ رنگ پیدا ہوا جسے مجموعی حیثیت سے "سرسید کا رنگ" کہا جا سکتا ہے۔ ادب کے متعلق سید صاحب کا نظریہ افادی تھا۔ ان کے خیال میں ادب و انشاء کا مقصد محض تفریح یا محض آرائش بیان نہیں ہے۔ اگر ادب صرف تفریح اور آرائش کا نام ہوتا تو وہ شاید ادیب بننا اور کہلانا بھی پسند نہ کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں "انشاء" کو بڑی اہمیت دی مگر انہوں نے انشاء کو محض انشاء کے لئے اہمیت نہیں دی بلکہ معانی و مطالب کیلئے۔ (ان کے نزدیک مضمون اور دل سے نکلا ہوا مضمون طرز ادا پر مقدم ہے)

سرسید کی عام تحریریں اسی وجہ سے صناعی تکمیل سے محروم ہیں جو شبلی اور حالی کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ مولانا حالی نے جس وصف کو بیساختگی سے تعبیر کیا ہے وہ اس طرح کی بیساختگی نہیں جو شبلی اور حالی کی تحریروں میں پائی جاتی ہے کیونکہ سرسید کے بیساختہ پن میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو مذاق سلیم کے لیے خوشگوار نہیں ....

.... مثلاً ترکیبوں کا بھدا پن، الفاظ کا مجموعی لہجہ، فقروں کی کمزور شیرازہ بندی، فقرے کے اندر ناگوار لفظوں کی ناہموار خشت بندی، حروف ربط و عاطفہ کی بے ہنگم تکرار، انگریزی الفاظ کا بے ضرورت اور بے محل استعمال۔ یہ سب باتیں ادبی پرداخت کی طرف سے اُن کی بے اعتنائی کا نتیجہ ہیں۔ اُن کی تحریروں میں بیساختہ پن یقیناً ہے مگر اس سے اُن کی تحریر کا ادبی حسن کم ہو گیا ہے زیادہ نہیں ہوا۔

بایں ہمہ سرسید کی تحریریں اثر آفرینی کے ذرائع و وسائل سے خالی نہیں۔ صنائع بدائع سے انہیں ضرور چڑ تھی مگر قدرتی صنعت کاری کے آثار اُن کے

بیان میں موجود ہوتے ہیں۔ انہوں نے تشبیہ، استعارہ، تمثیل سے خاص
کام لیا ہے اور طنز و ظرافت اور مکالمہ کے انداز ان کی تحریروں میں جا بجا پائے
جاتے ہیں۔

انہوں نے تاریخ، فنِ تعمیر، سیرت، فلسفہ، مذاہب پر قلم اُٹھایا۔ ان سب
مضامین میں اُن کا قلم یکساں پھرتی اور ہمواری کے ساتھ چلتا ہے۔ یہ صرف اُن کی
قدرتِ بیان کا کرشمہ ہے۔ اُن کے مقالات کی زبان عام فہم ضرور ہے۔ اُن کا اندازِ بیان بے تکلف گفتگو کا
انداز بیان ہے۔ مگر سنجیدگی اور متانت نے شگفتگی پیدا نہیں ہونے دی۔ البتہ ایسے
مقالات جن میں ترغیبی عنصر کی بجائے جہاں جوش انگیزی مقصود نہیں ان میں انہوں نے
مضمون نویسی کا اچھا معیار قائم کیا ہے۔ مثلاً مضمون تعصب، تکمیل، گذرا ہوا
زمانہ وغیرہ ہیں۔ یا رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات، تہذیب یا سولیزیشن
اور بحث و تکرار ہیں۔ مگر جہاں جوش و خروش کی ضرورت ہے وہاں ان کے
مضامین (خصوصاً جب ہو جائیں تو توازن کھو بیٹھتے ہیں) اور ان کے عام مضامین تو
اعلیٰ اور بہترین مضامین کی صف میں نہیں رکھے جاتے البتہ علمی مقالات کی
حیثیت سے بعض اوقات وہ لائقِ تحسین ہو جاتے ہیں۔

سرسید کے خطوط میں بھی اُن کی عام نثر کی اکثر خصوصیات موجود ہیں۔
مگر خطوں میں عبارتوں کی تنظیم اور بھی ڈھیلی ہے اور قواعد سے بے اعتنائی
بھی زیادہ کھٹکتی ہے۔ البتہ منطقیت اور استدلالیت کی گرفت قدرے
کمزور ہے کیونکہ خطوں کی فضا میں منطق کا ساتھ کبھی کبھی چھوڑ دیتے ہیں اور بے تکلف
ہو کر دلیل کے بجائے محبت کی اپیل سے کام نکالتے ہیں۔ اس کے سبب خطوں
کی فضا میں گلو گرفتگی کا احساس کم ہو گیا ہے۔ سرسید کی تحریروں میں ظرافت

اُس حد تک ہے جس حد تک اُن کی سنجیدگی، متانت اور مقصد کو گوارہ ہے۔
اُن کی طنزیات میں خفا اور کنایہ کم ہے۔ کہیں کہیں تضحیک کُھل ہو جاتی ہے[11]

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی

۱۔ آزاد کی تصانیف
۲۔ تنقید نگاری
۳۔ رمزیہ نگاری
۴۔ تاریخ نویسی
۵۔ لسانیات پر عبور
۶۔ کچھ اور تصانیف پر ایک نظر
۷۔ انشا پردازی
۸۔ طرز نگارش اور اس کا نقص
۹۔ طبیعت کا خاصا
۱۰۔ ادبیات آزاد اور آزاد کا مرتبہ اردو ادب میں۔

آزاد کی تصانیف

علمی و ادبی :-

آب حیات۔ سخندانِ فارس۔ نگارستانِ فارس۔ دربارِ اکبری۔ دیوانِ ذوق۔ ڈرامۂ اکبر۔ مجموعہ نظم آزاد۔ خم کدۂ آزاد۔

درس و تدریس

نصیحت کا کرن پھول۔ قصص ہند حصہ اول، دوم۔ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب۔ قواعد اردو۔ قواعد فارسی۔ جامع القواعد۔ تذکرۂ علمائے کا تبات عرب۔ حکایات آزاد۔ شہزادہ ابراہیم کی کہانی۔ قند پارسی۔ آموز گار پارسی۔ لغت اردو۔

عالم جنوں کی یادگاریں

مکاشفات آزاد۔ جاک و ناک۔ فلسفۂ الہیات۔ جانورستان۔

متفرقات

بیاضِ آزاد۔ سیر ایران۔ مکتوباتِ آزاد

مخطوطات

تاریخی مقامات۔ ترکی قواعد۔ عربی قواعد۔ اردو قواعد

اور عالم جنوں کی متعدد یادگاریں۔

ان تصانیف کا تجزیہ ہم اُن کی "تنقید نگاری"، "تاریخ نویسی"، لسانیات اور اُن کی اِنشا پردازی کے تحت کریں گے۔

آزاد کی تنقید نگاری :-

آزاد، سرسیّد اور حالیؔ کے ہمعصر ہیں۔ زمانہ کے جو عام رجحانات تھے۔ اُن کا اثر آزاد کے ہاں ملتا ہے۔ وہ بھی ادب میں تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ اُن کے پیش نظر بھی اس سے کچھ کام لینا تھا۔ مغرب کے اثرات وہ بھی قبول کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی طبیعت بھی جدّت پسند تھی۔ دہلی کالج کی تعلیم اور کرنل ہالرائیڈ وغیرہ کی محبت نے اُن کی آتش شوق کو اور بھی بھڑکایا تھا۔

کرنل ہالرائیڈ کی خواہش کے مطابق لاہور میں نئی وضع کے مشاعرہ منعقد کیے گئے۔ مولانا حالیؔ بھی ان کے رفیق کار تھے۔ ان مشاعروں میں یہ کوشش کی گئی کہ غزل گوئی کے بجائے شعرا انگریزی کی طرز میں نظمیں لکھیں جن کے مضامین فرسودہ اور پامال نہ ہوں اور انہیں مشاعروں میں سُنائیں۔ گمان غالب ہے کہ اس طرح آزاد کو کسی حد تک مغربی ادب سے روشناس ہونے کا موقع ملا ہوگا۔ بہر حال ان خیالات کے زیر اثر اور اس ماحول میں سانس لینے کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے تنقیدی خیالات کو "آب حیات" کی شکل میں پیش کیا۔

کلیم صاحب لکھتے ہیں کہ[۱۲] "آب حیات تنقیدی کارنامہ نہیں ایک تذکرہ ہے۔ آزاد نے تذکروں کو سامنے رکھ کر آب حیات کی ترتیب و تنظیم کی۔ انہوں نے سنا تھا کہ نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹین سے

سے روشنی پہنچتی ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں۔ ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے، نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سال فوت بھی نہیں کھلتا اور وہ جانتے تھے کہ نئے تعلیم یافتہ ٹھیک بات کہتے تھے۔ اسی لئے آزاد نے اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ جو حالات ان بزرگوں کو معلوم ہوئے یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کرکے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی، چلتی پھرتی تصویریں سامنے آکھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں نصیب ہو"۔

اکثر تذکرے فارسی ہی میں لکھے گئے ہیں۔ مگر جو اردو میں ہیں ان کا بھی تمام یہی رنگ ہے۔ "آب حیات" کے سلسلہ میں یہ تذکرے بہت اہم ہیں کیونکہ آزاد نے جہاں وجہ تسمیہ اپنی کتاب کی واضح کی ہے وہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے اُن کے لئے ایک حد تک نمونے (ماڈل) ہیں۔ حالانکہ اُن کی نوعیت میں وہ بہت کچھ تبدیلیاں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن آب حیات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا قرون وسطی کے تذکرہ نگاروں سے آگے نہیں بڑھتے۔ کیوں کہ "آب حیات" کی ابتدا اردو زبان کی تاریخ سے شروع کرتے ہیں اور جسے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ زبان کی تاریخ کا تعلق تاریخ لسانیات سے ہے نہ کہ تاریخ ادب۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا لسانیات اور ادبیات کو ایک ہی چیز سمجھے اور دونوں میں تمیز نہ کرسکے لیکن آزاد کے عہد کے پیش نظر یہ کوتا

بڑی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ علم سائنیات کو مولانا کے زمانہ میں اتنی ترقی نہیں
تھی جتنی آج ہے۔ شعر کی تعریف میں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"فلاسفۂ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے
تعلق نہیں قدرتی موجودات یا اُس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے
دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے اس خیال
کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔"[۱۳]

آزاد ماحول کے تقاضوں سے بہت زیادہ جدید بننے کی ناکام کوشش
کرتے ہیں۔ ناکامی کی وجہ اُن کی افتادِ طبع ہے۔ وہ پوری طرح مشرقی ہیں۔ یہی
وجہ ہے کہ وہ مروجہ روش سے ذرا بھی انحراف نہیں کرتے مثلاً شعر کو خیالی باتیں کہنا یا
شعر کو ایک الہامی چیز سے تعبیر کرنا وغیرہ۔ انہوں نے صاف صاف اس خیال کا
اظہار کیا ہے کہ "فی الحقیقت شعر ایک پرتو رُوح القدس کا اور فیضانِ رحمتِ الٰہی
ہے کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد شعر کے
مابعد الطبیعاتی نظریہ کے قائل ہیں اور شاعر کو ماحول کی پیداوار نہیں سمجھتے' بلکہ
ایک غیبی قوت کی تخلیق سمجھتے ہیں۔[۱۴]

آزاد پر مشرقی نظریاتِ تنقید کا گہرا اثر ہے۔ چنانچہ وہ جگہ جگہ معانی و بیان
کی اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔ شعر اُن کے خیال میں گلزارِ فصاحت کا پھول ہے۔
الہامی اثرات کا نتیجہ یہ ہے کہ اندازِ بیان اور اسلوب کی اہمیت کو وہ بار بار ذہن
نشین کراتے ہیں۔ لیکن معنوی پہلو سے بھی قطع نظر نہیں کرتے۔ وہ ان دونوں
کی اہمیت کے قائل ہیں۔

اُن کے نزدیک شعر کے لئے چند باتیں ضروری ہیں۔ سب سے پہلے وہ

خیال کو ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسرے اُن کے نزدیک شعر کے لئے موزونیت
ضروری ہے۔ تیسری چیز آزاد کے نزدیک اسلوب یا اندازِ بیان ہے۔ جس کے
بغیر شعر کہا نہیں جا سکتا۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے
کہ وہ شعر کو معنوی و فنی خوبیوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

"آبِ حیات" کا تنقیدی پہلو بہت کمزور ہے۔ انہوں نے جس طرح
ان شعراء پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ناقد
سے بدرجہا بہتر نکتہ چین ہیں۔ میر و سودا کے کمال کے معترف ہیں لیکن اس
امر پر روشنی نہیں ڈالی جاتی کہ ان بزرگ شعراء کا فن کن کن ممتاز اور نمایاں
صفات کا حامل ہے۔ جسکی وجہ سے انہیں دوسروں پر فوقیت حاصل ہے۔ ان
باکمال اصحاب کی شاعری میں جو صفت انہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان شعراء کا
بہت سی فارسی تراکیب کا اردو میں ترجمہ کرنا ہے۔ وہ بڑے سطحی انداز میں
ان بزرگوں کی شاعری کے فرق کو واضح کرتے ہیں کہ میر کا کلام "آہ" اور سودا کا
کلام "واہ"۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا کو شاعری سے دلچسپی ہی نہیں۔
اُن کی مخصوص دلچسپی زبان سے ہے اسی لئے قواعد اور الفاظ کا ہر جگہ ذکر
ہوتا ہے۔ یہ سب منظر دیکھکر سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس تصنیف کو انہوں نے
زبان کی تاریخ سے کیوں شروع کیا۔[۱۵]

ایک بات ضرور ہے کہ اصنافِ سخن میں مخصوص لوگوں کی کامیابی کا ذکر
ہوتا ہے جیسے یہ بتایا جاتا ہے کہ میر اور درد غزل اچھی کہتے تھے اور سودا کی
طبیعت کو قصیدہ سے مناسبت تھی مگر ان معاملوں میں بھی تذکرہ نویسوں ہی کی
چند ہی سی باتیں دوہرائی گئی ہیں اور دیگر تذکرہ نویسوں کی طرح مولانا کو بھی

اچھے اور بُرے شاعر میں تمیز کرنے کا شعور نہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی طرح کسی غیر ادبی سبب کی بنا پر وہ ایک شاعر کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابراہیم ذوق کی تعریف جن الفاظ میں کرتے ہیں وہ قصیدے کے شایانِ شان ہیں۔

جو رائیں اُنہوں نے شاعروں کے کلام پر دی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے کچھ بھی نہیں کیا صرف الفاظ کے طوطا مینا بنائے ہیں جن سے ایک قسم کی سنسنی تو ضرور پیدا ہوتی ہے مگر کوئی خاص تشفی بخش مطلب نہیں نکلتا۔ مثلاً غالب کے کلام پر یوں رائے دیتے ہیں:[14]

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اُس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے۔"

اُن کی رایوں میں ہر جگہ یہی رنگ ہے۔ لفاظی بہت کچھ معنی کچھ نہیں۔ تذکرہ نگاروں کی طرح محض انشاپردازی یا انشاپردازی برائے انشاپردازی ہی آزاد کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔ تمام شاعروں کے حالات اُن کے اخلاق و عادات اُن کا سماجی ماحول جو اُن کے کلام کے جانچنے کے لئے پس منظر کا کام دیتے ہیں ان سب کی تصویریں آزاد بڑی چابکدستی سے کھینچتے ہیں کاش وہ ان کی روشنی میں اُن کا تجزیہ بھی کرتے۔

آزاد اشعار کے خارجی حسن و قبح پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں زبان کی صفائی تراکیب کی دلچسپی اور محاوروں کی صحت کو وہ اصل شاعری تصور کرتے ہیں۔ نفسِ شاعری سے اُن کو بہت کم سروکار ہے۔ ویسے خیالات کی نزاکت اور مضامین کے غلو کا بھی ذکر ہے اور معنی آفرینی اور مضمون آفرینی

کو بھی وہ نہیں بھولے ہیں۔ لیکن اُن کی توجہ کا مرکز نفسِ شاعری سے اکثر دور ہی رہتا ہے۔ اور یہ ناگوار انداز ہوتا ہے کہ وہ طبعاً ناقد نہ تھے۔ جہاں وہ تنقید کرنے پر مجبور ہوئے ہیں وہاں بے رنگ اور بے مزہ ہو جاتے ہیں۔

آزاد طبعاً محقق بھی نہ تھے آج "آبِ حیات" کے بہت سے بیانات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ کیونکہ آزاد میں تحقیقی مادہ کم تھا۔ وہ کم سے کم سرمایہ پر بغیر چھان بین اور غور و فکر کے کوئی رائے قائم کر لینے میں عجلت سے کام لیتے تھے۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود اُردو تنقید میں آزاد ایک مرتبہ کے مالک ہیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ اُردو کے پہلے نقاد ہیں جن کے ہاتھوں نظریاتی مباحث کا چراغ روشن ہوا۔ بے شک اس میں تفصیل کو دخل نہیں بہر حال آغاز انہیں کے ہاتھوں سے ہوا۔ علاوہ اس کے انہوں نے پہلی مرتبہ اُردو تذکرہ کو تاریخ کی شکل دی۔ جس میں تنقید کا خیال رکھا گیا۔ مختلف شعراء پر قائم کی ہوئی اُن کی رائیں اگرچہ مختصر ہیں ان میں اصولوں سے بڑھ کر جذباتیت کی کارفرمائی ہے لیکن قدیم شعراء کے متعلق آج کے نقاد کو آبِ حیات کی ورق گردانی کے سوا چارہ ہی نہیں۔

رمزیہ نگاری:۔

"آبِ حیات" کے بعد اُن کی اہم تصنیف، جو شاعرانہ خیال آرائیوں اور ادبی گلکاریوں کی وجہ سے اُن کا دوسرا بڑا کارنامہ "نیرنگِ خیال" ہے جس کا اسلوب رمزیہ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ دُنیا کی دوسری زبانوں کے لٹریچر کی ایک صنف "ایلیگاری" ہے جس میں جذبات، احساسات، معتقدات کو

مشخص کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ روزِ اول سے ہی انسان کا تخیل اشکال و صورت کو بہت جلد گرفت کر لیتا ہے۔ مثلاً غم، شفقت، رحم اور انصاف کو ان کے خصائص طبعی کی بنا پر ویسی ہی انسانی شکلوں میں ڈھالا جائے تو پڑھنے والا اس سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس طرزِ بیان کی ایک مشہور کتاب "پلگرمس پراگریس" (زائر کا سفر) کے نام سے مشہور ہے جس میں مسیحی عقائد اور محاسنِ اخلاق کو محسوس صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا کی وہ یہی سفر نامہ ہے۔ اس کتاب کے مقبولِ عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ اب تک دنیا کی تقریباً ۱۰۰ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس طرزِ بیان کو پیشِ نظر رکھ کر آزاد نے بھی "نیرنگِ خیال" لکھی ہے۔ چنانچہ خود آزاد لکھتے ہیں "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں سے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔"

مولوی محمد یحییٰ تنہا مؤلف "سیر المصنفین" اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "نیرنگِ خیال کی نثر ہزار نظموں پہ فوقیت رکھتی ہے۔ رنگین بیانی کا ایک دلفریب مرقع ہے۔ اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک پختہ کار دستور العمل ہے۔ پند و نصائح کا ایک دفتر ہے۔ استعارے اور تمثیل میں مطلب کی باتیں بتا گئے ہیں کہ پڑھنے والا شستہ خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے اردو نثر کی نئی طرز قائم کی۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں زیادہ تر انگریزی ادب و انشا کا پرتو ہے۔ جس میں مضمون نویسی کی جدید طرز کا تجربہ کیا ہے

"نیرنگِ خیال" ایک دیباچہ، ایک ابتدائیہ اور تیرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ دیباچہ میں آزاد نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "ملک ہمارا قریب آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل چاہتا ہے۔ اور علوم و فنون انگریزی جس طرح ہمارے لباس، مکانات، معاملات، خیالات اور معلومات میں ترمیم کر رہے ہیں، اسی طرح اگلی انشا پردازی بھی ہمارے انشا میں اصلاح دیتی جاتی ہے۔" آزاد کو اس امر کا احساس تھا کہ انگریزی سیلاب کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔ جب صورتِ حال ایسی نوعیت اختیار کرے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنی زبان و ادب کا دامن وسیع کر لینا چاہیے۔

آزاد نے صاف صاف اس امر کا اظہار نہیں کیا کہ "نیرنگِ خیال" کے مضامین انہوں نے ترجمہ کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا بیان کسی حد تک مبہم ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ چند مضامین جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں جو کچھ ان کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔"

اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آزاد نے ترجمہ دوسروں کی زبانی سنا تھا۔ اور اسے اپنے پیرائے میں ڈھال لیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ کہہ چکے تھے کہ میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے چراغِ شوق روشن کیا ہے جس کا بلاواسطہ استفادہ کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آزاد انگریزی سے واقف ضرور تھے (اسلم فرخی نے ان کی تحریر کردہ ایک انگریزی درخواست بچشم خود دیکھی ہے)

"نیرنگِ خیال" ترجمہ کا وہ شاہکار ہے جس پر اردو تو کیا دنیا کی ہر زبان

نظر کر سکتی ہے۔ نیرنگِ خیال کے تمام مضامین تمثیلی ہیں۔ تمثیل جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، انتہائی قدیم صنفِ ادب ہے۔ اُردو میں ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" اسی ذیل میں آتی ہے۔ لیکن اس کی دوبارہ دریافت آزاد کے بہت بعد کی چیز ہے۔ پھر یہ کہ "سب رس" ایک طویل داستان ہے، ادبی مضمون نہیں۔ اُردو میں تمثیلی مضامین لکھنے کے موجد آزاد ہیں اور "نیرنگِ خیال" کے مضامین اس سلسلہ میں اولیت کا شرف رکھتے ہیں۔ لیکن تمثیلی مضامین کا سلسلہ آزاد ہی کے عہد میں ختم ہو گیا۔ نواب محسن الملک کا مضمون "موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ" اس سلسلہ کی آخری کڑی قابلِ ذکر ہے۔ مختصر افسانہ کی اس صنفِ ادب کو بیرے معدوم کر دیا گیا ہے اور اب اس کے پنپنے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

"نیرنگِ خیال" کو اُردو افسانہ کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ مختصر داستانیں اُردو افسانے کی پیش رو ہیں۔ آزاد کا اندازِ بیان ان داستانوں میں افسانہ کے بعض عناصر اجاگر کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اُن کی خوبیٔ قصہ گوئی میں بھی کلام نہیں۔ "نیرنگِ خیال" میں یہ قوت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس بنا پر اگر انہیں اُردو کا اولین افسانہ نگار کہا جائے تو کوئی نامناسب بات نہ ہوگی۔

دُنیا کے ہر ادب میں تمثیل رُومانی قصوں اور ناولوں کے درمیان کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ "نیرنگِ خیال" بھی اسی قسم کی ایک کڑی ہے۔ "نیرنگِ خیال" کے مضامین چونکہ ترجمے ہیں، اس لیے ہم اُن کے نفسِ مضمون پر بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

"نیرنگِ خیال" پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی نے آخر میں لکھا تھا کہ "انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً تصنیف و تالیف کا

دشوار کام جس کا بے عیب ہونا محال ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بے عیب ہونے کے برابر ہے۔"

مولانا حالی نے "نیرنگِ خیال" کے متعلق بہت صحیح لکھا ہے کہ "اب تک اکثر علوم کی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ طبعیات، کیمسٹری، طب، فلسفہ، منطق، ریاضی کی تمام فروعات، ہیئت، حرکت و سکون وغیرہ وغیرہ بقدرِ ضرورت ہماری دیسی زبان میں موجود ہیں۔ بہت ضروری تاریخیں اور کچھ ناول بھی ترجمہ ہوئے ہیں۔ جغرافیہ بھی لکھے گئے ہیں۔ مگر مغربی شاعرانہ خیالات کی جھلک آج تک ہندوستانیوں نے نہیں دیکھی تھی۔ "نیرنگِ خیال" پہلی ہی کتاب ہے جس نے اس سربستہ قفل کو کھولا ہے اور اہلِ وطن کے لیے علمِ انشاء کی ترقی کا ایک نیا راستہ نکالا ہے۔" حالی کی یہ رائے بہت صحیح اور متوازن ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ نیا راستہ آزاد کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

اس کا ہر مضمون اپنی نیرنگی میں "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کا مصداق ہے۔ چنانچہ الگ الگ ایک ایک مضمون کا تجزیہ کرنا دریا کو کوزہ میں بند کرنے سے کچھ کم نہیں۔

نیرنگِ خیال کے دوسرے حصہ میں مندرجہ ذیل چھ مضامین شامل ہیں۔ جنت الحمقا، خوش طبعی، نکتہ چینی، مرقع خوش بیانی، سیرِ عدم، بقائے دوام — سب مضامین میں انسانی خصائل کو مشخص کیا گیا ہے۔

شمالی ہند میں بھی مزید تصانیف کا وجود ملتا ہے۔ مگر یہ تصانیف زیادہ تر سنسکرت اور فارسی کتب کا ترجمہ ہیں۔ مثلاً بہادر علی حسینی کی "مفرح القلوب" کا

ترجمہ اردو میں کیا اور اس کا نام "اخلاقِ ہندی" رکھا۔ مفرح القلوب بھی سنسکرت
کی مشہور کتاب "ہتوپدیش" کا ترجمہ ہے۔ ہتوپدیش کی زیادہ تر کہانیاں پنچ تنتر
سے ماخوذ ہیں جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ تقریباً اسی دور میں شیخ حفیظ الدین
ابوالفضل کی تصنیف "عیارِ دانش" کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "خرد افروز"
رکھا۔ اس کتاب کا سلسلہ بھی سنسکرت کی مشہور کتاب "کلیلہ و دمنہ" تک پہنچتا
ہے۔ اسی دور میں مولوی اکرام علی صاحب نے عربی رسالہ "اخوان الصفا" کا ترجمہ
اردو میں کیا اور اس کا نام بھی "اخوان الصفا" رکھا۔ فورٹ ولیم کالج کے عہد کے
بعد دورِ متوسطہ میں بھی رمزیہ نگاری کی طرف کچھ نہ کچھ لوگوں کی توجہ رہی۔
چنانچہ فقیر محمد خاں گویا نے ۱۸۳۵ء میں "انوارِ سہیلی" کا ترجمہ کیا اور "بستانِ حکمت"
نام رکھا۔ ان سارے ترجموں کے مطالعے سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دورِ
متوسطہ میں رمزیہ ادب نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔

آزاد کا عہد رمزیہ نگاری کے اعتبار سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس
دور میں رمزیہ فارسی کتب کے ترجموں سے داخل نہیں ہوا بلکہ نثر نگاروں نے
خود ذاتی طور پر رمزیہ مضامین لکھے۔ خصوصاً سرسید احمد خاں کے کچھ مضامین
رمزیہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مضمون
"امید کی خوشی" کو اردو کے رمزیہ ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔
سرسید کے علاوہ محسن الملک نے بھی رمزیہ مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلہ
میں "موجودہ تعلیم و تربیت کا شجرہ" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔
شرر لکھنوی کے بہت سے رمزیہ مضامین ان کے رسالہ "دلگداز" میں شائع
ہوئے ہیں اور کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ حالی کے چند مضامین میں بھی تمثیلی رنگ

موجود ہے۔ ان کا مضمون "زبانِ گویا" تمثیلی رنگ کا حامل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے زمانہ میں رمزیہ نگاری آزادانہ طور پر
اردو کے دبستان میں داخل ہو گئی اور مذکورہ بالا انشا پردازوں نے اس کی قدر دانی
کی۔ مگر اس کے صحیح خط و خال کو صرف آزاد نے پہچانا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کرنل
ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات نے آزاد کو یونانی اساطیر کے نکات سمجھا دیے تھے اور
ان کے سامنے رمزیہ تصورات کے خاکے پیش کر دیے تھے۔ چونکہ مولانا آزاد
فطری طور پر ذہین آدمی تھے اس لئے انہوں نے ان رمزیہ نکات کو گرفت میں
لے لینے کی کوشش کی۔ اس طرح ان کو اپنے خیالستان کی سجاوٹ کے لئے
نئی تصویریں مل گئیں۔

مولانا آزاد نے "نیرنگِ خیال" حصہ اول میں جو دیباچہ لکھا ہے اس سے
یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ رمزیہ کا مفہوم بڑی حد تک سمجھتے ہیں۔ انہوں نے
اس بات کو محسوس کیا کہ زبانِ انگریزی میں "نثر میں بھی خیالی داستانیں یا
اکثر مضامین خاص مقصد پر لکھے گئے ہیں"۔ ان کا قول ہے کہ "بہت سے مضامین
ایسے ہیں جن کی روشنی ابھی ہمارے دل و دماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض مضامین
وہ ہیں جن میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا گیا ہے۔ انہیں
انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے۔ ان کے معاملات میں ترقی اور تنزل
کو سرگذشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شگفتگی طبع کے علاوہ یہ غرض
رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی حقیقت پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلقِ بد سے
نفرت ہو یا کسی حصولِ مطلب کے راستے میں جو نشیب و فراز آتے ہیں ان سے
واقف ہو"۔ مولانا آزاد کے ان خیالات میں انگریزی رمزیہ نگاری کی روح موجود

اس کے بعد آزاد نے انگریزی انتھالوجی یا علم الاصنام کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً "وقت ایک پیر کہن سال کی تصویر ہے اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پر پرواز لگے ہیں۔ گویا ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح انگریزی علم الاصنام میں غصہ کو ایک عورت تصور کیا جاتا ہے۔ جس کا رنگ کالا ہے صورت ڈراؤنی ہے اور تمام بدن پر بال کھڑے ہیں۔ عشق کو ایک نوجوان خوبصورت لڑکا تصور کیا جاتا ہے جو آنکھوں سے اندھا ہے۔ افواہ یا شہرت ایک بوڑھی عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ حسن ایک پری ہے جو سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے۔

غرض یہ کہ مولانا آزاد نے بتایا ہے کہ انگریزی انتھالوجی میں ہر جذبۂ انسانی کو گاڈز (GODS) کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خزاں، بہار اور موسیقی کے لیے بھی گاڈز مقرر ہیں۔ مولانا آزاد کا یہ خیال بہت درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانی اور انگریزی ادب میں قدم قدم پر گاڈز اور گاڈیسیز کا ذکر ملتا ہے۔

مولانا آزاد نے اس بات کو بھی محسوس کیا ہے کہ جس طرح انگریزی اور سنسکرت ادب میں مجرد خیالات کو دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں ظاہر کرتے ہیں اسی طرح سے اردو ادب میں ممکن نہیں ہے۔ اس کا سبب انہوں نے یہ بتایا ہے کہ:-

"اردو کے باغ نے فارسی اور عربی کے چشموں سے پانی پیا ہے۔ وہاں دیوی دیوتاؤں کا ذکر نہیں۔ دراصل اسلام کی بنیاد توحید پہ پڑی ہے۔ اسلئے اسلام میں دیوی دیوتا کا تصور نہیں ملتا۔ مگر قبل اسلام آتش پرستوں میں

مختلف خداؤں کا تصور موجود تھا۔ چنانچہ اہرمن خدائے شر اور یزداں خدائے خیر کہلاتا تھا۔ اسلام نے ان تصورات کو ختم کر دیئے۔ آزاد نے ایک اور فلسفہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

"اہل شریعت نے اس کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک فرشتہ موکل مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صرف زبان کا فرق ہے ورنہ وہی دیوتا، وہی گاڈ، وہی رب النوع، وہی فرشتہ موکل۔"

بہرحال عربی اور فارسی ادب میں مجرد خیالات کو شکل کر کے دیوی اور دیوتاؤں کے روپ میں پیش کرنے کا رواج نہیں ہے۔ اس لیے مولانا آزاد نے بھی مجرد خیالات کو دیوی دیوتا کے روپ میں نہیں پیش کیا ہے۔ بلکہ انہی خیالات کو بذات خود مجسم کر دیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا آزاد نے دور جدید میں رمزیہ نگاری کو خاص طور سے ترقی دی۔ آزاد کی رمزیہ نگاری اور دور قدیم اور دور متوسط کی رمزیہ نگاری میں نمایاں فرق ہے۔ دور قدیم اور دور متوسط کی رمزیہ نگاری زیادہ تر داستان اور قصہ کی شکل میں ہے۔ لیکن آزاد کی رمزیہ نگاری مضامین کی صورت میں موجود ہے۔

"نیرنگ خیال کے مضامین میں اگر کوئی کمزوری نظر آتی ہے تو بقول مولانا حامد حسین قادری صرف یہ کہ آزاد نے "رمز و تمثیل کی ایک شکل پسند کی ہے اور ہر جگہ اسی سے کام لیا ہے یعنی اشیائے بے جان اور قوائے اخلاق انسانی کو مجسم کر کے اپنے افسانوں کے اشخاص و کردار پیدا کیے ہیں۔ ہر جگہ ایمان، دل، عقل، نفس، انصاف، ظلم وغیرہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو بار بار دیکھ کر

بھی اُکتا جاتا ہے۔[۲۱]

مولانا آزاد کے اِن رمزیہ مضامین میں طنز کے بھی نشتر موجود ہیں۔ اُنھوں نے تمثیل کے پردے میں سماج کے عیوب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل رمزیہ اس لحاظ سے بہت مفید چیز ہے۔ ظاہری طور پر تو رمزیہ کے نشتر کی تیزی نہیں محسوس ہوتی ہے مگر وہ گھاؤ بہت گمبھیر ہوتا ہے۔

دورِ جدید میں رمزیہ کے اعتبار سے "نیرنگِ خیال" کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مولانا آزاد رمزیہ کے پودے کو مغربی سرزمین سے لائے اور اس کو ہندوستان میں لگایا۔ مگر ان کے بعد یہ پودا زیادہ سرسبز نہ ہو سکا۔

تاریخ نویسی:۔

دربارِ اکبری:۔

آزاد مرحوم کی تاریخی تصانیف میں "دربارِ اکبری" سب سے مشہور کتاب ہے۔ اپنی عبارت کی رنگینی و دلآویزی کے اعتبار سے بھی یہ اُن کی تیسری بہترین تصنیف ہے۔ تاریخ جیسے خشک و بے کیف مضمون میں بھی آزاد کا رنگ نمایاں ہے۔

اس میں جلال الدین اکبر شہنشاہِ ہندوستان اور اُس کے امرائے جلیل القدر کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ اکبر اور اُس کی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا کارنامہ اور اُس کی مہمات، تفریحی مشاغل، مصالح مملکت، اُس کے عہد کی تعمیرات و عمارات۔ غرض اکبر کے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات جادو نگاری سے آراستہ کر کے قلمبند کی ہے۔ اصل میں یہ کتاب اُس عہد کے ہندوستان کی ایسی

دلکش اور جامع تاریخ ہے کہ جس میں عام فہم محاورات کے دریا بہا دیے ہیں جو موثر خانہ شان کے ساتھ اُردو ادب کا بہترین ادبی کارنامہ کہلایا جا سکتا ہے۔ اُردو زبان میں اکبری عہد کے واقعات اِس قدر تفصیل کے ساتھ ملنے مشکل ہیں۔ جہاں تک وقائع نگاری کا تعلق ہے اُن تمام واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن کا تعلق اکبر اور ہندوستان سے ہے اگر کوئی صحیح معنوں میں تاریخِ ہند کی اِس جلیل القدر ہستی کی زندگی کے حالات من و عن جاننا چاہتا ہے تو وہ صرف "دربارِ اکبری" پڑھ لے۔ اور آزاد کا اندازِ بیان، جس جگہ کو کھولیے۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظرِ ثانی کے بعد نہ چھپوا سکے۔ اس کی نسبت اپنے قلمی خط میں لکھا ہے "دربارِ اکبری، سات آٹھ سو صفحے کی کتاب میں نے لکھی ہے۔ اِس میں امرائے عہدِ اکبر کے حالات اُسی لطف کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ جس طرح میر، سودا، مسعود انشا کے حالات آپ نے "آبِ حیات" میں دیکھے۔ کتاب تیار ہے۔ فقط نظرِ ثانی کی کسر ہے۔" مورخہ ۸ جون ۸۸ء

لالہ سری رام مؤلفِ "خمخانۂ جاوید" رقمطراز ہیں: "اُن کی پرانی تالیف موسوم بہ دربارِ اکبری جسے خود ترتیب دے کے نہ چھپوا سکے، حال میں شائع ہوئی ہے۔ مگر اس صورت میں بھی یہ کتاب عبارت کی رنگینی کے اعتبار سے اُن کی بہترین تصنیفات میں ہے۔"[۲۲]

مؤلف "تاریخِ ادبِ اُردو" رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:۔

"یہ عظیم الشان تصنیف اکبر کے عہد اور اُن کے ارکانِ سلطنت کے حال میں ہے۔ اِس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس کہ

اس پر نظرِ ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہدِ اکبری کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا مؤلف "سیر المصنفین" لکھتے ہیں:-

"دربارِ اکبری" کی عبارت دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ احباب کو ضرور لارڈ مکالے کی تاریخ نویسی یاد آجاتی ہے۔ جو لطف انگریزی میں لارڈ موصوف کی تحریر سے پیدا ہوتا ہے بعینہٖ آزاد کی تحریر اُردو میں دل پر وہی اثر کرتی ہے۔ اور جس طرح مکالے کی "تاریخ انگلستان" ناقابلِ اعتماد ہے۔ بعینہٖ یہی حال ایک حد تک "دربارِ اکبری" کا ہے۔ کیونکہ آزاد نے اپنی آرا اور اپنے جذبات کو ہر جگہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ امر اصولِ فنِ تاریخ نویسی کے بالکل خلاف ہے۔ اگرچہ اکثر مورخ اسی دام میں پھنس جاتے ہیں۔"[۲۳]

اب تصنیف کی نسبت خود مصنف کا خیال دیکھئے:-

"لوگ کہیں گے آزاد نے "دربارِ اکبری" لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ تو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جس سے شہنشاہ موصوف کے مذہب، اخلاق، عادات، سلطنت کے دستور و آداب اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔"

اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ دربارِ اکبری میں اکبر کے خصائل و عادات بیان کرنے میں آزاد نے اپنے پورے زورِ قلم اور طلاقتِ بیان سے کام لیا ہے۔ جس کی نظیر ان کی تمام تصانیف میں دوسری جگہ مشکل سے مل سکتی ہے۔

شیخ ابوالفضل کے مرنے پر کیسی اچھی بات لکھی ہے جو بذاتِ خود

ایک ضرب المثل ہے: "۵۲ برس چند مہینے کا سِن، مرنے کے دن نہ تھے مگر موت نہ دن دیکھتی ہے نہ رات، جب آجائے وہی اُس کا وقت ہے۔" عبدالرحیم خانخاناں حاتم ثانی کے ذکر میں بلاغت و فصاحت کی جھلکیاں بھر دی ہیں۔ لطائف و ظرافت سے اُن کے ذکر کو خوب سجایا ہے۔ مثلاً شیر شاہ سوری کے متعلق ایک لطیفہ ہے جس میں اپنے اندازِ بیان کا سحر جگایا ہے۔

لسانیات پر عبور:-

سخندانِ فارس:-

اُردو زبان میں سب سے پہلے لسانی تاریخ سے آزاد نے بحث کی ہے۔ اس زمانے میں یورپ میں اس فن کی ابتدا ہوئے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ آج یہ علم مدون صورت میں علم الالسنہ یا انگریزی میں فیلالوجی کے نام سے موسوم ہے۔ آزاد نے اپنے زمانے میں اہلِ یورپ کی غیر زبانوں میں تحقیق و تفتیش کو دیکھ کر سب سے پہلے فارسی زبان کی تاریخ و تحقیق کی مباحث کو اُردو زبان میں چھیڑا جبکہ اس زبان میں اتنی طاقت و توانائی نہیں تھی کہ ایسے دقیق مسائل کی تفہیم کی اہل ہو سکے یہ آزاد کا ہی حوصلہ تھا۔ چنانچہ یہ عقیدہ اب ہم پر اچھی طرح کھل گیا کہ آزاد نے نہ صرف اشخاص کی تاریخ ہی لکھی ہے بلکہ زبانوں کی تاریخ بھی لکھی نہ صرف تاریخ بلکہ یوں کہئے کہ فلسفۂ زبان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس راستہ سے ہم کو روشناس کیا ہے۔ یعنی زبان کی

اصل ایک زبان کا دوسری زبانوں سے تعلق، الفاظ کی اصل اور معنی کے تغیرات کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔

لسانی مباحث کے علاوہ آزاد نے ایران وغیرہ کے قدیم رسم و رواج کا مقابلہ ہندوستان کے رسوم کے ساتھ کیا ہے اور اپنی سیاحت ایران کے دلچسپ حالات موقع موقع پر درج کیے ہیں۔ نہ صرف سیاحت و مسافت، بلکہ وہاں کے میلے ٹھیلے دیکھے، شادی وغمی کی محفلوں میں حصہ لیا اور یہ مواد تیار کیا۔ (غرض اُن کی اس علمی و لسانی تحقیق و تدقیق کا اصلی مظہر "سخندانِ فارس" ہے جو بذات خود فارسی زبان کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ یہ مصنف کی پندرہ برس کی محنت و جانکاہی کا ثمر ہے اور نہایت قابلِ قدر و دلچسپ کتاب ہے) علاوہ سفر کے حالات اور اپنے ذاتی دلچسپ تجربوں کے، قابل مصنف نے اس میں مختلف زبانوں کے مقابلے سے قوموں کے باہمی رشتوں کے مٹے ہوئے سراغ نکالے ہیں۔ ژند، پہلوی، دری، سنسکرت کے الفاظ کا مقابلہ کر کے تاریخی نتائج نکالے اور مشہور مصنفین کی نظم و نثر کے مابہ الامتیاز پہلو دکھائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ زبانِ فارسی کی ایسی تاریخ اب تک ہندوستان میں اس سے قبل نہیں لکھی گئی۔ فیلالوجی کا فن زبان کے رُوشناسوں کے لیے آسان کر دیا۔

آغا محمد طاہر اس کی نسبت دیباچہ میں لکھتے ہیں۔[۲۳]

"سخندانِ فارس نام تو آپ کی کتاب کا ہے مگر درحقیقت سخندانِ فارس خود بدولت ہی تھے۔ فیضی ابوالفضل ہوں یا ہمارے مرزا غالب مرحوم، ان حضرات نے فارسی کی تحقیق و تدقیق میں حضرت آزاد جیسی کاوش اور محنت نہیں اُٹھائی۔ ان حضرات کی بڑی عرقریزی یہی تھی کہ اپنے گھر میں یا اپنے شہر میں فارسی دواوین،

فارسی علم ادب کی کتابیں یا فارسی زبان کی لغت اور فرہنگیں پڑھ لیں یا تُرک، افغان وغیرہ جو ایران و توران سے دلی، آگرہ وارد ہوئے اُن کی گفتگو سنکر اپنے ذہنِ رسا اور حافظۂ خداداد کے ذریعہ سے محاورے یاد کر لیے۔ مگر قصۂ زمین برسر زمین پورا ہوتا ہے۔ فارسی زبان کی تحقیق کے لیے ان میں سے ایک صاحب بھی دلی کے کابلی دروازہ سے باہر نہ نکلے۔ یہ حضرت آزاد ہی کا جگر اور حوصلہ تھا کہ سفر کی صعوبتیں اور تکلیفیں جھیل کر فارس کی سرزمین میں پہنچے۔"

اس کا حجم ۱۳۷ صفحے ہے۔ یہ جامع تاریخ لسان مندرجۂ ذیل پر مشتمل ہے۔ تمہید خود آزاد نے لکھی ہے جس کی تاریخ ۵ ر اگست ۱۸۸۷ء ہے لیکن یہ چھپی ۱۹۰۷ء میں۔

حصۂ اوّل میں علم اللسان پر بحث کی ہے۔ لغات اور زبانوں کے فلسفیانہ وتحقیقاتی اصول بتائے ہیں۔ انسان کے حیوانِ ناطق ہونے پر ایک مدلل بحث ہے جس میں فنِ تقریر کی بندی کی چندی کر دی ہے۔ زبان کے جینے اور مرنے کے اسباب بتائے ہیں کہ اس کے ہست و بود کا دارومدار کس پر ہے۔ وہ کیونکر پنپ سکتی ہے۔ سنسکرت اور فارسی کا بہناپا کر کیسے ایک کا گھرا لگاؤ دوسرے سے ہے۔

آزاد کی کچھ اور تصانیف پر ایک نظر

نگارستانِ فارس:۔

یہ سخندانِ فارس کی دوسری کڑی ہے جس میں رودکی سے لیکر واقف بٹالوی

تک کے شاہیر شعراء کی سوانح عمریاں ہیں۔ حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ کلام بھی درج ہے۔ یہ بھی آزاد کا تاریخی کارنامہ ہے۔ اس کتاب کو آغا محمد طاہر نے ۱۹۱۳ء میں طبع فرمایا۔ ۲۳۲ صفحات اس کا حجم ہے۔ آخر میں "عرض کیفیت" کے عنوان سے طاہر صاحب نے اظہارِ حال کیا ہے جو چار صفحوں پر محیط ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"افسوس اس وقت علامہ شبلی زندہ نہیں۔ وہ ہوتے تو اس تذکرہ کو دیکھ کر حضرت آزاد کے کمال کی داد دیتے کیونکہ "وائے بر جان سخن گر بہ سخنداں نرسد" قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔

وہ خود مورخ اور تذکرہ نویس، فارسی کے زبان داں اور شاعر مجمع علوم و فنون تھے۔ حضرت آزاد کی کتابوں کو بہت عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے اہلِ کمال اپنے ہم پیشہ و ہم رتبہ کی ضرور تعظیم کرتے ہیں"[۲۵]

اس میں تاریخ کو ادبی رنگ میں پیش کر کے ہر قصہ میں ایک نیا پہلو اختیار کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر میر معز الدین موسوی خاں فطرت (عہد جہانگیر کے ایک صاحب کمال) کے بیان میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے:۔

"ایک دن کوئی شاعر یاوہ گو اپنے اشعار میر کو سناتا تھا اور داد چاہتا تھا۔ کسی مقام پر ایک لفظ غلط ایسا بیہودہ باندھا تھا کہ میر نے ٹوکا۔ اس نے کہا کہ ضرورت شعر کے لیے۔ میر نے کہا "تمہیں شعر کہنا کیا ضروری تھا"۔

ایک اور موقع پر لکھا ہے:۔

"میر نے ایک دن اپنی ولادت کی تاریخ خود اس طرح بیان کی کہ "افضل اہل زمانہ" برخورش نے عرض کی کہ میں بھی اسی سال پیدا ہوا ہوں۔ یہ تو مجھے عنایت ہو کیونکہ میرا تو نام بھی فضل ہے۔ آپ اپنے لیے اور کہہ لیجیے گا۔

ہنس کر کہا "اچھا خدا مبارک کرے"۔

مکتوباتِ آزاد:۔

اس کتاب کی نسبت حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی دیباچہ میں لکھتے ہیں[۲۶]:

"آزاد کے چاہنے والوں نے بہت چاہا کہ آزاد کی نشار آپ کی شان اور درجے موافق ضخیم بھی ہو، دلچسپ بھی، مفید بھی۔ کچھ نہیں تو غالب کی اردوئے معلّیٰ اور عود ہندی جیسی تو ہو مگر یہ مراد پوری نہ ہوئی۔ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لاء کی خواہش اور کوشش کے باوجود سوائے میجر سید حسن صاحب بلگرامی کے کسی اللہ کے بندے نے ادھر توجہ نہیں دی۔ میجر صاحب ممدوح نے دریا دلی سے کام لیا اور آپ کے پاس جو ۳۰۔۳۲ خط حضرت آزاد کے قلم جواہر رقم کے لکھے ہوئے رکھے تھے وہ بے دریغ بیرسٹر صاحب ممدوح کے پاس بھیج دیئے۔ اور بیرسٹر صاحب دام اقبالہٗ نے وہ خطوط وقتاً فوقتاً اپنے رسالہ 'مخزن' میں شائع کئے۔ خط کیا جواہر کے ٹکڑے تھے جن کی خریداری کیلئے سارا ہندوستان اُمڈ پڑا"۔

آزاد مرحوم کے یہ خطوط گوناگوں دلفریبیوں کے حامل ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر خطوط دوستوں اور شاگردوں کے نام ہیں۔ طاہر صاحب نے ان کو مرتب کرکے سر عبدالقادر کے نام معنون کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا آزاد کا قلمی خط اپنے فرزند محمد ابراہیم کے نام ہے جو ۵ر جون ۷۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرے صفحہ پر اُن کی تصویر ہے۔ پھر مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے دیباچہ لکھا ہے۔ آٹھ صفحے اُس کی تعریف اور اُس کے اغراض و مقاصد میں

رنگے ہیں۔ گیارہویں صفحے سے ۳۵ صفحے تک حضرت ناصر نذیر فراقؔ دہلوی نبیرہ خواجہ میر دردؔ مرحوم نے ایک دلچسپ داستان لکھی ہے۔ جس میں اپنی شاگردی کا ذکر، مولانا آزادؔ سے ملاقات، اُن سے شرفِ تلمذ کا زرّین موقع اور آزادؔ مرحوم کی دیوانگی کے آخری ایام کا عبرت انگیز قصہ بیان کیا ہے۔ اب یہاں سے مکتوبِ آزادؔ کی ابتدا ہوئی ہے۔ سب سے پہلا خط میجر سید حسن بلگرامی صاحب کے نام ہے۔ اس خط میں اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کا ذکر کیا ہے۔

"خطوط اور کارڈوں کا ایک انبار پڑا ہے۔ اور دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں"۔ دوسرے خط میں میجر صاحب کو عورتوں کے تذکرہ کے سلسلے میں کچھ اشارے دیے ہیں، مشہور شاعرہ خواتین کا ذکر ہے۔ مثلاً گلبدن بیگم ہمایوں کی بہن، زیب النسا، سلیمہ، سلطان بیگم وغیرہ کہ میجر صاحب ایک ایسا تذکرہ مرتب کرنے والے تھے اور آزادؔ سے کچھ مواد کے طالب تھے۔ آزادؔ لکھتے ہیں:-

"سلیمہ سلطان ہمایوں کی بھتیجی زاد بہن تھی۔ نہایت عالی فہم، لطیفہ گو، بذلہ سنج، خوش تقریر، صاحبِ تدبیر، زیب النسا کی طرح وہ مخفی تخلص کرتی تھی۔ نظم تو اتنی لائق مگر جہاں دیکھا اس کا ایک ہی شعر لکھا دیکھا۔ شعر:-

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام

مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

ایک خط میں "آبِ حیات" کی تعریف پر لکھتے ہیں:-

"جو کچھ 'آبِ حیات' کے باب میں فرمایا ہے فقط قدر افزائی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔"

مکتوب کا یہ مجموعہ ۲۶۴ صفحات کی تصنیف ہے۔

فلسفۃ الحیات:-

۹۶ صفحات کی ایک تصنیف ہے جس میں اُردو زبان میں الہامی طرزِ بیان جلوہ گر ہے۔ مرحوم نے یہ کتاب عالمِ خود فراموشی میں لکھی ہے۔ چنانچہ ہر اس شخص کے لیے یہ کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے جو دقیق النظر ہونے کے علاوہ نفسیات سے بھی کچھ لگاؤ رکھتا ہے کیونکہ مولانا نے اس کو کچھ ایسی رنگ میں لکھا ہے گویا یہ تمام عبارت کوئی دوسری قوت لکھوا رہی ہے، وہ خود کچھ نہیں لکھتے۔

اس میں آپ مختلف باتیں دیکھیں گے۔ بعض عقائد کی بحثیں ہیں اور عقلی نظریات جو مختلف زمانوں میں موجود تھے اُن کو مولانا نے آپس میں متوازن کیا ہے۔ کچھ حصّہ دعاؤں اور التجاؤں سے معمور ہے۔ طرزِ تحریر ایک ہی ڈگر پر قائم نہیں، جلد بدلتی ہے۔ ابتدا میں ذرا اُلجھن ہوتی ہے۔ لیکن ایک نئی طرز کی اُردو ہے جس کو ذرا غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ابتدائی دو صفحے بالکل مجذوب کی بڑ معلوم ہوتے ہیں ان کو سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ تیسرے صفحے پر نفسِ ناطقہ سے مخاطب ہیں اور گویا اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ جو کچھ افعال انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ان سب کا فرمانروا "ایشور" ہے۔ اس میں انہوں نے خدا کو ایشور لکھا ہے۔

اس کتاب کے جتنے ابواب ہیں وہ باب نہیں کہلاتے بلکہ "ملاپ" سے معنون ہیں۔ مثلاً "فلسفۃ الحیات" شش ملاپ پر محیط ہے۔

نفسِ ناطقہ کی تعریف کے بعد پہلا ملاپ ہے۔ اس میں اُن چیزوں کا بیان ہے جنھیں ہم دیکھتے ہیں اور وہ ہیں جسے سوچتے ہیں اور پاتے ہیں۔ مثلاً مادہ

دونوں قابل تھے' یہ اخبار اتنا مقبول خاص و عام ہوا کہ اپنے ہم عصر اخباروں
سے بازی لے گیا۔ یوں بھی مضامین کی رنگینی و خوبی عبارت کی برجستگی
اور خوش اسلوبی نے جس کو ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ کسی شاندار ہر دلعزیزی
کو دیکھ کر ہندوستانی اخباروں کے دل جذبۂ رشک سے جل اُٹھے اور ان
سب نے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ گورنمنٹ کا رعایا کے مقابلہ میں اخبار
شائع کرنا در پردہ ملکی لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ گورنمنٹ نے اِس معقول
عذر کو تسلیم کر لیا۔ اخبار مذکور کی جگہ ایک رسالہ "پنجاب میگزین" کے نام سے
جاری کر دیا۔ حضرت آزاد پروفیسر ہو گئے تو خواجہ حالی نے بھی کچھ دنوں
"اتالیق پنجاب" کی سب ایڈیٹری کا کام انجام دیا تھا۔ دراصل یہ سب ایڈیٹری
نہ تھی۔ یہ دونوں اصحاب اُن مضامین کی جو انگریزی سے ترجمہ کئے جاتے تھے زبان کی
اصلاح و درستی پر مامور تھے۔

سیر ایران:۔

یہ سیاحت ایران پر لکھا ہوا ۲۰۸ صفحات کا روزنامچہ ہے۔ جناب
آغا محمد طاہر نے اِس پر دیباچہ لکھا ہے اور اس میں مولانا آزاد کے سفر ایران
کے اسباب وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً انہوں (آزاد) نے اپنے آبا و اجداد
کے کتب خانہ کو بڑھانے اور اس کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ٹھانی جس کے لیے
اکثر ایسے اتفاقات پیش آئے کہ ایک نہ ایک نئی کتاب کی اُن کو ضرورت
محسوس ہوتی اور باوجود تلاش بسیار وہ نہ ملتی اور اُن کی تشنگی اس حد تک
تجاوز کر گئی کہ اُن کو ایران کا سفر کرنا پڑا۔

آزاد کی انشا پردازی

اُنیسویں صدی کا آخری دور سیاسی اور سماجی اعتبار سے چاہے جتنا

انحطاط پذیر ہو لیکن ادبی اور علمی لحاظ سے اس کو عہدِ زرّیں ضرور کہا جا سکتا ہے
اس دور میں سرسید' آزاد' نذیر احمد' حالی اور شبلی اپنی نثر کے گوناگوں اور بوقلموں
مناظر پیش کر رہے تھے۔ جن میں ہم کو فکر کے چراغ' علم کے موتی' ظرافت کے پھول'
فن کی روشنی اور تحقیق کی چاندنی سب کچھ نظر آتا ہے۔ کہیں نئے اردو نثر کے دور کی
تزئین اور ترصیع میں مولوی محمد حسین آزاد کا بھی زبردست ہاتھ ہے۔ دراصل
خالص انشا پردازی کی بنیاد آزاد ہی نے ڈالی ہے۔ آزاد سے پہلے بھی شمالی ہند
میں انشا پردازی کا وجود ملتا ہے۔ مگر اس انشا پردازی کی صرف تاریخی
اہمیت ہو سکتی ہے اس کی ادبی اہمیت مشکوک ہے۔ مثلاً میر محمد عطا حسین خاں
تحسین کی کتاب "طرزِ مرصع" میں عربی فارسی کی ترکیبیں اور تشبیہیں بکثرت
پائی جاتی ہیں۔ رجب علی بیگ سرور کا "فسانۂ عجائب" بھی اس نقص سے
بری نہیں ہے۔ الغرض عام طور پر آزاد سے پہلے کی نثر مقفیٰ اور مسجع ہونے کی
وجہ سے آورد اور تصنع کا ایک مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ نثر کے اس صحرا میں
میرامن کی "باغ و بہار" حیدری کی "آرائش محفل" کو نخلستان ہی سمجھنا چاہیئے۔
ایسی نثر دورِ قدیم میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

آزاد انشا پرداز پہلے ہیں اور نقاد' مورخ اور محقق بعد میں۔ آزاد
کی توجہ خیال کی وضاحت سے زیادہ زبان کی لطافت پر ہوتی ہے۔ اسلیے
آزاد کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے ہمارے جمالیاتی ذوق کی
تسکین ہوتی ہے۔ ایک انشا پرداز کے فن کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے
یہی وجہ ہے کہ اردو کے نازک مزاج انشا پرداز مہدی افادی نے آزاد کو
"آقائے اردو" کے لقب سے یاد کیا۔ وہ اپنے مضمون "اردو لٹریچر" میں

"عناصر خمسہ" میں لکھتے ہیں۔

"سر سید سے معقولات الگ کر دیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے۔ سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

آزاد کا طرزِ تحریر :-

اگر کسی شخص کو آزاد کی سوانح زندگی، انقلابات و مصائب، انتادِ طبع اور جذب و جنون کا حال معلوم نہ ہو اور وہ اُن کی "آبِ حیات"، "نیرنگِ خیال"، "قصصِ ہند"، "دربارِ اکبری"، "سخندانِ فارس"، وغیرہ کتب جو آثارِ جنون کے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں، مطالعہ کرے تو پڑھنے والا آزاد کے اسلوبِ تحریر کی جدت، دلکشی اور آزاد کی فصاحت و لطافتِ طبع سے متاثر ہونے کے ساتھ یہ بھی محسوس کریگا کہ یہ مصنف "خیالی بندہ" و عالمِ خیال کا رہنے والا ہے۔ اُس کی ذہنی فضا احساسات و تصورات سے بھری ہوئی یا اُس کے دماغ پر تخیل کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔

علامہ آزاد کی تمام تصانیف اس نظریہ کی دلیل ہیں۔ صرف "نیرنگِ خیال" کے تخیلی و رمزیہ مضامین پر یہ قیاس قائم نہیں کیا گیا۔ اس طرح کی مستقل کتابیں عربی فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اردو میں بھی ایسے مضامین سر سید، محسن الملک، حالی وغیرہ نے لکھے ہیں اور وہ یقیناً "خیالی بندے" نہ تھے۔ نیرنگِ خیال کے علاوہ آزاد کی "آبِ حیات" میں ہر دور کی تمہید و خاتمہ، دربارِ اکبری و سخندانِ فارس

دیوانِ ذوق کے چند چھوٹے جملے اور بڑی عبارتیں آزاد کی اس ذہنیت کی شاہد ہیں، چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جو طرز نگارش سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آزاد اپنے تخلص (آزاد) کو جابجا ضمیر متکلم کی جگہ استعمال کرتے ہیں، یہ انداز ..... کہیں کہیں قدیم مصنفوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن نہ اس کثرت سے نہ اس طرز پر تاہم کلیہ استعمال عجیب آزاد روی کی شان رکھتا ہے۔

دوسرا جدید اسلوب یہ ہے کہ جابجا استعارہ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ دوسرے مصنفوں نے کہیں اتفاق ہی سے کیا ہوگا۔ مثلاً "پھولوں کی مہک جا کر اُڑایا" (آبِ حیات: تذکرہ میر تقی میر)

"تحیاب ترک کے صاحبِ ملک اور صاحبِ زبان تھے۔ ان کی حُبّ الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو خاک کے کانٹوں سے سنتی تو عجیب نہ تھا۔"

(سخندانِ فارس: فارس کی زبان میں انقلاب)

شاعرانہ فقرے اور تخیلی انداز آزاد کی تمام تصانیف میں بڑی کثرت سے ہے لیکن بالکل آورد ہے۔ یہ اسلوب مرزا غالب کے رقعوں میں کہیں پایا جاتا ہے تو اس انداز سے کہ آورد نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن دورِ اصلاح و ترقی یعنی سر سید اور ان کے بعد کے مصنفوں میں نہیں ہے۔ بہر حال یہ آزاد کی خصوصیت ہے۔

علامہ آزاد کی طبیعت میں نازک خیالی اور لطافت و موزونیت خداداد تھی۔ فارسی زبان کی محبت و شغف نے اس جوہر کو چمکا دیا تھا۔ ظہوری اور نعمت خاں عالی کی نثر کو پسند کرتے تھے اور ان کی نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں کا اثر

دل و دماغ پر تھا۔ چنانچہ سخندانِ فارس میں لکھتے ہیں:۔

"اُن کے نازک خیال، خوبصورت استعارے، نئی نئی تشبیہیں، خوشنما ترکیبیں، لفظوں کی عمدہ تراشیں، خیالوں کی نزاکتیں، طبیعتوں کی بلند پروازیاں، صنعتوں کے ہجوم جواب نہیں رکھتے۔ ظہوری نے جس فقرہ کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے، مجال نہیں کہ ایک کو اُٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اُس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا، بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے: "نکتہ ہائے برجستہ، غنچہ ہائے سربستہ" پھر کہتا ہے "ہر صفحش چمنے، ہر سطرے انجمنے، ہر حرفش نقطے، ہر نقطش داغے" (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے) "ابروان خجستہ، کلید دل ہائے بستہ"۔

اس کے بعد اس طرزِ تحریر کے استعمال کے متعلق ہدایت کرتے ہیں:۔

"بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑی غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔ انھوں نے خوبیِ الفاظ اور نزاکتِ خیال اور زورِ طبع کو بے مطلب و بے مدعا خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو اور بیانِ مطلب کے کام میں لاؤ۔ پھر دیکھو کہ تمہاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے۔"

چنانچہ آزاد خود اپنی تصانیف میں اس سے کام لیتے ہیں۔ اوپر جو مثالیں متفرق جلدوں کی لکھی گئی ہیں، ایسا ہی اسلوبِ نگارش آزاد کے ہاں طویل و مسلسل عبارتوں میں بھی ملتا ہے۔

(الف) "اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گذر چکا تھا اور ان کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ

اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ سا بھی آیا۔ یہ رنگ اگر اُسی قدر آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سُرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔"

(آبِ حیات: زبانِ اردو کی تاریخ ص ۴۹)

(ب) "جب وہ صاحبِ کمال (استاد ذوق) عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔" (آبِ حیات: تذکرۂ ذوق)

(ج) "حضرتِ عشق نے شادی کی تھی اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا۔ بیاہوں کو دم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ ... جودھ پور کا رُخ ہے کہ ادھر سے اُمید کی آواز آئی۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُمید نہ تھی، دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں آرزو منہ کھولے بیٹھی ہے۔" (دربارِ اکبری ص [illegible])

نثر میں شاعرانہ تخیل و اسلوبِ بیان کی ایسی دلکش و برجستہ مثالیں آزاد کے ہم عصروں میں کہیں نہیں ملتیں۔ یہ بھی آزاد کے عالمِ خیال کی آمد تھی۔

خیالی طرزِ ادا کی ایک اور دلچسپ صورت آزاد یہ اختیار کرتے ہیں کہ
تاریخی واقعات و قیاسیات جن کو دوسرے مصنف واقعہ فرض کرکے 'واقعہ کے
طور پر بیان کرتے ہیں' اُن کو آزاد قیاسی و احتمالی انداز میں لکھتے ہیں۔ مثلاً
زبانوں کی ساخت کے متعلق لکھتے ہیں:- "مگر ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں
اُن کی ایک زبان ہوگی۔ اسی کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں
رَہ سہہ کر بولتے ہوں گے اور ایک ہی الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام
دیتے ہوں گے یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان سے اس طرح نکلی ہوں گی
جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جُدا ہو گئیں۔" (سخندانِ فارس ص۱)
ایک اور مثال اس رنگ میں دیکھیے:-

عبدالرحیم خانخاناں کے بچپن کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں" وہ تین برس
کی جان (عبدالرحیم خانخاناں) بلکتا ہوگا۔ سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ انا کے پاس
چُھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بیچاریاں کہاں چھپالیں کہ آپ ہی چھپنے کی جگہ
نہیں۔ الٰہی تیری پناہ! عجب وقت ہوگا۔ شامِ غریباں اسی کو کہتے ہیں۔
رات قیامت کی رات گذری ہوگی۔ دن ہوا تو روزِ حشر۔" (دربارِ اکبری ص[illegible])

یہ اسلوبِ تحریر نہایت دلچسپ، لطیف اور پُرتاثیر ہے اور محاکات
پیدا کرنے کا بالکل صحیح طریقہ یہی ہے۔ "خیالستانِ آزاد" کے جلوے ہیں۔ کوئی
اور مصنف اس طرح نہیں لکھتا۔ یہ آزاد کی ایجاد ہے۔ علامہ آزاد کی تحریر
پر فارسی نثر کی کتابوں میں سے "گلستانِ سعدی" کی طرزِ تحریر کا اثر ہے۔
"سخندانِ فارس" میں ایک جگہ گلستان کا ذکر لکھتے ہیں:-
"عجائب اتفاقات سے یہ ہے کہ اسی صدی کے ۶۷۵ء میں شیخ سعدی

کی زبان پر جوشِ طبیعت نے چشمہ کھول دیا۔ جس میں فصاحت نے شربت اور بلاغت
نے دودھ بہایا اور گلستاں ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جس کا آج تک جواب
نہیں......... چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں۔ اور کتری کتری عبارت ہے۔
مگر خدا نے اس کے بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں ایسا رس دیا ہے کہ ریشم
کے لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ نصائح و پند کی دستکاری نے اس سے قلم
نہیں لگایا مگر سادگی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور اس کے ننھے ننھے فقرے
آیات اور حدیث کی طرح اب تک تقریروں اور تحریروں کو قوت دیتے ہیں۔
مزہ یہ ہے کہ جو چٹخارہ زبان کو نظم پڑھتے میں آتا ہے وہی اس کی نثر میں آتا ہے
کیونکہ اس کی قدرتی فصاحت نظم و نثر کو ایک خلا میں ڈبو جاتی ہے۔"
(سخندانِ فارس - تیسرا لکچر: ص۴۳)

اگرچہ آزاد کی زبان کو صنائع و بدائع کی دستکاری نے قلم لگایا ہے پھر
بھی منہ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کے فقرے گلستان کے
فقروں کی طرح تقریروں اور تحریروں کو قوت نہیں دیتے۔ تاہم اُن کے پڑھنے
میں زبان کو نظم کا سا چٹخارا ملتا ہے۔

یہی وصف طرزِ آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت اور بالکل انفرادی
شان ہے جس میں کوئی دوسرا مصنف اُن کا شریک نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے
فقرے، تشبیہ و استعارہ کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی،
الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت سب مل کر سادگی و پُرکاری کا عجیب و
نادر نمونہ پیش کرتے ہیں اور یہ اسلوب علامہ آزاد کی ہر تحریر میں موجود ہے۔
اسی کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن لکھ کر

دیکھئے تو صفحہ دو صفحہ لکھنے مشکل ہیں۔ آزاد اسی اسلوبِ بیان کے سبب سے
صاحبِ طرز کہلاتے ہیں۔ مذکورہ بالا سب چھوٹی بڑی عبارتیں اس کے نمونے
ہیں۔ ان کے علاوہ اور نمونے آزاد کی تصانیف کے سلسلہ میں آئندہ آئیں۔

طرزِ نگارش کا نقص :-

علامہ آزاد نے مختلف موضوعوں پر کتابیں لکھی ہیں۔ خیالی و تمثیلی مضامین
(نیرنگِ خیال)، تذکرہ شعراء (آبِ حیات)، تاریخ و سیرت (دربارِ اکبری)، فلسفۂ
زبان (سخندانِ فارس)، تاریخی کہانیاں (قصص ہند) وغیرہ۔ ان میں سے
ہر موضوع کے لئے الگ اسلوبِ بیان ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے ہر تصنیف
اپنے خیالی رنگ میں لکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو
تشبیہ و استعارہ میں بیان کئے گئے وہ اگرچہ صحیح و اصلی تھے تب بھی ان میں
فسانہ کا رنگ آگیا اور درست و واقعی تنقید بھی جب مبالغہ کے انداز میں
لکھی گئی تو خیالی ہو گئی۔ ان کی "آبِ حیات" میں "نیرنگِ خیال" کا لطف ہے
اور "دربارِ اکبری" میں "قصص ہند" کا مزہ۔ اسی لئے کہیں کہیں آزاد کی تحقیق
تحقیق نہیں معلوم ہوتی اور تنقید تنقید نہیں رہتی۔ لیکن کچھ نہ رہتے
پر بھی انشاپردازی کا عجیب لطف و اثر رہتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ آزاد
کے متعلق شبلی کی یہ رائے ہے :-

"آزاد کی کتاب آگئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں
تاہم ادھر ادھر گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے"[۲۵]

آزاد کی طبیعت کا خاصہ :-

علامہ آزاد مورخ بھی ہیں اور نقاد بھی اور مورخ و نقاد کا پہلا فرض
صداقت، انصاف اور بے تعصبی ہے۔ لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ
اپنی رائے کی تائید میں یا اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لئے یا اپنے پسندیدہ
و ناپسندیدہ شخص کی مدح و ذم کی خاطر کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں، کبھی
خلافِ واقع نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ ایسا کام کے لئے اسلوبِ بیان بڑا دلچسپ
و عجیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے حالات بیان کر رہے ہیں۔ اس کے جملہ
محاسن و فضائل نہایت عقیدت و ارادت سے لکھتے ہیں گویا بے تعصبی کے ساتھ
انصاف کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن لکھتے لکھتے کبھی درمیان میں، کبھی آخر میں
چٹکی لے لیتے ہیں۔ "آبِ حیات" اور "دربارِ اکبری" میں اس کا زیادہ موقع تھا۔
وہیں یہ باتیں خوب نظر آتی ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ اکبری تو اسی غرض
سے لکھی ہے۔ یہ تمام کتاب ملا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف "منتخب التواریخ"
پر مبنی ہے بلکہ ملا صاحب کی تردید و تضحیک کے لئے لکھی گئی ہے۔ علامہ آزاد کو
اکبر بادشاہ کی ذات و حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں۔ اس کے
اس لئے مداح ہیں کہ ابوالفضل، فیضی، خان خاناں وغیرہ کا قدردان ہے اور
چونکہ ملا عبدالقادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی و
اسلام کشی کو صداقت و جوشِ اسلامی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لئے آزاد
ملا صاحب سے بیزار ہیں۔ آزاد کی تصانیف سے چند مثالیں یہ ہیں۔

۱- "آبِ حیات" دورِ سوم میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی جو

خدمت آزاد نے کی ہے وہ صفحہ ۱۳۷ اور ۱۳۸ پر ہے۔

۲۔ آبِ حیات، دورِ پنجم میں شاہ نصیر دہلوی کے حسنِ اعتقاد کے سلسلہ میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے اُن کا حسنِ ظن حسنِ بیان واضح ہے۔

۳۔ دربارِ اکبری میں علامہ آزاد ہر موقع پر ملا عبدالقادر بدایونی کو لعن و طعن کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ دل کا بخار نکالنے کے سوائے کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً ملا صاحب نے ابوالفضل کے حال میں ایک جگہ لکھا ہے: "تفسیر آیۃ الکرسی کہ دقائق و نکاتِ قرآنی دراں خیلے مندرج شدہ دمی گویند کہ تصنیفِ والدش بود گناہ ریندہ عز تحسین یافت و تفسیر اکبری" "تاریخ آں شد" منتخب التواریخ۔ جلد دوم ص۱۹۸۔ اس پر علامہ آزاد دربارِ اکبری ص۱۹۱ میں ملا عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں "روسیاہ، تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی خوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہ ہی ہے تو اس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا، تمہارا باپ بھی ایسا تھا؟" ایک مثال ہے جسکے نمونوں سے تمام دربارِ اکبری بھری پڑی ہے۔

اولیاتِ آزاد:-

آزاد کا مرتبہ:-

آزاد باکمال "خدا ساز" ہستیوں میں تھے۔ اُن کا ذہن زبان و محاورہ، الفاظ و بندش کے انتخاب کے متعلق صحیح توازن و تناسب رکھتا تھا۔

اور اُن کی طبیعت میں ندرت، دلفریبی و جدت طرازی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ زبان و بیان کی شیرینی و ترقی میں کوئی ادیب اُن کا شریک نہیں ہیں۔ آزاد اپنے زمانہ کے پہلے صاحبِ طرز ہیں۔ آزاد کے طرزِ نگارش کو شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں بیان کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ آزاد تنہا "طرحدار" ادیب ہیں۔ اُن کی تحریر کا بانکپن سچ یہ ہے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے گویا مزے یہ دل کے لیے نہیں زبان کے لیے ہیں۔ اسی جدت پسندی کا نتیجہ ہے کہ علامہ آزاد نے طرزِ عبارت کی ایجاد کے علاوہ مضامین و موضوعات کی ترتیب و تالیف میں وہ جدتیں پیدا کی ہیں جو اُن سے پہلے موجود نہ تھیں اور یہ اولیاتِ آزاد ہیں۔ مثلاً شعراء کے تذکرے آزاد سے پہلے بھی بہت لکھے گئے لیکن سب نہایت مختصر تھے۔ اکثر میں حروفِ تہجی کی ترتیب تھی۔ کسی میں زمانہ کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تھا تو جہل اور سرسری طور پر۔ کسی میں حالات و کلام کے متعلق تحقیق و تفصیل نہ تھی، مقابلہ و موازنہ نہ تھا، زبان و محاورہ اور طرزِ کلام کا تجزیہ وار تقاء نہ تھا۔ آزاد کو سب سے پہلے ان تمام اجزاء و لوازم کی تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے آبِ حیات میں یہ سب خامیاں رفع کر دیں اور ایسی کتاب لکھ دی کہ آج بھی کوئی تذکرہ نویس "آبِ حیات" کے استفادہ سے بے نیاز نہیں ہے۔ پھر اس میں اگر کچھ غلط بیانیاں اور بیجا طرفداریاں بھی ہوں تو اُن سے آزاد کے فضلِ تقدم اور آبِ حیات کی اولیت میں فرق نہیں آتا۔

زبان کی ساخت اور ارتقاء کے متعلق آزاد کی "سخندانِ فارس"

اور "مقدمۂ آبِ حیات" سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آزاد کی زباندانی،
شوقِ تحقیق اور قوتِ ایجاد نے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصانیف
پیدا کر دی ہیں۔

رمزیہ و تمثیلی مضامین اور ان کے اسالیبِ نگارش کا اس قدر
تنوع اور ایسا کمال آزاد کے "نیرنگِ خیال" سے پہلے نظر نہیں آتا۔
آزاد نے اس پیرایہ میں مسائلِ مذہبی و علمی و ادبی کی تحقیق بھی
کی ہے اور نقد و تبصرہ بھی۔ طعن و طنز بھی کیا ہے اور اخلاق بھی
سکھائے ہیں۔

اگرچہ مولانا شبلی کی تاریخ و سیرت کی تصانیف "الفاروق" وغیرہ
کے سبب سے علامہ آزاد کی "دربارِ اکبری" کو اوّلیت کا درجہ حاصل
نہیں ہے تاہم تاریخ میں ادبی شان پیدا کرنا اور افسانہ و ناول سے زیادہ
دلچسپ بنا دینا آزاد ہی کا پہلا کمال ہے۔ خصوصاً اکبر بادشاہ کے
حالات خاص اہتمام سے لکھے ہیں۔ اگرچہ آزاد نے اکبر کی بے دینی اور
علماء کی توہین کو بہت سراہا ہے۔

اس لحاظ سے آزاد کا رتبہ موحد کا بھی ہے نقاد کا بھی اور صاحب
طرز کا بھی۔ آزاد سب سے پہلے انشاء پرداز ہیں پھر مورخ، تذکرہ نویس
اور سیرت نگار۔ ان کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان
کی انشاء پردازی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے بقائے دوام کے اعتبار سے
آزاد بہ حیثیت انشاء پرداز کے زندۂ جاوید ہیں۔ زبان و بیان کی

دلکشی میں ان کی ہر کتاب سدا بہار گلزار ہے۔ مطالعہ و حوالہ
کے لیے ان کی ہر کتاب مفید و ضروری ہے لیکن تحقیق و تنقید کی
نظر میں ان کی ہر کتاب پرانی ہو چکی ہے۔ "آبِ حیات" کے نظریے بدل
چکے ہیں اور بہتر تبصرے لکھے جا چکے ہیں "سخندانِ فارس" کے
تجزیے اور تقریظیں اب قولِ فیصل نہیں رہیں۔ "دربارِ اکبری"
تاریخ کے طالب علموں اور استادوں کیلئے پہلے بھی کچھ عجوبہ نہ تھی
اب تو بہت با اصول، مفصل و مکمل تاریخیں موجود ہیں۔

"نگارستانِ فارس" (تذکرہ شعرائے فارسی) صرف آزاد کے
شغف و عشقِ فارسی کا ایک چھینٹا ہے۔ لیکن اتنا ہلکا پڑا ہے کہ خود
آزاد کی تالیفات میں بھی اس کا کوئی درجہ نہیں۔ قدیم تذکرات "تذکرۂ
دولت شاہ سمرقندی" "آتشکدۂ آذر" "سروِ آزاد" وغیرہ کے مقابلہ
میں بھی کچھ نہیں ہے۔ چہ جائیکہ مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کی
تالیفات سے مقابلہ ہو سکے۔ "نیرنگِ خیال" آزاد کی دوسری کتابوں سے
زیادہ دیرپا ہے اس لئے کہ یہ نہ تاریخ ہے نہ "تذکرہ" نہ "سیرت"
نہ فلسفۂ زبان بلکہ صرف انشاء ہی انشاء ہے۔ اگرچہ یہ طرزِ رمز
و تمثیل مستقل مقالہ نگاری کی صورت میں رائج نہیں ہے لیکن یہ شانِ مجاز
اور صرف استعارہ شعر و ادب کا جزوی عنصر ہے اور اب بھی فسانے
اور ناول "مزاحیات و طنزیات" بلکہ تنقیدیں اور تبصرے اور ادبیات
و علمیات بھی "نیرنگِ خیال" کے رنگِ تحریر کے نمونے ضمنی جزوی
طور پر اپنے اندر رکھتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف

ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں بعض اُن کی اولیات میں شامل ہیں کہ اُن سے پہلے اِس طرز اِس موضوع پر کسی نے قلم نہ اُٹھایا تھا۔ مثلاً زنانہ لٹریچر اور اس میں ناول کا طرز۔ ترجمۂ قرآن مجید کی سلاست اور تسلسل۔ الحقوق والفرائض میں مضامین قرآن کی ترتیب قانونی کتابوں کے ترجمے۔ یہ سب ان کی بے نظیر جودتِ طبع اور جدّتِ فکر کے شاہد ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف کا سلسلہ بڑے دلچسپ طریقے سے شروع ہوا ہے۔ جس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں۔

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ اُن کو چاؤ سے پڑھیں .... ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتا نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے "مراۃ العروس" چھوٹی کے لیے "منتخب الحکایات" بشیر کے لیے "چند پند"۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں ساری لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں، نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیئے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لیے اور جس کو ایک صفحہ کی استعداد تھی وہ ورق کے لئے مستعجل تھا۔ جب دیکھا ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے، میں اُس وقت قلم

یادداشت لکھ دیا کرتا ہوں کتابوں کا پہلا گمان تیار ہوا۔

(دوبارہ لکچر - ڈپٹی نذیر احمد)

اس کے بعد نذیر احمد صاحب ان کتابوں کی شہرت و اشاعت کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ وہ بھی عجیب اتفاق اور پُرلطف واقعہ ہے۔ یعنی ڈپٹی صاحب کے صاحبزادے بشیر الدین کی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے کہیں ملاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے لڑکے سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو۔ بشیر الدین نے مذکورۂ بالا کتابوں کا نام بتایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے تعجب سے کہا کہ اردو میں ان ناموں کی تو کوئی کتابیں نہیں ہیں۔ لڑکے نے کہا یہ کتابیں ابا نے میرے اور آپا کے لئے لکھی ہیں۔ صاحب نے کہا اچھا دوڑ کر انہیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور "مراۃ العروس"، "منتخب الحکایات" اور "چند پند" کے قلمی نسخے لے آیا۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کتابوں کو دیکھا اور "مراۃ العروس" کو بہت پسند کیا اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دیے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ آپ کو ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی گھڑی انعام میں ملی۔ اس کے بعد تصانیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

۱- ناول (زنانہ لٹریچر):-

۱- مراۃ العروس۔ مطبوعہ ۱۸۶۹ء

۲- بنات النعش (مراۃ العروس کا دوسرا حصہ) جس میں لڑکیوں کو دستکاری اور عملی زندگی کی ترغیب دی ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء

۳- توبۃ النصوح:- جس میں بھی اسلامی زندگی کی تعلیم ہے۔ اس پر بھی

ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

۴- محصنات یا فسانۂ مبتلا۔ مطبوعہ ۱۸۸۵ء

۵- ابن الوقت۔ مطبوعہ ۱۸۸۸ء غدر کے زمانہ کا قصہ۔ انگریزی ہندوستانی و اسلامی معاشرت کا مقابلہ۔

۶- رویائے صادقہ۔ دہلی کے قدیم شریف خاندان کی زندگی۔

۷- ایامیٰ۔ جس میں بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کی ضرورت و فوائد بیان کیے ہیں۔

۲- اخلاق:-

(۱) منتخب الحکایات (۲) چند پند (۳) موعظۂ حسنہ

۳- مذہب:-

۱- ترجمۂ قرآن مجید

۲- الحقوق والفرائض - ۳ حصے: ۱۹۰۶ء میں لکھی۔

۳- الاجتہاد - عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت ۱۹۰۰ء / ۱۳۲۴ھ۔

۴- اُمہات الاُمہ: ازواج مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات

۵- اَدعیۃ القرآن۔ اس میں قرآن مجید کی تمام دعائیں اکٹھا کر دی ہیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔

۴- منطق:-

(۱) مبادی الحکمت: اس رسالہ میں علم منطق کی تعلیم کا جدید و دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہے۔ جو منطق کی مروجہ درسی کتابوں سے مختلف ہے۔ مثالیں بھی نئی نئی تلاش کی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ

ہو گیا ہے۔ تصنیف ۱۸۷۱ء/۱۲۸۸ھ۔

۵۔ علم ہیئت:۔

اسموات:۔ یہ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ گورنمنٹ نے اس پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ ۱۸۷۶ء/۱۲۹۲ھ میں ترجمہ کی۔

۶۔ قواعد:۔

۱۔ ما ینفعک فی الصرف

۲۔ صرفِ صغیر: عربی قواعد کے متعلق لکھیں۔

۷۔ متفرق:۔

۱۔ رسم الخط ۲۔ نصابِ خسرو

۳۔ فسانۂ غدر ۴۔ مجموعۂ لکچر

۵۔ نظم بے نظیر۔ (ان کی نظموں کا مجموعہ)

یہاں ہم صرف ان کی ناول نگاری سے بحث کریں گے۔

نذیر احمد کی ناول نگاری:۔

نذیر احمد میں ناول نگاری کا سلیقہ بدرجۂ اتم تھا۔ لیکن وہ اس صنفِ ادب میں صفِ اول کی چیزیں اسلئے پیش نہیں کر سکے کہ ناول کی روایت ان کے پیشِ نگاہ نہیں تھی۔ ان کے زمانے میں ہندوستانی سماج ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد ہمارا سماج ابتری کے دور سے گذر کر محکومی کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ ہندوستان بھر میں سماجی اصلاح کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں اور ہم اپنی دنیا

نئے سرے سے بنانی چاہتے تھے۔ سماجی اور تعلیمی اصلاح کے ساتھ مذہبی اصلاح و احیاء کی تحریکیں بھی ملک میں شروع ہو رہی تھیں۔ جذبۂ اصلاح کے غلبہ نے نذیر احمد کے فطری ذوقِ فن کو پورے طور پر اسیر کر لیا۔ ایک نذیر احمد پر ہی کیا منحصر ان کے ہم عصر سرسید، حالی اور شبلی سب اس جذبہ کے شکار ہو گئے۔ حق تو یہ ہے کہ سرشار بھی وعظ و پند سے کام لیتے تھے۔ لیکن ان لوگوں میں ایک سرشار ہی ہیں جو عام طور سے اصلاح کے مرتکب نہ بنے اور ان کے ناولوں میں تلقینِ اخلاق کی جنس بہت ہی کم ہے۔ سرشار کے برخلاف نذیر احمد اخلاق کے بڑے بیوپاری ہیں اور ان کی کھیپ بھی بھاری ہے۔ ان پر تو اصلاح کا سودا سوار ہے۔ وہ تو اخلاق اور مذہب کے بغیر ایک لقمہ بھی نہیں توڑتے لیکن مصلح کے اندر سے فن کار جھانکتا ہے۔[۲۳]

نذیر احمد کے قصوں کا آرٹ:۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نذیر احمد قصہ کی تخلیق اور بیان کرنے کے راز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے جملہ ناول طبع زاد اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ان کے قصے رتن ناتھ سرشار کے قصوں کی طرح دلچسپ نہیں اگر مرزا ہادی رسوا کی "امراؤ جان ادا" کو مستثنیٰ کر دیکھئے تو ان کے دور کا ناولوں سے نذیر احمد کے ناولوں میں زیادہ دلچسپی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں صرف واقعات کے لچھے نہیں بلکہ ان میں پلاٹ کی خاصی تشکیل ہے۔ لیکن نذیر احمد کے ناولوں کے قصوں کو انکا مولوی پن نقصان پہنچاتا

رہتا ہے۔ وہ راہِ نجات دکھانے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ناولوں میں کثرت
سے آیاتِ قرآنی پیش کرتے جاتے ہیں۔ نصیحتیں اور مذہبی بحثیں بے جھجک
ہیں اور انہیں اس قدر طول دیتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ "ابن الوقت" میں
بیو اور حجتہ الاسلام کی بحثیں مباحثہ و مناظرہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں[30]

ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے
یہ فن کہاں سے سیکھا یا کن کتابوں سے انہیں اس قسم کے افسانے لکھنے کا
اشارہ ملا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ان کا یہ خاص فن اخلاقی صفات کو انسانی
شخصیتیں دے کر ان کی بابت واقعاتی قصے بیان کرنے کا تھا۔ اور انکی
طبیعت کو اس فن سے خاص مناسبت تھی۔ ان کی حیثیت اولاً ایک
فسانہ نویس کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کی پیدائشی صلاحیتوں
اور ان کے سلیقے کا اندازہ لگانا ہمارا فرض ٹھہرتا ہے۔ ان کی افسانہ نویسی
کی بابت ان کی تمثیلوں سے ہم حسب ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں۔[31]

پہلے یہ کہ ان کے قصے کسی اخلاقی مسئلہ کی مثال پہلے ہیں اور
قصے بعد میں۔ ان کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ان کا پورا ڈھانچہ
اور ہر واقعہ ان کے بنیادی مسئلہ کو واضح کرتا ہو، دوسری طرف نصیحت
کے عنصر کو قصہ کے عنصر میں اس طرح گھلا ملا دیا گیا ہو کہ وعظ کا گراں اور
خشک پہلو سامنے آنے ہی نہ پائے۔ یہ خوبی ان کے ناولوں میں زیادہ تر
موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "مراۃ العروس" میں پورا قصہ بھی اور خاص واقعے
جیسا کہ ماما عظمت والا معاملہ اصغری کی تمیز داری کو پوری پوری طرح
واضح کرتے ہیں اور ان کے تمام قصوں کی بابت یہی عام رائے دی جاتی ہے

مگر ساتھ ہی ساتھ کوئی قصہ ایسا نہیں ہے جس میں تمثیل سے بے تعلق واقعات
نہ آ گئے ہوں۔ اور لمبے لمبے خشک وعظ نہ داخل کر دیے گئے ہوں۔
مثلاً "محصنات" میں مبتلا کی بیوی غیرت بیگم کے بھائیوں کی اپنی بہن
کی جائداد پر حق کے سلسلے میں گفتگو بالکل غیر متعلق ہے۔ یہی حال آزادی
کے قصوں میں مولویوں کی بابت بحث کا ہے اور وعظوں کی ہر جگہ بھرمار
ہے۔ اصغری کے باپ دور اندیش خاں کے اصغری کو خط سے لے کر آزادی
کی آخری وصیت تک سیدھے سادے وعظ کی اس قدر بہتات ہے
کہ ان کی ہر جگہ موجودگی کا ہمیں تلخ احساس ہو جاتا ہے۔ ایسے تمام موقعوں
پر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تمثیلی قوت دم توڑ رہی ہے اور وہ براہ
راست وعظ پر اتر آئے ہیں۔ اس کمزوری نے "رویائے صادقہ" کو
بگاڑ کر رکھ دیا اور ان کی بہترین تمثیلیں "توبتہ النصوح" اور "ابن الوقت"
بھی اس سے خالی نہیں۔

دوسرے یہ کہ ان کے یہاں قصہ گوئی کے سلیقہ کی کمی کا بجا احساس
ہوتا ہے۔ یہ مراۃ العروس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک مرکب قصہ کی تعمیر
نہیں کر سکتے تھے۔ ورنہ وہ اکبری اور اصغری کے قصے ایک دوسرے سے
الگ اور بالکل بے تعلق کر کے نہ بیان کرتے۔ یہ خامی "توبتہ النصوح"
تک میں محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہاں ہمیں ایک ہیولیٰ تعمیری سلیقہ ضرور
ملتا ہے۔ کیونکہ نصوح کا ارادہ اور تمام واقعات کا اس ارادے سے شاخ
ہونا شروع میں وحدت کا وجود پیدا کر دیتا ہے۔ یوں تو نصوح کے
ہر لڑکے کا قصہ الگ ہے اور الگ ہی ختم ہو جاتا ہے مگر نصوح سے ہر قصہ کا

تعلق ایسی چیز ہے جو ہمیں یہ محسوس نہیں کرنے دیتی کہ یہ سب قصے اسی طرح الگ الگ ہیں جیسے کہ اکبری اور اصغری"۔ ابن الوقت" میں ہیں اور بھی زیادہ سلیقہ نظر آتا ہے اور یہاں جو تسلسل اور واقعات کا ایک دوسرے سے تعلق ملتا ہے وہ مولانا کی کسی اور تمثیل میں نہیں ہے۔ یہاں سلیقہ کی ایک بڑی خامی ضرور محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ حجۃ الاسلام کو یہاں بہت دیر میں اور بہت بھونڈے طریقہ پر لے آیا گیا ہے۔ متضاد حالات کو ساتھ ساتھ لے چلنے کے سلسلہ میں یہاں مولانا نے کچھ کامیاب کوشش ضرور کی ہے مگر ان کی کامیابی کوئی خاص اثر نہیں رکھتی۔ بعد کے قصوں میں مبتلا کا قصہ واقعات کی بنا پر دلچسپ ہے۔ اور مبتلا کے دو گھروں کی کشمکش نہایت پر اثر طریقہ پر دکھائی گئی ہے۔ مگر یہاں بھی قصہ سیدھا سادھا ہی ہے۔ مرکب قصوں کے فن سے مولانا بالکل ناواقف ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی نقادوں کی نگاہ میں ناول نگار ہی ہیں۔

تیسرے یہ کہ باوجود ان تمام خامیوں کے ان کی فطری قصہ گوئی داد کو قابل ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ اُردو کے سب سے پہلے واقعاتی قصہ گو ہیں۔ مگر خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان کے قصوں کی دلچسپی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ مسائل پر بحثوں اور وعظوں سے قطع نظر کیجیے تو ان کے قصوں میں ایسا دلچسپ تسلسل ملتا ہے کہ انہیں ختم کئے بغیر چھوڑا ہی نہیں جاتا۔ یہ بات "توبۃ النصوح" میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اور "ابن الوقت" میں اس سے کچھ کم۔ مگر کوئی قصہ بھی اس سے خالی نہیں ہے۔

یہ تمام واقعات اس طرح ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور بذات خود اتنے پُرلطف ہیں کہ کتاب کے سوا تین سو صفحے نہایت جلدی سے کٹ جاتے ہیں۔ اور کتاب کو ختم کرنے سے پیشتر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جب اس کتاب کو تصنیف کر رہے تھے تو قصہ گری کے فرشتہ نے اُن کے قلم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اس طرح یہ کتاب ایک آسمانی اور دائمی چیز ہو کر وجود میں آ گئی۔ اس کے بعد والے قصے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ مگر "توبۃ النصوح" کا سا اعجاز "ابن الوقت" کے بعد سے بالکل غائب ہو جاتا ہے اور اُن کے قصے صرف کہیں کہیں اس پایہ کی دلچسپی پر پہنچتے ہیں جو "توبۃ النصوح" میں ہر جگہ اور "ابن الوقت" کے کافی حصے میں نظر آتی ہے۔

کردار نگاری:-

مولانا نذیر احمد کے اکثر کرداروں میں ارتقائی مدارج نہیں۔ وہ ابتدا ہی سے ہمارے سامنے مکمل ہو کر آتے ہیں۔ ان سے اُن کی فن کارانہ حیثیت ضرور گھٹتی ہے لیکن ان کامل کرداروں کی جیسی مرقع کشی انہوں نے کی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ "مراۃ العروس" میں اصغری کا کردار مثالی ہے۔ وہ اس کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں۔ "یہ لڑکی اس گھر میں ایسی تھی جیسے باغ میں پھول یا آدمی کے جسم میں آنکھ۔ ہر ایک کا ہنر ہر ایک طرح کا سلیقہ اس کو حاصل تھا۔ عقل، ہنر، حیا، لحاظ، سب صفتیں خدا نے اصغری کو عنایت کی تھیں۔ لڑکپن میں اُس کو کھیل کود، ہنسی اور

چھیڑنے سے نفرت تھی۔ پڑھنا یا کام کرنا۔ اس تہذیب کی بے چینی اور اخلاق
کی مشین ہے شروع سے آخر تک کوئی ایسا فعل اضطراراً بھی سرزد
نہیں ہوتا جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ وہ خطا اور نسیان سے مرکب
انسان ہے اور اس کے پہلو میں دل اور اس دل میں قدر ہے۔ اس
کی سیرت کا اہم ترین پہلو اس کی یہ "خشک عقلیت" ہے۔[34]

"مراۃ العروس" کے برعکس "توبۃ النصوح" میں خاتمے کے لیے
پڑھنے والا آخر وقت تک منتظر رہتا ہے۔ اسے کلیم کے انجام کے متعلق
تشویش رہتی ہے۔ اور یہ وہ خوبی ہے جس سے "توبۃ النصوح" کو کسی
حد تک خشک مضمون پر مشتمل ہونے کے باوجود بہت پسند کیا جاتا ہے۔[35]

یہ وہ سیرتیں ہیں جن میں ارتقائی مدارج نہیں ہیں لیکن کچھ ایسی
سیرتیں بھی ہیں جن کی ترقیاں اور خوبیاں درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل
بیان کی گئی ہیں۔ ان سیرتوں میں نعیمہ اور ابن الوقت ان کی بہترین
یادگار ہیں۔ نذیر احمد نے "ابن الوقت" کی قابلیت کی وجہ سے ہمیں بہت
متاثر کیا ہے مگر دلائل میں حجۃ الاسلام کو غالب دکھایا ہے۔ اس کے باوجود
قارئین کی نظر میں پلہ ابن الوقت کا ہی بھاری معلوم ہوتا ہے۔ حجۃ الاسلام
کے دلائل میں وزن ضرور ہے مگر قدامت کے علاوہ خشک منطقیت ہے
اس کے مقابلہ میں ابن الوقت کی نظر زیادہ وسیع ہے اور باتوں میں فلسفہ کا
رس ہے۔ اس لیے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس میں نذیر احمد ایک نکتہ رس فنکار
ثابت ہوئے ہیں کیونکہ اس پیرائے میں انہوں نے دراصل تہذیب
حاضر کی اس جگمگاہٹ اور ظاہری آب و تاب اور اس کے حامیوں کی

زبان کے رس اور ظاہری مٹھاس کا تصور دلایا ہے۔[36]

دوسرے اہم کردار میر متقی اور حجۃ الاسلام کے ہیں۔ آخر الذکر بالکل
نذیر احمد کے دل کے آدمی ہیں۔ باوجود ڈپٹی کلکٹر ہونے کے وہ اس طرح کے
کٹر مسلمان ہیں کہ ابن الوقت کی کوٹھی میں گاڑی سے اترتے ہیں تو خدمتگار
وضو کا آفتابہ لیے ہوئے ساتھ ساتھ ہے۔ گویا یہ پہلے سے یقین تھا کہ
ایک بھائی اور مسلمان کے ہاں نہ تو وضو کا سامان ہو سکتا ہے اور نہ نماز کا
کوئی انتظام۔ یا تو ظن خیر کا پتہ نہیں یا پھر شک و احتیاط کی انتہا ہے
پھر شروع سے آخر تک جتنی باتیں کی ہیں وہ سب قل اعوذ یا [illegible] کی
بات بات پر حدیثیں، آیتیں، عربی کے اقوال موجود ہیں گویا واقعتاً حجۃ الاسلام
بن کر آئے ہیں۔ اصول حفظان صحت کے منکر ہیں۔ طب اور ڈاکٹری کو
بیکار جانتے ہیں اور تدبیر کو بالکل ہی عبث اور فضول سمجھتے ہیں۔ کوٹھی
میں کتوں کی موجودگی سے نالاں ہیں اور کمروں میں تصویروں کے آویزاں
ہونے سے خفا۔ اس بات پر مصر ہیں کہ ہر شخص کے لیے ان ہی کی طرح
صرف ایک دالان اور ایک حجرہ زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔
ابن الوقت اصرار کرتا ہے کہ بھائی صاحب میرے ہاں آیا کیجیے۔ مگر نہ اس کے
یہاں ٹھہرے اور نہ کھاتے پیتے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے
کہ ان کو ابن الوقت سے محبت نہیں ہے۔ وہ اس سے اور شارپ صاحب
سے صفائی کرانے کے لیے مخصوص طور پر چھٹی لے کر آئے ہیں۔[37]

مولانا کے ناولوں میں کچھ اور سیرتیں بھی ایسی ہیں جو خاص طور پر
قابل توجہ ہیں۔ عظمت کی سیرت میں چھوٹی بیگم ایمان ما کا کردار [illegible]

خوبی سے پیش کیا گیا۔ کلیم کا کردار ایک طرار چرب زبان شاعر کی سیرت
ہے اور ابن الوقت کی پھوپھی اس طرح کی بڑی بوڑھی ہیں جس طرح کی
بے وقوف بیبیاں ربع صدی پہلے ہر خاندان میں پائی جاتی تھیں۔ ان کو
اس امر کا یقین ہے کہ ابن الوقت نے جو وضع اختیار کی تو یہ محض نوبل
صاحب کے بہکانے سے اور اسی فرنگی نے ان کے پیارے بچے کی مت
پھیر دی۔ بڑے یقین کے ساتھ اپنے داماد حجۃ الاسلام سے اپنے اس خیال
کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کردار کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ
"یہ کردار بھی صحیح اور دلچسپ ہے ۔۔۔۔۔۔ اس خاتون کی سادگی اور معصوم
بوالعجبی بڑی دلکشی رکھتی ہے۔ اس کی یہ دلچسپ بے خبری ــ جو اس
زمانہ کی بڑی بوڑھیوں میں قدرتی طور پر عام تھی کتنی پُرلطف ہے کہ
وہ کمپنی کو ملکہ وکٹوریہ کی بیٹی سمجھ رہی تھی۔ اور کہتی ہیں کہ ابن الوقت
پر جو ظلم ہوا ہے اس کی شکایت کمپنی بادشاہ زادی سے کرنی چاہیے۔
نسوانی کرداروں کی مصوری نذیر احمد کا خاص فن ہے"۔

مولانا کے یہاں کیفیات ذہنی و نفسی کی نہایت عمدہ عکاسی ہے۔
"بات یہ ہے کہ خود اس کی طبیعت شروع سے اس طرف راغب تھی۔
نوبل صاحب کا کہنا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔ ابن الوقت کی ظاہری
حالت کے بدلنے میں ابھی دیر ہے۔ مگر جاں نثار کے چلے جانے کے بعد بھی
وہ اسی خیال میں مستغرق ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کو معلوم ہوا کہ
گویا نوبل صاحب کی سی کوٹھی ہے اور خانہ باغ میں کرسی بچھائے صاحب
لوگوں کی شکل بنائے بیٹھا ہوا شب ماہ کے مزے لے رہا ہوں۔ پھر

آپ ہی آپ چونک پڑا (ابن الوقت)

ناول 'ایامیٰ' کا وہ باب کتنا داخلی ہے، جس کا عنوان ہے۔
"آزادی اپنے دل کے بہلنے کی سوچتی ہے اور آخر کار خودکشی"
نذیر احمد نے محض میلوڈرامائی خودکشی کا سانحہ بیان کرنے پر اکتفا
نہیں کی بلکہ اس کی ذہنی و نفسی اٹھان اٹھائی ہے۔ ہرچند کہ خودکشی بری
نہیں، مگر جو آزادی پر گزری وہ خودکشی سے بڑھ کر تھی۔ احسن فاروقی اور
نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:-

"ان کا ماحول اور ان کے کردار اسی دنیا کے ہیں خیال و خواب کی دنیا
کے نہیں۔ گویا سچ یہ ہے کہ ہم ان کے کرداروں کی خارجی اور ظاہری دنیا سے
واقف ہوتے ہیں ان کے روحانی احساسات سے نہیں۔ اصغری۔ اکبری،
نصوح، اور ابن الوقت معلوم ہوتا ہے کہ دل نہیں رکھتے صرف دماغ رکھتے
ہیں۔ یا دل کو دماغ یا مذہب کے پیچھے اس قدر بھلا بیٹھے ہیں کہ ان کا دل بھی
دماغ ہو کر رہ گیا ہے"۔

مولانا کی تصنیف محض قصوں ہی کی وجہ سے دلچسپ نہیں ہے قصوں
سے زیادہ ان کی دلچسپی جیتے جاگتے اخلاقی مجسموں کی وجہ سے ہے۔ ان مجسموں
پر رائے قائم کرنا ہمارا سب سے اہم فرض ہے۔ کیونکہ یہی ان کے فن تمثیل نگاری
کی جان ہیں اور انہیں پر ان کی تمثیلوں کی تخیلی قیمت کا دار و مدار ہے۔
ان کے افسانوں کے ہر فرد کا نام کسی اخلاقی صفت پر ہے اور اس کی حرکتیں
اور باتیں اس صفت کے موافق ہیں۔ لہٰذا وہ تشخیص کے نمونے یا مجسمے کہلائے
جا سکتے ہیں"۔

ابن الوقت بھی تمثیلی مجسموں کا ایک نفیس البم ہے۔ حالانکہ اس کے
مجسموں میں وہ زور نہیں ہے جو "توبۃ النصوح" کے مجسموں میں ہے۔ مگر پھر بھی
وہ سب جاندار ہیں اور دلچسپ بھی۔ ابن الوقت اسی خاص حقیقت کا
دلچسپ مجسمہ ہے جو مولانا کے زمانہ میں نمایاں ہو رہی تھی۔

اس کے بعد مولانا کی قوت مجسمہ نگاری کم ہی ہوتی گئی۔ "رویائے صادقہ"
میں صادق اور صادقہ دونوں ایسے کمزور اور بے اثر ہیں۔ ان کی آخری دو تمثیلوں
سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ مجسموں سے ٹائپ کی طرف آتے ہوئے دکھائی
دیتے ہیں۔ مگر اس دوسرے قسم کے افراد بنانے کی ان میں پوری صلاحیت نہ ہونے
کی وجہ سے ان کی تخلیقات کسی قسم میں بھی نہیں آتیں اور بے زور ہو جاتی
ہیں۔ کلیم ایک ٹائپ ہے جس کی تخلیق وہ کامیابی سے کر سکے، مگر یہ
بالکل اتفاق سے ہوا۔ مبتلا اور آزادی دونوں افراد ظاہر کرتے ہیں کہ
مولانا کو اس قسم کے کردار پیش کرنے کا سلیقہ نہیں۔

ان تمام مجسموں سے مولانا کی زندگی میں گہری دلچسپی، نفسیات انسانی
کا گہرا علم اور زندگی اور نفسیات کو ایک خاص ڈھنگ سے، اتنی خوبصورتی
سے ادا کرنے کی اعلیٰ صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان سے پہلے اردو میں
کوئی مصنف زندگی کا اتنا گہرا اور سچا نقاد نہیں گزرا۔ ایک حد تک یہ
کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو میں زندگی پر تنقید ان ہی سے شروع ہوتی
ہے۔ کیونکہ ان سے پہلے اردو ادب تمام تر مدح اور مبالغہ کا فن تھا جس
میں یا تو دور از قیاس تعریفیں یا تخیلی واردات عشق کا ذکر ہے اور صرف
کہیں کہیں اتفاق سے کچھ زندگی کی طرف اشارے مل جاتے ہیں۔ مولانا کو

سب سے زیادہ دلچسپ حال انسان کا معلوم ہوتا ہے اور ان کی تصنیفات
میں ہمیں زندگی کے نقوش اردو میں پہلی دفعہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔
ان نقوش کی نوعیت تمثیلی ہے۔ کرداری نہیں مگر دنیا کے ہر ادب میں
کردار نگاری کی ابتدا ان ہی تمثیلی مجسموں سے ہوئی۔ اس لئے مولانا اردو
میں تمام جدید ادب کے سب سے پہلے پیش رو کہلانے کے مستحق ہیں۔
ان کے بعد فن افسانہ گوئی نے بہت ترقی کی اور اردو میں ناول کا فن بھی
آیا۔ مگر اب تک کسی کی تصنیفات میں زندگی کے جیتے جاگتے نقوش نہیں
ملتے جیسے کہ ان کے یہاں۔

واقعہ نگاری:-

ایک واقعہ نگار کی حیثیت سے بھی نذیر احمد کامیاب فن کار ہیں۔ وہ واقعہ
پیدا بھی کرتے ہیں، اُگاتے اور ابھارتے بھی ہیں۔ اور انہیں مزے میں
بیان بھی کرتے ہیں۔ ادب اردو میں اکثر ناولیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کے
پلاٹ ارتقا غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔

ادریس احمد لکھتے ہیں "یہ بات اُن کے ہاں نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ یہ واقعات خود بخود پیدا ہوئے ہیں"

لیکن نذیر احمد کی واقعہ نگاری میں ایک غلطی یک سطحی اسپاٹ
ارتقا کی مثالیں اکثر و بیشتر ملتی ہیں۔ یہی ان کا عام رنگ ہے۔ اُن کے
یہاں بھرپور مختلف الجہتی ارتقا گویا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب
لکھتے ہیں۔ "وہ تو گویا اُن کا زور بیان ہے، زبان و محاورے پر قدرت،

اور کہیں کہیں مزیدار فقرے جو اُن کے وعظ کو صبر سے پڑھ لینے دیتے ہیں ورنہ اُن کا پڑھنا ہی دوبھر ہو جاتا۔"

نذیر احمد کی کردار نگاری، واقعہ نگاری اور ماحول نگاری یک سطحی ہے۔ ابعاد (DIMENSIONS) کا احساس اُن کو کم ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے کردار دبیز، گداز اور تگڑے نہیں ہو سکے۔ اُن کے واقعات تہہ دار نہیں اور مجموعی طور پر اُن کے پلاٹ تعمیر و تشکیل پر بالیدہ و پیچیدہ قماش بندی کی بنیادوں پر ابھار اور اٹھان نہیں ہوتا۔

"اُن کے ناولوں کے پلاٹ سیدھے اور سپاٹ ہیں۔ نہ کوئی گنجلک ہے نہ تعقید جو کم از کم دلچسپی کو اُجاگر کرنے ہی کا باعث ہو سکے۔ نہ حُسن کی دلفریبیاں ہیں نہ عشق کی گرمیاں ...... بکثرت حولیت اور صبر آزما خطابات اُن کے تمام ناولوں میں جاری و ساری ہے"[۴۴]

ان سب کمزوریوں کے باوجود نذیر احمد کے پلاٹوں میں وہ افراتفری اور ڈھیلا پن نہیں جو سرشار کے پلاٹوں میں ہوتا ہے۔ رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اُردو" میں لکھتے ہیں: "پلاٹ مربوط اور منظم نہیں ہوتے فسانۂ آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہیں ...... وہ تمام متفرق واقعات کو یکجا نہ کر سکے اور ان سے صرف باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے۔ یہی کمزوری اُن کے دوسرے ناولوں میں بھی نمایاں ہے۔"

کم از کم نذیر احمد آغاز کرتے ہیں کہ جتنا سامان اور مواد سلیقہ سے سمیٹ سکیں، ساتھ لے چلتے ہیں۔ سرشار تو مستی میں اسباب ناول بکھیرتے جاتے ہیں۔ سرشار میں اگر تعمیری بدحواسی ہے تو شرر میں

بے سروپا رومانیت۔ شرر میں ترتیب اور تعمیر کی صلاحیت پائی جاتی ہے مگر حقیقت نگاری کے میدان میں شرر بُری طرح ناکام ہیں۔ اُن کی دُنیا اور ...... اس میں رہنے والی مخلوق بے جان سی معلوم ہوتی ہے۔ جوش و جذبات کے ایک آنی و فانی طلسم سے شرر کے کردار حرکت کرتے ہوئے ضرور معلوم ہوتے ہیں مگر وہ دیر تک ذہن میں اپنی انفرادیت کے ساتھ زندہ نہیں رہتے۔ نذیر احمد اوسط درجہ کے ناول نگار صحیح مگر وہ سرشار و شرر کی لغزش و انتشار سے تو محفوظ ہیں۔ اُن کے ناول شدّت سے مقصدی ہیں پھر بھی اُن میں ایک کشش ہے اور وہ ہے حقیقت نگاری۔

مکالمہ نگاری:-

اُن کے افرادِ قصّہ کی گفتگو بیشتر طولانی، خشک اور بعض اوقات بے محل ہو جاتی ہے۔ عورتوں کے لب و لہجہ، محاورات، اندازِ گفتگو اور روزمرہ میں انہیں دسترس حاصل ہے۔ اُن کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے اور رنگ تحریر میں وہ صاحبِ طرز کا درجہ رکھتے ہیں۔ عام طور پر بیان میں جوش، شگفتگی، صفائی، بے ساختگی، غرض بھی کچھ موجود ہے۔ لیکن اسلوب نہایت ناہموار۔ ایک جگہ عربی کے ثقیل اور مغلق الفاظ، امثال و محاورات، اشعار، روایات و احادیث لکھتے ہیں تو دوسری جگہ ٹھیٹ ہندی کے صاف اور سلیس الفاظ صرف کرتے ہیں اور جابجا انگریزی کے الفاظ اور محاورات بھی ناخواندہ مہمان بن کر آ بیٹھتے ہیں۔ عربیت مولانا کا طرۂ امتیاز ہے اور اُن کی جذباتیت پر غالب ہے۔ خود کتابوں کے ناموں سے آشکارا ہے۔ مولانا کی زبان پر یہ ایک عام

اعتراض ہے کہ اس کا دائرہ محدود ہے۔ چنانچہ مولوی سعید انصاری بی۔اے (جامعیہ) لکھتے ہیں: "ڈپٹی صاحب بھی روزمرہ اور ٹکسالی زبان لکھنے کے جوش میں ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جو دہلی کے بعض مخصوص محلوں اور کوچوں میں بولی جاتی ہے۔"[۳۲]

باوجود اس کمزوری کے ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ مکالمہ نگاری اُن کے ناول کی نمایاں اور مضبوط خصوصیت ہے۔ خصوصاً جب وہ متوسط طبقہ کی شہری مسلمان عورتوں کی باتیں انہیں کے مخصوص محاوروں، انداز اور لب ولہجہ میں لکھتے ہیں[۳۳]۔ بے شک مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔ صنفِ نازک کے تکلّم، طرزِ گفتگو، نشستِ الفاظ، اور روزمرہ محاورے پر جیسا انہیں عبور ہے ویسا سرشار، ہوشش اور مرزا رسوا کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں۔ اِن مقامات میں مولانا نے سلاست، روانی، اور آمد کے دریا بہادئے ہیں، اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرہ پر جی لوٹ پوٹ جاتا ہے۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے۔ زور وہاں بھی بلا کا ہے، بہاؤ کی کمی نہیں۔ مگر ہاں یہ سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا دریا نہیں بلکہ کہساروں سے اُلجھتی ہوئی ندی ہے۔[۳۴]

خواجہ الطاف حسین حالی

۱۔ حالی کی تصانیفِ نثر
۲۔ حالی کی نثر نگاری
۱۔ سوانح نگاری
۲۔ تنقید نگاری
۳۔ مقالہ نگاری
۴۔ تبصرہ نگاری
۵۔ خطوط نویسی
۶۔ اسلوب بیان

اس سلسلہ کی مزید کڑیاں عنایت حسین دہلوی کا رسالہ مفید خلائق ۱۸۶۹ء اور عورتوں کی اصلاح کے لیے شاد عظیم آبادی اور مرزا عباس حسین ہوش کی تصانیف ہیں۔

سوانح حکیم ناصر خسرو:۔ (۱۸۸۲ء) اب نایاب ہے۔

تذکرہ رحمانیہ:۔ مولانا حالی نے اپنے استاد قاری عبدالرحمٰن صاحب (ایک پاک دل بزرگ تھے) کی وفات ۱۸۸۲ء پر اپنے تاثرات اس میں پیش کیے ہیں۔ ہر لفظ سے عقیدت ٹپکتی ہے۔

حیات سعدی:۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی سوانح حیات اور اُن کے کلام پر تبصرہ ہے اس کی سال اشاعت کے متعلق محققین میں اختلاف ہے لیکن زیادہ تر معتبر شہادتیں ۱۸۸۶ء کے حق میں ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری ۱۸۹۳ء اس تصنیف کے ذریعہ مولانا نے شاعری کی اہمیت پر بحث کی اور بہت سوالات اُٹھائے اور ان کے جوابات بھی دیئے اس سے تنقیدی بحث کا آغاز ہوا۔ اُردو تنقید کی دنیا میں مقدمہ کو تنقید کا پہلا صحیفہ قرار دیا گیا۔

یادگار غالب:۔ حالی کے سوانحی ادب کی دوسری کڑی یادگار غالب ۱۸۹۷ء ہے۔ غالب کے مطالعے کے سلسلہ میں اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

حیات جاوید:۔ حالی کی سوانح نگاری کے سلسلے کی تیسری کڑی حیات جاوید (۱۹۰۱ء) ہے یہ سر سید احمد کی سوانح حیات ہے۔ جو انیسویں صدی کی ایک عظیم المرتبت شخصیت کے مالک تھے۔ جس میں اُن کے زندگی کے نشیب فراز کامیابیوں اور ناکامیوں کی تفصیل سے بحث کی گئی۔ یہ صرف ایک مصلح کی

سیرت ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے تعلیمی، سیاسی اور تمدنی انقلابات کی کہانی ہے۔

مضامین حالی:۔ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۱ء تک کے مضامین جنہیں تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، کالج میگزین، معارف، روداد ندوۃ العلماء وغیرہ سے جمع کر کے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے مرتب کیا۔ اور پنجاب نیشنل ایجنسی پانی پت نے ۱۹۰۴ء میں طبع کیا۔

مکتوبات حالی:۔ مولانا کے صاحبزادے سجاد حسین ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا۔

حالی کی سوانح نگاری:۔

گذشتہ صفحات میں مولانا حالی کی نثری تصانیف کے سلسلہ میں ہم نے اُن کی سوانحی تصانیف حیات سعدی یادگار غالب اور حیات جاوید کا سرسری تذکرہ کیے ہیں۔ مولانا کی سوانح نگاری سے متعلق بحث کرنے سے پہلے اس امر کا اظہار بے محل نہ ہو گا کہ حیات سعدی کے لکھنے کی تحریک اُن کی ذہنی مطابقت ہے۔ حالی فارسی زبان کے بڑے باذوق عالم تھے۔ شیخ سعدی کے خیالات سے اُن کے خیالات بہت مطابقت رکھتے تھے۔ غالب حالی کے استاد بھی تھے اور رفیق بھی مولانا کو یہ سنہرا موقع نصیب ہوا تھا کہ وہ غالب کے خیالات کے نشیب و فراز خود غالب سے سمجھ سکتے تھے۔ مولانا کی ذہنی تربیت و نشو و نما سر سید کے تحت ہوئی۔ ان حالات کے پیش نظر ان بزرگوں کے سوانح حیات لکھنے کیلئے مولانا سے بڑھ کر

اور کون ہو سکتا تھا۔

اُردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز مغربی خیالات کے اثر کا نتیجہ جس کے علمبردار اُردو کے دو بہترین ادیب حالی اور شبلی ہیں۔ حالی اور شبلی کی سوانحی تصانیف کے دیباچے انھیں مغربی اثرات کے شاہد ہیں خاص کر اس نئی ڈگر کا سہرا مولانا حالی کے سر ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور اُن کی حیات سعدی کا دیباچہ گویا اُردو سوانح نگاری کا MANIFESTO ہے۔

ڈاکٹر سید شاہ علی اپنے مقالہ "اُردو میں سوانح نگاری" میں سوانح نگاری سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سوانح نگاری کے اصول و مسائل کی بحث کو تین عنوانوں تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) موضوع (۲) مواد (۳) بیان

مولانا حالی کے سوانحی موضوعات کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ حالی کے تینوں موضوع اہم اور مشہور شخصیتیں ہیں جن میں سے دو ادیب اور شاعر ہیں اور ایک مصلح دو ہمعصر ہیں اور ایک قدیم۔ اُردو کو مستقل اور باقاعدہ سوانح عمریوں سے روشناس کراتے ہوئے شاید یہ حالی کو ہمت یا توفیق نہیں ہوئی کہ وہ کسی غیر مشہور ہستی کو اپنا موضوع بناتے۔ گو حالی کی سیرت و کردار کے پیش نظر یہ قرین قیاس اور مناسب ہوتا کہ وہ اپنی طرح کے ایک نیک دل اور عافیت پسند انسان کی داستانِ حیات قلمبند کرتے، لیکن حالی سے شاید اس کی توقع قبل از وقت تھی کیونکہ اہم اور غیر اہم موضوع کے مسئلہ کو زمانہ ...... حال ہی میں خاطر خواہ اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اور آج بھی یہ ایک حد تک معرضِ بحث میں ہے۔

اُردو کے پہلے سوانح نگار کا سوانحی مواد بھی اوّل درجہ کا ہے۔

ظاہر ہے کہ صدیوں بعد سعدی کے خطوط، خود نوشتہ حالات یا اُن کی گفتگو کا پتہ چلانا محال ہے۔ خصوصًا اس حال میں کہ فارسی میں بھی سعدی کی کوئی مستقل سوانح عمری موجود نہ تھی۔ حالی نے اُن کی شہرت اور مقبولیت کے مدِ نظر اُن کی حیات قلمبند کرنے کا ارادہ تو کر لیا مگر مواد کی کمیابی پر انھیں سخت مایوسی ہوئی اور مختلف جگہوں سے خوشہ چینی کر کے ایک ایسی عمدہ سوانح عمری مرتب کی کہ مولانا شبلی جیسے کڑے نقاد کو بھی بے ساختہ داد دینی پڑی کہ یہ ایک دلچسپ محققانہ اور بے مثل سوانح عمری ہے۔ حالی کو متعدد فارسی تذکروں سے اکثر باتوں کا سراغ لگانے اور کلیاتِ سعدی کی مختلف اشاعتوں کے دیباچوں اور سر گور اوسلی کے انگریزی تذکرے شعرائے ایران کے ناتمام اور غیر مستند حالات اور روایات کی درایت صحیح اور معقول باتوں کے اخذ و انتخاب کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کرنے پڑے۔ شبلی کے سے ذہین مصنف کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ "جب تک کافی مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ اُن کی دقیق رسی اور نکتہ سنج طبیعت اُس جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے"

"یادگارِ غالب" کے لیے حالی نے اپنی ذاتی واقفیت اور غالب کے دوستوں اور رشتہ داروں وغیرہ کی معلومات سے اُن کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ لگانے کے علاوہ اُن کی تصانیف کو اکٹھا کر کے اُن سے بھی اُن کے حالات اخذ کیے ہیں۔ اُن کی تاریخ ولادت، خاندان کا

سلسلہ، بچپن، عنفوانِ شباب، شادی وغیرہ کا حال اُنہی کی تحریروں اور
خطوں سے نقل کیا ہے۔ خصوصاً اُن کے بولتے ہوئے مکالموں سے بھرے ہوئے
اور دیگر بھی خطوط اُن کے لطائف و ظرائف، چٹکلوں اور گفتگو کی مدد سے
وہ کام لیا ہے کہ یادگارِ غالب کو اُن کی اور اُردو ادب کی مقبول ترین
تصانیف کی صفِ اوّل میں جگہ مل گئی ہے۔ چونکہ غالب کے کلام نظم و نثر
میں بھی داخلیت کا عنصر غالب تھا، حالی نے اُن کی تصنیفات سے لئے
اقتباسات کے علاوہ اُن کے کلام کے انتخاب اور اُس کی تشریح سے
اُن کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اُن کے اشعار اُن
کی دلی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں اور اُن کی بعض خصوصیات مثلاً
انفرادیت، عظمت و احساس کے مبتذل عامیانہ سوقیانہ الفاظ اور باتوں سے
نفرت، دنیا سے بیزاری اور ابنائے زماں کی شکایت کو بار بار جھلکاتے ہیں۔

چونکہ حالی اور سرسید کا طویل ساتھ رہا اور اُن کی معلومات کے
ذرائع بھی وسیع تھے "حیاتِ جاوید" میں اُنہوں نے "یادگارِ غالب" سے بھی
ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ چنانچہ اُن کے خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت
اور غدر سے پہلے کے حالات، بعض رشتہ داروں غلام نبی خاں کے فراہمی
رسالے 'سیرتِ فریدیہ' اور خود سرسید کی یادِ دل ناخواستہ مدد سے اور
غدر کے بعد کے حالات جو نمایاں ہیں اُن سے زیادہ مفصل اور مستند ذرائع
سے مثلاً علی گڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، سرسید کی تصانیف، خطوط،
سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں، اُن کے دوست احباب اور مدبرانِ
سلطنت کی تحریروں اور بعض دیگر معتبر مقامات سے بڑی محنت سے

جمع کئے ہیں۔ اپنے تینوں موضوعوں میں حالی سب سے زیادہ انہیں سے واقف
تھے۔ لہٰذا مواد کی کوئی کمی نہ تھی۔ البتہ متناسب متعلقہ مواد کا اخذ اور
انتخاب ضروری تھا۔

اب یہ غور کرنا ہے کہ حالی نے اپنی سوانح عمریوں میں واقعات کو کس
طرح پیش کیا ہے۔

باوجود اِس قدر شہرت اور مقبولیت کے حالی کو سعدی کے متعلق
کوئی قرینہ کا سوانحی مواد نہ مل سکا۔ اور بقولِ مولانا عبدالحق حالی کو شہد
کی مکھی کی طرح کلام کے مطالعہ سے ذرّہ ذرّہ چن کر سعدی کی سیرت،
اخلاق اور اُن کے حالات کو ترتیب دینا پڑا۔ اِس کوشش میں اُن سے
لغزشیں ہوئی ہیں۔ سعدی کی تصانیف سے اُن کے خیالات و
اخلاق کا قطعیت کے ساتھ پتہ چلانا مشکل ہے کیونکہ اُنہوں نے اکثر جذبات
و مسائل کے دونوں رُخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اُن کی
تصانیف کو خود نوشتہ مواد کے طور پر استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔
چنانچہ سعدی کے سفر کے حالات، مجلسوں میں شرکت وغیرہ کے بیان
میں اسی طرح کی لغزشوں کا احتمال پایا جاتا ہے۔ لیکن حیاتِ سعدی میں
باوجود کلام سے استنباط کی اِن کوششوں کے سوانحی مواد بہت کم جمع ہو سکا ہے۔

حیاتِ سعدی کی موجودہ ترتیب میں اُن جدید تصانیف کی یاد دلاتی
جن میں کسی کی تصانیف پر تنقید، یا کلیات یا دیوان کی اشاعت کے سلسلہ
میں ابتدا مختصر سے سوانحی حالات بھی شامل کر دئے جاتے ہیں۔ حیاتِ سعدی
میں مواد کی کمی کی وجہ سے طوالت اور اختصار کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔

اگر اِس قدر تفصیل کے ساتھ سعدی کی تصانیف پر تبصرہ اور اُن کا اوروں کی تصانیف سے موازنہ اور مقابلہ نہ کیا جاتا۔ اِس کے علاوہ سعدی کے ذاتی حالات کے بیان میں زوالِ اسلام اور شخصی و قومی آزادی کی بحث اور سعدی کو وزرائے سلطنت کی مالی امداد کی تفصیل بھی نہ صرف غیر ضروری طور پر طویل ہے بلکہ غیر متعلق بھی معلوم ہوتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید انتخاب و اجتناب کے اِس فقدان کا باعث بھی لازمی ہے۔ مواد کی کمی کی تلافی تمام دستیاب شدہ مواد کی نقل سے نہیں ہو سکتی۔ اِس طرح کتاب کے خاتمہ پر شیخ کے عام حالات اور اُن کی عام شاعری پر اجمالی نظر اُس پرانے طریقہ کی یاد دلاتی ہے جو مولانا کے عہد میں رائج تھا لیکن اب جدید سوانح ترتیب کے خلاف ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا یہ اعتراض مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا نے سعدی کو بحیثیت انسان نہیں دیکھا اور اُن کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر نہیں ڈالی اِس سلسلہ میں ڈاکٹر سیّد شاہ علی لکھتے ہیں کہ یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب کسی کے متعلق کافی مواد موجود ہو۔ جہاں تک اُن کی پیش کردہ معلومات کا تعلق ہے۔ اِس میں اُن کی اِنصاف پسندی کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً انہوں نے سعدی کے فلسفہ کی طرف کم توجہی، رزم کے بیان میں کمزور ہونا، ہزل گوئی، سادہ رخوں اور اَمردوں کی جانب میلانِ خاطر کا صاف صاف ذکر کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے مجموعی طور پر سعدی کے بچپن، تعلیم و تربیت، جوانی، سیر و سیاحت، دانش مندی، فرزانگی، میانہ روی وغیرہ اور اسی مناسبت سے سلاطین،

فاتحین، وزراء و امراء، اُن کی عزت و وقعت وغیرہ کا عمدہ نقش قاری کے پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔

حالی کی تحریر میں صفائی، سادگی، ہمواری، متانت اور وقار کے ساتھ ساتھ، جو شاید عربی زبان و ادب، شیفتہ و سرسیّد کے اثر کا نتیجہ ہے، اُن کی انسانی ہمدردی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ حالی کی نثر پر بعض لوگ خشک اور سپاٹ ہونے کا اعتراض کرتے ہیں جس سے اتفاق مشکل ہے۔ یہ اُن کی تحریر اور پختگی کا کمال ہے کہ مواد کی مشکلات کبھی اُن کے بیان کی فطری سادگی اور اسلوب کی روانی اور گاہ گاہ لطافت پر اثر انداز نہیں ہوتیں اور اِس میں ایک نرم رَو ندی کی سی، جو خاموشی کے ساتھ منزلیں مارتی ہوئی چلی جاتی ہے، روانی پائی جاتی ہے۔

یادگارِ غالب کی ترتیب کے سلسلہ میں حالی نہ صرف ایک ادیب اور شاعر بلکہ غالب کے ہم عصر عزیز دوست اور شاگرد ہونے کے لحاظ سے وہ تمام شرائط پوری کرتے ہیں جو عموماً ایک سوانح نگار کے لئے ضروری اور مفید قرار دی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شاہ علی لکھتے ہیں کہ اب دیکھنا یہ ہے کہ اُنہوں نے ان خصوصیات کا استعمال کیسے کیا ہے؛ شیفتہ کے مختصر تذکرے سرسیّد کی آثار الصنادید کے باب چہارم اور آبِ حیات کے تذکرے سے قبل شاید ہی کسی نے غالب کی حیات پر روشنی ڈالی تھی مؤخر الذکر میں غالب کی حقیقی عظمت کا اعتراف بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اِس کے علاوہ "یادگارِ غالب" حالی کی اولین سوانح عمری ہے۔ بہ لحاظ سوانحی موضوع غالب کی شخصیت اہمیت، انفرادیت وغیرہ کے سوانحی نظریات و تصورات کے معیار پر

پوری اُترتی ہے۔ حالی کے غالب سے تعلقات بھی مواد کی فراہمی کے لئے
بہت ہی مفید و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن اِن سب باتوں
کے باوجود جو غالب کی ایک طویل مبسوط اور مفصل سوانح عمری کی طالب
تھیں حالی نے ایک مختصر سوانح عمری لکھنے پر اکتفاء کیا۔ غالب کی حیات
کو ضمنی حیثیت دی اور اُن کے کارناموں اور ملکۂ شاعری کی وضاحت پر
زیادہ توجہ صرف کی اور بحیثیت سوانح نگار اپنے فرائض کو پوری طرح ادا
نہیں کیا۔ حالی نے خود کو اُن چار چیزوں تک محدود رکھا ہے۔ جن کے پیرائے
میں مرزا کا عجیب و غریب ملکہ ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی نظم و نثر، ظرافت و
بذلہ سنجی، عشق بازی اور رندمشربی اور حُبِ اہلِ بیت اور یہ اُمید کی ہے کہ
اِن سے مرزا کی شاعری پر جو تو بر تو پردے پڑے ہوئے ہیں اُن کے
مرتفع ہونے میں مدد ملے گی۔ لیکن اُنہوں نے بھی سوا اوّل الذکر کے کسی کے
ساتھ اِنصاف نہیں کیا ہے۔

حالی کے اپنے آپ کو زیادہ تر غالب کے ملکۂ شاعری تک محدود کرنے
کی مزید شہادت غالب کے اُن اقوال سے بھی ملتی ہے جو دیباچہ اور
متن کتاب میں نظر آتے ہیں اور شاید ایک حد تک اُن کا مقصدِ تصنیف
بھی ہیں۔ اور اِس خیال کو اُردو میں اِس طرح ظاہر کیا ہے۔

"میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا
کہ اِن باون برسوں میں اُس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے
ہیں اور میری فکر کو کس درجہ کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے
میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا اور زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ انسان ذرہ ازدری

کی شناخت سے محروم رہے اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے
گویا نظیری جنت آرام گاہ کا مطلع میرے حسبِ حال ہے ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

حالی نے بھی اِس کا تاسف کیا ہے۔[۵۸] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'یادگارِ غالب' کی تصنیف
کی تحریک میں 'آبِ حیات' کو بھی دخل ہے۔ چنانچہ نہ صرف طریقۂ بیان بلکہ طرزِ
تحریر سے بھی اِس کا اثر صاف نمایاں ہے۔ وہی 'آبِ حیات' کے لطائف و ظرائف
وہی شگفتہ اندازِ بیان 'یادگارِ غالب' میں بھی موجود ہے۔ 'یادگارِ غالب' کا نام بھی
اِس بات کا شاہد ہے کہ حالی نے متاخرین کے لیے اپنے اُستاد کی حیات نہیں بلکہ
یادگار چھوڑنی چاہی ہے۔ اِس مقصد میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں علاوہ ازیں
غالب کی عظمت اُن کے زمانے میں عام طور پر مسلّم نہ تھی۔ یادگارِ غالب سے پہلے
مرزا کی شاعری کے بارے میں یہ عام خیال تھا کہ ؎

کلام میر سمجھے اور بیان مرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اِس پر اضافہ کیجیے 'آبِ حیات' کا جس میں "خدائے اُردو" محمد حسین آزاد نے
غالب کے کمالات پر جگمگاتے الفاظ کا پردہ ڈال دیا تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے
پیشِ نظر چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔ "بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو
قیامت ہی کر جاتا ہے" "جو شعر صاف نکل جاتا ہے وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں
رکھتے۔" "اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن
وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔" یہ تھا وہ پس منظر جس میں حالی نے غالب کو سمجھنے

اور سمجھانے کی کوشش کی اور اس میں عدیم المثال کامیابی حاصل کی۔ آج غالب فہمی بلکہ غالب پرستی کی جو عام فضا ہے اس کی تخلیق کا سہرا حالیؔ کے سر ہے۔ حالیؔ کا غالب کی ایک مختصر سوانح عمری لکھنے پر اکتفا کرنے اور اُن کی حیات کو محض حیثیت دینے کی وضاحت حالی کے اس خیال سے ہوتی ہے کہ ابھی تنقیدی سوانح عمری لکھنے کا وقت نہیں آیا۔ حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں اُنھوں نے اپنی پہلی دو سوانح عمریوں میں اپنے موضوعات کے بعض پہلوؤں کو ٹھیس نہ لگنے دینے اور ملمع سازی کا جو ذکر کیا ہے وہ شاید زیادہ تر یادگارِ غالب سے متعلق ہے اور مشرقی ذہنیت کا غماز ہے۔ چنانچہ حالیؔ نے غالب کے سرسری واقعات نقل کر دیے ہیں اور غالب کی زندگی کے اُن مظاہر پر بالکل روشنی نہیں ڈالی۔ مثلاً غالب اپنے خطوط اور کلام میں اپنے حیاتِ معاشقہ کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔ اپنے دوست مرزا حاتم علی کو اُن کی محبوبہ کی وفات پر جو تعزیتی خطوط لکھے ہیں اُس سے غالب کے نظریاتِ عشق پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ غالب کی یہی تنوع پسندی (وہ زمردین کاخ طوبیٰ کی شاخ اور صرف ایک حور ہی کے خیال سے گھبراتے تھے) اُن کی اپنی بیوی کی بیزاری کا باعث ہو۔ جس کی طرف غالب نے اپنے خطوط، ملاقات اور متعدد فارسی قطعات میں اشارے کیے ہیں۔ اس لیے یہاں حالیؔ کے اس خیال سے اتفاق ناممکن ہے کہ یہ بھی مرزا غالب کی شوخی و ظرافت کا ایک مظہر تھا۔ جسے ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پہ محمول کرسکتا ہے۔ غالبؔ اور اُن کی بیوی کی افتادِ طبع کا فرق، غالبؔ کی آزاد خیالی، اُن کی بیوی کی رجعت پسندی کی وضاحت یا اعتراف ضروری تھا یا کم از کم اس کی ایسی تاویل نامناسب تھی

اسی طرح غالب پر اپنے بھائی سے بے رخی کے الزام کی تردید بھی۔ اُن کی افتادِ طبع اور غدر کی مجبوریوں وغیرہ کے مدِ نظر ممکن تھی۔ دوستوں سے خلوص دغل اور حیلہ کا تبادلہ، غدر میں پنشن بند ہونے کے باوجود ملازمین و متوسلین کی کفالت ایسی معلوم و مسلّم باتیں ہیں کہ ان کے مدِ نظر مذکورہ بالا الزام بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے دل و دماغ کی بے پناہ وسعتوں اور صلاحیتوں کے باوجود اُن کے ہم عصروں کی اُن سے بے اعتنائی، زمانہ کی ناقدردانی، پنشن بند ہونا، مالی مشکلات، پے در پے سات بچوں کی وفات وغیرہ یہ وہ سانحات ہیں جو مجموعی طور پر کسی بھی شخص کو رنجیدہ اور غمگین کرنے کے کافی تھیں۔ حالیؔ نے ان کی کماحقہٗ تشریح نہیں کی۔ لیکن یہاں اس حقیقت کو فراموش کرنا حالیؔ کے ساتھ ناانصافی ہوگی کہ حالی نے جس دَور میں یادگارِ غالب تحریر کی وہ سرسیّد کی تحریک سے پوری طرح وابستہ ہو چکے تھے اور ادب کو قومی تعمیر کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اس لیے غالب سے متعلق بعض نازک واقعات کی تفصیل سے اُنھوں نے شعوری طور پر گریز کیا۔ یہ واقعات اُن کی کتاب میں آئے ہیں لیکن غزل کی زبان میں اور حالی سچے غزل گو تھے۔

جنابِ شیخ اکرام، جناب مالک رام اور مولانا غلام رسول مہر نے حیاتِ غالب پر اچھا کام کیا ہے۔ کئی نئے گوشے اور تفصیلات ان صاحبوں نے پیش کی ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کتاب میں غالب ایک زندہ انسان کی طرح ہمیں نظر نہیں آتے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے الفاظ میں مولانا نے مرزا غالب کی سیرت کے خط و خال اس خوبی اور جامعیت کے ساتھ

کھینچے ہیں کہ مرزا جیتے جاگتے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہنسی دل لگی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم اُن کی صحبت میں بیٹھے اُن کی باتوں اور اُن کے کلام کا مزہ لے رہے ہیں۔ غالب کے ساتھ ہم نشینی کی یہ سعادت ہمیں حالی کی بدولت نصیب ہوئی اور یہ معلومات اپنے جلو میں کیف جاودانی رکھتی ہے۔ ورنہ بعد والے واقعات سے صرف غالب کی سیرت اور شخصیت کا بے جان ڈھانچہ ہی تیار کر سکتے تھے۔[۳۵]

حالی کو اردو کا اوّلین اور بہترین سوانح نگار اور "حیاتِ جاوید" کو اُن کی کامل ترین سوانح عمری قرار دیا گیا ہے۔ اس تصنیف کی بنا پر حالی کو باسویلؔ مصنفِ حیاتِ جانسنؔ سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کی طرح حالی کی علمی، ادبی، ملکی اور قومی کاموں اور اُن کی اصلاح سے دلچسپی، سرسید کی رفاقت، سوانحی مواد کی فراوانی، برسوں سے اُن کی سوانح عمری لکھنے کی نیت اور ہر چیز انہیں اس کا استحقاق اور موقع عطا کرتی تھی کہ اسے ایک لازوال شاہکار کی شکل دیں۔ اُردو کے ایک عظیم ادیب کو ہندوستان کے ایک عظیم ترین انسان کی سوانح عمری لکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ حالی کو کم سے کم پچیس سال تک سرسید کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے سرسید کو نہایت قریب سے دیکھا اور اُن کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ ملازمتوں کی مجبوریوں کی وجہ سے سرسید کے عزیز ترین دوست محسن الملک کو بھی اُن کی سیرت و کردار اور کارناموں کے مشاہدہ کا اتنا قریبی موقع نہ ملا ہوگا جتنا حالی کو۔ حالی ایک ادیب ہونے کی وجہ سے سرسید کو بحیثیت شبلی

انسان بہت پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حالی اپنی طبعی شرافت، رواداری اور فراخ دلی کی بنا پر دوسروں کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور اُن کا انکسار اور اُن کا طالب علمانہ جذبہ ہمیشہ اُن کے دل و دماغ کے پٹ کھلے رہنے کا باعث بنا ہوا تھا۔

یہ سچ ہے کہ سرسید کی شخصیت کی عظمت، اُن کی طویل اور پُر از واقعات زندگی، مواد کی فراوانی اور کسی باقاعدہ سوانح عمری کی عدم موجودگی کے مدِ نظر سرسید کی ایک مفصّل اور جامع سوانح عمری کی ضرورت تھی۔ لیکن حالی کا طبعی اعتدال اس کی ضخامت کے سلسلہ میں کام نہ آ سکا۔ حالی نے مولوی سراج الدین کی سرسید کی سوانح عمری کے مواد کو اپنی تصنیف میں شامل کر دیا تھا۔ کرنل گراہم کی لکھی ہوئی سوانح عمری سے بھی استفادہ کیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی عظمت، حالی کی ہمعصری، دوستی، رفاقت اور مستند مواد کی فراوانی ہی اُن کی سب سے بڑی دشواری کا باعث بنی اور اُن کی قوتِ امتیاز و انتخاب کو اپنی رَو میں بہا لے گئی۔

ایک عذر حالی کی طرف سے یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا تعارف سرسید سے اس وقت ہوا تھا جب کہ سرسید کی حیات کی دوپہر ڈھل چکی تھی اور اُن کی شخصیت کے ڈھلنے کا زمانہ گذر چکا تھا۔ حالی کا سرسید کی

زندگی کے آخری حصّے پر زور دینا مناسب ہی تھا کیونکہ وہی براہِ راست اُن کے مشاہدہ میں آیا تھا۔ انگریزی ادب میں ایک روشن مثال ہمیں باسول کی حیاتِ جانسن سے ملتی ہے۔ جس میں تقریباً اسی طریقہ پر عمل کیا گیا ہے۔

باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز حالیؔ سے ہوتا ہے۔ ان کے بعد شبلیؔ کا نمبر آتا ہے۔ یہ دو مصنف اپنی کوتاہیوں کے باوجود اُردو سوانح نگاری کے امام ہیں اور ان کی سوانحی تصانیف اُردو ادب کا ایک وسیع حصّہ اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اُردو ادب کی سربلندی کا باعث بنی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ خالص سوانح عمری کے معیار پر کہاں تک اُترتی ہیں۔ جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے یہ نقوشِ اولین کے علاوہ اس کی صنفِ سوانح نگاری کا بھی اولین اور بہترین سرمایہ ہیں۔

حالیؔ کی تنقید نگاری:۔

تنقید میں اُن کی مستقل کتاب تو "مقدمۂ شعر و شاعری" ہے لیکن اُن کی سوانحی تصانیف میں بھی جگہ جگہ تنقیدی خیالات مل جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ اُن کے کچھ مضامین اور تبصرے بھی ہیں جو مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے اور جن کو اب انجمن ترقی اُردو نے "مقالاتِ حالیؔ" کے نام سے دو حصّوں میں شائع کر دیا ہے۔ ان مضامین اور تبصروں میں بھی تنقیدی پہلو نمایاں ہیں۔

مقدمۂ شعر و شاعری:۔

مقدمۂ شعر و شاعری حالیؔ کے دیوان کا مقدمہ ہے اور اُردو میں اصول

تنقید کی سب سے پہلی کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں اُنہوں نے شعر و شاعری کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور اس کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں شاعری کی ماہیت، حیات اور سماج سے اس کا تعلق، اس کے لوازم، زبان کے مسائل، اُردو شاعری کے اصنافِ سخن، اُن کے عیوب و محاسن اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث بڑے مدلل اور فلسفیانہ انداز میں کی ہے اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

حالیؔ اُردو کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے فنِ تنقید پر انگریزی اور عربی سے مواد لے کر ایک جگہ جمع کیا جو ناقدین کے لئے شمعِ ہدایت ثابت ہوئی۔ اب زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے اور تنقید کے مبادیات اور نظریات بدلتے جا رہے ہیں۔ اس لئے اب شاید یہ کتاب تشفی بخش ثابت نہ ہو لیکن اس کی تاریخی اہمیت اور اولیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ حالیؔ نے انگریزی مصنفین سے بہت مواد حاصل کیا لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ اُردو اور فارسی میں اس فن پر بہت کم لکھا گیا تھا۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ ہندوستان اور ایران میں یہ فن کوئی جداگانہ فن سمجھا ہی نہیں گیا۔

اس کتاب میں ان تمام مباحث کو موضوع بنانے کا باعث انجمنِ پنجاب کے وہ مشاعرے تھے جن کا مقصد اُردو شعر و ادب میں ایک نئی لہر کو پیدا کرنا تھا۔ اور جس نے اُردو ادب میں مغرب کے زیرِ اثر ایک نئے رُجحان کو لانے کے لئے شعوری کوشش کی تھی۔ سرسیدؔ کی تحریک اور اُن کے

رسالہ "تہذیب الاخلاق" نے اِس ادبی انقلاب میں اور بھی زیادہ تنقیدی تلخی اور تیزی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اور پرانے رجحانات کے خلاف مکمل بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ کیونکہ اُس وقت ہمارے ادب میں تھک کر بیٹھ جانے والی جو کیفیت تھی اور اُس میں جو غلط معیار قائم ہو گئے تھے اُن کا وجود ہماری سماجی زندگی کے منافی تھا۔ اس پس منظر میں حالیؔ نے مقدمۂ شعر و شاعری کو مرتب کیا۔

یادگارِ غالبؔ حالیؔ کا دوسرا یادگار تنقیدی کارنامہ ہے اور ہم بغیر کسی پس و پیش کے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک مستقل اور پائیدار اضافہ ہے۔ آزادؔ نے بھی اپنے اُستاد کی مدح میں بہت سے راگ الاپے۔ اُس کے مقابلہ میں حالیؔ کا اندازِ گفتار دیکھیے۔ غالبؔ اُن کے اُستاد تھے لیکن یہ کمال ہے کہ اُن کے بیان میں متانت، عدل، سخن سنجی اور حقیقت پسندی کے آثار جا بجا موجود ہیں اور فی جملہ یادگارِ غالبؔ تنقید کی عمدہ مثال ہے ممکن ہے آج اِس کی تنقید ناقص اور کم معلوم ہوتی ہو کیونکہ گذشتہ پچاس سال میں تنقید کے فن اور مبادیات میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یادگارِ غالبؔ عرصہ تک ناقدین کے لیے شمعِ ہدایت بنی رہی۔ اِس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غالبؔ کو حیاتِ جاوید بخشی، غالبؔ کے مرتبہ سے ہمیں واقف کرایا۔ غالبؔ کے کلام پر حالیؔ کی تنقید بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ اس پر غالبؔ کے متعلق آئندہ تبصروں کی بنیادیں رکھی گئیں۔ اور ہم میں شعر و شاعری کے سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ حالیؔ کے کردار کی دو خصوصیات عام طور پر مشہور ہیں۔ اُن کی سادگی اور اُن کا خلوص یہی

دونوں خوبیاں اُن کی تصانیف کا جوہر ہیں۔[55]

"یادگارِ غالبؔ" میں حالیؔ نے انہیں اصولوں کی روشنی میں مرزا غالبؔ کے کلام پر روشنی ڈالی ہے جو مقدمۂ شعر و شاعری میں بیان کیے ہیں۔ یہاں اُن کی تنقید میں انتخاب و تشریح کا پہلو غالب ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انتخاب کو پیش کرنا اُن کی آرزو تھی اور اِس خیال کے پیشِ نظر انہوں نے اس کتاب کو شروع کیا تھا۔ انہوں نے خود اِس خیال کا اظہار کیا ہے کہ غالبؔ کی شاعرانہ اہمیت کو ذہن نشین کرانے کی خاطر ضروری یہ تھا کہ آپ کے کلام کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ اُس کی تشریح بھی ہوتی۔ لیکن بعض حالات نے انہیں اس سے بھی آگے بڑھا دیا اور اُن کے کلام پر کچھ ریمارک کرنے پر وہ مجبور ہو گئے اور جا بجا شرح بھی کر دی۔ چنانچہ اِس میں بھی تنقیدی پہلو نمایاں ہے۔

حیاتِ جاوید میں بھی تنقیدی پہلو موجود ہے۔ اس کے دوسرے حصہ میں سرسید کی سرکاری خدمات، ملکی و قومی خدمات، مذہبی خدمات کا بیان ہے۔ انہوں نے موضوعات کے تحت سرسیّد کی تصنیف و تالیف اور طرزِ تحریر کا بھی تنقیدی تجزیہ کیا۔ البتہ ان میں اُن کی سیاسی، قومی اور ملی خدمات پر تنقید زیادہ ہے۔ ادبی پہلو پر تنقید کم۔ "حیاتِ سعدی" میں دوسری سوانح عمریوں کے مقابلہ میں تنقیدی پہلو نسبتاً زیادہ نمایاں ہے

حیاتِ سعدیؒ کی تنقید میں نئی تنقید کی خصوصیات موجود ہیں۔ اس سے قبل فارسی شاعری عموماً لفظی خوبیوں سے جانچی جاتی تھی۔ معانی و خیال کی اہمیت پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ حالیؔ نے اِس طرف توجہ کی تو دوسرے شاعروں

سعدی کا مقابلہ کیا تاکہ اُن کے کلام کی خصوصیات نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔ انہوں نے سعدی کے کلام میں ایک پیام کی تلاش کی ہے اور وہ پیام ہے زندگی کی صحیح ترجمانی اور اس کے نشیب و فراز سے دنیا کو آگاہ کرنا۔ اُن کے خیال میں سعدی کی غزلیں اور قصیدے دونوں زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے بہت سے مسائل کو اپنی شاعری کے دامن میں اس لئے جگہ دی ہے اور اپنے قصیدوں میں اُن مذموات کا ذکر کرتے ہیں جو اُس زمانہ کی جاگیردارانہ سوسائٹی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہرچند کہ اشارۃً و کنایۃً سہی ان کی غزلوں میں زندگی کی تمام حقیقت کی تصویریں بے نقاب ہیں۔ انہی وجوہات سے حالی کے نزدیک سعدی ایک بڑے شاعر ہیں۔ سعدی کی شاعری پر حالی کی تنقید سے اُن کے تنقیدی نظریات پر کافی روشنی پڑتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسی قسم کی شاعری کو پسند کرتے تھے۔

حالی کی تقریظوں اور تبصروں کا جائزہ بھی یہاں بے محل نہ ہوگا۔ حالی نے تقریظیں یا تبصرے مختلف رسائل میں لکھے تھے جن کو اب انجمن ترقی اردو نے "مقالاتِ حالی" کے نام سے دو حصوں میں شائع کیا ہے۔

تقریظوں میں حالی صرف تعریف ہی نہیں کرتے بلکہ جو بات کھٹکتی ہے اُس کو بھی اشاروں اور کنایوں میں کسی نہ کسی پہلو سے ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس طرح اُن کی تقریظ روایتی اندازِ تقریظ سے مختلف ہو جاتی ہے۔ جہاں اُن کے تبصروں کا حال ہے وہ موجودہ اصولِ تبصرہ نگاری سے مطابقت رکھتے ہیں۔ تبصرہ میں وہ پوری کتاب پر تنقید کرتے، بلکہ پڑھنے والوں کو

اس سے آگاہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ خود بھی لکھا ہے کہ میرے نزدیک ریویو نگاری کا مقصد صرف اس بات کو دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ ذائقہ جن کو زمانہ کا مذاق ہر نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو کس درجہ تک ادا کئے ہیں۔ پس جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں تو ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ مصنف کی رائے جزئیاتِ مسائل میں فی نفسہٖ کیسی ہے کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے نہ کہ ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ کتاب کا عنوان بیان کیا ہے؛ ترتیب کیسی ہے؛ طریقِ استدلال مذاقِ وقت کے موافق ہے یا نہیں؛ اور کتاب لکھنے کی غایت جو مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہیئے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے، وہ اُس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ - بہرحال مقالاتِ حالی بھی حالی کے تنقیدی شعور پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان سے بھی حالی کی تنقید کا اندازہ ہوتا ہے۔

حالی کے تنقیدی شعور کی نشوونما

حالی کے تنقیدی شعور کی نشوونما میں دو باتوں کو بہت دخل ہے۔ ایک تو اُن کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحان اور دوسرے ماحول کے اثرات جہاں تک اُن کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحان کا تعلق ہے سب جانتے ہیں کہ وہ زندگی کو حرکت سمجھتے تھے اُن کا نصب العین تھا کہ جس طرف زمانہ مڑے انسان کو اُسی طرف مڑ جانا چاہیئے۔ وہ صاف صاف لکھتے ہیں کہ "جو لوگ زمانہ کی پیروی نہیں کرتے وہ گویا زمانہ کو اپنا پیرو بنانا چاہتے

ہیں۔ مگر یہ اُن کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو
نہیں روک سکتیں اور چند جھاڑیاں ہوا کا رخ نہیں پھیر سکتیں"۔
انہیں خیالات کے پیشِ نظر انہوں نے اپنے وقت کے حالات کا
جائزہ لے کر سر سیّد کی تحریک میں شامل ہونا مناسب سمجھا۔ یہ بات
اُن کے تنقیدی شعور پر دلالت کرتی ہے۔

حالیؔ کے تنقیدی شعور کی نشوونما میں ان حالات کے علاوہ دہلی کی ان
تین شخصیتوں نے بھی بڑا اثر ڈالا ہے[۵۵]۔ ان میں سب سے پہلے سرسیّد ہیں جو
زندگی اور ادب دونوں کے بہت بڑے نباض تھے۔ حالیؔ اُن کی شخصیت
سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ زندگی اور ادب دونوں کو تنقیدی زاویۂ
نظر سے دیکھنے کا خیال اُن کے اندر سب سے پہلے سرسیّد ہی نے پیدا کیا۔
سرسیّد بڑے دور بین اور دور رس آدمی تھے۔ حالیؔ کو بھی اس کا اعتراف
ہے۔ لکھتے ہیں: "ملک و قوم کی تمام مقدم ضرورتیں جن میں بعض ابھی تک
لوگوں کو محسوس نہیں ہوئیں اس شخص نے اب سے تیس بلکہ چالیس
برس پہلے بخوبی محسوس کر لی تھیں"۔ بہر حال حالیؔ کے تنقیدی شعور کی
نشوونما میں سرسیّد کی شخصیت کو اچھا خاصا دخل ہے۔

سرسیّد کے علاوہ مرزا غالبؔ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کی صحبت نے
بھی حالیؔ کے تنقیدی شعور کی نشوونما میں بڑا کام کیا۔ غالبؔ حالیؔ کے استاد تھے
جن کی صحبت میں حالیؔ کو ادبی نکتوں کے سمجھنے اور اُن پر غور کرنے کا موقع ملا۔
غالبؔ سے اُن کو ادب کے بہت سے اسرار و رموز معلوم ہوئے۔ حالیؔ خود
لکھتے ہیں: "جس زمانہ میں میرا دلّی کو جانا ہوا اکثر اُن کے اُردو اور فارسی

دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے
انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے[۵۶]۔ ان صحبتوں کے اثرات
نے اُن کے تنقیدی شعور پر ضرور پڑے ہیں اور انہوں نے اِس کی نشوونما میں
اچھا خاصا حصہ لیا ہے۔

تیسری شخصیت جس نے حالیؔ کے تنقیدی شعور کی نشوونما پر اثر کیا وہ
نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ ہیں۔ وہ اس زمانہ کے بڑے عالم تھے اور اُن کا
ادبی ذوق اعلیٰ درجہ کا تھا۔ حالیؔ کو خود اس کا اعتراف ہے۔ لکھتے ہیں،
"نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے اس کی
نسبت اُن کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے
ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر اُن کے مرنے
کے بعد وہ مرزا غالبؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "میرے
وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا
تازہ ہو گیا۔ اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان جو اب تک مکروہات کے
سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اُس زمانہ میں اردو اور
فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہی
کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر
درحقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو
نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور
حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی
باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری

سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

اِن خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ شیفتہ کی صحبت نے نہ صرف حالی کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں مدد کی بلکہ ان کے بعض تنقیدی نظریات کی تشکیل بھی شیفتہ ہی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ مبالغہ آمیزی سے نفرت، تنوع، خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ کر کے حقائق و واقعات کا بیان اور چھچھورے خیالات اور الفاظ و محاورات سے نفرت، یہ تمام خیالات و نظریات انہیں کے زیر اثر حالی نے پیش کئے ہیں۔

غرض انہی دہلوی بزرگوں کی سرپرستی میں حالی کے تنقیدی شعور کی نشو و نما ہوئی اور اُن سے وہ تنقیدی خیالات و نظریات پیش کر دائے جو اُردو میں بالکل نئے ہیں اور جنہوں نے اُردو تنقید کو ایک بالکل نئی شاہراہ پر ڈال دیا۔

حالی کے تنقیدی نظریات اور ان کا تجزیہ :-

شعر و شاعری کے متعلق حالی کے خیالات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی شعر کی اچھائی اور بُرائی دونوں پہلوؤں کے قائل ہیں۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ شعر کسی بلند اور اچھے کام کے لئے استعمال ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کی افادیت کے قائل ہیں ان کے نزدیک شاعر کے سامنے ایک بلند نصب العین کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جہاں تک شاعری اور اس کے مقصد کا تعلق ہے وہ افلاطون کے ہم خیال ہیں۔ لیکن

وہ افلاطون کی طرح شاعروں کو جمہوریت سے نکالنا نہیں چاہتے بلکہ کسی خاص مقصد کے لئے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مقصد ہے شعر کے ذریعہ سوسائٹی کو فائدہ پہنچانا۔ افلاطون خود بھی اس کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک شاعری اس حد تک شاعری ہے جس حد تک اس سے کسی سماجی بہتری کی ترقی ہو ورنہ اس کے خیال میں وہ غیر ضروری اور مضر ہے۔ حالی بھی اس کے ہم آواز ہیں۔

شاعری کا مقصد حالی نے جذبات کو برانگیختہ کرنا قرار دیا ہے۔ اُن کا مطلب بنی نوع انسان کے دل میں ایک قسم کی جولانی اور اُمنگ پیدا کرنا ہے تاکہ ان پر چھائے ہوئے اُداسیوں کے بادل چھٹ سکیں اور اُن میں عمل کی صلاحیت بیدار ہو۔ حالی کا یہ نظریہ اپنے وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔ اس سلسلہ میں کلیم الدین احمد یوں گویا ہیں کہ شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا نہیں۔ شاعری جذبات کی تعلیم و تربیت کرتی ہے انہیں برانگیختہ نہیں کرتی۔ یہی سبب ہے کہ شاعری کا اثر ہنگامی نہیں پائیدار ہوتا ہے۔ اس سے ہماری روحانی، جذباتی اور جسمانی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ اچھے شعر جذبات کو بھڑکاتے نہیں ہیں۔ اور جو شعر جذبات کو بھڑکاتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے۔ اصل یہ ہے کہ حالی کا معیار مادی ہے۔ وہ شعر کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے۔ اس غلط فہمی کا سبب وہ شعر کی تاثیر اور اس کے فائدے کو تسلیم کرتے ہیں اس خوش فہمی کا سبب بھی یہی مادی معیار ہے۔ اس طرح وہ افلاطون والے نظریے کے متعلق لکھتے ہیں کہ بیشک شاعری تفنن طبع کا ذریعہ نہیں اُس کے آئینہ میں مادی اور

رُوحانی دُنیا اور اس دُنیا کے بنیادی قوانین کا صاف، مکمل اور پُرسکون
عکس ملتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج بھی یہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔[61]

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے بے محل نہ ہوگی۔
"اگر ہم حالی کے عہد یعنی ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد مسلمانوں کی حالت کا مطالعہ
کریں تو اُن کے اس نظریے کی غرض و غایت واضح ہو جائیگی اور حالی کی یہی صفت
اُن کے تنقیدی شعور پر دال ہے۔"

انہیں خیالات کے زیر اثر حالی نے شاعری کے اخلاقی پہلو پر بھی زور دیا
ہے۔ اُن کے خیال میں "شعر اگرچہ براہِ راست علم الاخلاق کی طرح تلقین
و تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اُس کو اخلاق کا نائب و مناب
اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔[62]"

اس بارے میں کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ اخلاق اور شاعری اہم
موضوع ہے۔ لیکن اس موضوع پر جو خیالات حالی نے پیش کئے ہیں وہ اہم
نہیں۔ ان میں کوئی نیاپن اور گہرائی نہیں۔ دیکھنے میں اخلاق ایک
سیدھا سادہ معمولی عام فہم لفظ ہے، لیکن بہت سے لفظوں کی
طرح اس کا بھی ایک مخصوص مفہوم نہیں۔ وہ کئی معنوں میں استعمال
ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ حالی کی نظر میں اخلاق کا عام اور محدود معنی ہے۔[63]

کلیم الدین احمد کی اس رائے کے متعلق اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ ہمیں
تعجب ہوتا ہے کہ کلیم الدین صاحب حالی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے وقت
اُن کے عہد کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالی جیسے پیش رو سے کلیم الدین
احمد کا اس طرح توقع کرنا بیجا معلوم ہوتا ہے۔ حالی کے عہد میں سماجی زندگی

انحطاطی کیفیت نے سماج کے افراد کو اخلاقی اعتبار سے پست کر دیا تھا۔
چنانچہ ایسے زمانہ میں شاعری کے متعلق اس قسم کے خیالات قائم کرنا نہایت
ضروری بات تھی۔ اور حالی نے اسی وجہ سے اس قسم کی بحثوں کو چھیڑا
تھا کہ وہ پہلے مفکر تھے۔ کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا صحیح تعین اس کے
پس منظر ہی میں ممکن ہے۔

شاعری اور اخلاق کے سلسلہ میں حالی لکھتے ہیں "قومی افتخار،
قومی عزت، عہد و پیماں کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزائم پورے
کرنے، استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنے اور ایسے فائدوں پر
نگاہ نہ کرنے جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہو سکیں اور اس قسم کی وہ
تمام خصلتیں جن کے ہونے سے ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک
اُٹھتی ہے اور جن کے نہ ہونے سے بڑی سے بڑی قومی سلطنت دُنیا کی
نظروں میں ذلیل رہتی ہے۔[64]" ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ ان جملوں
کی اہمیت اور بھی زیادہ اس وجہ سے ہے کہ حالی نے اپنی شاعری میں
ان پر عمل کر کے دکھایا۔ اور اُن کے بعد اسی بنیاد اور اسی خیال سے
مدد لیتے ہوئے اقبال نے اُردو کی مقصدی شاعری کو درجۂ کمال پر پہنچایا۔"
لیکن آگے وہ لکھتے ہیں کہ "مگر اخلاقی شاعری کے عمل سے وہ اس قدر ناواقف
نظر آتے ہیں کہ اُن کی اس سلسلہ میں رائیں اُن کی تنقید کو بہت پست
درجہ پر اُتار دیتی ہیں۔[65]" مگر حالی صاحب کی حیثیت ایک پیش رو کی
تھی۔ وہ اُردو ادب میں پہلی مرتبہ تنقید کی داغ بیل ڈال رہے تھے۔
اُن سے اتنی ہی توقع کرنا ٹھیک ہے۔ بیسویں صدی کے تنقیدی اصولوں کو

مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کی تنقید کا جائزہ لینا اُن کے ساتھ ناانصافی کرنے
کے مترادف ہے۔

حالی کا یہ خیال بھی بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شعر و شاعری سوسائٹی
کے تابع ہوتی ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عموماً شاعری
سوسائٹی سے متاثر ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کا اثر سوسائٹی پر
بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بیسویں صدی میں بھی اِس
نظریہ کی قدر کی جا رہی ہے۔ اِس سے ہم حالی کے تنقیدی شعور کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

شعری ماہیت کے متعلق اُنہوں نے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ
بہت وسیع مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہیں۔ چنانچہ اِس سلسلے میں وہ صرف
لارڈ میکالے کا قول نقل کرتے ہیں۔ میکالے کی نقاد کی حیثیت سے
کوئی وقعت نہیں۔ اُس کے قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ میکالے
کے خیال میں شاعری ایک خاص قسم کی نقالی ہے۔ یہ نقالی فن مصوری یا نقاشی کے مقابلہ
میں نامکمل ہے لیکن اس کی دنیا وسیع ہے تاہم حالی نے شعر کی تعریف کے سلسلے میں میکالے کا
جو قول پیش کیا ہے اُس سے وہ پوری طرح اتفاق نہیں کرتے۔ حالی
کا خیال ہے کہ میکالے نے جو کچھ شعر کے متعلق لکھا ہے گو اُس کو شعر کی
تعریف نہیں کہا جا سکتا لیکن شعر سے جو کچھ آج کل مراد لی جاتی ہے۔
اُس کے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے۔[۲۳]

میکالے کے علاوہ اُنہوں نے ایک اور محقق کا نظریہ پیش کیا ہے
لکھتے ہیں:-

"جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ اس طرح

ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے۔ خواہ
وہ نظم میں ہو خواہ نثر میں۔"[۲۴]

یہ خیال اُن کے نزدیک اہم ہے۔ چنانچہ وہ قافیہ، ردیف، وزن کا
التزام شعر کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ بات ضرور مانتے ہیں کہ
وزن سے شعر کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ قافیہ، ردیف اور وزن سے اِس
بیزاری کا سبب یہ ہے کہ حالی شاعری کو قافیہ پیمائی بنانا نہیں
چاہتے تھے۔ خیال اُن کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے
اُس کے بعد یہ ظاہری خوبیاں آتی ہیں۔ وہ شعر کو قافیہ اور وزن کا
پابند کرنا نہیں چاہتے بلکہ وزن اور قافیہ کو شعر کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔[۲۵]
اُن کے نزدیک، صرف عروض کا ماہر شاعر نہیں ہو سکتا۔ شاعر اور غیر شاعر
میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے۔ شاعر معانی کا خیال رکھتا ہے اور
غیر شاعر کے نزدیک قافیہ پیمائی شاعری کی معراج ہے۔

اچھا شاعر ہونے کے لئے وہ تین شرطوں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔
۱- تخیل ۲- کائنات کا مطالعہ ۳- تفحص الفاظ[۲۶]

اِس کے متعلق کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ یہ بھی سطحی اور کورانہ طور
پر اخذ کی گئی ہیں۔ "تخیل کی تعریف حالی نے جس ڈھنگ سے کی ہے اس
کے متعلق کلیم الدین صاحب یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ حالی صاحب
فینسی (FANCY) اور امیجنیشن (IMAGINATION) میں امتیاز
کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اور وہ یہ لکھتے ہیں کہ تخیل کی
بہترین تعریف کولرج نے کی ہے۔ حالی سے اِس طرح کی توقع نہیں۔

کی جاسکتی کیونکہ انہوں نے کولرج یا دوسرے رومانی نقادوں کے تنقیدی
خیالات کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ اس سے پہلے اردو میں تخیل کی
تعریف کی کوئی روایت موجود ہے۔ حالی نے اس کو پہلی مرتبہ پیش کیا
اس لئے اس میں سطحیت موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود تخیل کے متعلق
ضروری باتیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ حالی نے مطالعہ کے مفہوم کو اتنی وسعت
دی ہے کہ اس میں تخیل، حافظہ، غور و فکر، قوتِ حاسہ ساری چیزیں
سما سکتی ہیں۔ تاہم شاعری میں اس پہلو کی اہمیت تو ظاہری ہے۔
حالی کا یہ خیال صحیح ہے کہ اگر شاعر اس کا خیال نہیں رکھے گا تو قوتِ
تخیل بھی کام نہیں کر سکتی۔ تیسری شرط تفحص الفاظ کے متعلق کلیم الدین
احمد لکھتے ہیں کہ اس میں بھی سطحیت ہے اور حقیقت سے بے خبری پائی جاتی ہے۔
لیکن بقول عبادت بریلوی بغیر اس کا خیال رکھے شاعر اپنے مافی الضمیر کو
اچھی طرح پیش ہی نہیں کر سکتا۔

عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ حالی کی یہ تینوں شرطیں جو انہوں نے
شاعری کے لئے ضروری قرار دی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ اگرچہ تنقید بہت
زیادہ آگے بڑھ چکی ہے لیکن آج بھی انہیں خیالات پر زور دیا جا رہا ہے
الفاظ بدل گئے ہیں۔ پیش کرنے کے طریقہ میں نیا رنگ اور نیا انداز
اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن بنیادی خیالات وہی رہے ہیں۔

شعر کی ضروری خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے حالی نے ملٹن کے خیالات
پر اپنے نظریات کی بنیاد رکھی ہے۔ ملٹن کے نزدیک شاعری میں سادگی

اصلیت اور جوش کا ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں فاروقی صاحب
لکھتے ہیں کہ حالی نے ان الفاظ کے متعلق جو تشریح کی ہے اس میں ایک
بہت بڑی غلطی ہے۔ سادگی اور جوش (SIMPLE اور PASS-
IONATE) نہایت مناسب ترجمے ہیں۔ مگر SENOUOUS کا ترجمہ
'اصلیت' سراسر غلط ہے۔ بیشک حالی سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔

فاروقی صاحب کا یہ کہنا کہ ملٹن نے شاعری کے متعلق جو کچھ کہا
تھا حالی نے اس کو اٹل تصور کیا، حقیقت سے منہ موڑنا ہے۔ کیونکہ حالی نے
جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملٹن کے خیالات اگر
ان تک نہ بھی پہنچتے تو تب بھی وہ انہیں خیالات کو شاعری کے لئے ضروری
قرار دیتے۔ کیونکہ ان کی ذہنی نشو و نما جس ماحول میں ہوئی، ماحول
کے جو اثرات ان پر پڑے اور ان کے شعور کی بیداری نے حالات کا جو
اثر قبول کیا ان کی وجہ سے ان کے لئے لازمی تھا کہ وہ انہیں خصوصیات
کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیتے۔ اس لئے حالی نے ان کے مقابلہ میں
سادگی کو ضروری قرار دیا۔ اسی طرح شاعری میں اصلیت کے خیال کو
ضروری قرار دینے کا باعث بھی اس زمانہ کا تقاضا تھا۔ کیونکہ ہمارے قدیم
شاعر ہوائی باتیں کرتے اور لوگ ان کو پسند کرتے تھے۔ حقیقت اور
واقعیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ حالی کو یہ بات پسند نہ تھی
اس وجہ سے انہوں نے اصلیت کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا۔ جوش
کی خصوصیت کا خیال بھی اپنے وقت کی پیداوار ہے کیونکہ اس زمانہ میں
بہت سے شاعر بغیر محسوس کئے ہوئے شعر کہتے تھے اس وجہ سے ان کی

جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ مقالہ
دونوں کے تعلقات کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں اتحاد بڑھتا گیا۔

حالی کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ بچپن سے لے کر دلی کے
مدارس اور شیفتہ کی صحبتوں تک ان کی زندگی پر مذہب کا غلبہ رہا۔ جو
اس دور میں عام لوگوں کی دماغی کاوشوں کے لیے پسندیدہ میدان تھا۔
حالی کا ابتدائی نثری کام بھی ردِ عیسائیت اور اخلاقی قصوں جیسی تصانیف
تک محدود تھا۔ لیکن سرسید کی بدولت ان کے مذہبی خیالات میں انقلاب
واقع ہو گیا۔ اور وہ محدود دائرہ سے نکل کر زندگی اور اس کے مختلف
مسائل میں دلچسپی لینے لگے۔

ان کے مقالات کا دوسرا حصہ تبصروں، خطبات، کانفرنسوں اور
جلسوں کے لیکچروں پر مشتمل ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ تحریریں دو حصوں
میں منقسم ہیں۔ پہلے میں وہ تحریریں اور لیکچر شامل ہیں جو مولانا نے مختلف
اجتماعات کے لیے مرتب کیے تھے۔ دوسرے میں عملی تنقید کے نمونے ہیں۔
اس میں ادبی اور تاریخی کتابوں کے علاوہ رسائل، تراجم، روداد
اور دوسرے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کچھ تبصرے محض ہمت
افزائی اور ذاتی تعلقات کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی
ان میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہے۔

تبصرہ نگاری :-

تبصرہ نگاری تنقید کی ابتدائی منزل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس صنف کو

بہت ترقی ہوئی ہے۔ بعض رسالوں میں ایسے تبصرے شائع ہوتے ہیں
جنہیں تقریباً ایک مستقل مضمون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن
اس سے قطع نظر تبصرہ کی نوعیت یہ ہے کہ مبصر صاحب کتاب کا
تعارف کرا دے اور کتاب کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مصنف
کے خیالات کے بعض اہم گوشوں یا خامیوں کی طرف ناظرین کو متوجہ کرا دے
اس کی زبان، طرز ادا نیز قیمت اور طباعت و اشاعت کے سلسلے میں
ضروری باتیں تحریر کر دے۔

حالی کے تبصروں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا داد دینے اور
تعریف کرنے میں فیاضی برتتے تھے۔ جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا۔
بقول مولوی عبدالحق صاحب "ممکن ہے یہ صحیح بھی ہو لیکن اس کا دوسرا
پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذراسی داد دینے سے دل کتنا بڑھ جاتا اور
آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ حالی ایک نیک سیرت بزرگ تھے۔
خود پرستی اور ہم چشموں سے رقابت ان میں بالکل نہ تھی۔ ہر کتاب کو
علمی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور ان تمام حدود کا خیال رکھتے تھے کہ
مصنف کو کیسے کیسے سخت مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ پھر ہمارے یہاں
ٹھوس علمی کام کرنے والے کتنے ہیں۔ جب مولانا کسی میں یہ شغف
اور جذبہ دیکھتے ہیں تو اس کی دلجوئی کرتے، ہمت بڑھاتے کہ شاید
یہی ملک میں ایک دن علم کا چشم چراغ ثابت ہو۔ گویا حالی کا یہ
رویہ اشاعتی اور علمی بہبود کے لئے تھا۔ جس میں ایک خطرہ ضرور ہے
کہ کبھی کبھی یہ ہمت افزائی معیاری نہیں ہوتی مگر حالی کی دلجوئی اور

تعریف میں اس خطرہ کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ تبصرہ لکھنے کا حالی کا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ خوبیوں پر بہت زیادہ توجہ دیتے تھے اور خامیوں کا ذکر دبی زبان سے کرتے تھے۔

خطوط نویسی :۔

عام طور پر حالی کے خطوط کو بھی سرسید کے خطوط کی صف میں جگہ دی جاتی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دونوں مصلحین ایک جان دو قالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے یہاں درد مندی ہے، قوم کی غمگساری ہے اور ملکی و ملی مسائل سے والہانہ وابستگی ہے۔ ان کی یہی پرائیوٹ زندگی ہے۔ وہ خلوت اور جلوت دونوں میں ایک ہی چال ڈھال اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن احساسات اور جذبات دونوں غم میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے حالی کے خطوط میں بھی سرسید کے خطوط کی طرح یکسانیت اور وحدت نظر آتی ہے۔ یہ شخصی تاثرات اور ذاتی جذبات سے تقریباً خالی ہیں۔

لیکن اس سے ہمیں اتفاق نہیں البتہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ خانگی معاملات سے لے کر قومی و ملی، علمی اور ادبی تحریروں تک میں ایک ہی دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے جو دوئی سے بیگانہ اور مصلحت سے ناآشنا و صداقت سے مملو۔

خطوط کی تعریف کے ضمن میں اگرچہ یہ بات آئی ہے کہ وہ مکتوب نویس کی شخصیت کا صحیح عکس اور اس کی زندگی کے آئینہ دار ہیں تو یہ بات

حالی کے خطوط پر بھی صادق آتی ہے۔ البتہ ان میں جاذبیت، رنگینی اور ہیجان خیز کیفیت نہیں ہے۔ نہ غیض و غضب ہے، نہ غصہ ہے، نہ نفرت اور نہ حقارت کا سیلاب موجزن ہے۔ ان میں جنسی زندگی اور معاملات عشق و محبت کا کوئی اشارہ نہیں۔ پھر بھی وہ خط حالی کی روح کے ترجمان ہیں۔ اگر کسی جگہ شکایت و گلہ کا لہجہ پیدا بھی ہو گیا تو اس میں بھی یہ کیفیت نظر آتی ہے بلکہ اس شکوے کا سبب استواری تعلقات ہے، نہ کہ مخالفت اور ذاتی رنجش۔ حیات جاوید کی اشاعت کے وقت جو سردمہری نواب محسن الملک کی طرف سے ہوئی اس ضمن میں بعض شکایت آمیز فقرے مولانا کے قلم سے نکل گئے ہیں، لیکن بہت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ۔ نواب حبیب الرحمن شیروانی کو "حیات جاوید" پر تبصرہ کی نسبت لکھتے ہیں: "نواب محسن الملک بہادر نے بھی کچھ ریمارکس کرنے کا ارادہ کیا ہے مگر ان کا ارادہ ایسا ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے۔" مذکورہ بالا انداز نہ تو مخالفانہ ہے اور نہ مخاصمانہ ہے، بلکہ لطیف ظرافت کے ساتھ اظہار مطلب ہے۔

ان کے خانگی خطوط میں بھی بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں جہاں محبت اور ملاطفت ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔ اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں "کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمہیں کوئی پہچان نہ سکے۔ اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی ہوں" حالی کی دردمندی، دلسوزی، غمخواری اور شفقت و ہمدردی کو اردو ادب میں ایک مستقل روایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ جواں اللہ

بھائی بند، اہلِ محلہ، پڑوسی، استاد، شاگرد، دوست احباب، ملک و ملت، دیر و مسلح — ہر شخص کے لیے عام ہے" گویا حالی خلوت پسند نہیں۔ وہ اپنے آپ سے کبھی باتیں نہیں کرتے بلکہ بنی نوع انسان کو مخاطب کرتے ہیں۔ وہ اجتماعی احساس سے معمور ہیں۔ اُن کی ہر صدا قوم و ملت کے سوگ میں ڈوبی ہوئی ہے اور وہ بھی دوٹوک ...... اُن میں قطعیت، سادگی، اعجاز، اختصار و اعتدال ہے۔

مولانا حالی نے مولوی عبدالحق صاحب کے نام جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں مختلف اور متنوع مضامین ملتے ہیں۔ حالی اِن خطوط میں مختلف رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ دوست، بزرگ، ناصح اور شفیق ہر حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ وہ اُن سے نجی کی باتیں پوچھتے ہیں اور راز کی باتیں کہتے ہیں۔ کبھی اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہیں اور کسی جگہ انہیں زمانہ کے گرم و سرد سے آگاہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں "مجھے بے سروپا مدح سرائی اور ہجو گوئی بالکل نہیں آتی۔ یا کیشن کو چند ریزولیوشن ایسے بھی پاس کرنے چاہئیں جن سے موجودہ ٹرسٹیوں کی غفلت و بے پروائی کا انسداد ہو۔ اور آئندہ کسی عمدہ اور مستحکم اصول سے اُن کا انتخاب عمل میں آیا کرے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ حالی کے خطوط میں خوش مذاقی اور مدعا نگاری کا پُر لطف آمیزہ موجود ہے۔ اُن میں شخصی ادعا کم ہے۔ مکتوب الیہ کا لحاظ زیادہ نمایاں ہے۔ حالی کے خط اُن کی ذات سے زیادہ اُن کے مکتوب الیہ کے حالات اور ذہنی کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں۔

صاف بیانی اور قطعیت سادگی کے ساتھ آمیز ہو کر اُن کے خطوط کو معنی دار بنا دیتے ہیں۔ ...... اُن کے خط کو پڑھ کر مکتوب الیہ کو اطمینان بخش پیغام تو مل جاتا ہے مگر دل میں جوش پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اِس سے انکار نہ ہوگا کہ حالی کے خطوط کے مطالعہ سے قلبی کشادگی اور وسعت کی فضا ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اُن کے خطوط آدمیوں کی ذاتی ملکیت تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ نفع عام اور ذوقِ عام کی چیز بن جاتے ہیں۔ حالی کے خط دراصل سرسید کی طرح محض مقصد کے زیرِ اثر پیدا ہوتے ہیں۔ اُن میں غالب کی سی آرزو کے ہم کلامی اور شبلی کا سا جوشِ حیات نہیں اُن کے یہاں خود نمائی نہیں۔ اُن کے خطوں میں حقیقت کی پُرخلوص سادہ بیانی ہے۔ انہوں نے خط کو نہ فن بنایا، نہ فن کا تماشا بنایا، نہ سخن کا پردہ۔ یعنی اُن کے خط نہ فن ہیں نہ سخن، محض خط ہیں جو اپنا اصلی فرض (مدعا کا ابلاغ) نہایت اچھی طرح انجام دیتے ہیں[۲۰]۔

حالی کے خطوط پر یہ تبصرہ کم و بیش قابلِ قبول ہے۔ لیکن ایک بات ضرور ذہن میں پیدا ہوتی ہے کہ خطوں کو چونکہ نصف ملاقات کا درجہ دیا جاتا ہے وہ اپنے لکھنے والے کے قائم مقام اور نائب و مناب ہوتے ہیں۔ اِس لیے اِن میں شخصی تاثر سے اغماض برتنا مناسب نہیں۔ چونکہ خطوں میں ایک کہتا ہے اور دوسرا سنتا ہے اور وہی کہتا ہے جس سے پڑھنے والے کو بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ اِس لیے خط میں دونوں کے جذبات کی ترجمانی ضروری ہو جاتی ہے وہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ انسانوں کی ملاقات اور کیفیات کا مظہر ہے۔ حالی کے یہاں مکالمہ کی

کیفیت نہیں ایک طرح کی یکسانیت اور یک رنگی چھائی ہوئی ہے۔ خطوط زندگی کا حقیقی عکس ہوتے ہیں۔

حالی کا اسلوب:-

حالی کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ اُن کے خیالات سرسید کے خیالات کی آواز بازگشت ہیں۔ اور اسی نسبت سے اُن کا اسلوب بھی سرسید سے بہت زیادہ متاثر ہے لیکن بعض حضرات کا تو یہ بھی خیال ہے کہ اگر حالی سرسید کی بجنسہٖ نقل کرتے تو اسلوب زیادہ مقبول ہوتا۔ بلاشبہ حالی کے اسلوب میں سرسید کی بعض باتیں ملتی ہیں جیسے سادگی، منطقی، نیچرل کیفیت اور اظہار بیان میں بے تکلفی۔ لیکن ان کی نثر میں سرسید کے مقابلہ میں جہاں تنوع کم ہے وہاں سرسید کے مقابلہ میں سادگی زیادہ ہے۔ سرسید کے یہاں "کر کر" جگہ جگہ استعمال ہوا ہے جو بہت ہی نامانوس اور کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ حالی کے یہاں اس طرح کی کوئی تکرار نہیں نظر آتی بلکہ سرسید کی اثر پذیری کے باوجود سرسید سے زیادہ ان کے یہاں نرمی اور ملائمت پائی جاتی ہے۔ اُنہوں نے جا بجا شاعرانہ رنگ کو بھی اختیار کیا ہے لیکن محض مُنہ کا مزہ بدلنے کیلئے وہ شعر و شاعری اور نثر میں ایک امتیاز برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی یہ شعوری کوشش تھی کہ وہ سادگی کی طرف مائل ہوتے گئے۔ طبیعت کا جوش و خروش اکثر تحریروں میں جھلک کر مصنف کی شخصیت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ سرسید شدت جذبات کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں اور حالی متانت، سنجیدگی اور سادگی کی وجہ سے روشناس خلق ہیں۔

حالی ان تمام طریقوں کو برتتے ہیں جو ایک اچھے نثر نگار کا زیور ہیں۔ مگر اُن کا معتدل نقطۂ نظر افراط و تفریط سے ہمیشہ گریز کرتا ہے۔ وہ اثر پیدا کرنے کے لیے تشبیہوں کی بجائے تخیل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ وہ بھی وضاحت کے لئے اور سرسید استدلال کے لیے یہی سبب ہے کہ حالی کے یہاں سرسید سے بھی زیادہ نپا تلا انداز اور فطرت پرستی نظر آتی ہے۔ دراصل حالی ضرورت سے زیادہ فطرت پرست بن گئے تھے اور اس قدر نیچرل ہوجانے سے ادب کو نقصان پہنچتا ہے۔ حالی کے یہاں پھیکا پن اسی افراط کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ حالی کی سب سے بڑی کمزوری نقادوں نے یہ بتائی ہے کہ وہ تصویریں نہیں بنا سکتے۔

حالی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی نثر کو تمام جذبات سے محفوظ رکھا اگر وہ ہر رنگ کو ایک ہی نقطۂ نظر سے نہ لکھتے تو اُن کے اسٹائل میں تنوع کے بہت وسیع امکانات تھے۔ مولانا شبلی کے مقابلہ میں حالی کے اسٹائل میں عوامی انداز کی زیادہ کارفرمائی ہے۔ اس لئے وہ علمی نثر کے لیے تمام ہمعصروں کے مقابلہ میں زیادہ موزوں ہے۔ اسی اسٹائل کو مولوی عبدالحق نے ترقی دی جس میں اس بدلتے ہوئے سماجی شعور کو جذب کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ الفاظ کی مینا کاری اور خالی خولی عبارت آرائی اس علمی اور تحقیقی دور میں قبول عام نہیں حاصل کر سکتی بلکہ سادگی اور صفائی کیلئے راستہ زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔

حالی کی ابتدائی نثر کی بھی ایک نمایاں خصوصیت اپنے ہمعصروں کے

مقابلہ میں نظر آتی ہے۔ مذہبی رسائل میں مناظرہ کا رنگ کم، علمی دلائل
زیادہ ہیں۔ لیکن یہ حالی کا مستقل رنگ کبھی نہیں بن سکا۔ اُن کا
ذہن ابتدا ہی سے مقصدیت کی طرف مائل تھا جس کی جھلکیاں
جا بجا اُن کی ابتدائی نثری کتابوں میں نظر آتی ہیں۔ مجالس النساء میں
یہ کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ حالی سے قبل اور بعد میں جو کتابیں
ان موضوعات پر لکھی گئیں۔ اُن کو سامنے رکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی
ہے لیکن اُن کا اصلاحی رجحان ان کتابوں میں زیادہ نظر آتا ہے جو سرسید
تحریک کے اثرات قبول کرنے کے بعد لکھی گئیں اور جنہوں نے جدید اردو
ادب میں بنیادی حیثیت حاصل کی۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ
جاوید، مقدمۂ شعر و شاعری اور مقالوں میں کہیں کہیں یہ کیفیت موجود ہے۔

عام طور پر نقادوں نے حالی کے ذہنی انقلاب کو پنجاب بکڈپو کے
ترجموں سے منسوب کیا ہے۔ آج اس بکڈپو کا کوئی ذخیرہ محفوظ نہیں
ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ کون سے ترجمے تھے جن کی عبارت کی
اصلاح کر کے حالی مغربی شاعری اور اس کے اصولوں سے واقف ہو گئے۔
لیکن اس دور کے اخبارات میں جو اردو ترجموں کی فہرستیں یا د تاریخی
کی تحقیقات سے منظرِ عام پر آگئی ہیں، اُن میں ادبی کتابیں شاذ و نادر ہی ہیں
بلکہ تاریخ، نیچرل سائنس اور تعلیم پر زیادہ کتابیں ہیں۔ جو کچھ ادبی تصانیف
ہیں اُن کا موضوع اور انداز اس قسم کا ہے جس سے کسی خاص نظریۂ
فکر کے پیدا کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس سے یہ بات زیادہ صاف
ہو جاتی ہے کہ حالی کی ذہنی تربیت میں ان تراجم کا کوئی نمایاں ہاتھ

نہیں ہے بلکہ مختلف اثرات کے ذریعہ یہ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ آج جبکہ
زمانہ کا ادبی مذاق زیادہ نکھر گیا ہے۔ اور تنقید نے بحیثیت فن کافی ترقی
کر لی ہے۔ اب بھی اردو زبان مغربی شاعری کے اہم نمونوں اور اصولِ تنقید کی
کتابوں کے تراجم سے محروم ہے۔ البتہ جستہ جستہ خیالات کا ذکر [illegible]
کی بعض تحریروں میں ملتا ہے۔ اور حالی کے "مقدمہ" پر یہ اثرات موجود
ہیں۔ خاص کر میکالے کے ملٹن پر مضمون کا اثر صاف نمایاں ہے بلکہ کئی جگہ
اس کے خیالات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ جس طرح ملٹن کے بیان کردہ اصول
اصلیت، سادگی اور جوش کو بھی انگریزی تنقید میں کوئی نمایاں جگہ
نہیں حاصل ہو سکی۔ اور نہ ملٹن کے نقادوں نے ان کا کوئی خاص ذکر کیا ہے۔
اسی طرح مشہور انگریزی نقادوں کا ذکر بھی مقدمہ میں نہیں ملتا۔ لیکن ورڈز
ورتھ کے مضمون کا اثر جا بجا ملتا ہے۔ مغربی شعرا کے اقوال اور ذکر بسا
اوقات غلط مفہوم میں حالی کے یہاں ملتے ہیں جو انگریزی زبان سے براہِ
راست ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

علامہ شبلی

شبلی پر سرسید کا اثر :-

علامہ شبلی کا شمار سرسید کے نامور رفقاء میں ہوتا ہے۔ جن بزرگوں نے سرسید کے فیضِ تربیت اور اپنی جودتِ طبع سے علمی میدانوں میں شمعیں روشن کیں ان میں علامہ شبلی کا نام سرِفہرست ہے۔ انھوں نے جیسا کہ اس سے پہلے ہم اس امر پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ سرسید کی ذہنی فکر کے جدید نقطۂ نظر کو اپنا کر اردو ادب میں ایک نیا چراغ روشن کیا۔ وہ بھی ہر عظیم مفکر اور مصنف کی طرح اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا ادراک رکھتے تھے اور نہ صرف مشرقی علوم و فنون کی تاریخ پر گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ جدید علوم سے بڑی حد تک آشنا تھے۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی علوم، فلسفہ اور تاریخ کی تصنیف و تالیف کو اپنا مستقل لائحہ عمل بنایا تاکہ مسلمان اپنے عقائد کی حکمت، اپنے علوم و فلسفہ کی عظمت اور تاریخی کارناموں سے روشناس ہو سکیں۔ وہ مفکر، ادیب، عالم، مورخ، سوانح نگار، ناقد، مصلح، جریدہ نگار، شاعر، غرض ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اس لئے جدید رجحانات و تصورات نے ان کو علم کلام کی تجدید کی طرف راغب کیا۔ علم کلام کی تاریخ، اس کا عہد بہ عہد ارتقاء اور علمائے متکلمین کے نظریات پر "علم الکلام" اور "الکلام" میں خوب بحث کی ہے۔ اور مغربی مصنفین کے توہمات پر کہ اسلام فرد اور جماعت کی ترقی میں رکاوٹ ہے ایک بڑی مدلل بحث کی ہے۔

طرزِ نگارش کے سلسلہ میں ایک بات قابلِ غور ہے کہ شبلی نے

جب قلم اٹھایا تو اُن کے سامنے اسلوب و تحریر کے دو واضح نمونے تھے۔ پہلا
آزاد اور دوسرا سرسید کا۔ آزاد کے یہاں فارسی تراکیب و استعارے
کی بہتات تھی۔ سرسید کے یہاں انگریزی الفاظ استعمال ہوتے تھے
مگر شبلی کی فطرت ان بندشوں سے قطعاً پاک تھی۔ وہ رواں دواں
نثر نگاری کے قائل تھے۔ دوسری زبان و ادب کے ہلکے پھلکے الفاظ استعمال
کرنے میں تامل نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اسالیب میں سے صرف وہ
عناصر چن لیے جو کامیاب نثر نگاری کیلئے مناسب تھے۔ اور انہیں ایسے
اعتدال کے ساتھ برتا اور پیش کیا کہ یہ اعتدال ہی شبلی کا اسٹائل
بن گیا۔ چنانچہ غالب کی آسان نثر، آزاد کی انشا پردازی، نذیر احمد
کا عام فہم انداز اور سرسید کی سادگی اور بے تکلفی نے مل کر شبلی کے
یہاں ایک عجیب طرز نگارش اختیار کر لی۔ الفاظ کا مناسب انتخاب،
بندش کی چستی اور سنجیدگی شبلی کا حصہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شبلی
کو الفاظ کے استعمال پر جو ماہرانہ قدرت حاصل تھی وہ فن انشا پردازی کا
اعلیٰ کمال ہے۔ زبان میں جو لوچ اور لطافت ہے وہ خاص اُن کا حصہ ہے۔
اسی انداز اور زبان پر قدرت اور اس کی نبض شناسی نے شبلی کو اردو
ادب میں وہ مقام عطا کیا جو اُن کے معاصروں کو نصیب نہ ہو سکا۔ شبلی نے
جس عالمانہ وقار کے ساتھ اور معلمانہ جوش کے ساتھ لکھا اُس کا یہ اثر ہوا
کہ نئے انداز کے سوچنے اور نئے طرز سے لکھنے کا سلیقہ لوگوں میں پیدا ہونے
لگا۔ شبلی کی تصانیف علوم و فن کے لحاظ سے اس طرح مرتب ہو سکتی ہیں۔

سیرت و سوانح :- المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، سیرۃ النبی۔

فلسفہ و کلام :- علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم۔

ادبیات :- موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم (۵ حصے)

سفرنامہ :- سفرنامۂ مصر و روم و شام۔

تاریخ :- تاریخ اسلام، مضامین عالمگیر۔

تعلیمات :- مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔

تقریرات :- ندوۃ العلماء اور ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں۔

خطوط :- مکاتیب شبلی (۲ حصے)

مقالات :- مقالات شبلی (۸ حصے)

نظم اردو :- مثنوی صبح امید، قومی مسدس، مجموعۂ کلام اردو۔

عربی تصانیف :- الانتقاد علی التمدن الاسلامی (مصر کے عیسائی مصنف
جرجی زیدان ...... کی کتاب التمدن الاسلامی کی تنقید) بدء الاسلام۔

فارسی نظم :- دیوان شبلی، دستۂ گل، بوئے گل وغیرہ مختصر مجموعۂ اشعار ہیں۔

ترتیب کے لحاظ سے گو مولانا شبلی کا نام عناصر اربعہ میں سب سے
بعد میں آتا ہے۔ لیکن کارناموں اور علمی خدمات کے لحاظ سے سرفہرست۔
بقول سعید انصاری (مولانا شبلی بحیثیت اردو کے بہترین انشا پرداز)
آزاد نے اردو ادب کا سنگ بنیاد رکھا اور نذیر احمد و حالی نے اس
پر بہت کچھ اضافے کئے لیکن اس کی تعمیر کی تکمیل جس نے کی وہ شبلی کی
ذات تھی۔ شبلی کو علم و ادب کا جو ذخیرہ علاوہ دینیات، تاریخ، سوانح
اور تنقیدات پر مشتمل تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان میں بیش بہا
اضافے کیے بلکہ جدید طرز تصنیف سے اردو کو آشنا کیا۔ یہ صرف

شبلی کا کارنامہ ہے کہ اردو اس قابل ہوئی کہ ہندوستان کی علمی زبان کہلا سکے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں ملا سکے۔"

مولانا نے تصنیف و تالیف شروع کرنے سے پہلے ایک طرف اردو کا جائزہ لیا اور بدلتے ہوئے زمانہ اور یورپ کی بڑھتی ہوئی ترقی پر نظر ڈالی اور دوسری طرف اسلاف کے علمی کارناموں اور عہد دولت عباسیہ کی علمی خدمات اور دوسری زبانوں سے تراجم کو بہ نظر غائر دیکھا اور تصنیف و تالیف کی ایک مکمل اسکیم مرتب کی جس کے متعلق عبداللطیف اعظمی لکھتے ہیں کہ "مجھے یقین ہے کہ اس اسکیم کے علاوہ شبلی اور کچھ بھی نہ لکھتے جب بھی اُن کی علمیت سے اُن کی واقفیت اُن کا علم و فضل اور معاصرین میں اُن کا تفوق و برتری بالکل مسلم تھی کیونکہ ایسی جامع و مانع اسکیم کوئی ایسا ہی شخص بنا سکتا ہے۔ جو غیر معمولی دل و دماغ کا مالک ہو اور جو تمام مشرقی علوم و فنون پر نظر رکھتا ہو۔"[۴۹]

شبلی کی تمام کتابوں پر تبصرہ کرنے اور ان کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی اس محدود مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ہم اُن کی صرف سوانحی تصانیف پر تبصرہ کریں گے۔

سوانح نگاری:-

مولانا حالی کے باب میں ہم لکھ چکے ہیں کہ مغربی اسلوب اور تصور سے اُردو ادب کی اصناف میں سوانح نگاری نے خصوصیت کے ساتھ بہت اثر قبول کیا۔

شبلی کی سوانح عمریوں کو اُن کی معنوی خصوصیات کی بنا پر تین اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) علمی شخصیتوں کی سوانح عمریاں: مثلاً سیرۃ النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم

(۲) سیرت النبی:

(۳) تاریخی شخصیتوں کی سوانح عمریاں، مثلاً المامون اور الفاروق۔

یہ تقسیم بعض وجوہ سے غیر علمی بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اُن کا ایک حصہ صریحاً تاریخ نگاری کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ سیرت رسولؐ سوانح نگاری کی جداگانہ شاخ ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا تقسیم سے بحث میں بڑی سہولت ہوگی۔ تاریخی شخصیتوں کی سوانح عمریوں کا تذکرہ اُن کی تاریخ نگاری کے ضمن میں آئیگا۔

سیرت النعمان ۱۸۹۱ء:-

"المامون" کے دیباچہ سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ابتدا میں مولانا فرمانروایانِ اسلام کی سوانح عمریاں مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں دس خاندان کے دس بہترین فرمانرواؤں کا انتخاب کیا۔ لیکن کلام اور کلامیوں کی دلچسپیوں کی وجہ سے سلسلۂ فرمانروایانِ اسلام ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یہ اچھا ہوا۔ اس طرح انہیں ناموران اسلام لکھنے کا موقعہ ملا جسکی پہلی کڑی سیرت النعمان سنہ ۱۸۹۱ء ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اجتہادی مسائل تقریباً بارہ سو سال سے تمام اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آج بھی دنیا کی عظیم الشان اسلامی

سلطنتوں میں اور اسلامی دنیا کے غالب حصے میں انہیں کا فقہ رائج ہے عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں اُن کی متعدد سوانح حیات لکھی گئیں۔ ناانصافی ہوتی اگر اُن کے حالاتِ زندگی اُردو میں نہ لکھے جاتے۔ مولانا نے اِس کام کا بیڑا بڑی کامیابی سے اُٹھایا اور بڑے جامع انداز میں اس کام کو مکمل کیا۔

اس سوانح عمری میں مولانا نے فن کے تقاضوں کا بڑا خیال رکھا ہے۔ ایک جامع سوانح عمری کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُنھیں اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے حضرت امامؒ کے متعلق اُن مروجہ روایات کی بہ بانگِ دہل تردید کی ہے جو خوش اعتقادی کا نتیجہ ہیں مثلاً یہ خیال کہ حضرت امامؒ نے ۴۰ سال تک عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ اِس کا نہ کسی تاریخ میں تذکرہ ملتا ہے اور نہ اس کے انکار سے اُن کے کمالات اور بزرگی پر کسی قسم کی آنچ آتی ہے۔ مولانا شبلی اِس خیال کے علمبردار تھے کہ ہیرو کی وہی تصویر معتبر اور قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے جو سادہ اور فطرتِ انسانی کے قریب ہو۔ اِس لیے اُنھیں قاضی ابو یوسف کی لکھی ہوئی حضرت امامؒ کی سوانح عمری بے حد پسند تھی۔ گو یہ سادہ ہے لیکن حقیقت کے بہت قریب ہے۔ اعتدال سے بڑھی ہوئی ہیرو کی تعریف اس کی عظمت اور بزرگی کے منافی ہوتی ہے۔ قدیم تذکرہ نگاروں نے حضرت امامؒ کو بڑا مناظر اور حاضر جواب دکھایا ہے۔ اُنھوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے جس انداز سے بحث کی ہے اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ایک چالاک موقع شناس آدمی تھے۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی

خوش فہمی اور عقیدت مندی کے جذبہ سے مغلوب ہونے کا نتیجہ ہے۔

مولانا حالی کی طرح شبلی نے بھی اپنی ہر سوانحی تصنیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اس کتاب کے پہلے حصے میں مختصر سی تمہید کے بعد تدوین کی اُن کتابوں کی فہرست ہے جو امام ابو حنیفہؒ کے حالات پر لکھی گئی ہیں۔ پھر امامؒ کی ولادت اور نسب، تابعیت کی تحقیق، امام کا سنِ پیدائش اور تعلیم، اُن کے شیوخ حدیث کی تفصیل اور اُن کے مختصر تراجم، تعلیم و حالاتِ زندگی، دربارِ شاہی سے تعلقات، وفات، اُن کی اولاد کی تفصیل، اُن کے اخلاق و عادات، طرزِ معاشرت اور عام حالات، اُن کے مناظرے و فتوی اور علمی مجالس، اُن کی شہرت اور معصروں کی اُن کی نسبت رائیں وغیرہ ہیں۔ دوسرے حصے میں تدوینِ فقہ اور امام صاحبؒ کے طریق اجتہاد پر بحث کی ہے۔ آخر میں اُن کے مشہور شاگردوں کے مختصر حالات بھی ہیں۔

شبلی نے اپنی ہر سوانحی تصنیف میں چند بنیادی نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں بھی یہ نظریات کار فرما ہیں۔ مثلاً موجودہ مغربی تہذیب و تمدن اور اسکے قوانین سے مقابلہ، پرانی کتابوں پر نقد و جرح اور اسباب و علل کی نشاندہی وغیرہ۔

"سیرۃ النعمان" کے ضمنی مباحث بھی علمی لحاظ سے بہت مفید اور دلچسپ ہیں۔ مثلاً صدرِ اسلام کی اسلامی اور علمی زندگی، مناظرے کے طریقے، طرزِ تعلیم، علماء اور حکومت کے باہمی تعلقات، حدیث اور رائے کے جھگڑے، فقہ حنفی کی قدر، فنی اور عقلی بنیاد وغیرہ۔ شبلی مغربی مصنفین کی

اِس رائے سے بہت متفق معلوم ہوتے ہیں کہ علم الکلام کی ترقی میں عجم کا حصّہ نمایاں ہی نہیں، غالب ہے۔ سیرت النبیؐ میں حدیث کے برتر اور مستند ہونے کے متعلق قطعی رائے ظاہر کی ہے۔ مگر سیرۃ النعمان کے بیانات اِس سے کچھ مختلف ہیں۔ شبلی امام صاحب کے مسلک کی تعریف کرتے ہوئے اُن کے قیاس اور رائے کو حدیث سے متفق اللفظ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ 'سیرۃ النعمان' اپنے موضوع پر بہترین سوانح ہے۔[80]

الغزالیؒ ۱۹۰۲ء:-

الغزالی حضرت امام غزالیؒ کی سوانح عمری ہے۔ مولانا شبلی کے مجوزہ سلسلۂ اسلامیہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ وہی سلسلہ ہے جس کا ایک حصّہ علم الکلام۔ متکلمین اسلام کی تاریخ ہے۔ مولانا نے اُردو میں پہلی مرتبہ امام غزالیؒ کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ غزالیؒ کو کن اثرات نے امام غزالیؒ بنایا جس کے جواب میں لکھتے ہیں ......

....

احقاقِ حق کے فطری جوہر کے ....

علاوہ زندگی کے واقعات اور تجربات نے امام صاحبؒ کو تحقیق کا دلدادہ بنایا جس کی وجہ سے وہ عمر بھر تحقیق میں مستغرق رہے۔ مولانا کی رائے یہ ہے کہ مجدد اور ریفارمر بھی واقعاتِ خارجی سے متاثر ہوتا ہے اور ان واقعات کو ترقی خیالات میں بہت دخل ہوتا ہے۔

شبلی نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ "امام صاحبؒ کے کمالات میں فلسفہ کا

بہت بڑا حصّہ ہے۔" اِس کے علاوہ تصوّف نے بھی حضرت امامؒ کی ذہنی و رُوحانی تعمیر و تکمیل میں بڑا حصّہ لیا ہے۔

"الغزالی" میں شبلی نے جن موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:-
علماء کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح، حکام اور سلاطین کے سامنے آزادی اور حق گوئی کی اہمیت، فلسفہ و عقلیات کے مطالعہ کی اہمیت، تمدّن اور سوسائٹی کی تہذیب کی ضرورت، اجتہاد اور آزادیٔ رائے کی اہمیت، یورپ کی علمی خدمات اور علمائے یورپ کا تعصب مسلمانوں کے متعلق وغیرہ۔

"الغزالی" ایک عمدہ علمی کتاب ہے مگر اچھی سوانح عمری نہیں، اِس میں حضرت امامؒ کے ذہنی کارناموں پر خاص توجہ کی گئی ہے مگر جزئیاتِ زندگی کم ہیں اور شخصیت کی تصویر نامکمل ہے۔[81]

سوانح مولانا روم:-

سوانح مولانا روم بھی سلسلۂ کلامیہ سے متعلق ہے اور شبلی کے زمانۂ قیام حیدر آباد کی تصنیف ہے۔ اُنہوں نے مثنوی مولانا روم کی مختلف حیثیتوں سے بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر خود لکھا ہے: "یہ عجیب بات ہے کہ اِس قدر مقبول ہونے اور ہزاروں لاکھوں دفعہ پڑھے جانے کے بعد بھی لوگ اِس کو جس حیثیت سے جانتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ تصوّف اور طریقت کی کتاب ہے۔ یہ کسی کو بھی خیال نہیں کہ وہ صرف تصوّف ہی نہیں بلکہ عقائد اور علم الکلام کی بھی عمدہ ترین کتاب ہے۔"[82] یہی مقصد اس سوانح عمری کی تصنیف کیلئے محرک ہوا۔ اور شبلی نے پہلی مرتبہ مولانا روم کو حکیم کی حیثیت

اور ان کی مثنوی کو حقائق و معارف اور کلام کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔ محض سوانح عمری کی حیثیت سے یہ کتاب مولانا کی غالباً ناقص ترین تصنیف ہے جس طرح مولانا روم کے قدیم سوانح نگار سپہ سالار نے اُن کی لائف سے انصاف نہیں کیا اسی طرح جدید محققین کے سپہ سالار مولانا شبلی نے بھی ان کی سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کیا۔ سپہ سالار نے مولانا روم کی کرامتوں کو واقعات کے ذریعے اُن کو ایک ما فوق البشر ہستی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ شبلی نے مواد کی قلت کی وجہ سے سپہ سالار کی روایتوں کو کانٹ چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ سپہ سالار نے انہیں ایک ولی اور صوفی کی حیثیت سے دیکھا ہے اور شبلی نے ان پر حکیم اور ماہرِ کلام کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی ہے۔[۱۲]

مولانا روم نے عرفان و حکمت کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ عام صوفیانہ مسلک کے منفیانہ تفکر کی عین ضد ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو زندگی اور حیات کی پرورش کرتا ہے اور سعی و عمل کو بقا و قوت کا ضامن قرار دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں جو نامرادی اور مایوسی کا جذبہ پیدا ہوا تھا اسے مٹانے کے لئے سر سید اور اُن کے رفقاء عمر بھر سرگرداں رہے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر شبلی نے اپنی اس تصنیف میں مولانا روم کے فلسفہ کے اس پہلو کو بہت نمایاں کیا ہے۔

سیرت النبیؐ :-

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ مسلمانوں نے آنحضرتؐ کی

سوانح حیات کی ترتیب و تدوین میں جس احتیاط، دیانت، اور جرح و قدح سے کام لیا ہے۔ اس کی مثال دُنیا کی اور زبانوں کے تاریخی و سوانحی اور تنقیدی ادب میں ناممکن ہے۔ آنحضرتؐ کی سیرت کو مستشرقین نے جس انداز سے پیش کیا ہے وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ سوہانِ روح کا باعث رہا۔ اس لیے زمانۂ حاضر میں آنحضرتؐ پر ایک ایسی جامع اور مکمل سوانح حیات کی ضرورت تھی جس میں آپ کی مبرہ منزہ زندگی اور تعلیمات کو موجودہ تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش کیا جائے اور اُن اعتراضات کے مدلل جوابات دیئے جائیں جو عام مستشرقین نے حضرتؐ کی ذات پر کئے ہیں یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس فریضہ سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ جس نے اس مستشرقین یورپ کی اس ضمن میں لکھی ہوئی کتابوں یا ان کتابوں کے عربی فارسی کے ترجموں اور عرب و ایران کے علماء کی کتابوں کا جو ان کی تردید میں لکھے گئے تھے۔ مطالعہ کیا ہو۔ صرف مولانا شبلی ہی اس کام کے اہل تھے۔ چنانچہ ہمیں مولانا شبلی کے حوصلہ کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کی ایک جامع سوانح حیات لکھنے کا عزم کیا۔ گو اس سلسلہ کو وہ اپنی حیات میں تکمیل نہ کر سکے لیکن ایک ایسا جامع اور مکمل خاکہ تیار کیا جو اُن کی آرزو کے مطابق تکمیل کا جامہ پہنا۔

شبلی کی "سیرت النبیؐ" (جس کی پہلی دو جلدیں ان کی اپنی مرتب کردہ ہیں) سادہ بائیوگرافی نہیں بلکہ اسے ان کے بنیادی انداز بیان کے اعتبار سے "دائرۃ المعارف النبویہ" کہنا چاہیئے۔ اپنی مکمل صورت میں یہ

سیرت کے موضوع سے نکل کر اسلام کی صداقت اور حقانیت کے موضوع پر
ایک کتاب بن جاتی ہے۔ تاہم اس کا سوانحی حصہ اپنی جگہ مکمل اور مفصل ہے۔
اس لیے یہاں صرف اس کی سوانحی حیثیت کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔

"سیرت النبیؐ" بنیادی طور پر ایک عاشقِ رسولؐ کا والہانہ اظہارِ عقیدت
ہے۔ اس میں عشق و محبت کا وہی رنگ ہے جو خطباتِ احمدیہ میں نظر آتا ہے۔
"سیرت النبیؐ" کی غایت شبلی کی باقی سوانح عمریوں کی طرح یہی ہے کہ اس سے
اخلاق کی اصلاح اور تربیت کا کام لیا جائے۔ شبلی کے نزدیک اصلاحِ
اخلاق کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ نفوسِ قدسیہ کی زندگیوں کو عوام کے سامنے
پیش کیا جائے۔ کیونکہ "دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوسِ
قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اسباب ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں" اور اس
لحاظ سے آنحضرتؐ کی ذاتِ مبارک یقیناً تمام فضائل کا مجموعہ ہے کیونکہ آپؐ
کی ہستی کو جامعیتِ کبریٰ کا درجہ حاصل ہے۔ اسی سبب سے آپؐ کی
سیرت تمام انسانی ضرورتوں میں اور تمام تمدنی اور انفرادی مسائل میں
نصیحت، عبرت اور تربیت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ شبلی اسی خیال سے
آپؐ کی سیرت کی تدوین کو نہ صرف اسلامی اور مذہبی، ادبی اور علمی اور
اخلاقی و تمدنی ضرورت سمجھتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک یہ مجموعہ ضروریاتِ
دینی اور دنیوی ہے۔

"سیرت النبیؐ" کے متعلق یہ سوال برمحل ہے کہ شبلی کی یہ کتاب محض
ایک عاشقِ رسولِ اُمّیؐ کے جذبات و عقیدت کا مظاہرہ ہے یا ایک غیر
جانبدار صاحبِ فن کے ایک محققانہ نتائج و جستجو کا مجموعہ بھی ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے آنحضرتؐ کی ذات ہی سب کچھ
ہے۔ آپ کی سیرت میں نقص یا عیب کی تلاش کفر سے کم نہیں
اس لیے اس کتاب میں شبلی کی حیثیت محض ایک عام اُمتی ہی
کی نہیں بلکہ عاشقِ رسولِ اُمّیؐ کی ہے۔ تاہم شبلی ان اعتراضات
سے بے خبر نہیں تھے جو غیر مسلموں نے آنحضرتؐ کے متعلق کیے تھے۔ اس
سبب سے شبلی نے ان تمام بحثوں کو چھیڑا ہے۔ جن میں آنحضرتؐ
کی بشریت کے مدِنظر غیر مسلم مؤرخوں نے آپؐ پر طعن کیا ہے۔ شبلی
سیرت نگاری میں اپنے قدیم پیشروؤں سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہیں کہ
پچھلے سیرت نگاروں کے برعکس جو نبوت اور الوہیت کو باہم خلط
ملط کر دیتے ہیں، انہوں نے آنحضرتؐ کو ان کی جامعیتِ کبریٰ کے
باوجود انسان اور بشر ہی تصور کیا ہے اور اسی حیثیت سے پیش
کرنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی نے آپؐ کو ایک بشر، ایک نبی اور ایک
عقلمند نبی تصور کیا ہے۔ اگرچہ آپ کی ذات روحانیت کامل اور پاکیزگی کا
اکمل ہی تھی۔ بشریت اور معقولیت کا یہ رجحان دلبستانِ سرسید کا
مشترک رجحان ہے۔ شبلی نے آپ کی شخصیت کی خارجی اور بشری جزئیات
اتنی تفصیل سے پیش کی ہیں کہ "سیرت النبیؐ" کو اردو سوانحی ادب کی
مکمل اور مفصل ترین کتاب کہا جاسکتا ہے۔ "آپ کی خلوت اور جلوت
کے ..... باریک اور چھوٹے چھوٹے واقعات و جزئیات، آپ کی
عادات و شمائل کے لطیف سے لطیف پہلو، ان سب باتوں سمیت
جن کا اظہار عموماً نہیں کیا جاتا۔ سیرت النبیؐ کے اوراق میں جمع ہو گئے ہیں۔

اور جہاں تک ازدواجِ رسولؐ کا تعلق ہے۔ ان کی بشری کمزوریوں (نعوذ باللہ) کو تو مطلقاً چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی بھی صحیح اور مکمل تصویریں اس مرقع میں موجود ہیں۔

"سیرت النبی" میں انیسویں اور بیسویں صدی کے مخصوص علمی نظریات و افکار کا خاص اثر نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کے بعض خاص رجحانات بھی کتاب میں چھائے ہوئے ہیں۔ اسلامی لڑائیوں کا خصوصاً آنحضرتؐ کے غزوات کا مدافعانہ ہونا یہ عقیدہ اس دور میں نہایت راسخ اور محکم تھا۔ شبلی نے اس کو اصول اور اساس بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت پیغمبر تھے سپہ سالار نہ تھے اور یہ بھی کہ آپ نے جنگ کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے اس قدر پاک اور منزہ کر دیا ہے کہ وہ افضل عبادت بن گئی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کا مقصد ملک گیری نہ ہو بلکہ انسانی ہمدردی اور مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت اس کی غایت اصلی ہے۔[۵۴]

مختصر یہ کہ دنیا کی ہر زبان میں آنحضرتؐ کے حالات اور ان کی تعلیمات پر کتابیں لکھی گئیں لیکن اس عظیم الشان تالیف کی نظیر نہ تو عربی زبان باوجود اپنی قدامت اور باوجود اپنی اس خصوصیت کے کہ یہ رسولؐ اور قرآن حکیم کی زبان ہے پیش کر سکتی ہے اور نہ فارسی یا دنیا کی کوئی اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان۔ اسی وجہ سے اسے عربی اور بعض دوسری زبانوں میں منتقل کیا جا رہا ہے۔[۵۵]

شبلی کی تاریخی سوانح عمریاں

شبلی کی تاریخی سوانح عمریاں دو ہیں (۱) المامون اور (۲) الفاروق یہ دونوں کتابیں سوانح عمریاں بھی ہیں اور تاریخیں بھی۔ سیرت النبی بھی ایک لحاظ سے تاریخ ہے مگر وہ سوانح عمری زیادہ ہے اور تاریخ کم۔

المامون ۱۸۸۹ء

اس کو انہوں نے علی گڑھ کے دورانِ قیام میں مرتب کیا۔ اس لیے اس پر ان کے پیر و مرشد سرسید کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کا دیباچہ سرسید کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے اچھی تاریخ اور اچھی سوانح عمری کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

"المامون" میں شخصی جزئیات کی کمی نہیں مگر مصنف کی نظر برابر تاریخ پر جمی ہوئی ہے۔ یعنی زمانہ کی معاشرت اور دوسری علمی و ذہنی جزئیات جن کے لیے عہدِ مامون ممتاز تھا۔ ہیرو کے انتخاب میں جذبہ اور عقیدت سے بڑھ کر عقل اور فکر کی کارفرمائی ہے۔ عباسی خاندان کے حکمرانوں میں ہارون رشید کی شخصیت اور اس کا دورِ حکومت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ لیکن چونکہ اس کا دامن برامکہ کے خون سے داغدار ہے اس لئے مولانا کی انصاف پسند نظر میں وہ ہیرو کی حیثیت سے نہیں جچتا۔

شبلی ایک تجربہ کار مورخ کی طرح المامون کے ماحول کا بہت اچھا مرقع پیش کرتے ہیں جس میں المامون کی سوانح حیات کو مرکزی

اور نمایاں حیثیت ہے۔ اُس کی تعلیم و تربیت، ولیعہدی کی ساری داستان
شہزادوں کی تعلیم کے سارے طریقے، امین کی نالائقی اور المامون کا ہونہار
پُر اُمید لڑکپن وغیرہ سارے مراحل یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں کے سامنے
آتے ہیں۔ مولانا اس دوران میں قاری کے ذہن کی اس طرح تربیت
کرتے ہیں کہ سچ مچ المامون ہی خلافت عباسیہ کا صحیح مستحق تھا۔ مگر اس میں
مامون کی شخصی تصویر کے مقابلہ میں اس کے ماحول کا مرقع زیادہ حسین
معلوم ہوتا ہے۔

تخت و تاج کے لیے مامون و امین کی کشمکش کی تصویریں بھی دلکش
ہیں۔ جوڑ توڑ کا بازار گرم ہے۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال
بچھے ہوئے ہیں۔ امرا و سپہ سالار سب اپنی اپنی چالیں اُس وقت تک
چلتے ہیں۔ جب تک کہ آخری فیصلہ کن معرکہ نہیں ہوتا۔ اس وقت مولانا نے
امین کی تصویر جس ڈھنگ سے پیش کی ہے اُس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں
امین کے انجام پر افسوس نہ ہو۔ یہ اُن کی سوانح عمری کا کمال ہے۔ مامون کی
فوجیں ہر لمحہ آگے بڑھ رہی ہیں مگر امین بدستور عیش کوشی سے کام لے رہا ہے
مامون کا سپہ سالار بغداد کے عین دروازہ پر آپہنچتا ہے اور امین کو، جو
مچھلیوں کے شکار میں مصروف ہے، اِس خطرہ کی خبر پہنچائی جاتی ہے تو وہ
پیغام لانے والے کو جھڑک دیتا ہے اور کہتا ہے۔ چپ رہ! کوثر دو مچھلیاں
پکڑ چکا ہے اور مجھ کو صبح سے لے کر اب تک ایک بھی نہیں ملی۔ اس کے
بعد کیا ہوتا ہے؟۔ وہی جو عیاشوں، کم ہمتوں اور بے تدبیروں کے ساتھ
ہوا کرتا ہے۔

مولانا شبلی اپنے اس ہیرو کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو
پیش کیا ہے۔ محاسن کے ساتھ ساتھ اس کے معائب اور بے اعتدالیوں کا
بھی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن مولانا کے قلم کا کیا کہنا کہ مامون کی بے اعتدالیاں
ایسی ہیں جن پر محاسن قربان کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً المامون کی حد سے بڑھی
ہوئی فیاضی یا اس کا رحم و انصاف جو جادۂ اعتدال سے متجاوز ہے لیکن مولانا
شبلی اس میں معذور ہیں۔ انہیں ایک ہیرو کی زندگی اور اس کے کارناموں
کی سرگذشت لکھنا ہے۔ اسی لیے اُس کے عیوب بھی وہی بیان ہونے
چاہئیں جن پر محاسن قربان کیے جا سکتے ہیں۔ شبلی کو دلچسپ بشریت
سے بہت کم غرض ہے۔ انہیں تو شان، جاہ و جلال، قوت، عظمت، جبروت
جیسے اوصاف سے محبت ہے۔ اسی لیے ان کے ہوتے ہوئے شبلی کی نظر
کسی دوسری صفت پر پڑ نہیں سکتی۔ شبلی کی سوانح عمریوں میں معائب
کی تصویریں دھندلی ہیں۔ غرض شبلی سوانح نگار کے اس فرض سے عہدہ برآ
نہیں ہوتے کہ موضوع کی تصویر کے دونوں رُخ دُنیا کے سامنے رکھنے
چاہئیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شبلی المامون کے غلط اور غیر منصفانہ
اعمال و افعال کے سلسلہ میں بھی تاویل سے کام لیتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ
ہے کہ شبلی تصویر کے دونوں رُخ ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے
تھے مگر نہیں کر سکے۔[۱۲]

الفاروق

"الفاروق" ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کی ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد

زمانۂ آزادگی اور علالت میں لکھی گئی۔ اِس کی تصنیف کے لیے مولانا کو نہ صرف ہندوستان کے سارے کتب خانوں بلکہ رومؔ شامؔ اور مصرؔ کے کتب خانوں سے بھی استفادہ کرنا پڑا۔ اُنہیں دور دراز سفر کی جس قدر صعوبتیں اٹھانی پڑیں اُس سے بڑھ کر اِس میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کا خود مولانا کو احساس تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں تو اپنی تصنیفات میں "الفاروق" کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ حضرت عمر فاروقؓ کی بلند شخصیت، پاکیزہ سیرت اور اُن کا اعلیٰ طرزِ حکومت اِس بات کا متقاضی تھا کہ اُن کا سوانح نگار بھی ایسا ہو جو اِن تین منزلوں کے عبور کے مراسم سے بخوبی واقف ہو۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ کی لائف لکھتے مولانا شبلیؔ کا قلم ڈرتے ڈرتے اُٹھا تھا۔ اور اُس سے یہ الفاظ کہلوائے کہ حضرت عمرؓ کی لائف لکھنا ایسا ہے جیسا کہ بقول عرفیؔ "ہشیار کہ رہ بر دم تیغ است قلم را" شبلیؔ اِس راستہ کی مشکلات سے واقف تھے۔"

اپنی دوسری سوانحی کتب کی طرح مولانا نے "الفاروق" کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصّہ اوّل میں حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی کے حالات ہیں۔ اور حصّہ دوم میں اُن کے عہد خلافت کی ممتاز نمایاں انتظامی تمدنی اور معاشرتی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اس سوانح حیات میں بھی انہوں نے درایت کے اُصول کو نہایت کامیابی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اصول وضاحت کے لیے شاندار علمی دیباچہ لکھ کر گذشتہ اسلامی تاریخوں کی بعض خامیوں پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے۔

آج ہم ان نقائص کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

درایت کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

"مختلف واقعات کی صحت و اعتبار کے مدارج بھی اصولِ عقلی کی بناء پر مختلف ہوں گے" مثلاً لڑائی کے واقعات جو تقریباً ایک سو سال کے بعد ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ اُن کی تفصیلات کو یقینی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیوں کہ اس میں سہو اور مبالغہ کا پورا امکان ہے۔ یا حضرت عمرؓ کے قواعد اور قوانین اور دیگر انتظامات جن کا سلسلہ آج تک قائم و جاری ہے۔ خود اپنی سند اعتبار میں اور ہر طرح یقین کے لائق ہیں یا حضرت عمرؓ کی وہ تقریریں ضرور صحیح ہوں گی کیوں کہ ایک خوش بیان مقرر کی تقریریں اور ان تقریروں کے موثر الفاظ کا ذہنِ انسانی میں محفوظ رہنا قرین قیاس ہے۔ اس طرح مولانا شبلی نے درایت کی روشنی میں واقعہ قرطاس، جزیہ اور کتب خانۂ اسکندریہ کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ جنہیں متعصب مستشرقین متعصبانہ رنگ دے کر ایک عرصہ دراز تک حضرت عمرؓ کو بدنام کرتے رہے۔

بعض ناقد و مورخ معترض ہیں کہ الفاروق میں آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے تمدن کی تصویریں اس طرح کھینچی گئیں ہیں کہ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا اس طویل عرصے میں انسانی تہذیب نے ترقی کا کوئی مرحلہ طے نہیں کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ بظاہر یہ اعتراض معقول ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے متعلق ایک غلط فہمی ہے جس کا دفع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس

زمانہ کے انتظامات اور حکومت کے مختلف اداروں پر آج کل کی اصطلاحیں جب چسپاں کی جاتی ہیں تو بظاہر مندرجۂ بالا گمان پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً قانون مالگذاری جمہوریت وغیرہ وغیرہ۔ شبلی نے نظم و نسق کا جو مفصل حال لکھا ہے اس میں بیسیوں ایسی اصطلاحیں موجود ہیں جو اس زمانہ میں اپنی موجودہ شکل اور مفہوم میں موجود نہ تھیں کیونکہ اس وقت نظم و نسق میں انتہائی سادگی اور بدویت تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان اداروں اور محکموں اور انتظامی کاموں کے لیے شبلی الفاظ کہاں سے لاتے ؛ خان کریم وغیرہ نے جو کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں اُن میں بلا تکلف جدید زمانہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں لیکن الفاروق میں قارئین کو کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے مبالغہ آمیز طریق پر جدید اور نیا ماحول پیدا کرنے کے لیے بیتاب اور مضطرب تھے۔

اس سوانح عمری میں مولانا نے اسباب و علل کی روشنی میں عربوں کی روم و فارس جیسی مضبوط حکومتوں پر فتح کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ جو مغربی مصنفین کے پیش کردہ وجوہات سے بڑھ کر معقول معلوم ہوتے ہیں۔ بحث کرتے ہیں وہ کیا اسباب تھے۔ جن کی بدولت چند صحرا نشینوں نے روم و فارس کی عظیم الشان سلطنتوں کو تہہ و بالا کر دیا۔ مغربی مصنفین کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سلطنتیں اوج اقبال سے گر چکی تھیں اور اپنی اندرونی کمزوری کے مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ لیکن شبلی کے نزدیک اگرچہ یہ جواب واقعات سے خالی نہیں لیکن اس میں واقعیت سے کہیں زیادہ طرزِ استدلال کی ملمع سازی ہے جو یورپ کا خاص انداز ہے۔

مولانا شبلی کے نزدیک اِس کا جواب یہ ہے کہ روم و فارس گو کہ اپنی بلندیوں سے گر چکے تھے لیکن پھر بھی فنونِ جنگ سے زیادہ واقف اور منظم تھے۔ مسلمانوں کے پاس ان کے مقابلہ میں کچھ تھا تو وہ صرف جوشِ ایمان تھا جس نے اُن میں ایک برقی قوت پیدا کر دی تھی۔ موت سے بے خوفی تھی جس نے انہیں تیروں، نیزوں اور ہاتھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کی ہمت دلادی تھی۔

شبلی کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ مقابلہ و موازنہ کرنے میں بہت دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ اِس موقعہ پر بھی وہ فتوحات کے اسباب کی وضاحت کے بعد فاروقی فتوحات کا سکندر اور چنگیز کی فتوحات سے مقابلہ کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ جہاں چنگیزی فتوحات میں ظلم و جبر کی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں وہاں حضرت عمرؓ کی فتوحات قانونِ انصاف سے سر مو متجاوز نظر نہ آئیں گی۔

"الفاروق" میں اگر کوئی نقص ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں مصنف کا ہے گاہے عاشق کے لباس میں سامنے آتا ہے۔ دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کا مقصد مغرب کے رُجحان کا غیر معتدل احترام ہے۔ مثلاً واقعۂ بدر کو مدافعانہ ثابت کیا ہے تاکہ جارحانہ جہاد کے اعتراض سے بچ سکے تیسرا عیب بقول بعض علمائے حدیث یہ ہے کہ بعض جگہ حدیث پر معقولیت کو ترجیح دی گئی ہے۔

مجموعی لحاظ سے 'سیرت النبی' کے بعد 'الفاروق' شبلی کی بہترین تصنیف ہے۔ اور سوانحی لحاظ سے بھی بڑی مکمل اور مفصّل ہے۔ اصولِ صداقت کے

معاملہ میں شبلی نے جتنی احتیاط اس کتاب میں روا رکھی ہے۔ شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ نہیں۔

”الفاروق“ نہ صرف اُن کی تصانیف میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اُردو زبان کے لیے سرمایۂ فخر و ناز ہے۔ اگر ”الفاروق“ کے علاوہ مولانا ایک کتاب بھی نہ لکھتے جب بھی وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ اور محقق کہلاتے۔

خصوصیات

علامہ شبلی کی سوانح نگاری کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

مقصدیت

انہوں نے جتنی سوانح عمریاں لکھی ہیں کسی نہ کسی مقصد کے پیشِ نظر لکھی ہیں[۹۹]۔ ناموران اسلام کا سلسلہ انہوں نے دو مقاصد سے شروع کیا۔ ایک تو یہ کہ غدر کے بعد مسلمانوں پر جو ایک مایوسی اور اپنے کارناموں کی بے وقعتی کا احساس پیدا ہو رہا تھا اُسے اُن کے اسلاف کے کارناموں کو پیش کر کے رفع کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اُردو زبان جو مستقبل میں قومی زبان کی شکل اختیار کرنے والی تھی اُس میں ادبِ عالیہ کا اضافہ کیا جائے۔ اگر اُن کے خیال میں ایسا نہ کیا جائے گا تو پھر اُردو زبان پر سطحی قسم کے لٹریچر کا غلبہ ہو جائیگا۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ علماء کو اُکساتے کہ وہ عربی فارسی کے بجائے اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کریں۔

شبلی کے نزدیک سوانح نگاری کا بڑا مقصد اصلاحِ اخلاق ہے۔ اور اُن کی رائے میں یہی طریقہ سب سے زیادہ صحیح، زیادہ کامل اور سب سے زیادہ عملی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ دنیا میں اخلاق و کسبِ فضائل کی جو تعلیم بھی آج موجود ہے وہ نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں[۱۰۰]۔

درایت

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مولانا نے جن اسباب کی بنا پر سوانح نگاری کی بنا ڈالی۔ اُن میں ایک نقد و جرح بھی ہے یعنی کسی واقعہ کو محض اس لئے نہ مان لیا جائے کہ یہ اس طرح بیان ہوا ہے بلکہ اس پر دو طرح سے غور کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ واقعہ جن لوگوں نے بیان کیا ہے وہ قابلِ اعتماد قابلِ وثوق اور دیانتدار ہیں یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ وہ عملاً اور عقلاً بھی ممکن ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یا یہ واقعہ کسی مسلمہ اصول کے خلاف تو نہیں ہے۔ یا بیان کرنے والے نے کس حد تک واقعہ میں اپنی رائے تو شامل نہیں کر دی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

علامہ شبلی کی جملہ سوانح عمریاں مذکورہ بالا خصوصیت کی آئینہ ہیں جس کی وجہ سے انہیں بعد کے سوانح نگاروں پر بھی برتری حاصل ہے۔ مولانا کسی واقعہ کو نہ تو صاحبِ سوانح کی عظمت و عقیدت کی وجہ سے مان لیتے تھے اور نہ محض اس بنا پر اُسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ کسی تاریخ یا تذکرہ میں خواہ وہ کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو اس کا ذکر ملتا ہے بلکہ وہ روایت کے

ساتھ درایت سے بھی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بعض غلط فہمیاں بھی دُور ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے اصولی حیثیت سے درایت پر "سیرۃ النعمان" جلد دوم اور "الفاروق" کے مقدمہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ طوالت کے خیال سے اقتباس نہیں دیا جا رہا ہے۔

سچائی اور صداقت

فن سوانح نگاری کے اس اصول پر کہ خوش اعتقادی سوانح عمری کے محاسن پر پانی پھیر دیتی ہے، مولانا کو مکمل اعتقاد تھا اور ان کی تمام سوانح عمریاں اس اصول کی شاہد ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ جس شخص کے عام لوگ عقیدت مند ہوں گے اُن کی سوانح عمری لکھنا نہایت نازک کام ہے۔ بس ایسے شخص کے حالات پر کڑی نظر ڈالنی چاہیے اور واقعات کی چھان بین کرتے وقت عقیدت کو بالکل دخل دینے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ واقعات بے حد مستند ہوں کیونکہ مقبول عام ہیرو کے حالات کی ترتیب میں صحیح واقعہ کے سلسلہ میں کوئی ایسی سند درکار ہے جس میں ذرہ برابر بھی شبہ کی گنجائش نہ رہے۔

ہیرو کے معائب و محاسن

شبلی نے سوانح نگاری میں تصویر کے دونوں رُخ پیش کرنے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ معاصر رحیمی پر ریویو کرتے وقت لکھتے ہیں "اِس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخاناں کی خوبیاں ہی

خوبیاں بیان کی گئی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں۔"[91] اسی طرح حیات جاوید کے متعلق ایک دوست کو لکھتے ہیں، "اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانا تنگ خیالی اور بدطینتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں"۔

بشری خط و خال

پرانی سوانح عمریوں میں بزرگوں کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا تھا اُس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کسی مافوق البشر ہستی یا کسی ولی اللہ کی تصویر ہے۔ لیکن مولانا اس طرز کے مخالف ہیں اور اس پر عمل پیرا ہیں کہ ہیرو کی تصویر جتنی سادہ اور بشریت کے قریب ہوگی اس سے قارئین اُتنا ہی متاثر ہوں گے۔

پس منظر اور پیش منظر

عموماً مسلمان مورخین اور سوانح نگار بھی تاریخوں اور تذکروں میں سیاسی واقعات اور ذاتی حالات لکھتے وقت اُس وقت کے تمدنی حالات و اسباب و علل پر بہت کم بحث کرتے ہیں۔ اور اگر کرتے ہیں تو سیاسی واقعات اور ذاتی حالات میں اور اُن میں کوئی ربط و تعلق نہیں محسوس ہوتا۔ اور پھر عموماً اُن کی نظریں اس حقیقت سے بھی بعض وقت ہٹ جاتی ہیں کہ بعض واقعات کے علل و اسباب کا ذکر کیے بغیر اُن کے بیان کرنے میں کیا کیا نقصانات اور شبہات ہوتے ہیں۔

علامہ شبلیؔ نے اپنی جملہ سوانح عمریوں میں اُن اُمور کو بڑی اہمیت دی ہے۔

محنت جستجو اور عالمانہ شان

محنت جستجو اور عالمانہ تحقیق و تفتیش علامہ شبلیؔ اور ان کے اسکول کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو اُن کے معاصرین اور اُن کے بعد کے لوگوں میں کم لوگوں کو حاصل ہوئی۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "ہم لوگ چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کر کے مٹھائیاں تیار کرتے ہیں۔" اُن کی محنت و جستجو کا اندازہ اُن کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہوگا جو تصنیف کے وقت اُن کے پیشِ نظر تھیں۔ اس سے اُن کے شوق و سلیقہ کا اندازہ بخوبی ہوگا۔

ایجاز و اعتدال

علامہ شبلیؔ اختصار و ایجاز کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے بیان میں جو دلکشی اور جوش ہے وہ ان کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے۔ تحریر میں یہ کیفیت وہ مبالغہ، استعارہ اور محاورہ بندی سے پیدا کرتے ہیں البتہ اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے کہیں کہیں چھوٹ جاتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ کسی کی تعریف یا تنقیص پر آجاتے ہیں تو یہ چیز اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عالمانہ و محققانہ حیثیت کے ساتھ شاعرانہ طبیعت بھی پائی تھی جس کا ایک خاصہ مبالغہ بھی ہے۔ چنانچہ "شعرالعجم" "المامون" اور مکاتیب میں یہ چیز کافی نمایاں ہے۔

انشاء پردازی

ادبی کتابوں میں حسنِ تحریر اور لطف انشاء پیدا کرنا آسان ہے اس لیے اس میں تخیل سے اور کسی حد تک مبالغہ سے کام لینے کی گنجائش ہوتی ہے۔ سوانح عمری اور تاریخی واقعات کے بیان میں اس حسن و لطف کا باقی رکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں مقصود واقعات کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر ایک ہی شخص کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں۔ جس لئے ان تمام حیثیتوں کے لحاظ سے طرزِ تحریر اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہ حقیقت "الفاروق" اور "سیرۃ النعمان" کے دیباچہ سے واضح ہو جاتی ہے۔

اخذِ نتائج اور اعتدال میں عجلت اور غلطی

علامہ شبلیؔ اکثر کسی ایک خاص واقعہ کی بناء پر یا کسی اعتراض سے بچنے کے لیے ایک نظریہ قائم کرتے ہیں اور پھر بہت سے مسلّمہ واقعات کو وہ اسی نظریہ کے مطابق دیکھتے اور لکھتے چلے جاتے ہیں اور جب دوسرا کوئی مسلّمہ واقعہ ان کے اس نظریہ سے ٹکراتا ہے تو وہ اس مسلّمہ واقعہ کو اپنے نظریہ کے خلاف پا کر رد کر دیتے ہیں۔ مثال کے لیے انہوں نے غزوۂ بدر کے سبب کے سلسلہ میں یہ روش اس لیے اختیار کی کہ وہ بعض اعتراضات سے بچنے کے لیے اس کو مدافعانہ جنگ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے امام غزالیؒ کے فلسفۂ اخلاق کو ابن مکویہ کی تہذیب الاخلاق سے ماخوذ بتانے میں زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا۔

اور محض اپنے قیاس یا سرسری مطالعہ کی بنا پر احیاء العلوم کو اس کا
چربہ قرار دیا۔

قومی حمیت کا غلبہ اسلامی حمیت پر

علامہ شبلی کے دل میں اسلامی حمیت بھی تھی اور قومی حمیت بھی
لیکن بسا اوقات ان کی اسلامی حمیت قومی حمیت کے مقابلہ میں
مغلوب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ "سیرت النبیؐ" کو چھوڑ کر اس میں اس کا
کوئی موقع نہیں تھا انہوں نے جتنی کتابیں لکھیں ان میں بیشتر جذبۂ قومی
کا نتیجہ ہیں۔
شبلی کی سوانح عمریوں کے اشخاص عالی مرتبت مگر مقدس
لوگ ہیں اس خاص نقطۂ نظر سے حالی کے مقابلہ میں شبلی کی مشکلات
کچھ کم ہو گئی ہیں۔ کیونکہ مقدسین کی کمزوریوں کا تذکرہ نہ کرنے پر بھی
شبلی کو ہدف ملامت نہیں بنایا جا سکتا۔ بخلاف مولانا حالی کے
اُن کی سوانح عمریوں کے اشخاص عالی مرتبت تو تھے مگر مقدسین کے
زمرہ میں شامل نہ تھے اس لیے اُن پر نکتہ چینی نہ کرنا اور اُن کے کچے
پھوڑوں کو ٹھیس نہ لگانا سوانح نگار کو ہدف ملامت بنا سکتا ہے۔
اس سبب ہم دیکھتے ہیں کہ حالی کی مشکلات بہت زیادہ تھیں۔ سعدیؔ
غالب اور سرسید پر قلم اٹھانا اور اس میں توازن قائم رکھنا معمولی
بات نہ تھی۔ اگر شبلی حالی کے اشخاص کے سوانح نگار بنتے تو اُن سے
حالی سے زیادہ لغزشیں سرزد ہوتیں اور حق یہ ہے کہ شبلی طبعًا

سرسید، غالب اور سعدی کا سوانح نگار بننے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔
اُن کے ذہن کو اسلام کے روشن ماضی کی پُر شوکت ہستیوں کی پُر فخر
داستان ہی سے دلچسپی تھی۔ معاصرانہ سوانح عمریوں کے لیے اُن کے
دل میں کوئی کشش نہ تھی۔ حالی کو اشخاص عزیز تھے مگر شبلی کو
"ہیروز" و "ناموران" سے ودھر شاید نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ یہی
وجہ ہے کہ شبلی عمومًا مورخ خیال کیے جاتے ہیں اور حالی سوانح نگار۔
حالانکہ شبلی نے بھی سوانح عمریاں لکھی ہیں، مسلسل تاریخ کی کوئی مربوط
کتاب نہیں لکھی — مگر پھر بھی وہ مورخ سمجھے جاتے ہیں۔ سبب
اس کا یہی ہے کہ اُن کا مزاج، انتخاب موضوع اور طریق کار سوانح
نگاروں سے زیادہ تاریخ نگاروں سے ملتا جلتا ہے۔

شبلی کا اسلوبِ بیان

مولانا نے ہر قسم کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ انہوں نے بزرگانِ اسلام
کے حالات لکھے، خلفاء و سلاطین کی سوانح عمریاں لکھیں، علم الکلام کے
دقیق مسائل کی تشریح کی، شعراء کے حالات اور اُن کے کلام پر ریویو لکھا
اور باہمی موازنہ کیا ہے۔ انہوں نے یونانی منطق کی غلطیاں نکالیں، ترجمے
کیے، قومی، ملکی، سیاسی، غرض ہر قسم کے مضامین لکھے۔ اور سب سے
آخر میں اس مقدس زندگی کو اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ
اختلاف اور تنوع عبارت کی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے دیا۔
شبلی کی شاعری، اُن کے مضامین اور اُن کے اسلوبِ بیان میں

وہی رس اور رنگینی موجود ہے جو اُن کے استاد فارق چڑیا کوٹی کی
متنوع طبع کا جوہر تھا۔ شبلی کی اِنشاپردازی کا یہ پہلو اُن کی دوسری
حیثیتوں پر غالب رہتا ہے۔ فاروق چڑیا کوٹی کی طرح ماحول کی سنجیدگی
اُن کی شخصیت کو بے کیف اور اسلوب کو بے رنگ اور سپاٹ نہ بنا سکی۔

شبلی کا طرزِ تحریر رنگین، پُرکیف اور شگفتہ ضرور ہے لیکن جو لوگ
بے مہار تخیل کی کارفرمائیوں، تشبیہات کی بھول بھلیوں اور لفظی صنعت گری
میں رنگینی اور انشاپردازی کے معیار ڈھونڈتے ہیں انہیں شبلی کے مضامین
سے یقیناً مایوسی ہوگی۔ شبلی کا انداز پختہ کارانہ اور عالمانہ ہونے کے باوجود
سادہ اور دلکش ہے۔ اُن کے پاس خیال اور الفاظ دونوں سادہ ہوتے ہوئے بھی
پُراثر اور معنی آفریں ہوتے ہیں اور یہی سادگی اور پُرکاری شبلی کے مضامین
کی ایک خصوصیت نظر آتی ہے۔ سلیس جملوں کی ترتیب سے عبارت پیدا
کرنے کے فن سے وہ پوری طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ کی جھنکار
اُن کے صوتی تاثر پر بھی شبلی کی نظر رہتی ہے۔ شبلی کی تحریر بظاہر
سادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں ایک خاص لطف اور ایک مخصوص لے
اور نکھار ہوتا ہے۔ اُن کے ایک مضمون کی عبارت ملاحظہ ہو:-

"معشوقہ میرے پاس اچانک آگئی۔ میں نے کہا "خیر ہے؟ اس وقت
کیونکر تکلیف کی؟ بولی کہ بادل آگئے۔ انہوں نے مجھے آمادہ کیا کہ تیرے
پاس آؤں۔ میں نے کہا رات اور بادل کی تاریکی میں راستہ کیونکر نظر پڑا؟
بولی بجلی نے رہنما ساتھ کر دیا تھا۔ میں نے کہا لیکن رات کو اکیلے سفر کرنا
کسی طرح مناسب نہیں۔ بولی، میں تنہا نہیں آئی تیرا خیال میرے

ساتھ آیا۔"

مذہبی اور تاریخی مضامین میں شبلی کا اندازِ تحریر اس سے مختلف
ہوتا ہے۔ جن مضامین میں انہوں نے یورپین مورخین کے اعتراضات
کا جواب دیا ہے اُن کے اسلوب میں اپنے موضوع کی مناسبت سے
جوش، زور، توانائی اور گرمی پائی جاتی ہے۔ شبلی کو اسلام کے
قدیم تمدن اور اپنے اسلاف سے بے پناہ محبت تھی۔ مخالفین کی معمولی
اور غیر اہم تنقیدیں بھی اُن کے جذبات کو مشتعل کر دینے اور اُن کے
مناظرہ کی صلاحیتوں کو رُوبہ کار لانے کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ وہ بڑے حساس آدمی تھے اور بعض وقت ذرا سی بات بھی
اُن کے جذبات اور خیالات میں ہلچل پیدا کر دیتی اور اُن کے احساس
میں تموج پیدا ہو جاتا۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی شبلی کی زود حسی
کا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں "احساس بڑا شدید تھا اس لئے
رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے ۱۹۰۲ء کانفرنس کے اجلاس کے
زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ
بھڑ نے اُن کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو
حیرت ہوگئی ــــ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا"۔ شبلی کے تاریخی
مضامین میں جو عام طور پر مناظرہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں "ایسی
شدتِ احساس" کا پتہ چلتا ہے۔ وہ مخالفین کے ذرا سے اعتراض
پر تلملا اٹھتے تھے۔ شبلی کے مضامین سے اُن کے اس ذہنی اضطراب اور
احساس کی چبھن کا اندازہ ہوتا ہے جو معترضین کی تنقیدوں کا ردعمل

ہوتی ہے۔

یہی چبھن اور احساس کی یہی کسک شبلی کے تاریخی مضامین میں مناظرہ کا رنگ پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ شبلی کا دور کئی حیثیتوں سے مناظرہ کا دور تھا۔ قدیم اور جدید، مشرق اور مغرب، ندوہ اور علی گڑھ، ایشیا و یوروپ، مشرقی علماء اور انگریزداں، مذہب اور سائنس، غرض تمدنی زندگی کے بہت سے گوشوں میں کشمکش اور تصادم کی سی کیفیت طاری تھی۔ جو شخص ایک نیم مردہ بھڑ کے ڈنک کی تاب نہ لا سکتا ہو وہ اپنے محبوب تصورات اور عقاید کو اعتراضات سے گھائل ہوتے کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ ابتداء ہی سے ان کی ذہنی پرورش مناظرے کی فضا میں ہوئی تھی۔ ان کے اولین استاد فاروق چڑیاکوٹی تھے جنہوں نے شبلی کے ادبی ذوق کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ وہی فاروق چڑیاکوٹی تھے جنہوں نے "مسدس حالی" کے جواب میں "مسدس عزالی" لکھی تھی۔ اس کے بعد عنفوان شباب میں جب شبلی کی شاعری اور ان کی قلبی توانائیاں ابھرنے لگیں تو "اودھ پنچ" اور "پیام یار" نے ان کے ذہن اور نفسیات کو متاثر کیا۔ یہ دونوں رسالے اپنی شعریت اور ادبیت کے باوجود جانب دارانہ اور مصالحت پسندی کے منکر تھے۔ طنز و تعریض اور مناظرہ و مجادلہ کے لئے اودھ پنچ ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ علی گڑھ تحریک کی مخالفت اور "معرکۂ چکبست و شرر" سب اسی کے رہین منت ہیں۔ اسی رسالے نے حالی کی تضحیک میں یہ شعر لکھا تھا ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اس طرح شروع میں انہیں وہابی اور سنی نزاع سے دلچسپی تھی اور ان کی مناظرانہ قوتیں آہستہ آہستہ چمکنے لگی تھیں۔ آگے چل کر اسی جذبہ نے ایک وسیع تر میدان تلاش کر لیا اور اس کی جگہ علی گڑھ اور ندوہ نے لے لی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ شبلی کی زندگی میں ہمیشہ دو متضاد رنگوں، دو مختلف مکاتیب خیال اور دو علیحدہ علیحدہ میدانوں کا ٹکراؤ رہا ہے۔ اور ان میں سے شبلی نے ایک رخ، ایک زاویہ اور ایک صداقت کو انتہائی شدت کے ساتھ پسند کیا ہے۔ ان تمام باتوں نے شبلی کے اسلوب بیان میں مناظرانہ ہیجان، جوش، یکرخی، دلچسپی اور طنز کی کاٹ پیدا کر دی ہے۔ تاریخی مضامین میں چونکہ معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا ہے اس لئے وہ انہیں قلم سنبھال کر لکھتے ہیں اور اس طرح شبلی کے تاریخی مضامین میں موضوع اور اسلوب کی بہت سی رعنائیاں سمٹ آئی ہیں۔ شبلی نے ادب میں تاریخ کی علمی شان پیدا کی اور تاریخ میں ادب کی دلکشیاں سمونی چاہیں۔

شبلی کا طرز تحریر اپنی شگفتگی کے باوجود ایک خاص متانت اور رکھ رکھاؤ کا حامل ہے۔ ان کی نثر سے بڑی سنجیدگی اور وقار جھلکتا ہے۔ شبلی کے مضامین کا بغور مطالعہ کریں تو اس بات کا بار بار احساس ہوتا ہے کہ انہیں اپنی علمیت اور عظمت کا شدید احساس ہے۔ تاثرات کو قاری کے ذہن تک پہنچانے کا انداز، شبلی کا لب و لہجہ اور اپنی معلومات پر ان کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد اس بات کا بین ثبوت ہے۔ انہیں اپنے زمانہ کے مردم خیز نہ ہونے کا بڑا رنج تھا اور انہوں نے اس کا

بڑا اہم کیا ہے۔ یہ ماتم اِن حالات کی روشنی میں کچھ زیادہ بے جا بھی نہ تھا
حقیقت یہ ہے کہ شبلی کا مطالعہ اُن کی ہمعصر نوجوان پود کے مقابلہ میں
کہیں زیادہ وسیع اور گہرا تھا۔ یہ احساس بھی شبلی کے پیرایۂ بیان کی تشکیل
میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے رونما ہوتا ہے۔ اُن کے مضامین
میں اس قسم کے جملے عموماً نظر آتے ہیں، "تم بھی جانتے ہو" "تم غور کرو" "تم کو معلوم
ہے"۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں: "میں نے اس آرٹیکل میں اس بات
سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں۔
قوم کی آج یہ حالت ہے جتنا لکھا گیا یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔"

محمد اکرام شبلی کی وکالت میں ناکامی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں
کہ وہ "فطرتاً مغرور اور کم آمیز تھے"[92]۔ یہی پندار اور لئے دئے رہنے کا
انداز اُن کے اسلوب میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ احساسِ عظمت خارجی احول
سے زیادہ توریث کا رہین منت تھا۔ شبلی نعمانی راجپوت نسل سے تھے
اور اُن میں راجپوتوں کی ساری خودداری، حمیت اور آن بان موجود تھی۔
یہ بات اگر ایک طرف اُن کے اسلوب بیان کو پُر وقار سنجیدگی عالمانہ
متانت اور بلندی عطا کرتی ہے تو دوسری جانب انہیں قاری کی سطح پر
آکر اس کے احساسات اور جذبات کو مغلوب کرنے اور اس کی ہمدردیوں کو
اپنانے سے باز رکھتی ہے۔ وہ ایمرسن (EMERSON) اور لیمب (LAMB)
کی طرح قاری کے دل کو چھو نہیں سکتے۔ اس کے دماغ کو مسحور کر دیتے ہیں[93]۔

شبلی کے اسلوب کی چند امتیازی خصوصیات:-

شبلی کے اسلوب کی نمایاں صفت اس کی وہ قوت اور جوش

بیان ہے جو اُن کے احساسِ کمال اور احساسِ عظمت کی پیداوار ہے۔ اُن کے
احساسِ فخر اور برتری کا بڑا سرچشمہ اُن کے نسلی احساسات سے پھوٹتا ہے۔

شبلی کے طریقہ خطاب میں خود اعتمادی و برتری کا احساس ہر جگہ
نمایاں ہے۔ یہ احساس کسی جگہ خطیبانہ، کسی جگہ مدرسانہ، کسی جگہ
واعظانہ اور کہیں فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اُن کی تحریروں سے
یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے زمانے کی جہالت اور بد مذاقی کا پورا یقین تھا
اور یہ بھی اُن کی خود نگری اور احساسِ کمال کا نتیجہ ہے۔

شبلی کی تحریروں کا ایک خاصہ اُن کا ایجاز و اختصار ہے
اختصار اُن کے بیان میں بڑا حسن پیدا کرتا ہے۔ وہ بے ضرورت
جزئیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اطناب سے بچ جاتے ہیں
اور ایجاز و اختصار کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے کئی طریقے اور
صورتیں اختیار کرتے ہیں۔

شبلی کی نثر بظاہر سادہ ہوتی ہے مگر اس میں حسن کاری کی
ایک خاص شان پائی جاتی ہے جو اُن کے شاعرانہ بیان کے ساتھ
اُن کی نثر کو صوتی اور ظاہری اعتبار سے بھی اثر و حسن کا نادر مجموعہ بنا دیتی ہے۔

شبلی کا دور ہر لحاظ سے ایک مناظرہ کا دور تھا۔ مشرق و مغرب،
ایشیا و یورپ، قدیم و جدید، علماء اور انگریزی داں، مذہب اور
سائنس غرض زندگی کے تقریباً سب میدانوں میں ایک شدید
آویزش اور کشمکش نظر آتی ہے۔ ان مناظروں میں مولانا کی حیثیت
ایک فریق کی ہے۔ وہ ان معاملات میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

جس کی صداقت کا انہیں حد درجہ یقین ہے۔ اِس کی وجہ سے اُن کی تحریروں میں خود اعتمادی اور وثوق کا رنگ پیدا ہوا اور دوسری طرف غالب آنے اور جیتنے کی خواہش نمودار ہوئی۔ اس سے کہیں تلخی کا عنصر بھی اُبھر آیا ہے۔ یہی تلخی اُن کی تحریروں میں طنز و تعریض کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ شبلی ایک زبردست مناظر کی طرح مخالف کو بے دست و پا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اپنے ہیجان خیز فقروں کے ذریعہ مخاطبوں کے دماغ کو مسخّر اور مرعوب کر لیتے ہیں۔ شبلی کے طنزیہ رُجحانات وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ گہرے اور شدید ہوتے گئے۔ اُن کا نشانہ تعلیم یافتہ گروہ، کوتاہ نظر علماء اور یورپ کے متعصب مؤرخ اور سیاست دان ہیں۔ شبلی کا پُر لطف طنز عموماً غائب یا ماضی کے متعلق ہوتا ہے۔ عہدِ حاضر سے متعلق طنزیات میں زہر زیادہ ہوتا ہے۔ غائب یا ماضی کے متعلق طنز میں ظرافت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ عام طور سے شبلی کی تحریروں میں ظرافت کم ہے مگر شوخی اور نکتہ آفرینی کی وہ مثالیں جن میں لفظوں کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ بکثرت مل جاتی ہیں۔

اُردو زبان میں سلاست اور رَوانی کی ابتداء اگرچہ سرسیّد نے کی اور اُن کے عہد کے تمام ممتاز مصنفین مثلاً حالیؔ، آزادؔ اور نواب محسن الملک نے سادگی اور سلاست سے کام لیا ہے۔ لیکن جب اِن بزرگوں کے طرزِ تحریر کا مقابلہ مولانا کی طرزِ تحریر سے کیا جاتا ہے تو مولانا کے ہر ہر قلم سے صاف یہ صدا آتی ہے کہ؎

اموجِ ہر موج شکستم چوں بہ آماں زدتم

مولانا کے معاصرین میں جو لوگ اُردو کے مشہور انشاء پرداز تسلیم کیے جاتے ہیں اُن میں کسی کی تحریر ابتذال سے خالی نہیں۔ لیکن مولانا کی تحریروں میں ایک لفظ، ایک فقرہ یا ایک ضرب المثل ایسی نہیں پائی جاتی جس کا شمار ابتذال میں ہو۔

مولوی ذکاءاللہؒ:-

مولوی ذکاء اللہ کو ابتداء سے درس و تدریس اور خدمت علم و فن کا شوق تھا۔ اتفاق سے اُن کو ملازمت میں بھی اسی شغل و صیغہ کی ملیں۔ ریاضی سے سب سے زیادہ مناسبت تھی تو سب سے زیادہ اِسی فن کی کتابیں لکھیں۔ چونکہ اُن کے زمانہ میں تعلیم اُردو زبان میں تھی اس لیئے ذکاء اللہ صاحب کی ریاضیات و طبیعات کی کتابیں سرکاری نصابِ تعلیم میں داخل ہو گئیں اور اس خدمت کے صلہ میں گورنمنٹ سے پندرہ سو روپیہ کا انعام ملا شمس العلماء اور خاں بہادر کے خطابات عطا ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹری کے زمانہ میں تعلیمِ نسواں کی وسعت و اشاعت کے صلہ میں گورنمنٹ نے خلعت بھی دیا تھا۔ اُنکی اقسام تصانیف کی فہرست "سیر المصنفین" میں یوں ہے۔

مضمون	تعداد تصانیف مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ و جغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم و ادب	۱۶	۰	۱۶

علم اخلاق	۲	۰	۶
طبیعیات و ہیئت	۷	۲	۹
سیاست مدن	۲	۵	۷
	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

ان میں سے تاریخ ہندوستان کے ۱۰ حصے ہیں۔ جن کے مجموعی صفحات ۷۱۲۹ ہیں۔ اس کے علاوہ سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، کرزن نامہ، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ، تاریخ عہد انگلشیہ، آئین قیصری بہت سی کتابیں ایسی تصنیف کیں کہ ان سے پہلے ان موضوعات پر کسی نے نہیں لکھی تھیں۔

مستقل ضخیم کتابوں کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ نے مختلف رسالوں اور اخباروں میں بیشمار مضامین لکھے۔ تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، مخزن لاہور، زمانہ کانپور، رسالہ حسن حیدرآباد وغیرہ مشہور پرچوں میں بھی لکھتے رہتے تھے اور شمس کلکتہ، صبح بہار وغیرہ وغیرہ مشہور رسالوں کو بھی بے تامل لکھ کر بھیج دیتے تھے کبھی انکار نہ تھا۔

کثرتِ مطالعہ اور اس کام میں ضبط و استقلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دولت خانہ کوچہ چیلان میں ایک مخصوص جگہ پر دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے اور اتنی مدت اُس جگہ بیٹھے کہ دیوار میں گڑھا ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں حامد حسن قادری صاحب نے اس تکیہ گاہِ علم و فضل کی زیارت کی تھی۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب کے ہمعصروں میں کسی ایک مصنف نے

اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں نہیں لکھیں۔ لیکن یہ بخت و تقدیر کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اب اُن کی تصانیف کی طباعت، اشاعت، قدردانی و فیض رسانی کم سے کم ہے۔ اُن کی تصانیف ریاضی و سائنس اُن کے زمانہ میں شامل درسیات رہیں۔ پھر جب تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم و امتحانات انگریزی میں ہونے لگے تو اُن کی ضرورت نہ رہی۔ تاریخوں اور جغرافیوں کا بھی یہی حال ہوا۔ سوانح عمریاں ملکہ وکٹوریہ لارڈ کرزن وغیرہ ایسے اشخاص کی تھیں جن سے عام دلچسپی بھی نہ تھی اور انگریزی میں ان سے بہتر موجود تھیں۔ اُن کی تاریخ ہندوستان بے شک اپنی ضخامت، تفصیل و تحقیق کے سبب قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ تھی۔ لیکن ان کی طوالت و گرانی قیمت کے سبب سے عام لوگ اس سے مستفیض نہ ہو سکے۔ پھر ایک یہ بات بھی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی اکثر کتابیں خصوصاً یہ تاریخ نہایت معمولی کاغذ اور کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئیں اور حسنِ ظاہری یعنی دلکشی و بصارت نواز نہ رہیں۔ اب صرف اُن کے مضامین بعض درسی کتابوں میں داخل نظر آتے ہیں اور بس۔

مولوی ذکاء اللہ کا طرزِ تحریر

مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت میں اختراع و ایجاد کا مادہ بہت کم تھا۔ اس لیے ان کی تحریر میں بجز صفائی و روانی اور تفصیل و تجزیہ کے زبان و طرز بیان کا کوئی لطف نہیں بلکہ ان کی زبان میں محاورہ

دہلی کا بھی مزہ نہیں ہے۔ اُن کو غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت
تھی۔ اِس لئے علمی، تاریخی، سیاسی، اخلاقی ہر قسم کے مضامین کو پوری
وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن مسرت والم، غصّہ و نفرت، شوخی
و ظرافت کے کسی موقع پر اُن کے الفاظ سے اُن کا جوشِ طبیعت
بہت کم مترشح ہوتا ہے۔

اُن کی اکثر تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری زبان سے
ترجمہ کر رہے ہیں حالانکہ وہ مضامین ان کی ذاتی فکر اور آزادانہ تحریر کا
نتیجہ ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں محاورۂ اُردو کے خلاف فارسی محاوروں کا
لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً تاریخ ہندوستان میں راناؔ اُودے پور
کے سلسلۂ ذکر میں لکھتے ہیں۔

"سپاہ کشتہ و اسیر ہوئی، خویشوں نے مع منتسبوں کے اپنا سر پکڑا"
فارسی محاورہ ہے "سرِ خویشتن گرفتند" یعنی اپنا راستہ لیا، ساتھ چھوڑ گئے۔ کبھی عوام کی زبان کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً "عزت
وناموری" کے مضمون میں کہتے ہیں۔ "ہم خزانوں کا ممتاز کرنے والا کمال ہے"
ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "حضرت اکبر بادشاہ نے پنجاہ سال سلطنت کی"
یہاں "پچاس" کا لفظ زیادہ فصیح تھا۔ اسی مضمون میں شہر اودے پور کے
حال میں لکھتے ہیں۔ "بڑی پرفضا اور خوش جا ہے" یعنی خوش وضع
جگہ ہے۔ کبھی غیر متعارف یا کم مشہور لفظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اسی
بیان میں فرماتے ہیں۔

"وہ حسن خدمات کے جلدو میں سندر داس کے رائے رایاں کا

خطاب ملا" جلدو کی جگہ انعام و صلہ اچھے لفظ تھے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا
ہے کہ مولوی ذکاءاللہ صاحب کو الفاظ و عبارت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی۔
جو قلم سے نکل گیا، نکل گیا۔

تاریخی کتابیں بڑی کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھتے ہیں۔ چنانچہ خود اپنا
طرزِ نگارش بیان کرتے ہیں۔

"میرا قاعدہ ہے کہ میں سلاطینِ ہند کی تاریخ نویسی کے لیے وہ تاریخ لیتا
ہوں جن کے مؤلف عہد نویس ہوں اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند
سمجھی جاتی ہوں۔ ان سے تاریخی حالات اخذ کر کے لکھتا ہوں اور پھر انگریزی
تاریخوں سے، جن کا ایک انبار میرے پاس موجود ہے، بعض مضامین التقاط
کر کے لکھتا ہوں" (تاریخ ہندوستان۔ جلد ہفتم۔ احوالِ شاہجہاں)

یورپ کے مؤرخوں نے اپنی تواریخ ہند میں غلط بیانیاں کی ہیں۔ مولوی
ذکاءاللہ نے بقول اپنے "ان تاریخوں کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے اور ان کی
غلطیوں کو بیان کیا ہے" لیکن یہ تصحیح اغلاط زوردار الفاظ میں نہیں کرتے
انگریزوں کی خامیاں بیان کرنے میں جرأت سے کام نہیں لیتے۔

مولوی سیّد احمد دہلوی:۔

مولوی صاحب کو ابتدا سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ طالب علمی کے
زمانہ میں ایک طویل فارسی نظم "طفل نامہ" لکھی تھی۔ اس کے بعد خط و کتابت
کی تعلیم کے لیے "انشائے تقویۃ الصبیان" لکھی جس میں اُردو تلازمہ و
ضلع قایم رکھا گیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ اسی زمانہ میں

اُن کو اپنی عظیم الشان لغت فرہنگِ آصفیہ کی تالیف کا خیال پیدا ہوا اور اس کی تیاری شروع کی۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں اُنہوں نے مناظرہ تقدیر و تدبیر "کنز الفوائد" کے نام سے شایع کی۔ اس پر سرکار نے ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا اسی زمانہ میں مسٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) اپنی مشہور اُردو لغت مرتب کر رہے تھے اُنہوں نے اس تالیف کی اعانت کے لئے مولوی صاحب کو بلوایا جہاں مولوی صاحب نے "انشائے ہادی النسا" کی تالیف کی فیلن صاحب کے کام کی تکمیل کے بعد مہاراجہ آلور کی دعوت پر اُن کا سفرنامہ ۶ ماہ میں مرتب کیا۔ جس کے صلہ میں راجہ صاحب نے اُنہیں معقول تنخواہ و انعام دیا کچھ دنوں گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں بھی نایب مترجم کی خدمت انجام دی ۱۹۰۵ء میں جب پرنس آف ویلز دہلی تشریف لائے تو مولوی صاحب ایک نظم خیر مقدم اور اپنی ایک تالیف رسوم دہلی پیش کی۔

مولوی سیّد احمد کی تصانیف

مولوی صاحب نے بڑی کثرت سے کتابیں تصنیف کیں۔ اگرچہ ضخیم کتابیں کم ہیں۔ لیکن بعض تالیفات موضوع کے لحاظ سے مفید و جدید ہیں۔ فہرست یہ ہے:۔ (۱) تقویۃ الصبیان (۲) کنز الفوائد (۳) وقائع درابیہ (۴) انشائے ہادی النسا (۵) قصۂ راحت زمانی (۶) تحریر النسا (۷) اخلاق النسا (۸) لغات النسا (۹) طبی تعلیم (۱۰) قواعد اُردو (۱۱) علم اللسان (۱۲) رسوم دہلی (۱۳) تکمیل الکلام (۱۴) تحقیق الکلام (۱۵) محاکمۂ مرکز (۱۶) آرسی کھلان (۱۷) ریت بکھان (۱۸) ناری کتھا (۱۹) سیر شملہ (۲۰) روزمرہ دہلی۔

۲۱۔ رسوم اہلِ ہنود ان دہلی (۲۲) اُردو ضرب الامثال۔

فرہنگِ آصفیہ:۔

یہ اہتمام و عظمت میں سب سے مقدم ہے۔ مولوی صاحب اپنے نام سے زیادہ اس کتاب کے نام سے "مؤلفِ فرہنگ آصفیہ" مشہور ہیں۔ آغاز تالیف میں بھی بہت قدیم ہے۔ سنہ ۱۸۶۸ء سے اس کی ترتیب شروع کی۔ ۱۸۷۶ء میں "ارمغان دہلی" کے نام سے بطور نمونہ شائع کیا لیکن تکمیل جاری رہی۔ ۲۴ سال کی محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں تکمیل کو پہنچا گئی۔ مولوی صاحب کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اس قدر ضخیم کتاب کو شائع کر سکیں۔ اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں جب شملہ کی اسکول میں مدرس تھے سر آسمان جاہ وزیرِ اعظم حیدر آباد شملہ آئے۔ مولوی صاحب نے حاضر ہو کر اپنی تالیف کا مسودہ پیش کیا۔ وہ اس کو ساتھ لے گئے۔ مولوی سیّد علی بلگرامی کو دکھایا۔ انہوں نے بہت پسند کیا اور منظوری کی سفارش کی چنانچہ دربار دکن سے انعام کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں بعد تکمیل کے فرہنگِ آصفیہ نام رکھا گیا۔ دولت آصفیہ سے ...۵ روپیہ انعام ملا۔ اور ۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ گورنمنٹ پنجاب نے ...۵ روپئے انعام دیئے اور ایک ہزار روپیہ کی کتابیں خریدیں۔

اُردو لغات:۔

اس کی مختصر تاریخ "تاریخ داستان اُردو" میں صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۴ کے حاشیوں پر لکھی گئی ہے۔ لغات اُردو کے آغاز تالیف سے تقریباً ۴۰ برس

بعد فرہنگِ آصفیہ مرتب ہوئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس سے زیادہ ضخیم مکمل اور مستند فرہنگ آردو موجود نہ تھی۔ مولوی سیّد احمد صاحب نے چار جلدوں میں ۵۵ ہزار الفاظ کو محاورات، تحقیق اور سند و حوالہ کے ساتھ درج کیے ہیں۔ اب اگر اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی واقع ہو گئیں تو ایسی فرو گذاشتوں سے اور کوئی لغت بھی خالی نہیں ہے۔ 'نوراللغات' فرہنگ سے ۲۵ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی صرفی، لسانی، تحقیق اور استنادی غلطیاں بہت ہیں۔ بہرحال تقدیم و تکمیل کی فضیلت مولوی سیّد احمد کو حاصل ہے۔

فرہنگِ آصفیہ امیراللغات اور نوراللغات کا مختصر مقابلہ

مولوی سیّد احمد نے فرہنگ آصفیہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:۔

"جس طرح جامع امیراللغات نے 'ارمغانِ دہلی' مطبع ۱۸۷۸ء میں سے لفظ 'آنکھ' لے کر اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ چھاپی تھی اسی طرح مؤلف 'نوراللغات' نے بھی اُن کی پیروی کر کے سنہ اشاعت سے پورے تین قرن بعد فرہنگ آصفیہ میں سے لفظ (بات) اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ شائع فرمائی ہے یہ بڑا سخت اعتراض ہے۔ حضرت امیر مینائی اور مولوی نورالحسن نیّر کاکوروی ایسے آدمی نہ تھے کہ کسی کتاب کی ہو بہو نقل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیں۔"

بات یہ ہے کہ الفاظ و محاورات کسی مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے ہر شخص اُن کو تلاش کر سکتا ہے۔ البتہ پہلی مرتبہ جمع کر کے مرتب کر دینا

مؤلف کا کارنامہ ہوتا ہے۔ لیکن لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہ جامع و مؤلف کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اُن کی ہو بہو نقل بیشک سرقہ اور قابلِ الزام ہے۔

مؤلف سیّد احمد کی اس فضیلت میں شک نہیں کہ اُنہوں نے اُردو کی سب سے بڑی اور مکمل لغات سب سے پہلے مرتب کی اور ۱۸۷۸ء میں ارمغانِ دہلی شائع کی منشی امیر احمد مینائی کو امیراللغات کا خیال بعد کو آیا اور اُنہوں نے ۱۸۸۴ء میں لفظ 'آنکھ' کا نمونہ مرتب کیا۔ امیر مینائی کے سامنے فرہنگ کا نمونہ موجود تھا۔ یقیناً اس سے استفادہ کیا لیکن اس کی ہو بہو نقل نہیں کی۔ بلکہ سیّد صاحب کی لغات کو خود جانچا۔ غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا۔ ضروری محاورات جو رہ گئے تھے اُن کا اضافہ کیا۔ سند کے اشعار الگ تلاش کر کے لکھے۔ مولوی نورالحسن صاحب نیّر کے سامنے بھی فرہنگ تھی اور اُنہوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ لیکن ہو بہو نقل نہیں کی فرہنگ میں 'بات' کے ۴۶ معنی ہیں۔ نوراللغات میں ۲۸ ہیں۔ ان کے اسناد کے چند شعر نیّر صاحب نے سیّد صاحب سے لیے ہیں اور باقی سب خود تلاش کیے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں یہ کمی ہے کہ 'بات' کے تلازمے زیادہ محاورے لکھے ہیں۔ لیکن سند کے اشعار خال خال کہیں لکھے ہیں۔ کلام کے اشعار سے خالی ہیں۔ فقروں کی مثالیں بھی کم ہیں۔ لفظ 'بات' کے دس دس معنی نمبروار یکجا لکھ دیے ہیں اور مثال کہیں نہیں لکھی۔ نوراللغات میں اکثر سند میں اشعار کم ہیں۔ کہیں کہیں فقرے لکھ دیے ہیں۔

غرض امیر اللغات اور نور اللغات پر سیّد احمد کا یہ الزام بالکل غلط ہے
کہ انہوں نے فرہنگِ آصفیہ کی ہو بہو نقل اُڑالی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ
سیّد صاحب نے سالہا سال کی محنت سے لغت تیار کی تھی اور چاہتے تھے کہ بقول
"اقلیمِ لغت میرے قلمرو سے نہ جائے"
اس لئے اُنہوں نے حضرت امیر و نیّر کے لغات کو اپنی مِلک پر دست درازی
تصوّر کیا ہے۔ شکر ہے کہ سیّد صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے ریاض کو
سرسبز دیکھ لیا اور اپنی ریاضت کا پھل پالیا اور یہ زمانہ کی کارستانی
رہی کہ امیر اللغات تمام نہ ہو سکی۔ فرہنگِ آصفیہ باوجود مکمل شائع ہونے کے
اب نایاب ہے اور نور اللغات بازار میں سب کی ملکیتوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔[۹۶]

میر ناصر علی خاں دہلوی

میر ناصر علی خاں دہلوی کے والد مولوی سیّد ناصر الدین ابو المنصور اعلیٰ پایہ
کے ادیب تھے۔ بڑے بھائی میر نصرت علی "نصرت الاخبار" کے مالک اور
ایڈیٹر تھے۔ چنانچہ ادبی ماحول میں اُن کی نشو و نما ہوئی۔

ادبی خدمات

میر ناصر علی خاں اُن ادیبوں میں ہیں جو صرف ایڈیٹری اور مضمون نگاری
کے سبب نامور ہوئے[۹۷]۔ انہوں نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ لیکن
زبان و ادب کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ آغازِ شباب سے مضمون نگاری
شروع کر دی تھی۔ اُردو اخبارات میں مقالہ نگاری کا صحیح مذاق سرسیّد کے

انشاپردازی میں نئی روح پھونکی۔ میر ناصر علی خاں نے اپنے لئے اخبارات
و رسائل کی ادارت کو اُردو کی خدمت کا ذریعہ تجویز کیا۔ چنانچہ "تیرھویں
صدی" "زمانہ" وغیرہ پرچے نکالے اور ان کے ذریعے صحیح زبان، دلکش
اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے نمونے پیش کئے آخر میں "صلائے عام"
کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جو اُن کی وفات تک جاری رہا۔
اسی پرچے سے اُس کے مالک و مدیر کی ساری شہرت ہے۔ "صلائے عام"
اور میر ناصر علی کے مقالات کی تمام ادبی دنیا میں دھوم تھی۔

میر ناصر علی خاں لکھنؤ میں بھی رہے تھے۔ اور انہیں وہاں کی زبان
کا اپنی زبان سے مقابلہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں کا فرق ایک
مضمون میں یوں بتاتے ہیں۔

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا،
یہ ہے کہ دہلی میں سقہ جرنیل پر شک بھر رہا ہے، دوسرے سقہ سے
جس زبان میں باتیں کر رہا ہے اُسی زبان میں لال قلعہ تک باتیں
سنتے چلے جائیے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔ لکھنؤ
میں خاص کی زبان اور ہے، عوام کی زبان اور۔"

میر صاحب شاعر نہ تھے لیکن نثر میں شاعری کرتے تھے۔ یہ نثر کی
شاعری مولوی عبدالحلیم شررؔ نے ایسی کی کہ حدِ کمال ختم کر دی۔ لیکن
اس کی ایجاد و ابتدا کرنے والوں میں میر ناصر علی خاں بھی تھے۔
شرر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نئے خیالات اور خیال آفرینی کے
اسلوب انگریزی انشاپردازوں سے لئے اور اُن کو اُردو زبان کے

طرزِ ادا کے ساتھ اور شعرائے ہند کے مذاقِ ادب کے مطابق ترتیب کرکے
پیش کیا۔ یہی کام ناصر علی خاں اور عبدالحلیم شررؔ سے پہلے علامہ محمد حسین
آزادؔ نے "نیرنگِ خیال" میں کیا تھا۔ لیکن وہ 'تمثیلی رنگ' ہونے کے
سبب سے ایک صنفِ خاص تھا۔ شررؔ اور میر صاحب صرف تمثیل کے
پابند نہ تھے۔ نئی بات نئے انداز سے لکھنی چاہتے تھے، پاکیزہ خیالات
پیدا کرنا چاہتے تھے۔ میر ناصر علی خاں صلائے عام میں لکھتے ہیں۔

"صلائے عام میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال کی تلاش
زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی ہیں جو لیاقتِ علمی سے
خالی ہیں۔ مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم و لیاقت کی ضرورت ہے۔
اس لئے اہلِ علم و کمال میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح
دی جاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا
سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرتے ہیں جو خونِ جگر کھانا پڑتا ہے
اس کے سمجھنے کے لئے دل و دماغ چاہیے اور دل و دماغ بخت عربی
کی طرح ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔"

میر صاحب کا طرزِ تحریر بھی یہی ہے کہ زبان شستہ و صاف،
سادہ و سلیس لکھتے ہیں۔ لفظوں اور ترکیبوں میں استعارے پیدا
نہیں کرتے بلکہ پوری بات یا سارے مضمون کو خیالی و مجازی بنا دیتے
ہیں۔ دو چار نمونے یہ ہیں۔

۱۔ "عرس و سالگرہ" صلائے عام کا مضمون ہے۔ شروع میں تقریب
تحریر بیان کردی ہے۔ مختلف حصے درج ذیل ہیں۔

اخبار والے جن کو سخن گستری کا شوق ہے سال کے انجام و آخر کے
دو مضمون ذرا زور سے لکھتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے ان دنوں دو مضمون
علیحدہ علیحدہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ ایک مضمون کی بحث نکال کر
سال کے انجام و آغاز کو میں عرس و سالگرہ سے تشبیہ دیتا ہوں۔
۳۱ دسمبر کو تو گویا پیر گردوں کا عرس سمجھئے اور یکم جنوری کو گردشِ
روزگار کی سالگرہ ......

ہر سال کا اخیر میری نگاہ میں زمانہ کا عرس ہے کہ جس طرح
اولیاء اللہ کو کہتے ہیں کہ فنا نہیں۔ اُن کا ہماری نظر سے غائب ہونا
"وصال" سمجھا جاتا ہے، اس طرح ایک سال کا غائب ہونا جز کا
کل میں مل جانا ہے۔ اسے وصال نہیں تو اور کیا کہیے؛ ورنہ زمانہ وہی
ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ گئے ہوئے زمانہ کو آپ فاتحہ خیر
سے یاد کریں کہ حاصلِ عرس بزرگان یہی ہے اور گردشِ روزگار کی
سالگرہ منائیں کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے ؎

تو ابتدا سے ہم کہیں اب داستانِ عشق کو آخر شبِ فراق کو تو انتہا نہیں

اتفاقات زمانہ سے پیر گردوں کی سال گرہ کا دن یہی تھا جو
گردشِ روزگار کی سالگرہ کا دن ہے کہ آغازِ عالم میں تمام کائنات ایک
ہی وقت "کُن فیکون" سے پیدا ہوئی۔ پیر گردوں کی سالگرہ کی یادگار
کہکشاں آسمان پر موجود ہے ؎

دوستانِ رفتہ کی روداد کس سے پوچھئے
بات کے لائق کوئی خیر خرشاں میں نہ تھا

۲۔خیال بمقابلۂ زبان

زبان و خیال کے متعلق میرزا مرعلی خاں انگریزی انشار پردازوں کے چند خیالات پیش کرتے ہیں۔

اور ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات میں نیا مضمون پیدا ہو۔ آئینہ کو ہم حیران باندھنے سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ یونان کے کسی شاعر نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے، زہرہ کے مندر پر آئینہ چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں۔ جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہے کو نظر آئے گی۔ جو شکل ہونے والی ہے اس کو دیکھ کر کیا کروں گی؛ جوانی کے بعد جو میری صورت ہوگی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائیگی جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی اب آئینہ کو دیکھ کر کیا ہوگا؟ یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جاتی گی

ایک کمسن لڑکی جواب تک گڑیوں سے کھیلتی رہی صغیر سنی کی شادی میں از روئے رسم مندر میں پوجا کے لئے گئی اور لوگ جہاں چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب ان سے کھیل چکی؛ ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں۔ دیبی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے رخصت ہے گڑیوں سے کھیلیں گی۔ شادی کے بعد کھیلنا معلوم!

عقل نے عشق سے کہا کہ اکیلے تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ایک سے برابر کی لڑائی ہے۔ مگر تیرے ساتھ اگر دختر رز ہو گئی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے۔

ایک بچہ کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں کہ اگر میں نے زندگی کا لطف نہیں دیکھا تو اس کی مصیبتیں بھی نہیں اٹھائیں، اُدھر کی کسر اُدھر نکل گئی۔

کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی لگ گئی۔ بھلا میرے ساتھ تو کر کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے؛

"یہ چند خیال میں نے اہل علم رکمال کی طبع آزمائی کے لیے جمع کر دیئے کہ ان پر مضمون لکھیں یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں جن سے میں عاری ہوں۔ شعرائے اُردو ان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے۔

میں نے بُری بھلی اُردو میں ان کا مطلب ادا کر دیا اب آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں ؎

کیوں خاک میں ملاتے ہو رفتارِ ناز سے کو ملتی میں لوٹتا ہے ٹو دوپٹہ اٹھائیے ۹۵

خواجہ سیّد ناصر نذیر فراق دہلوی

حضرت خواجہ میر درد رحمتہ اللہ علیہ کے نواسے تھے۔ ۷ اگست ۱۸۶۵ء (ربیع الاول ۱۲۸۲ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود ایک رُباعی میں اپنا نسب بیان کرتے ہیں ؎

حمدِ حق لکھوں گا یا نعتِ نبی لکھوں گا
وصفِ سبطین کا تعریفِ علی لکھوں گا
زیدی النسل ہوں سیّد ہوں مجھے ننگ ہے
مدحِ غیروں کی دکھی نہ کبھی لکھوں گا

ان کے دادا منصب دار تھے۔ والد میر محسن علی درویش صفت، بڑے عالم بزرگ تھے۔ والدہ بھی علوم ظاہر و باطن میں کامل تھیں۔

میرناصر نذیر نے خواجہ میر درد کی سوانح عمری "میخانۂ درد" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے اپنے والدین ماجدین کی صحبت چوالیس سال اُٹھائی اور ان دونوں حضرات نے مجھے اُن کمالاتِ ظاہری و باطنی سے جو ورثۂ خواجہ میر درد صاحب سے پہنچے تھے مالا مال کر دیا۔"

اس فیضان کے علاوہ میر فراق نے فارسی و عربی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور درسِ نظامیہ ختم کر کے سند لی۔ پھر فنِ طب کی طرف توجہ کی پہلے حکیم بدرالدین خاں دہلوی سے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر حکیم محمود خاں دہلوی اور ان کے فرزند اکبر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔

میر ناصر نذیر فراق کے خاندان میں قدیم سے سلسلۂ نقشبندیہ جاری تھا۔ خواجہ میر درد اس سلسلے کے درویش کامل تھے۔ لیکن میر فراق نے چشتیہ طریقہ میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی قدس سرہ کے پوتے حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت حاصل کی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرا سلوک پورا ہو گیا اور میں اپنے مقصد کو پہنچ گیا۔ مرض الموت میں بھی اپنے صاحبزادہ سے فرمایا: "تم کو معلوم نہیں ہے۔ میرے پاس انفاس ہر وقت جاری رہتا ہے۔" بعض رباعیوں میں اپنا مسلک بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کچھ بھی نہیں ہے موجود الا اللہ ٭ سب ہیچ ہے تا در وجود الا اللہ
کہتے ہیں فراق جن کے دل روشن ہیں ٭ لا فاعل فی الوجود الا اللہ

وفات سے ایک مہینہ قبل جنوری ۱۹۳۳ء میں فرمایا تھا کہ "ہمارا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا ہے اور وہ فقرہ کیا جو اپنی مرگ سے آگاہی نہ رکھتا ہو۔" انہیں دنوں میں اُن کے ایک دوست مزاج پرسی کے لئے آئے تو ان سے فرمایا "بھائی اب روا داری ہے۔ میں نے یہ شعر اپنے حسبِ حال لکھا ہے ؎

کرے گا اس عالم کی تو ترکیب کب تک ٭ منائے گی بکرے کی ماں خیر کب تک"

چنانچہ دوشنبہ شب میں ۱۰ر فروری ۱۹۳۳ء (۱۴ر شوال ۱۳۵۱ھ) کو رحلت فرمائی۔ قرآن مجید سے تاریخ وفات ہے۔

الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ = ۱۹۳۳ء

(سورۂ قمر آخری آیت۔ پارہ ۲۷)

تصانیف اور طرزِ تحریر

میر ناصر نذیر فراق کی فہرست تصانیف یہ ہے:۔

۱۔ میخانۂ درد:۔ حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ کے حالات۔

۲۔ دلی کا آخری دیدار:۔ دہلی و بادشاہ دہلی اہلِ شہر و اہلِ قلعہ کی معاشرت رسم و رواج اشغال میلے تہوار سب کچھ بیان کیے ہیں۔

۳۔ لال قلعہ کی ایک جھلک:۔ دہلی کے آخری تاجدار ابو ظفر بہادر شاہ کے زمانہ کا لال قلعہ پورا اس کتاب میں منعکس ہے۔

۴۔ دلی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ:۔ مختصر کتاب ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے فرزند شاہ رُخ مرزا کے شکار کھیلنے کے حالات ہیں۔

۵۔ **بیگموں کی چھیڑ چھاڑ:** ۔ ایک شادی کی محفل کا نقشہ ایک بیگم کی زبانی پیش کیا ہے۔

۶۔ **سات طلاقنوں کی کہانیاں:** ۔ سات عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی کہانیاں کہتی ہیں کہ اُن کو کس وجہ سے طلاق ملی۔

۷۔ **دکن کی پری:** ۔ ایک طویل افسانہ

۸۔ **مضامین فراق:** ۔ مصنف کے افسانوں کا مجموعہ۔

۹۔ **چار چاند:** ۔ مصنف کے چند مضامین کا مجموعہ۔

میر ناصر نذیر فراقؔ جس دلّی کی خود یادگار تھے اُسی دلّی کی یادگار اُن کی زبان اور کتابیں ہیں۔ اُنہوں نے کوئی علم و فن کی کتاب نہیں لکھی۔ اُن کا قلمی کارنامہ لطفِ زبان اور حسنِ بیان کے ساتھ دہلی کی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ پیش کرتا ہے۔ اُن کی طرزِ تحریر کی داد اُن کے ایک ہم پایہ اور اُن سے بزرگ ادیب دیتے ہیں۔ فراقؔ صاحب کے صاحبزادے نے اُن کے حالات میں لکھا ہے :۔

"منشی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگِ آصفیہ آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے "بھائی صاحب کمال کیا ہے۔ اتنے سے چھوٹے افسانہ "اختر محل" میں اتنے دلّی کے ٹھیٹھ محاورے آپ نے بھر دیئے مجھ کو حیرت ہے۔ میں تو آپ کو سلطانِ زبانِ اردو کہتا ہوں"۔ چنانچہ خطوط میں اُن کو سلطانِ زبان اردو لکھا کرتے تھے۔[99]

میر بشارت علی جالب

آپ ۱۸۷۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کے پڑپوتے صاحب عالم نے آپ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ جس کی وجہ سے اُن کی تعلیم و تربیت شاہزادوں کی صحبت میں ہوئی۔ اِس کا اثر اُن کی زبان اور اخلاق پر پڑا۔ ابتدائی تعلیم یعنی اُردو، فارسی اور عربی سے فارغ ہونے کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ پہلے مجروحؔ اور پھر داغؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔

آپ کی قابلیت سے متاثر ہو کر حکیم اجمل خاں نے اپنا "اکمل الاخبار" آپ کے سپرد کیا۔ یہیں سے آپ کی صحافت نگاری زور پکڑنے لگی اور کئی اخباروں سے بھی تعلق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ منشی نول کشور نے اپنے "اودھ اخبار" کے لیے اُن کو دہلی سے لکھنو بلا لیا۔ جہاں وہ ایک مدت تک اِس اخبار کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مختلف اخبارات کی ایڈیٹری کے سلسلہ میں پنجاب، بمبئی اور حیدر آباد کا بھی سفر کیا اور کچھ دنوں تک اخبار "ہمدرد" اور آخری زمانہ میں "ہمت" کی ناخدائی کرتے رہے۔ انکا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا۔

میر جالبؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ مغل شہزادوں کی صحبت اٹھائی تھی جس کی وجہ سے بڑی شستگی پیدا ہو گئی تھی۔ اُن کا طرزِ تحریر

سلیس، مدلل اور دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ اُن کے اداریٔ مضامین انگریزی اخبار کے ہم پلہ ہوا کرتے تھے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ اُس کا بہت اچھا استعمال کرتے تھے۔ ملک کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر وہ لکھنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں[۱۲۰]۔

اُن کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے سوائے ایک کتاب کے جس کا تعلق پانی پت کی تیسری لڑائی سے تھا۔ جسے رسالۂ زمانہ نے ایک خاص نمبر شائع کیا تھا۔ اُنہوں نے یہ کتاب بڑی تحقیق کے بعد لکھی۔

چھٹا باب

۱۸۵۷ء سے پہلے کے اخبار

۱۸۵۸ء تا ۱۸۷۵ء تک

۱۸۷۶ء تا ۱۸۹۵ء تک

۱۸۵۷ء سے قبل کے اخبار

دہلی اُردو اخبار ۱۸۳۶ء:- مولانا امداد صابری صاحب اپنی تصنیف "تاریخ صحافت اُردو" میں رقم طراز ہیں کہ عام طور پر قدیم اور خصوصی دہلی اُردو اخبار اور دہلی اخبار کو علیحدہ علیحدہ اخبار لکھا گیا۔ اس سلسلے میں وہ مولانا احسن مارہروی کا ذکر کرتے ہیں جو اپنی کتاب "تاریخ نثر اُردو" میں جس انداز سے اس کا تذکرہ کیا ہے اس سے مذکورہ بالا مفہوم نکلتا ہے۔ یہ اخبار کب جاری ہوا اس کے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ متفقہ رائے تو یہی ہے کہ یہ ۱۸۳۶ء میں جاری ہوا۔

اس سلسلے میں صابری صاحب مرزا غالب کے ایک خط بنام چودھری عبدالغفور صاحب سرور کا ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ یہ اخبار ۱۸۳۶ء کو جاری ہوا۔ مزید اس غرض سے صابری صاحب کلکتہ کے اخبار "مہر عالم افروز" کو پیش کرتے ہیں جس کے ۲۱ جولائی ۱۸۳۶ء کے پرچے میں دہلی اخبار مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۳۶ء کی مطبوعہ خبر نقل کی گئی ہے۔ اس زمانے کے اخبارات کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ جس اخبار سے خبر نقل کرتے تھے حوالے کے طور پر اس اخبار کا نام بھی پیش کرتے تھے۔ مولانا صابری کے مذکورہ بالا بیانات سے قارئین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اخبار ۱۸۳۶ء میں جاری ہوا۔

گارساں دتاسی کے ایک بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "سراج الاخبار" "دہلی اُردو اخبار" سے قدیم ہے۔ صابری صاحب اس کی صراحت یوں کرتے ہیں: "یہاں گارساں دتاسی نے قیاس سے کام لیا ہے۔ انہوں نے "سراج" کے نام کو چونکہ بادشاہ کا نام سراج الدین ہے اس لیے یہ اخبار

اُنھوں نے جاری کیا ہوگا اور بادشاہ سے پہلے اخبار کو کون جاری کر سکتا ہے؟ اور جو بھی اخبار جاری ہوئے وہ سراج الاخبار کے بعد ہی جاری ہوئے ہوں گے۔ اس لیے اُنہوں نے یقین کیا کہ "سراج الاخبار" ہی سب سے پرانا اخبار ہے حالانکہ سراج الاخبار ۱۸۴۱ء میں جاری ہوا۔" "دہلی اُردو اخبار" کی قدامت کی تائید "آب حیات" سے بھی ہوتی ہے۔

ابتداء میں اس اخبار کے مہتمم سید حسین صاحب تھے۔ اس کے بعد معین الدین صاحب اور بعد میں موتی لال پرنٹر و پبلشر مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۳ء سے مولانا محمد حسین آزاد پریس کے پروپرائٹر مقرر ہوئے۔ اور ان کے والد مولوی باقر صاحب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی ابتدائی زندگی اس اخبار کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے وابستہ رہی۔ اس کا ماہانہ چندہ دو روپے، ششماہی گیارہ روپے اور سالانہ ۲۰ روپے تھا۔ بڑے سائز ۲۰×۳۰/۴ پر دو کالمی چھپتا تھا۔

اس اخبار میں خاص طور پر دہلی کی سیاسی، مجلسی اور تمدنی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ اخبار تعلیم کا زبردست حامی تھا۔ تنگ نظر نہیں تھا۔ اُدبی مضامین بھی اس میں نظر آتے تھے۔

سیّدالاخبار

دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک سیّد محمد خاں صاحب، مہتمم سیّد عبدالغفور صاحب تھے۔ ماہانہ چندہ ڈیڑھ روپے تھا اور اخبار مطبع سیّدالاخبار میں چھپتا تھا۔

اِس اخبار کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ چونکہ سیّد محمد خاں صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی سیّد احمد خاں صاحب سے انتہائی محبت تھی جن کو اُن کے رشتہ دار سیّد کہا کرتے تھے اِس لیئے انہوں نے اِس کا نام سیّد احمد خاں کی عرفیت کی مناسبت سے "سیّد الاخبار" رکھا۔

یہ اخبار اُس وقت جاری ہوا۔ جب سر سیّد مرحوم کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال کی تھی سر سیّد کے ابتدائی مضامین غالبًا اسی اخبار میں شائع ہونے شروع ہوئے تھے۔ "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن بھی مطبع سیّد الاخبار میں چھپا تھا۔ ۱۴ر اگست ۱۸۴۳ء کے شمارہ سے ظاہر ہے کہ اُس وقت تک یہ اخبار جاری رہا۔

سراج الاخبار ۱۸۴۱ء

انیسویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانے کے معاصر اخباروں میں ایک فارسی اخبار کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۴۱ء میں نکلا۔ اس کے ایڈیٹر سیّد اولاد علی تھے۔ مطبع سلطانی میں مصلح الدولہ سیّد ابوالقاسم واقعہ نگار اولاد علی کے اہتمام میں چھپتا تھا۔ یہ اخبار شاہ ظفر کے دربار کا کورٹ گزٹ روزنامچہ تھا جو بادشاہ کی ہدایت کے مطابق دہلی کے قلعہ معلی سے فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ آخری صفحوں میں دوسری سلطنتوں اور ریاستوں کے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یا کبھی دہلی کی مقامی شکایتوں، حکام کی بدعنوانیوں یا موسم وغیرہ کی کیفیت بتائی جاتی تھیں۔ جب یہ اخبار

چھپ جاتا تھا تو تاروچی خاں بادشاہ کے پاس اخبار لے جاتا۔ بادشاہ جس کو کہتے اُس کو یہ اخبار روانہ کر دیا جاتا تھا۔ اور خاص طور پر ہفتہ یہ اخبار معظم الدولہ کی معرفت لفٹننٹ آگرہ کے یہاں بھیج دیا جاتا تاکہ وہ اخبار سے اندازہ لگا سکے کہ کس طرح کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔

اِس اخبار کی فارسی بہت پختہ اور ٹھیٹ منشیانہ ہوتی تھی جو دربار کے شایانِ شان تھی۔ اس کے علاوہ اسلوب فصیح اور عبارت بلیغ ہوتی تھی۔ زبان کے قاعدے اور اصولوں کی پابندی سخت تھی۔

سراج الاخبار میں بہادر شاہ ظفر، استاد ذوق، مرزا غالب وغیرہ کے قصے شائع ہوتے تھے۔

مظہر حق ۱۸۴۳ء

اِس اخبار کو مولانا محمد باقر صاحب نے ۱۸۴۳ء میں دہلی سے جاری کیا تھا۔ اس کا مقصد شیعہ فرقہ کے مذہبی نقطۂ نظر کی اشاعت کرنا تھا۔ مولانا صابری نے اِس اخبار کے متعلق "سراج الاخبار" (۱۴ ستمبر ۱۸۴۳ء) میں مطبوعہ ایک خبر کے حوالہ سے یہ بتایا ہے کہ بغداد شریف میں ۱۸۴۳ء میں سنّی اور شیعوں میں بڑا فساد ہوا جس میں شیعوں کا بڑا جانی اور مالی نقصان ہوا تھا ہندوستان کے سنّی اخبار اس قتل و غارت گری کے منکر تھے۔ اگر کوئی شخص اس قتل و غارت گری کو جھٹلاتا تھا تو مولانا اِس اخبار کے ذریعہ اس کا مسکت جواب دیتے۔ جب اس اخبار کی یہ غرض پوری ہوئی تو اسکو بند کر دیا گیا۔

صادق الاخبار سنہ ۱۸۴۴ء

مولانا عبدالرزاق صاحب ارشد مددگار معتمد حیدرآباد دکن، صادق الاخبار کے متعلق لکھتے ہیں کہ ابتداء میں یہ اخبار دہلی سے فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی تائید "احسن الاخبار" بمبئی کے ایک پرچہ مطبوعہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۷ء سے ہوتی ہے: "صادق الاخبار کے ایڈیٹر رفتہ رفتہ اپنے اخبار کو اردو زبان کا اخبار بنا دیا......" اس اجراء کے متعلق صابری صاحب لکھتے ہیں کہ ان کے والد ماجد کے کتب خانے میں "صادق الاخبار" کی ۱۸۴۵ء کی کاپی موجود ہے۔ اس سے قارئین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ۱۸۴۵ء یا اس سے قبل اس اخبار کا اجرا ہوا۔ اس پرچہ کی وضع و تقطیع اپنے معاصر اخباروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس زمانہ کے دستور کے خلاف پریس کا نام اخبار کے نام کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ نہ مہتمم پریس کا نام ہے اور نہ ہی ایڈیٹر اور نہ ہی جلد نمبر اور نہ ہی شمارہ نمبر۔

قرآن السعدین سنہ ۱۸۴۵ء

دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار سنہ ۱۸۴۵ء کو جاری ہوا۔ ماہانہ قیمت دو روپے سالانہ قیمت بیس روپے اور ششماہی دس یا گیارہ روپے تھی۔ مطبع العلوم میں چھپتا تھا۔

"محب ہند" "فوائد الناظرین" "قرآن السعدین" اور "تحفۃ الحدائق" دہلی کالج کے اساتذہ کے اہتمام میں شائع ہوتے تھے اور ان کے مضامین کی نگرانی کالج کی ایک کمیٹی کے ذمہ تھی۔ ان اخباروں میں اشاعت سے پہلے چھپنے والے

تمام مضامین کالج کے شعبہ عربی کے اول اور دوم مولویوں کو دکھلائے جاتے تھے۔ ان مضامین میں جو حصے ان لوگوں کو قابل اعتراض معلوم ہوتے ان کو حذف کرنے کا اختیار انہیں حاصل تھا۔ طباعت کے بعد "قرآن السعدین" کی ایک کاپی مقامی کمیٹی کے ممبر جے۔ پی۔ گیو بنس کو اور "فوائد الناظرین" کی ایک مسٹر ٹیلر کو بھیجی جاتی تھی۔ یہ حضرات ان کا بغور مطالعہ کرتے۔ بلکہ "قران السعدین" کے بانی تو دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر سپرنگر تھے۔ اس اخبار کے متعلق مولانا صابری کی تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معیار بلند تھا۔ اس کے مضامین بڑے دقیق، تاریخی و معلوماتی ہوتے تھے۔ اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں کو یورپین علم و ادب سے روشناس کرانا اور تعلیم کی طرف توجہ دلانا تھا۔ اس کا طرز تحریر دلپسند اور دلکش تھا۔ عمدگی اور قابلیت کے ساتھ عام ذہنوں کو تربیت دینے میں کامیاب رہا۔ محب ہند کے مضامین اس میں نقل کئے جاتے تھے۔ چونکہ اسکا بھی ہر مضمون انگریزوں کی نظر سے گذرتا تھا اس لیے یہ اخبار بہت محتاط تھا۔ اور انگریزی حکومت کے خلاف کچھ بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ لیکن بعض اوقات اس میں ہندوستان کے صحیح حالات چھپ جاتے تھے۔ مثلاً ہندوستان سے انگریز کس قدر روپیہ انگلینڈ روانہ کرتا تھا اسکی تفصیل زیر عنوان حال روانگی روپیہ کا ہندوستان اور ولایتوں کے تحت ۷ مارچ ۱۸۴۵ء کے "قران السعدین" میں دی ہے۔

خاندان مغلیہ اور لکھنؤ کی نوابی کا خاتمہ کیوں ہوا تھا، اس لئے کہ ان سے غیر ذمہ دارانہ و طفلانہ حرکتیں سرزد ہونے لگی تھیں۔ ان کی بیگمات کی وسیع انداز سے زندگیاں گذرتی تھیں۔ لکھنؤ کی بیگمات کا ایک اسی قسم کا واقعہ

۲۱ فروری ۱۸۴۸ء کے پرچہ میں درج ہے۔ اس اخبار کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غالباً قِران السعدین ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے قبل تک جاری رہا۔

کریم الاخبار اور گلِ رعنا ۱۸۴۵ء

۱۸۴۵ء میں مولوی کریم الدین صاحب نے دہلی سے ایک ماہنامہ "گلِ رعنا" اور ہفتہ وار "کریم الاخبار" نکالا تھا۔ "گلِ رعنا" کو مولوی صاحب خود مرتب کرتے تھے۔ اُنہوں نے ۱۸۴۵ء میں ایک تاریخی مشاعرہ کا اعلان کیا تھا جو ہر مہینہ یا ہر ہفتہ منعقد ہوتا تھا اور ان مشاعروں کا کلام گلِ رعنا میں چھپتا تھا۔

گارساں دتاسی کے ایک خطبہ مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۵۰ء سے "گلِ رعنا" کے متعلق حسبِ ذیل کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

مولوی کریم الدین نے کچھ عرصہ ہوا کہ ایک خاص رسالہ "گلِ رعنا" میں جو دہلی سے شائع ہوا ہے، ایسے شاعروں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ "کریم الاخبار" دہلی کی تصدیق ایک اشتہار سے ہوتی ہے جو "فوائد الشائقین" دہلی مورخہ ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس اشتہار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "کریم الاخبار" دہلی سے نکلتا تھا۔

فوائد الناظرین ۱۸۴۵ء

دہلی کے اس سائنسی اور تاریخی رسالہ و اخبار کا ۱۸۴۵ء میں اجرا ہوا۔

پہلے یہ ماہانہ نکلتا تھا۔ بعد میں پندرہ روزہ ہو گیا۔ پہلے چار صفحوں پھر آٹھ صفحوں پر نکلنے لگا۔ اس کے ایڈیٹر ماسٹر رامچندر صاحب تھے بلکہ ۱۸۵۱ء میں اس کے نائب مدیر سیّد علی ہو گئے تھے۔ پہلے ڈیڑھ آنہ بعد میں چار آنہ ماہانہ چندہ ہو گیا تھا۔ شروع کے کچھ پرچے دہلی اردو اخبار مکان مولوی محمد باقر میں چھپے۔ ابتدائی چند پرچوں کے سرورق پر دو ایسے ہاتھوں کی تصویر ہے جو ایک پتی کو پکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد سرورق پر بادشاہوں اور مشہور آدمیوں کی تصویریں شائع ہونے لگی تھیں۔ دہلی کے رسالوں میں مستند و جامع مضامین کے بارے میں "فوائد الناظرین" کا پلہ بھاری تھا۔ اس میں نقشے اور سائنٹفک مضامین کے علاوہ حالاتِ تاریخی، تاریخی اشخاص کی تصویریں شائع ہوتے تھے۔ اکثر علمی بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ خدا، قاعدہ و توانا، انسان کی تقدیر، عام توہمات، ذہانت، ضبط و نظم، اخلاقیات، بالغوں کی تعلیم جیسے .... مضامین چھپتے تھے جسے پڑھ کر لوگ ماسٹر صاحب کو بد مذہب اور ملحد سمجھتے تھے۔ اس اخبار میں یورپین علوم کی بھی اشاعت ہوتی تھی۔ "ٹائمز" لندن کے ہفت روزہ ایڈیشن کے مضامین کا ترجمہ شائع کیا جاتا تھا۔

یہ اخبار علم کو پھیلانے میں کافی دلچسپی لیتا تھا اور اس قسم کی خبروں کی اشاعت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ یکم اپریل ۱۸۴۹ء کے شمارہ میں ایک خبر "تیاری مدرسہ واسطے ہندوستانی عورتوں کے" کے عنوان کے تحت شائع ہوئی تھی۔ زمانہ حاضرہ کی طرح اس اخبار میں ہر سال کے پہلے پرچہ میں سال گذشتہ کی اہم خبریں شائع کی جاتی تھیں۔

چنانچہ ۱۸۵۲ء کے شمارہ میں گذشتہ سال ۱۸۵۱ء کی اہم خبریں شائع ہوئی تھیں۔

مولوی عبدالحق صاحب اور گارساں دتاسی صاحب نے اس اخبار کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ۱۸۵۲ء میں بند ہوگیا تھا۔ ایک صاحب اسکی تردید کرتے ہیں کہ یہ اخبار بند نہیں ہوا۔ حالانکہ اس بات کی تصدیق ۱۸۵۷ء کے سرکاری گزٹ کی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ چونکہ فوائدالناظرین کے ۱۸۵۹ء کے بعد کے پرچے موجود ہیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ اخبار چند مہینے بند رہا ہو اور پھر جاری ہوا ہوگا۔ دتاسی نے اپنے خطبہ ۲۹ نومبر ۱۸۵۳ء میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

فوائدالشائقین ۱۸۴۶ء

دہلی سے یہ ہفتہ وار قانونی اخبار ۱۸۴۶ء میں جلوہ افروز ہوا۔ چار صفحات پر مشتمل تھا۔ مہتمم پربھو دیال تھے۔ قیمت ماہانہ چار آنہ تھی۔ گویا تین روپیے سالانہ چندہ تھا۔ ۸ جنوری ۱۸۴۸ء تک مطبوعۂ دارالسلام دہلی میں چھپا اور بعد میں اُردو اخبار دہلی میں چھپنا شروع ہوا۔

مولانا صابری کے ایک اندازے کے مطابق یہ اخبار ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ اس کی قیمت شرح بھی مختلف تھی پیشگی دینے والوں سے مقررہ چندہ لیا جاتا تھا۔ لیکن جو بعد میں ادا کرتے تھے اُن سے زیادہ وصول کیا جاتا تھا۔ جس کی تشریح یکم فروری ۱۸۴۸ء کے فوائدالشائقین کے تتمہ سے ہوتی ہے۔

اس قسم کے لوگ اُس زمانے میں بھی تھے۔ جو کسی مصنف کی کتاب کو بلا اجازت چھاپ دیتے تھے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو قانونی شکنجے میں کسنے کے لئے قانون بنایا گیا تھا۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ اگر مصنف کے انتقال کے بعد کتاب نہیں چھپی ہے اور اس سے عوام استفادہ نہیں کر سکتے ہیں تو ایسی صورت میں کیا قدم اُٹھانا چاہیے یہ تفصیل ۲۴ جنوری ۱۸۴۸ء کے فوایدالشائقین میں بھی طبع ہوئی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عوام تو عوام خواص بھی انگریزی قانون سے بالکل ناواقف تھے۔ یہ اخبار اس سلسلے میں رہنمائی کا کام انجام دیتا تھا۔ جو شخص قانونی نکتہ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ سوال کی شکل میں اخبار کو بھیج دیتا اور یہ اخبار حتی الوسع شافی جواب دے دیتا۔ اس طرح کا ایک سوال جواب ۲۴ جولائی کے پرچہ میں شائع ہوا تھا۔

خیرخواہِ ہند ۱۸۴۷ء

یہ علمی و ادبی ماہنامہ ۱۸۴۷ء کو دہلی سے جاری ہوا۔ پچاس صفحات ہوا کرتے تھے۔ انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو نکلتا تھا اور مطبع "دہلی اُردو اخبار" مکان مولوی محمد باقر میں طبع ہوتا تھا۔ پنڈت موتی لعل پرنٹر، ماسٹر رامچندر دہلوی مہتمم و ایڈیٹر تھے۔ ایک پرچہ کی قیمت ایک روپیہ تھی اور محصول ڈاک بذمۂ خریدار یہ رسالہ مصور تھا۔ ماسٹر رامچندر نے "خیرخواہ ہند" کے جاری کرنے کا اشتہار ۱۲ ستمبر ۱۸۴۷ء کے "فوایدالناظرین" میں

چھپوایا تھا: خیر خواہ ہند پہلا رسالہ ہے جو اُردو زبان میں پروفیسر رام چندر صاحب نے نکالا تھا۔ وہی اس کے مضمون کے لکھنے والے تھے۔

پروفیسر قاسم علی سجن لال وغیرہ کا خیال ہے کہ اس رسالہ کا ایک ہی نمبر ۱۸۴۷ء کا شائع ہوا ہے اور دوسرا نمبر نہیں نکلا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی نظر سے دوسرا نمبر نہیں گزرا اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ فرما دیا۔ حالانکہ اس کا دوسرا نمبر اکتوبر ۱۸۴۷ء کا نکلا ہے جو امداد صابری صاحب کے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب مرحوم و مغفور کے کتب خانہ میں ہے جس کا فوٹو "تاریخ صحافت اُردو" کی جلد اوّل میں شائع ہوا ہے۔ جس میں حسبِ ذیل مضامین شائع ہوئے تھے۔

۱۔ تاریخ ملک اودھ: سعادت علی خاں، نواب صفدر جنگ، نواب شجاع الدولہ، نواب غازی الدین حیدر، محمد علی شاہ، شاہ امجد علی خاں کے حالات صفحہ ۲۴ تک
۲۔ ترتیب اہل ہند کے بیان میں صفحہ ۳۷ تک۔
۳۔ بیان سادھوؤں کے طریقے کا صفحہ ۴۴ تک۔
۴۔ علم ہیئت: بیان ستاروں کا صفحہ ۴۸ تک۔
۵۔ قصیدہ شیخ ابراہیم ذوقؔ صفحہ ۵۰ تک۔

اس شمارہ میں نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ کی تصویریں اور ستاروں کے مضمون میں نقشہ، نظام شمسی، تصویرِ دمدار ستارہ اور ستاروں کے نظام کا نقشہ بھی ہے۔

اُردو زبان کی مقبولیت کا حال آج سے ۱۱۳ سال پہلے کیا تھا۔ اسکی تفصیل ماسٹر رام چندر صاحب کے قلم سے سُنئے جو انہوں نے خیر خواہ ہند کے

نمبر ۲ "ترتیب اہل ہند" والے مضمون میں تحریر کی ہے۔

"سادھوؤں کے طریقے" والے مضمون میں ماسٹر رام چندر صاحب نے اس فرقہ کے موجد کا نام اور ہندوستان کے کس مقام پر یہ لوگ زیادہ رہتے ہیں، بتاتے ہوئے اُن کے عقائد کا ذکر کیا ہے۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ کے قصیدہ کے ۴ بند اس شمارہ میں درج ہیں۔

ماسٹر رام چندر صاحب نے خیر خواہ ہند کے دو نمبر نکالنے کے بعد اس کا نام محبّ ہند کیوں رکھا اس کی وجہ انہوں نے فوائد الناظرین میں بتائی ہے۔

محبّ ہند ۱۸۴۷ء

خیر خواہ ہند کے بجائے "محبّ ہند" نومبر ۱۸۴۷ء سے نکلنا شروع ہوا۔ صفحات پچاس اور قیمت بھی وہی تھی۔ اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ رسالہ دہلی کالج کے پریس مطبع علوم میں چھپنے لگا۔

یہ پرچہ حقیقتاً تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے جامع مفید مستند تاریخی علمی و ادبی و معلوماتی مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ اس کا ہر ایک پرچہ لائبریریوں کی زینت بننے کے لائق ہے اور بعض مضامین تو اس کے نادر اور شاہکار ہیں۔

فروری ۱۸۴۸ء کے اس پرچہ کے شمارہ میں نواب حیدر علی خاں والیٔ میسور اور خانہ کعبہ کے فوٹو ہیں۔ رسالہ محبّ ہند کی ایک کاپی

مقامی کمیٹی کے سیکریٹری سر ٹیلر کو دکھائی جانی ضروری تھی۔ اس کی وجہ
یہ تھی کہ تاریخی مضامین اور خاص طور پر مسلمان بادشاہوں کے حالات
زندگی میں انگریزوں کے منشا اور ان کے خیالات کو پیش نظر رکھا
جاتا تھا۔ انگریز مسلمان بادشاہوں کو بدنام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اسلیے
انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ماسٹر رامچندر اس قسم کے اکثر
مضامین میں یہی رویہ اختیار کرتے تھے۔ لیکن بعض مقامات پر اصل
واقعات و حالات ان کے قلم پر آجاتے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں انگریز ہندوستان کے
کن کن شہروں سے خراج وصول کرتا تھا اور ان کے علاوہ دوسرے ذریعوں سے
کتنا روپیہ حاصل کرتا تھا اور اس کی کل رقم کتنی بنتی تھی، اس کی تفصیل
شمارۂ فروری ۱۸۴۹ء شائع ہوئی ہے۔

رسالہ "محبت ہند" میں نامور و مشہور شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔
فروری ۱۸۴۹ء کے پرچہ میں چھ غزلیں بہادر شاہ ظفر کی شائع ہوئی تھیں۔

عجائب الاخبار ۱۸۴۷ء

یہ اخبار دہلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں وجود میں آیا۔ اس کا ذکر فوائد الناظرین
دہلی یکم جنوری ۱۸۴۸ء میں زیر عنوان "فاصلات" میں ہوا ہے۔

مفید ہند ۱۸۴۸ء

دہلی سے یہ پندرہ روزہ اخبار اپریل ۱۸۴۸ء کو منشی حسینی اور
پنڈت اجودھیا پرشاد کی نگرانی میں جاری ہوا۔ یہ دہلی کالج کا اخبار تھا۔

"فوائد الناظرین" ہی کے طرز کا تھا۔ مطبع علوم میں طباعت ہوتی تھی۔
"قران السعدین" دہلی میں مورخہ ۱۸۴۸ء کو اس کا پہلا اشتہار بلا اخبار
کے نام سے شائع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس کا نام تجویز نہیں ہوگا۔
دوسرا اشتہار "مفید ہند" کا قران السعدین ۱۷ اپریل ۱۸۴۸ء
میں جب چھپا اس وقت اس اخبار کا ایک شمارہ وجود میں آگیا تھا۔
"مفید ہند" کا کوئی مضمون قران السعدین میں نہیں چھپا۔ ظاہر یہ ہوتا
ہے کہ یہ اخبار بہت جلد بند ہوگیا۔

تحفۃ الحدائق ۱۸۴۸ء

دہلی سے یہ اخبار جو مہینہ میں دو بار شائع ہوتا تھا ۸ صفحات پر
مشتمل تھا۔ مہتمم محمد جعفر اور علی نقی تھے۔ بعد میں امیر سید محمد مہتمم مقرر ہوئے۔
ماہانہ چندہ ایک روپیہ تھا اور مطبع علوم میں چھپتا تھا۔ ۱۳ جون ۱۸۴۸ء
کو قران السعدین دہلی میں اس اخبار کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس
میں اس پرچہ کا نام اور دوسری تفصیلات موجود ہیں۔

ضیاء الاخبار ۱۸۴۹ء

یہ اخبار بھی دہلی سے جاری ہوا۔ اس کے مہتمم و ایڈیٹر شیخ محمد ضیاء الدین
صاحب تھے۔ اس اخبار کے جاری ہونے کا اعلان "فوائد الناظرین" میں ہوا تھا۔

رفیق الاخبار ۱۸۵۵ء

دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار ۵ دسمبر ۱۸۵۵ء کو جاری ہوا۔ اس کے

ایڈیٹر پرایا داس تھے۔ مطبع زبدۃ الاخبار میں طباعت ہوتی تھی۔ گارساں دتاسی نے اس کو ہندوؤں کا اخبار قرار دیا ہے۔

وحید الاخبار ۱۸۵۲ء

دہلی چھتہ موم گراں سے یہ ہفتہ وار اخبار یکم جنوری ۱۸۵۲ء کو نمودار ہوا۔ مالک پیر خاں اور کاتب پنڈت شری کرشن تھے۔

نورِ مغربی ۱۸۵۳ء

دہلی سے یہ اخبار ۱۸۵۳ء کو رونق افروز ہوا۔ اس کے ایڈیٹر بلدیو سنگھ تھے۔ انڈین اسٹنڈرڈ پریس میں طبع ہوتا تھا۔ اس میں روزمرہ کی مقامی و بیرونی خبریں زیادہ چھپتی تھیں۔ اس کا مقصد اہلِ ملک کے لیے مفید معلومات کی اشاعت کرنا اور ان کو حبِ بنی نوع انسان کے خیالات اور اصول سے باخبر رکھنا تھا۔

نورِ مشرق ۱۸۵۳ء

دہلی سے ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا۔ سید امیر علی ایڈیٹر تھے۔ ماہانہ چندہ چار آنہ تھا۔ مطبع نورِ مشرق میں چھپائی ہوتی تھی۔ مفید معلومات کی اشاعت اس اخبار کا مقصد تھا۔ اس میں دہلی کی مقامی خبریں زیادہ ہوتی تھیں۔ بہادر شاہ کی صحت کا حال اور ان کے معمولات کا پابندی سے ذکر کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کا کلام اور خاص طور پر بہادر شاہ ظفر کی

غزلیں چھپتی تھیں۔ لال قلعہ کے دربار کی ریشہ دوانیاں اور بازاروں کے جھگڑوں کے متعلق سنسنی خیز خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ملکی اور غیر ملکی خبریں بھی درج ہوتی تھیں۔ نورِ مشرق اپنے ہمعصر نورِ مغربی کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ نورِ مشرق مذہبی اعتبار سے خصوصاً شیعہ خیالات کا اور اس کا موید و مبلغ تھا۔ یہ اخبار شیعہ حضرات چلاتے تھے جو سنیوں کے خیالات و عقاید پر نکتہ چینی کرتا تھا۔

صادق الاخبار ۱۸۵۳ء

یہ اخبار بھی ۱۸۵۳ء کو دہلی سے جاری ہوا۔ مہتمم مصطفےٰ خاں تھے۔ دتاسی اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

"صادق الاخبار" جسے مصطفےٰ خاں، مصطفائی پریس کے مینیجر نکالتے ہیں۔ یہ پریس پہلے لکھنؤ میں تھا۔ لیکن چند خاص وجوہ کی بنا پر یہ کارخانہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد مصطفےٰ خاں نے اس کی دو نئی شاخیں ایک کانپور اور دوسری دہلی میں قائم کیں۔ یہ پرچہ دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اسی نام کا دوسرا اخبار فارسی زبان میں شائع ہوتا ہے۔"

صادق الاخبار ۱۸۵۴ء

جمیل پورہ عرف چوڑی والاں دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۵۴ء کو جاری ہوا۔ ہر دوشنبہ کو کبھی آٹھ اور کبھی چار صفحات پر جمیل المطابع دہلی میں سے شائع ہوتا تھا۔ مالک و مہتمم سید جمیل الدین ہجر تھے۔ ماہانہ

ایک روپیہ ششماہی پانچ روپے اور سالانہ چندہ نو روپے تھا۔

اس میں رفاہ عام کے لئے بلا اجرت مضمون چھپتا تھا اور کوئی شخص مضمون چھپواتا تو اس کو دو آنے فی لائن دینے پڑتے تھے۔ یہ اخبار اپنے دور کے اچھے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں ملکی اور غیر ملکی خبریں شائع ہوتی تھیں اور سنجیدہ و متین مضامین بھی چھپتے تھے۔ اس کا ایڈیٹر و مالک خود دار انسان تھا۔ ملک اور قوم سے اس کو محبت تھی ظلم و بے انصافی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس اخبار اور ایڈیٹر نے بھی جنگ آزادی کو کامیاب بنانے کی سعی کی اور قلم کے جوہر دکھائے جس کی پاداش میں اس کو اسیر فرنگ بننا پڑا۔ یہ اخبار بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی نذر ہوا اور آزادی کی تحریک کی ناکامی کے بعد بند ہو گیا۔

صادق الاخبار ۱۸۵۵ء

اختر شہنشاہی میں ہے کہ دسمبر ۱۸۵۵ء کو دہلی سے "صادق الاخبار" ظہور پذیر ہوا۔ جس کے مالک سید محمد صادق مرحوم تھے۔

صادق الاخبار ۱۸۵۶ء

یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۵۶ء کو متصل تھانہ بھوجلا پہاڑی دہلی سے مہتمم سید عبدالقادر اور منتظم شیخ خدا بخش صاحب کی نگرانی میں مطبع قادری سے ہر پنجشنبہ کو آٹھ صفحات پر نکلتا تھا۔ ماہانہ چندہ ایک روپیہ پیشگی پانچ روپیہ ششماہی اور نو روپیہ سالانہ تھا۔ اس کے سرورق پہ

"ھوالقادر" اور شیخ خدا بخش صاحب ہفتاد سال منصرم کا اخبار لکھا جاتا تھا۔

انگریز دوسرے ملک میں کس طرح اس ملک کا لباس بدل کر اس کے رہنے والوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے کیا کیا جتن کرتے تھے۔ اس کا اندازہ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۸۵۵ء کے پرچہ "صادق الاخبار" سے ہو سکتا ہے۔

جس طرح آج کل پولس والوں کو رات کے وقت سیٹیاں دی جاتی ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کو جو فاصلہ پر ہوتے اطلاع دیتے رہتے ہیں اسی طرح ۱۸۵۷ء میں چوکیداروں کو دہلی میں ٹیٹریاں دی گئی تھیں۔ یہ خبر بھی اس اخبار کی زینت بنی تھی۔

اسد الاخبار ۱۸۵۷ء

دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار اپریل ۱۸۵۷ء میں ظہور پذیر ہوا۔ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ مہتمم و ایڈیٹر میر حیدر علی صاحب تھے۔ ماہانہ چندہ آٹھ آنے تھا۔ مطبع حیدری میں طبع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے جاری ہونے کا اشتہار صادق الاخبار دہلی ۲ اپریل ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔

۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۵ء تک

احسن الاخبار ۱۸۶۲ء

۱۷ ستمبر ۱۸۶۲ء کو بانس بریلی محلہ درزی چوک سے یہ ہفتہ وار اخبار

جاری ہوا۔ جمعہ کے روز آٹھ صفحات پر نکلتا تھا۔ مولوی محمد احسن صاحب اس کے مالک و مدیر تھے۔ سالانہ چندہ نو روپیے تھا۔ مطبع مدنی میں چھپتا تھا۔

اکمل الاخبار ۱۸۶۷ء

یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو محلہ بلی ماراں دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار اکمل المطابع سے ہر چہار شنبہ نکلتا تھا۔ اس اخبار کے سرورق کے اشتہار سے اس کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"اکمل الاخبار کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حکیم غلام رضا خاں صاحب حکیم غلام نبی حکیم محمود خاں اور میر فخرالدین کے درمیان میں بہت گہرے تعلقات تھے آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ ایک اخبار نکالا جائے جس کے لیے پریس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اپنے جد امجد حکیم شریف خاں صاحب کے والد ماجد اکمل خاں کے نام پر اخبار جاری کیا جائے اور پریس کھولا جائے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں پریس اور اخبار شروع کیے گئے۔ مطبع اور اخبار کے کرتا دھرتا مہتمم میر فخرالدین صاحب اور نگراں باقی حضرات مقرر ہوئے

اس پریس سے زیادہ تر شریفی خاندان کی طبی مستند کتابیں چھاپی گئیں۔ شریفی خاندان کی مشہور و نایاب کتاب 'علاج الامراض' اسی پریس میں چھپی۔ اس اخبار کے اجرا کا اعلان کرنے والے مرزا غالب تھے، چنانچہ اس قسم کا پہلا مراسلہ انہوں نے اپنے دوست مولوی سیف الحق سیاح کے نام لکھا تھا۔

اس اخبار میں مرزا غالب کے بھی مضامین چھپتے تھے اور انہوں نے

اپنا مفصل حال چھپوایا تھا۔ برہان قاطع کے قضیہ میں جو اعتراضات و جوابات کا سلسلہ چلا اس میں اکمل الاخبار مرزا غالب کا حامی تھا۔ وہ مرزا یا مرزا غالب کے حامیوں کے جوابات و اعتراضات شائع کرتا تھا۔

بقول علامہ کیفی آنجہانی یہ اخبار اپنے وقت کے نہایت ثقہ اخبار وں میں تھا۔ اس میں جہاں ہندوستان بھر کی خبریں شائع ہوتی تھیں وہاں دہلی کی خبریں زیادہ اہتمام سے چھپتی تھیں۔ دہلی کی جماعتوں، سوسائٹیوں، سکولوں، کالجوں کی روئداد اور شخصیتوں کے حالات پر خاص طور سے نظر رکھی جاتی تھی۔ اور ان کو خاص جگہ دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ دہلی کی میونسپل کمیٹی کی ہفتہ واری میٹنگوں کی کارروائی تک شائع ہوتی تھی۔ شریفی خاندان میں خودداری اور خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ اخبار انہیں رجحانات کی ترجمانی کرتا تھا۔ نڈر اور بے باک تھا۔ سچی بات کہنے سے نہیں چوکتا تھا۔

اکمل الاخبار میں شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ محبوب، معشوق و مطلوب سے گلے شکوے اور شکایتوں سے بھری غزلیں اس میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن محبوبہ کے مقتول ہونے کے بعد وہ بھی طوائف اس کی تعریف و توصیف میں کسی اخبار یا شاعر کو رطب اللسان ہوتے نہیں دیکھا۔ مگر اکمل الاخبار اپنے دور کی سوسائٹی کی اصلی تصویر دکھانے سے نہیں چوکا۔

چراغ دہلی ۱۸۶۷ء

فروری ۱۸۶۷ء کو دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ ہفتہ کے روز شائع ہوتا تھا۔ سالانہ چندہ نو روپیے، ششماہی مع محصول ۵ روپیے۔

ماہانہ مع محصول ۱۲؍ آنے تھا۔ دہلی پریس میں چھپتا تھا۔ سردار زین سنگھ اس پریس کے مالک اور اخبار کے مہتمم تھے۔ اس اخبار کا کاتب گنگا پرشاد تھا۔ ٹائٹل پیج پر اخبار کے نام پر "باہو" لکھا ہوا ہے۔

۲۶ مئی ۱۸۶۶ء کے شمارہ میں پادری عمادالدین کے پادری ہونے کی خبر ہے۔ ۱۱ اگست ۱۸۶۶ء کے اخبار میں ایک شہزادی کے چوری کے الزام میں سزا یاب ہونے کا ذکر ہے۔

۱۶ اکتوبر ۱۸۶۷ء میں "قاطع القاطع" کتاب کا اشتہار شائع ہوا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس پر مرزا غالبؔ نے اس کے مصنف پر ہتک عزت کا دعویٰ کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ "چراغِ دہلی" کا مہتمم مرزا غالب کے مخالفوں میں سے ہے۔ چنانچہ اشتہار کا مضمون بھی یہی بتاتا ہے کہ مہتمم صاحب مولوی امین الدین مصنفِ "قاطع القاطع" کے حامیوں میں سے تھے۔

اس اخبار میں شاعروں کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ لیکن غزلوں کے ساتھ یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ مشاعرہ کہاں ہوا کس نے کرایا اور کس تاریخ کو ہوا۔ ۸ جنوری ۱۸۶۷ء کی اشاعت میں اس طرح کے مشاعرہ کی غزلیں شائع ہوئی تھیں۔

اُردو اخبار ۱۸۶۷ء

دہلی محلہ چاندنی چوک کوچہ نٹواں متصل عجائب خانہ سے ۱۸۶۷ء کو یہ ہفتہ وار اخبار شائع ہونے لگا۔ ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ ۱۲ صفحات تھے۔ سالانہ چندہ ۱۲ روپے تھا۔ اس کے مالک خواجہ قمرالدین اور مہتمم سید حسن جہاں تھے۔

یہ پرچہ "مطبع بدرالدجیٰ" میں چھپتا تھا۔

ضیاءالاخبار

یہ عشرہ وار اخبار آٹھ صفحوں پر دہلی کوچہ چیلان منشی ذکاءاللہ خاں بہادر پروفیسر کے مکان سے جمعہ کے روز سے نکلنا شروع ہوا۔ سالانہ چندہ گیارہ روپے چار آنے تھا۔ مالک مرتضیٰ خاں وردی میجر مہتمم مرتضیٰ خاں ایڈیٹر حاجی عزیزالدین صاحب نقرؔ اور کاتب منشی فیض الحسن تھے۔ طباعت مطبع مرتضوی میں ہوتی تھی۔

رسالۂ دہلی سوسائٹی ۱۸۶۷ء

دہلی سوسائٹی جو ایک علمی و ادبی سوسائٹی تھی ۱۸۶۵ء میں دہلی میں قائم ہوئی یہ سوسائٹی ماسٹر پیارے لال آشوب کی کوششوں کی مرہونِ منت تھی۔ اس سوسائٹی کی باقاعدہ میٹنگیں ہوتی تھیں۔ جس کی روداد کو شائع کرنے کے لئے رسالہ کی ضرورت سمجھی گئی۔ چنانچہ اس رسالہ کا پہلا پرچہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس رسالہ کی ضخامت ۶۴ صفحے کی ہوتی تھی۔ لیکن اس میں کمی و بیشی بھی ہوتی۔ اس سوسائٹی کی میٹنگ میں شامل ہونیوالے اور اس میں مضامین پڑھنے والے دہلی کے مقتدر اور اہلِ علم حضرات تھے۔ جن میں چند کے نام یہ ہیں:۔ مرزا غالبؔ، منشی ذکاءاللہ، ماسٹر رامچندر، مولانا حالیؔ، حکیم غلام رضا خاں صاحب دہلوی، میر نصرت علی ایڈیٹر نصرت الاخبار دہلی، میر قاسم علی آنریری مجسٹریٹ، ماسٹر پیارے لال، منشی سُندر لعل،

پادری کروفٹ کرنل ینگ کمشنر دہلی، وغیرہ۔ اِس سوسائٹی میں جو مضمون
پڑھے جاتے تھے اور رسالہ میں شائع ہوتے تھے وہ عالمانہ، تاریخی، پُر از
معلومات اور حالاتِ حاضرہ کے متعلق ہوتے تھے۔

اشرف الاخبار :—

اخترِ شہنشاہی میں ہے کہ اشرف الاخبار ۱۸۷۵ء میں کوچہ چیلاں
فیض بازار سے جاری ہوا۔ جس کے مالک ریاض الدولہ بہادر محمد مرزا خاں ولد
فخر الدولہ حافظ مرزا خاں اور ایڈیٹر امراؤ خاں تھے۔ اِس کے صفحات کی
تعداد آٹھ تھی اور سالانہ چندہ بارہ روپے تھا۔

اشرف الاخبار کا سالِ اجرا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مرزا غالب نے
بارہ فروری ۱۸۶۷ء مطابق ۷ رشوال ۱۲۸۳ھ کے خط بنام مولوی سیف الحق
ادیب میں لکھا ہے۔ "ایک نئی بات سنو۔ محمد مرزا خاں میرے حلبی بھائی کا
نواسہ ہے اس نے ایک اخبار نکالا ہے جس کا نام اشرف الاخبار ہے۔ اُس کا
ایک لفافہ بھیج رہا ہوں۔"

اخترِ شہنشاہی کی اس پرچہ سے مطلق اطلاع اس کے دوبارہ شائع
ہونے کی ہے اس اخبار میں مرزا غالب کے مفصل حالات طبع ہوئے تھے۔ اِس
اخبار کے بارے میں گارساں دتاسی کی رائے حسب ذیل ہے :

"اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے دہلی کے بہترین اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔
اس کے مالک اور مدیر محمد مرزا خاں ہیں جو اپنی انشا پردازی، تاریخ دانی
اور رواداری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اِن کا قلم منجھا ہوا اور رائے پختہ تلی ہے۔"

خیر المواعظ

یہ اخبار کس سنہ میں شائع ہونا شروع ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ
گارساں دتاسی کے ۱۸۶۹ء کے خطبہ کے تذکرہ سے ہم یہ اندازہ کر سکتے
ہیں کہ شاید اسی دوران میں یہ چھپتا ہوگا۔ اِس کے صفحات کی تعداد آٹھ
ہے۔ اِس اخبار کا مقصد اسلام کی نشر و اشاعت اور مسیحی تعلیم کا رد تھا۔
ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کے مکر و فریب سے آگاہ کرنا اس کا مقصد
ہوگا۔ اور عیسائیوں کے ایک اخبار جس کا نام "مواعظِ عقبیٰ" تھا، کے جواب
میں نکالا گیا تھا۔ یہ اخبار کچھ دن چلنے کے بعد دوبارہ ۱۸۷۲ء میں جاری ہوا۔

انجمن مناظرہ ۱۸۷۱ء

دہلی محلہ تہرا بابہرام خاں گذر فیض بازار مئی ۱۸۷۱ء کو یہ اخبار جاری
ہوا۔ اِس کا سالانہ چندہ ۲ روپے تھا۔ سیکریٹری نظیر علی اور معاون سیکریٹری
سید میر نصیر علی تھے۔ پہلا پرچہ مطبع محمدی میں چھپا تھا۔ اِس کے اور پرچے
مطبع مجتبائی میں چھپنے شروع ہوئے۔ پہلا پرچہ من ابتدا رمئی لغایت
جولائی ۱۸۷۱ء کا تھا۔ اِس رسالہ کے ٹائٹل پیج پر یہ شعر درج ہے ؎

حکمت طلب و بزرگی آموز ؎ تا بہ نگرند روزت از روز

رہبر ۱۸۷۱ء

"رہبر" اخبار ماہانہ بھوجلا پہاڑی دہلی سے مولوی عبدالرحیم صاحب کی

ادارت میں ۱۸۷۱ء کو جاری ہوا۔

میو گزٹ ۱۸۷۲ء

انجمن مناظرہ کی طرف سے یہ اخبار عشرہ وار جنوری ۱۸۷۲ء کو ظہور میں آیا تھا ۵، ۱۰، ۲۵ تاریخوں میں شائع ہوتا تھا۔ یہ یادگار لارڈ سابق وائسرائے گورنر جنرل ہند جاری ہوا تھا۔ سالانہ چندہ روسا سے ۶ روپے ۸ آنے اور عام لوگوں سے ۴ روپیہ ۸ آنے لیا جاتا تھا۔ ایڈیٹر و مہتمم سید نصیر علی پرنٹر عبدالرزاق بیگ تھے۔ مطبع مجتبائی میں چھپا ہوا تھا۔ ۸ صفحوں پر مشتمل تھا۔ دہلی سے جاری ہوا۔

خیرخواہِ عالم ۱۸۷۲ء

دہلی محلہ بلبلی خاں مکان میر نواب ایجنٹ کمشنریٹ سے ۱۸۷۲ء کو یہ اخبار جلوہ گر ہوا۔ مہینہ میں ۳ بار ۵، ۱۵ اور ۲۵ تاریخ کو نکلتا تھا۔ عام چندہ ۵ روپے ۱۰ آنے تھا۔

یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے چوتھے روز چار صفحوں پر نکلنے لگا۔ سالانہ تین روپے چندہ ہوا۔ مالک سید میر حسین رضوی ایڈیٹر شہزادہ عبدالغنی تھے مطبع رضوی میں چھپتا تھا۔

ریاستوں کے بارے میں آزادانہ مضمون شائع ہوتے تھے۔ پبلک اور گورنمنٹ کو اس اخبار سے بہت مدد ملتی تھی۔ خصوصاً ریاست جے پور میں تو اخبار حرزِ جان و مال سمجھا جاتا تھا۔ اس ریاست کو اس سے پوری مدد

ملتی تھی۔ اس کی تحریر پر وہاں عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ اس دور میں اگر ریاستوں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی تو وہاں کے وقائع نگاروں پر سنگین مقدمات دائر کیے جاتے تھے اور جو اخبار جس ریاست کی مخالفت کرتا اس کو اس ریاست میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس اخبار نے ریاست جے پور میں جو بدعنوانیاں تھیں اُن کی کم و بیش اصلاح کرا دی تھی۔ وہاں اس کی تحریر دستور العمل سمجھی جاتی تھی۔

۱۸۷۶ء میں عیسائیوں کا اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب خاص طور پر مسلمانوں سے شاہجہاں پور میں مناظرہ ہوا۔ اس میں ہر ایک مذہب کے رہنما' علماء' پنڈت اور پادری شامل ہوئے "میلہ خدا شناسی" اس مناظرہ کا نام رکھا گیا تھا۔ یہ مناظرہ چونکہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے خیرخواہ عالم مورخہ ۱۹ مئی ۱۸۷۶ء میں اس مناظرہ کی روداد چھپی ہے۔

اس اخبار میں نظم کا حصہ کم نظر آتا ہے۔ ۸ نومبر ۱۸۹۰ء میں ایک غزل مرزا داغ دہلوی کی اور ایک قصیدہ سلطان خاں صاحب سلیم دہلوی کا جو انہوں نے راجندر سنگھ والئی ریاست پٹیالہ کو اختیارات ملنے کی خوشی میں کہا تھا درج ہے۔

۱۹۱۰ء تک یہ اخبار جاری رہا لیکن اس زمانہ میں اسے شمالِ پنچ' اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا۔ سالانہ چندہ ۶ روپے تھا اور اس کے مالک میر حسن صاحب ہی تھے۔

ناصر الاخبار ۱۸۷۳ء

"ناصر الاخبار" دہلی کوچہ مداری' دریچہ فراش خانہ سے یکم جنوری

۱۸۷۳ء کو جاری ہوا۔ عشرہ وار ۲۰ صفحات پر نکلتا تھا۔ بقول صاحب اختر شہنشاہی یہ اخبار محض اپنے خریداروں اور معاونین کی قدردانی کی وجہ سے چلتا تھا۔ کبھی کسی ریاست میں اس کا ایڈیٹر نہیں گیا۔ حریت آزادانہ بے لاگ و بلا رعایت ڈنکے کی چوٹ پر ہر ایک معاملہ میں اس کے مضامین طبع ہوتے تھے۔ ہر ایک دیار و امصار میں اس اخبار کو وقعت حاصل ہے۔ اس کے ٹائیٹل پیج پر جامع مسجد کے دروازہ کا نقشہ دیا گیا ہے۔

مضامین و خبروں کے ساتھ ساتھ کبھی غزلیں اور نظمیں بھی شائع کی جاتی تھیں اور کتابوں وغیرہ کی تاریخیں درج کی جاتی تھیں۔ خاص طور پر اگر کسی وزیر یا شہزادہ کی آمد ہوتی تو بڑی بڑی نظمیں شائع ہوتیں اور صفحات بھر دیے جاتے تھے

سید الاخبار ۱۸۷۳ء

دہلی بازار شیا محل مکانِ مفتی صدرالدین سے ۱۸۷۳ء کو یہ اخبار جاری ہوا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۶ تھی۔ پہلے کالم میں انگریزی دوسرے میں اردو اور تیسرے میں ہندی ہوتی تھی تین زبانوں کا اخبار تھا سالانہ چندہ بارہ روپیہ تھا۔ مالک منشی مرادی لال مہتمم وزیر علی صاحب مطبع مرادی میں چھپتا تھا۔

میو میموریل گزٹ ۱۸۷۳ء

دہلی محلہ ترا ہا بہرام خاں مکانِ نواب دبیر الدولہ خواجہ فریدالدین خاں

مرحوم سے ۱۸۷۳ء کو انجمن رفاہ رعایائے دہلی نے شائع کرایا۔ یکم ۱۱ اور ۲۱ تاریخ کو آٹھ صفحوں پر یہ اخبار نکلتا تھا۔ چندہ سالانہ والیان ریاست سے ۱۲ روپے اور عام خریداروں سے چار روپے ۴ آنہ تھا۔ مہتمم خواجہ احمد خاں' مرادی سیکرٹری انجمن تھے۔ مطبع مجتبائی میں طباعت ہوتی تھی۔

ناصر الاسلام ۱۸۷۳ء

۱۸۷۳ء میں دہلی سے مہینہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ بارہ روپے تھا۔ یہ اخبار تائید مذہب حق کے واسطے جاری کیا گیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر و منیجر مولوی سید نصرت علی خاں آبجر تھے۔ مطبع نصرت المطابع' میں طباعت ہوتی تھی۔

سفیر ہند ۱۸۷۴ء

محلہ چیل پہاڑیا اندرونِ چھتہ صوفی جی سے جنوری ۱۸۷۴ء کو یہ اخبار جاری ہوا۔ ۸ صفحات پر نکلتا تھا۔ سالانہ چندہ نوابوں سے ۲۴ روپے رئیسوں سے بارہ روپے اور عوام سے ۶ روپے تھا۔ مہتمم منشی بلاقی داس اور ذاکر بیگ تھے۔ رجسٹر نمبر ۳۶ تھا۔ میو پریس میں چھپتا تھا۔

افتخار الاخبار ۱۸۷۵ء

کوچہ چیلاں سے ۱۸۷۵ء کو ۸ صفحات پر جاری ہوا تھا۔ سالانہ چندہ گورنمنٹ انگلشیہ وغیرہ سے ۲۴ روپے' رؤساء سے ۱۰ روپے'

عوام سے ۳ روپے تھا۔ محصول ۱۲ آنے۔ مالک سردار مرزا صاحب تھے۔ سردار المطابع میں چھپتا تھا۔

خیر خواہِ ہند ۱۸۷۵ء

محلہ پیپل مہادیو اندرونِ چھتہ صوفی جی ڈاک خانہ حوض قاضی سے ۱۸۷۵ء کو یہ اخبار نمودار ہوا۔ اس کے آٹھ صفحے ہوتے تھے۔ سالانہ چندہ تین روپے۔ مالک لالہ مہاراکشن تھے۔ مطبع چشمۂ فیض میں طبع ہوتا تھا۔

۱۸۷۶ء سے ۱۸۹۵ء تک

لٹن گزٹ ۱۸۷۶ء

محلہ پیپل مہادیو چھتہ صوفی جی سے ۱۸۷۶ء سے یہ پندرہ روزہ اخبار جاری ہوا۔ مہتمم منشی بلاقی داس تھے۔ بعد میں اس کے ایڈیٹر بابو گنیش لال مقرر ہوئے۔ ۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ ۶ روپے تھا۔ مطبع میور پریس میں چھپتا تھا۔

ضیاء الاسلام ۱۸۷۷ء

یہ اخبار متصل بلبلی خانہ سے ۱۸۷۷ء میں آٹھ صفحات پر جاری ہوا۔ مالک سید میر حسن رضوی ایڈیٹر شاہزادہ مرزا عبدالغنی ارشد تھے۔ سالانہ چندہ ۳ روپے۔ مطبع رضوی میں چھپتا تھا۔

ہندوستانی اُردو لغات ۱۸۸۲ء

دہلی ترکمان دروازہ حویلی نواب مظفر خاں سے یہ ماہانہ رسالہ ۲۴ صفحات پر یکم نومبر ۱۸۸۲ء کو شائع ہوا۔ مالک و ایڈیٹر منشی سید احمد دہلوی مدرسِ فارسی دہلی ضلع اسکول تھے۔ اس میں اُردو کی بالاقساط ڈکشنری شائع ہوتی تھی۔

ریختہ ۱۸۸۲ء

یہ بھی محلہ پیپل مہادیو حوض قاضی سے ۸ صفحات پر ۱۸۸۲ء کو نمودار ہوا۔ ۸ اور ۲۴ تاریخوں کو نکلتا تھا۔ مالک منشی مہا نارائن تھے۔ اس کا چندہ سالانہ ۳ روپے تھا۔ مطبع مہا کاشی عرف چشمۂ فیض میں طباعت ہوتی تھی۔

شاعرہ ۱۸۸۳ء

خمرۂ سخن کا یہ ماہانہ رسالہ متصل کلاں محل چھتہ حکیم آغا جان سے ۴۴ صفحات پر مشتمل یکم جنوری ۱۸۸۳ء کو جلوہ گر ہوا۔ اس کے مہتمم مرزا یعقوب بیگ عاقل تھے۔ اس کا سالانہ چندہ ۳ روپے ۱۲ آنے تھا اور محمود المطابع میں لکھائی اور چھپائی ہوتی تھی۔

اندر پرست پرکاش ۱۸۸۳ء

دہلی نہر سعادت خاں سے یہ ہفتہ وار اخبار یکم جون ۱۸۸۳ء کو شائع ہوا۔ اُردو ہندی میں نکلتا تھا۔ مالک پنڈت جینی پرشاد مہتمم پنڈت اودو دت تھے۔ سالانہ چندہ ڈھائی روپیہ تھا۔

حامیِ اسلام ۱۸۸۳ء

دہلی کوچہ رحمان سے یہ عشرہ وار اخبار ۱۰ جون ۱۸۸۳ء کو جاری ہوا۔ آٹھ صفحات پر ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔ مالک فیض الحسن، مہتمم مولوی عبدالحق، ایڈیٹر عبدالوہاب تھے۔ سالانہ چندہ سات روپے تھا۔

سلام ۱۸۸۴ء

دہلی درگاہ نظام الدین، ڈاک خانہ عرب سرائے سے یہ شعر و سخن کا ماہانہ رسالہ ۲۴ جنوری ۱۸۸۴ء کو نمودار ہوا۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ مالک امیر سنگھ تھے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

جادۃ الحق ۱۸۸۴ء

دہلی بازار چاندنی چوک کوچہ قابل عطار سے یکم مئی ۱۸۸۴ء کو یہ ماہانہ رسالہ جاری ہوا۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ انجمن انصاریہ کا آرگن تھا۔ مہتمم سید منور علی تھے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

ایڈورڈ ٹائمز ۱۸۸۴ء

دہلی محلہ بھوجلہ پہاڑی سے یہ پندرہ روزہ اخبار یکم جون ۱۸۸۴ء کو ظہور میں آیا۔ یہ ایڈورڈ ٹائمز کمیٹی دہلی کا آرگن تھا۔ مطبع ہندی میں طباعت ہوتی تھی۔

قانون معاہدہ کا رسالہ ۱۸۸۴ء

دہلی محلہ چاوڑی بازار سے یکم جولائی ۱۸۸۴ء کو یہ ماہانہ رسالہ نکلا۔ مالک مہتاب رائے وکیل تھے۔ یہ رسالہ قانونی تھا۔ سالانہ چندہ چھ روپے تھا۔

قانون معاہدہ کا رسالہ ۱۸۸۴ء

دہلی محلہ چاوڑی بازار سے یکم جولائی ۱۸۸۴ء کو یہ ماہانہ رسالہ نکلا۔ مالک مہتاب رائے وکیل تھے۔ یہ رسالہ قانونی تھا۔ سالانہ چندہ چھ روپے تھا۔

اخبار النساء ۱۸۸۴ء

دہلی ترکمان گیٹ، حویلی نواب مظفر خاں سے یکم اگست ۱۸۸۴ء کو یہ عشرہ وار اخبار آٹھ صفحات پر شائع ہوا۔ مالک منشی سید احمد صاحب مدرس فارسی، دہلی ضلع اسکول تھے۔ سالانہ چندہ چھ روپے تھا۔ مطبع ارمغان میں طباعت ہوتی تھی۔

اس اخبار میں خانہ داری کے متعلق معلومات دی جاتی تھیں اور خاص طور پر ایسے مضامین شائع کیے جاتے تھے جن میں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی جاتی تھی اور بتایا جاتا تھا کہ وہ حیا اور شرافت کو نہ چھوڑیں اور خانگی جھگڑوں سے بچیں۔ اس اخبار میں عورتوں کے مضامین بھی ہوتے تھے۔ یہ اخبار کئی برس تک دھوم دھام سے جاری رہ کر بند ہو گیا۔

مفید ہند ۱۸۸۴ء

دہلی کوچہ بلاقی بیگم سے یکم نومبر ۱۸۸۴ء کو یہ ماہانہ رسالہ ۱۶ صفحات پر جاری ہوا۔ مالک امیر سنگھ ساکنہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء تھے۔ سالانہ چندہ سوا تین روپے تھا۔ آئینہ ہند پریس میں چھپائی ہوتی تھی۔

افسانۂ ایام ۱۸۸۵ء

دہلی دریچہ نوازش خانہ، کوچہ میر مداری سے یہ ماہانہ انشاء پردازی کا رسالہ یکم جولائی

۱۸۸۴ء کو شائع ہوا۔ ۲۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ مالک مولوی نصرت علی خاں مدیر تھے۔ سالانہ چندہ دس روپیے تھا۔ نصرت المطابع میں چھپتا تھا۔

جادو ۱۸۸۵ء دہلی محلہ تیراہا بیرام خاں سے یہ ماہانہ شعر و سخن کا رسالہ یکم جنوری ۱۸۸۵ء کو شائع ہوا۔ بارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ مالک رکن الدین صاحب جادوؔ، مہتمم سید بدیع الزماں صاحب شیرکوٹی تھے۔ ہر پنجشنبہ کو نکلتا تھا۔ مطبع مجتبائی میں چھپائی ہوتی تھی۔

دربار اکبری ۱۸۸۵ء دہلی محلہ چاندنی چوک سے یہ عشرہ وار اخبار یکم فروری ۱۸۸۵ء کو جاری ہوا۔ مالک افضل خاں تھے۔ ۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ ۴ روپیے تھا۔ افضل المطابع میں طبع ہوتا تھا۔

ظریف ہند ۱۸۸۵ء دہلی چاندنی چوک کوچہ قابل عطار سے یکم مارچ ۱۸۸۵ء کو یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ ۸ صفحات پر ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔ مالک و ایڈیٹر افضل خاں دہلوی تھے۔ سالانہ چندہ سوا روپیہ تھا۔ افضل المطابع میں طباعت ہوتی تھی۔

صحیفہ قدسی ۱۸۸۵ء دہلی متصل گلی امام عقب مسجد مولوی محبوب علی، چھتہ شیخ منگلو سے یہ ہفتہ وار اخبار یکم مارچ ۱۸۸۵ء کو شائع ہوا۔ ۱۲ صفحات پر ہر پنجشنبہ کو نکلتا تھا۔ مالک مولوی عبد القدوس صاحب مہتمم منشی غلام حسین صاحب تھے۔ سالانہ چندہ نو روپیے تھا۔

بمبیر ۱۸۸۵ء : — دہلی محلہ چاندنی چوک کوچہ قابل عطار سے

مارچ ۱۸۸۵ء کو یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ ۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔ مالک افضل خاں تھے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ تھا۔ افضل المطابع میں طبع ہوتا تھا۔

مشتہر ۱۸۸۶ء دہلی بھوجلہ پہاڑی سے یہ پندرہ روزہ اخبار جنوری ۱۸۸۶ء کو نمودار ہوا۔ ۸ صفحات پر مشتمل تھا مطبع رضوی میں طباعت ہوتی تھی۔ اس میں ہر قسم کے تجارتی اشتہارات اور بیوہ عورتوں کی شادی کے اشتہارات شائع ہوتے تھے۔

گلدستۂ کلام ۱۸۸۶ء دہلی بستی حضرت نظام الدین سے یہ شعر و شاعری کا ماہانہ گلدستہ یکم اپریل ۱۸۸۶ء کو وجود میں آیا۔ مالک منشی امیر سنگھ تھے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

دہلی گائڈ ۱۸۸۶ء دہلی بستی حضرت نظام الدین سے یہ شعر و شاعری کا ماہانہ گلدستہ یکم اپریل ۱۸۸۶ء کو وجود میں آیا۔ مالک منشی امیر سنگھ تھے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

دہلی گائڈ ۱۸۸۶ء دہلی بازار چتلی قبر سے یہ عشرہ وار اخبار ۱۸۸۶ء کو شائع ہوا۔ سالانہ چندہ ۴ روپیہ تھا مالک و ایڈیٹر نواب مرزا صاحب دہلوی، سجادہ نشین درگاہ حضرت میر محمدی قبر دہلی تھے۔ اس کا پہلا نام "رہنمائے ہند" تھا۔ اس کے نام کی تبدیلی کی وجہ یہ ہوئی کہ نواب مرزا صاحب لال قلعہ کے چاندماری کے میدان میں کھڑے تھے۔ ڈپٹی کمشنر دہلی اور اس کے عملے کے دو تین آدمی بھی

اس میدان میں موجود تھے کہ وہاں ایک دھوبن آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کو ہٹانے کے لئے ڈپٹی کمشنر نے اپنے جوتے کے ٹھوکرے سے اُسے مارا۔ وہ حاملہ تھی اس ضرب کو برداشت نہیں کر سکی اور مر گئی۔ اُس کی لاش خاموشی کے ساتھ لاپتہ کر دی گئی۔ رہنمائے ہند میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ ڈپٹی کمشنر نے اس اخبار کو نوٹس دیا۔ دعویٰ دائر ہوا مجسٹریٹ کے ہاں پیشی ہوئی۔ مرزا جی دبے نہیں۔ جب عدالت نے پوچھا۔ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ دھوبن کو ڈپٹی کمشنر نے مارا ہے؟ اُنہوں نے کہا میرے پاس اس کا مکمل ثبوت و شہادت موجود ہے۔ آخر باہمی سمجھوتہ ہو گیا اور یہ طے پایا کہ آپ اپنے اخبار کا نام بدل دیں۔ اُس وقت سے رہنمائے ہند کا نام "دہلی گائڈ" ہو گیا۔

اس اخبار میں مقامی و غیر مقامی اور جنگوں کی خبریں کافی دی جاتی تھیں۔ راجہ مہاراجہ، نوابوں اور رئیسوں کے مفصل حالات شائع کئے جاتے تھے۔ اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے مرزا جی کو بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ اُن کے بھی حالات چھپتے تھے۔ یہ اخبار ۱۸۹۲ء میں روزانہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں عشرہ وار نکلنے لگا تھا۔

چلتا پرزہ ۱۸۸۷ء

محلہ بھوجلہ پہاڑی سے یہ ہفتہ وار مزاحیہ اخبار بڑی دھوم دھام سے ۱۴ جنوری ۱۸۸۷ء کو نکلا۔ ہر یکشنبہ مطبع رضوی میں چھپتا تھا۔ اس کے صفحات کی تعداد آٹھ ہوتی تھی۔ اس کے مالک میر حسن رضوی، ایڈیٹر مولوی عبدالرحمٰن راسخ

تھے۔ سالانہ چندہ ۳ روپیہ تھا۔

صدر پنچ ۱۸۸۷ء

محلہ صدر بازار سے یہ ہفتہ وار اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل ۱۸۸۷ء سے ہر یکشنبہ کو نمودار ہوتا تھا۔ اس کے مالک امجد صاحب تھے۔ مطبع امجد المطابع میں بھگوان داس کے اہتمام میں شائع ہوتا تھا۔

اخبار الاخیار ۱۸۸۷ء

محلہ چوڑی والان سے یہ ہفتہ وار اخبار یکم اپریل ۱۸۸۷ء کو جاری ہوا۔ اس کے مالک مولوی شیخ محمد دین، ایڈیٹر منشی حبیب الدین احمد صاحب سوزاں تھے اس کا سالانہ چندہ ۴ روپیہ تھا اور انوار محمدی پریس میں شائع ہوتا تھا۔ غالباً یہ اخبار ۱۸۹۰ء میں بند ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نہ صرف دہلی بلکہ سارے ہندوستان کے چپہ چپہ پر عیسائی مشنری اپنی دولت و ثروت اور حکومت کی دھونس اور دبدبہ سے غریب ہندوستانیوں کو پھانس رہے تھے۔ اور عیسائیت کا پرچار بڑے زور و شور سے کر رہے تھے۔ اُن کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس ناقابلِ برداشت حالت کو دیکھ کر منشی محمد دین صاحب نے یہ اخبار عیسائیت کی بیخ کنی اور اسلام کو فروغ دینے کے لئے جاری کیا۔ چنانچہ یہ اخبار حکومت کے جبر و تشدد پر آزادانہ اور بیباکی سے تبصرہ کرتا تھا۔ اس طرح کی کئی مثالیں ہیں اس اخبار کے شماروں میں بکھری پڑی ملتی ہیں۔

منشی محمد دین صاحب مرحوم بڑے نڈر، بے خوف و بہادر انسان تھے۔ حکام وقت پر بڑی کڑی نکتہ چینی کرتے تھے اور بڑی سنجیدگی اور متانت کیساتھ

ان کی قلعی کھولنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں جب کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو پورا ہضم کر چکی تھی اور روس ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا، ان حکومتوں کے اس وقت کے خیالات اور ہندوستانی حالات کا نقشہ "مشاعرہ روس و انگلینڈ در ہند" کے عنوان کے تحت ۸ مارچ ۱۸۸۹ء کے پرچہ میں کھینچا ہے اور ایک ایک کی زبانی ان کے خیالات اور جذبات بیان کئے ہیں۔ خاص اخبار میں کم و بیش حکومت کے ہر محکمہ اور شعبہ کی بدعنوانیت پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ اخبار حق بات کہنے سے کبھی بھی نہیں چوکتا تھا۔ جہاں جو برائیاں دیکھتا اس کی نقاب کشائی کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں ریاستوں کی رعایا کی جو ناگفتہ بہ حالت تھی، راجہ نوابوں اور ریذیڈنٹوں کی سازشوں کی وجہ سے وہاں کی رعایا جس طرح ستائی جا رہی تھی اس کا ذکر اس اخبار کے ۱۲ر اکتوبر ۱۸۸۸ء کے آرٹیکل میں کیا گیا ہے۔

دوست ۱۸۸۷ء محلہ گندی گلی، دریا گنج متصل کوچہ پرمانند سے یکم اپریل ۱۸۸۷ء کو یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ آٹھ صفحات پر ہر شنبہ کو نکلتا تھا۔ مالک بابو ماشنکر تھے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ بارہ آنے تھا۔ مطبع محب ہند میں طبع ہوتا تھا۔ بابو رجپال سنگھ شیدا دہلوی اس اخبار کے بانی و ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار زیادہ دنوں نہیں چل سکا۔

خادم الطلباء ۱۸۸۷ء دہلی محلہ حوض قاضی سے یہ سہ ماہی رسالہ یکم جنوری ۱۸۸۷ء کو جاری ہوا۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ مالک مولوی خواجہ الطاف حسین حالی مدرس اینگلو عربک

اسکول دہلی ایڈیٹر منشی ذکاء اللہ خاں پروفیسر میور کالج الٰہ آباد تھے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنہ تھا۔ اس اخبار میں طلباء کے مضامین، اسکول کے امتحانات کے نتائج وغیرہ شائع ہوتے تھے۔

مدبر عالم ۱۸۸۷ء محلہ بلی ماراں سے یہ ہفتہ وار اخبار ۵ر اگست ۱۸۸۷ء کو نمودار ہوا۔ مالک، مہتمم و ایڈیٹر منشی محمد اسماعیل شفر تھے۔ سالانہ چندہ ۲ روپیہ تھا۔ ہر دوشنبہ کو نکلتا تھا۔ مطبع فاروقی میں طباعت ہوتی تھی۔

روزانہ اخبار دہلی ۱۸۸۹ء یہ روزانہ اخبار دہلی سے ۱۸۸۹ء کو نمودار ہوا۔ بڑے سائز عمدہ سفید کاغذ پر ۸ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ تازہ خبروں، نوٹ، تار، آرٹیکل، علمی مضامین، ملکی حالات سے مملو تھا۔ انگریزی اخباروں سے خبریں نقل کی جاتی تھیں۔ قومی و مذہبی تعصبات سے یہ اخبار پاک تھا۔

نظام ہند ۱۸۹۰ء دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار فروری ۱۸۹۰ء کو شائع ہوا۔ مالک شاہزادہ ثریا جاہ تھے۔ ۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ ۵ روپئے تھا۔ نظام ہند پریس میں چھپتا تھا۔

وکیل ہند ۱۸۹۰ء کٹرہ غلام محمد خاں لال کنواں دہلی سے ۱۸۹۰ء کو یہ ہفتہ وار اخبار شائع ہوا۔ مہتمم منشی محمود مرزا خاں، مالک و ایڈیٹر منشی احمد میرزا خاں تھے۔ ۱۰ صفحات پر نکلتا تھا۔ سالانہ چندہ ڈیڑھ روپئے تھا۔ مطبع خادم الاسلام میں چھپتا تھا۔

زبان ۱۸۹۳ء :- دہلی سے ۱۸۹۳ء میں یہ ماہانہ گلدستہ جاری ہوا۔

جس کے بانی و ایڈیٹر مولانا داغ دہلوی تھے۔ کبھی ۱۲ کبھی ۲۴ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ سالانہ چندہ سوا روپیہ تھا۔ مطبع مظہر العجائب دہلی میں چھپتا تھا۔

اِس گلدستہ میں ہندوستان کے نامی شاعروں کی قابلِ داد اور مرصع غزلیں چھپتی تھیں۔ اِس کی لوح پر جناب داغ کا مندرجہ ذیل شعر زیرِ عنوان ہے:

ہے بلندی پہ ترقی پہ وہ شانِ دہلی
کہ زمانہ میں ہے مشہور زبانِ دہلی

سخن گوئی اتنی مشکل نہیں جتنی سخن فہمی۔ چنانچہ جناب داغ دہلوی کو یہ دونوں کمال حاصل تھے اور یقیناً ان کے اشعار کا انتخاب قابلِ تعریف اور لائقِ داد ہے۔

دہلی پنچ ۱۸۹۵ء

دہلی کوچہ چیلاں سے یہ ہفتہ وار ظریف اخبار ۸ جنوری ۱۸۹۵ء کو جاری ہوا۔ مرزا محمد عبد الغفار مالک، مولانا عبد الرحمن راسخ ایڈیٹر۔ ۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ مطبع مظہر العجائب میں چھپتا تھا۔ اِس کا ٹائٹل پیج بجاری بھرکم اور دلچسپ ہے اور صرف دو فقرے اِس کو زینت دے رہے ہیں۔ مختلف قوموں کو یک جان و دو قالب کرنے کی کوشش اور ظریفانہ بحث و پیچیدہ معاملات پر روشنی ڈالنا۔ پہلے نمبر ۸ جنوری ۱۸۹۵ء کی ابتدا بڑی شان و شوکت سے کی گئی ہے۔ جس میں ۶۵ شعر کا تمہیدی سالِ نو کا ساقی نامہ ہے۔

افضل الاخبار ۱۸۹۵ء

کوچہ چیلاں دہلی سے یہ ہفتہ وار اخبار ۸ جنوری ۱۸۹۵ء کو جاری ہوا۔ ۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ مالک میرزا محمد عبد الغفار، ایڈیٹر مولانا عبد الرحمن راسخ تھے۔ طلبا سے چار روپیہ اور عوام سے پانچ روپیہ سالانہ چندہ تھا۔ افضل المطابع میں

طباعت ہوتی تھی۔ اِس اخبار میں ملکی و غیر ملکی اور مقامی خبریں دی جاتی تھیں۔ دہلی اور باہر کے شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ ادبی و علمی معرکے بھی رہتے تھے۔ اِس اخبار کا ضمیمہ دہلی پنچ تھا۔ جان بلز عیسائی انسپکٹر حقیقہ کشمیری دروازہ دہلی انگریزوں اور میموں کے ہمراہ جامع مسجد دہلی میں داخل ہونے لگے۔ جان بلز جوتے پہنے ہوئے تھے۔ دربانوں نے ان کو اندر جانے سے روک دیا تو انہوں نے جامع مسجد کے دروازہ پر پیشاب کر دیا۔ پولیس میں رپورٹ ہوئی۔ جیوری کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ اس نے ملزم کو بری کر دیا جس کا ذکر ایڈیٹر نے ۱۲ مارچ ۱۸۹۵ء کی اشاعت میں کیا ہے۔ عیسائی مشنری جب ہندوستان کے باأثر لوگوں کو عیسائی بنانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے ان کو پھانسنے کے لیے کیسا شرمناک ذریعہ اختیار کیا تھا وہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۵ء کے شمارہ میں درج ہے۔

کرزن گزٹ ۱۹۰۰ء

کلاں محل دہلی سے فروری ۱۹۰۰ء میں یہ ہفتہ وار اخبار جلوہ نما ہوا۔ ۲۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے مالک و ایڈیٹر مرزا حیرت تھے۔ سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔ کرزن پریس میں چھپتا تھا۔ اِس کا ایل نمبر ۱۲۳ تھا۔

اِس اخبار کی پالیسی بے باکانہ اور بے لاگ تھی۔ حکومت کے وفاداروں کی دل کھول کر خبر لیتا تھا اور حکومت کے غلط اعمال کی بیخ کنی کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ مذہبی ٹھیکے داروں اور ملت کے غم گساروں کی مکاریاں منظرِ عام پر لانے میں اِس کو کمال حاصل تھا۔ اِس کے ایڈیٹر مرزا حیرت حق گوئی

اور بے باکی کی خاطر مصیبتیں برداشت کرتے تھے۔ لیکن قلم میں کبھی کمزوری اور بے راہ روی آنے نہ دی۔

اِس اخبار میں غیر ملکی خبریں زیادہ چھپتی تھیں۔ جنگی واقعات پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔ اِس کے بعد مقامی یعنی دہلی کے واقعات و حالات، اِس زمانہ کی دلّی کا حال، دہلی کے علاوہ فنکاروں و اہلِ صنعت سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ دہلی کی بڑی سے بڑی اور معزز سے معزز ہستیاں اور شخصیتیں بھی اِس کی تنقید کی زد میں آجاتی تھیں، اور ان پر بھی نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ان کا جو تاریک پہلو دُنیا کی نظر سے اوجھل ہوتا تھا اُس کو بھی منظرِ عام پر لانے سے نہیں جھکتا تھا۔ عیسائی شنریوں کی خطرناک حرکتوں سے عوام کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

نسیم ۱۹۰۰ء

یہ ماہانہ گلدستہ ۱۹۰۰ء کو کڑا آگوکل شاہ بازار مٹیا محل سے جاری ہوا۔ ہر انگریزی مہینہ کی تیسری تاریخ کو ۲۴ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ سرپرست محمد عبدالستار اختر، مہتمم منشی قربان علی بسمل تھے۔ سالانہ چندہ سوا روپیہ تھا۔ رحمانی پریس دہلی میں طبع ہوتا تھا۔ اِس گلدستہ میں غزلوں کے علاوہ مضامین اور دو ورق بالاقساط ناول بھی شائع ہوتا تھا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے تقریباً ۱۸۳۶ء تا ۱۸۵۷ء تک دہلی کے اخبارات کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان اخباروں کے ایڈیٹر یا مرتب اور مضمون نگار اپنے زمانہ کے بڑے

لایق اور قابل اشخاص تھے۔ مثلاً مولوی محمد باقر، مولانا محمد حسین آزاد، ماسٹر رامچندر، سر سیّد، غالب، ذکاء اللہ اور حالی وغیرہ ان اہلِ علم حضرات کی تحریریں ہماری آنکھوں کا سرمہ ہیں۔ انہوں نے اُردو صحافت کے ابتدائی ایام میں اِس کی باگ ڈور کو سنبھالی اور اپنے قلم سے انہوں نے نہ صرف زمانہ کی آواز کو اپنے ہم وطنوں تک پہنچایا بلکہ اُردو صحافت کی راہیں متعین کیں۔ ان اخبار و رسائل کے متعلق آزاد، سر سیّد کے علاوہ، گارساں دتاسی، مولوی عبدالحق، علامہ کیفی وغیرہ کی آراء سے ان کے معتبر و ثقہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اِن اخباروں کے اکثر و بیشتر مرتب و قلم کار بڑے خوددار، نڈر اور حق گو حضرات تھے۔ اُن کا رویہ بے باکانہ اور بے لاگ ہوتا تھا۔ حکومت کے وفاداروں کی دل کھول کر خبر لیتے تھے اور حکومت کے غلط اعمال پر تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ مذہبی ٹھیکہ داروں کی مکاریاں منظرِ عام لانے پر انہیں کمال حاصل تھا۔ اِس سلسلہ میں وہ کبھی حاکمِ وقت سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے باوجود یہ بانگِ دہل اُن کے ظلم و ستم اور عیسائیت کے پروپگنڈے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مکر و فریب سے بچانے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے اور بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اُن کی قلعی کھولتے۔

اِن اخبارات میں سے کچھ اخبار و رسالے دہلی کالج کے تحت اور اُن کے اساتذہ کی نگرانی میں شائع ہوتے تھے۔ جن میں شائع

ہونے والے مضامین بڑے وقیع، دقیق، جامع، مفید اور مستند تاریخی، سائنسی
معلومات اور علمی و ادبی محاسن کے حامل ہوتے تھے۔ ان کا مقصد اپنے
ہم وطنوں کو یورپین علم و ادب سے روشناس کرانا اور انہیں جدید
تعلیم کی طرف متوجہ کرانا تھا۔ بڑے دلچسپ انداز میں قارئین کے
ذہنوں کی تربیت کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں کبھی لندن ٹائمز کے
معلوماتی مضامین کا ترجمہ بھی اُن اخباروں یا رسالوں میں شائع کیا جاتا
تھا۔ دوسرے اخباروں میں بھی مرقعۂ دہلی کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھا جاتا
تھا۔ مثلاً انگریزی قانون کے متعلق سوالات و جوابات شائع ہوتے تھے۔
دہلی کی مقامی خبریں، بہادر شاہ کی صحت کا حال، قلعہ کی ریشہ دوانیاں،
شاعرے، دہلی کی ادبی جماعتوں، سوسائٹیوں، اسکولوں اور کالجوں کی
روئدادیں، دہلی کی میونسپل کمیٹی کی ہفتہ وار میٹنگوں کی تفصیل اُس زمانہ
کی دلی کا حال، دہلی کے علماء، فنکار اور اہلِ صنعت سے متعلق مضامین
شائع ہوتے تھے۔ دہلی کی بڑی سے بڑی اور معزز سے معزز ہستیاں اور
شخصیتیں بھی ان کی تنقید کی زد میں آجاتی تھیں اور ان پر نکتہ چینی کی
جاتی تھی۔ ان کی زندگی کا جو تاریک پہلو دنیا کی نظر سے اوجھل
ہوتا تھا اُس کو منظرِ عام پر لانے سے نہیں جھجکتے تھے جس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ دہلی میں شایع ہونے والے ان اخبارات و صحافت کی نہایت صحت مند
خطوط پر نشوونما کی ۔

ساتواں باب

خارجیت اُردو شاعری میں اِس قدر جلد پیدا نہ ہوتی جو لکھنؤ اور اس کے اثر سے بعد میں ہر جگہ یہاں تک کہ دہلی میں پھیل گئی۔ رہا زبان کا مسئلہ تو اختلافات اور مباحثے اِسی سے شروع ہوئے......

"جب سے اُردو پروان چڑھی، دہلی ہر قسم کی سیاسی آفتوں کا نشانہ بنی رہی۔ جعفر زٹلی سے لے کر غالب اور داغ تک تقریباً تمام ممتاز شعراء شہر آشوب لکھتے رہے۔ آخر میں تو خود شاہانِ دہلی شاعری کی آڑ لے کر دل کے پھپھولے پھوڑنے لگے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کا مرثیہ ...... اور بہادر شاہ کے دردبھرے نالے اور آہ و زاری اِس کے شاہد ہیں......

معاشی اختلاف کا مزاج طبیعت اور اندازِ فکر پر گہرا اثر پڑا۔ مذہبی معتقدات اور اخلاقی نقطۂ نظر کے فرق سے بھی یہ اثر قائم ہوا۔ دہلی میں صوفیانہ تعلیم علمی اور ذہنی تربیت کے بڑے عرصے سے رائج تھی۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں شیعیت کا زور تھا۔

دلی اور لکھنؤ کے شعری دبستانوں کے نمایاں اختلافات کا جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ہاشمی صاحب ہی کی زبانی سنئے۔

"ایک جگہ قلب کی وارداتیں ہیں تو دوسری جگہ دماغ کی موشگافیاں ایک جگہ دل کا عجز ہے تو دوسری جگہ دماغ کا زعم۔ ایک جگہ شاعری کے لیے دل کا گداز ہونا ضروری ہے تو دوسری جگہ فقط طبیعت کا موزوں ہونا۔ ایک جگہ درد ہے تو دوسری جگہ فن۔ مختصر یہ کہ ایک جگہ آہ ہے تو دوسری جگہ واہ۔ دہلی کا تمدن زندگی کا المیہ رُخ پیش کرتا ہے تو لکھنؤ کا طربیہ۔"

ہاشمی صاحب کے تحقیقی مقالہ "دلی کا دبستان شاعری" پر تنقید کرتے ہوئے

دہلویت:—

پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے اپنے تحقیقی مقالہ "دلی کا دبستانِ شاعری" میں دہلویت کیا ہے کے عنوان سے باقاعدہ ایک باب قائم کیا ہے۔ وہ اپنی موضوعاتی ضرورت کے پیشِ نظر دہلویت کی تعریف شعر و شاعری تک محدود رکھتے ہیں اور اسے واضح کرنے کے لئے دہلی اور لکھنؤ کے شعری دبستانوں کا تقابلی مطالعہ کرتے اور اس کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہیں۔ آپ کے نزدیک دہلویت سے مُراد یہ ہے۔

"دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتادِ ذہنی، ایک مزاجِ شعری کا جسے سمجھنے کے لئے لکھنویت سے قدم قدم پر مقابلہ کرنا ہوگا......"

فاضل مقالہ نگار نے آگے چل کر دہلی اور لکھنؤ کے ادبی مراکز پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن ان کی یہ رائے اُردو کے شعری ادب تک محدود ہے۔ اور انہوں نے اِس سلسلہ میں اُردو نثر نگاری کا کہیں ذکر نہیں فرمایا ہے۔ اُن کے خیال میں محض خارجی شاعری کی بنا پر دونوں اَدبی اسکول ایک دوسرے سے ممیز ہیں۔ وہ فرماتے ہیں"

"بعض اساتذہ اور نقاد لکھنؤ کی خارجیت کو اُردو شاعری کے ارتقاء میں کوئی الگ چیز قرار نہیں دیتے اور چند الفاظ اور محاوروں کے اختلاف یا تذکیر و تانیث کے فرق کو کوئی ایسی مابہ الامتیاز شے نہیں مانتے جس سے لکھنویت یا دہلویت کے الگ مراکز یا اسکول قائم کیے جاسکیں۔ لیکن میری رائے میں یہ فرق قطعی ہے۔ اگر مرکزِ شاعری لکھنؤ میں منتقل نہ ہوتا تو وہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شاعری کی حد تک ان شعرائے کرام کے نام گنائے ہیں جن کا کلام دہلوی رنگ کا آئینہ دار ہے۔

"سوداؔ، میرؔ، دردؔ، غالبؔ اور مومنؔ وہ شاعر ہیں جن کے دم سے دلّی کا چراغ روشن ہے اور ہمیشہ ہمیشہ روشن رہا ہے۔ ہاشمی صاحب نے جن خصوصیات کو دہلویت سے تعبیر کیا ہے وہ ان کے کلام میں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دہلوی رنگ انہیں سے عبارت ہے۔"[۱]

اس رائے میں ہم غالبؔ کے مجموعۂ خطوط "اُردوئے معلّٰی" اور "عود ہندی" کا مزید اضافہ کرسکتے ہیں جو دہلوی نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔

دلّی کے ادبی رنگ و روپ کو ذہن نشین کرنے کے لیے دلّی کی تہذیبی زندگی کا مطالعہ بھی اشد ضروری ہے۔ تاریخی کتابیں دلّی کے سیاسی انتشار، قتل و غارت، تشدّد، معاشی بدحالی اور سراسیمگی کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ اِس سیاسی انتشار کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد سے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تک چار بادشاہ تخت نشین ہوئے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں فرخ سیر سادات کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مرزا بیدلؔ نے اس کی تاریخ کہی "سادات بوی نمک حرامی کردند"۔ سات سال کی قلیل مدت میں چار بادشاہ چند روزہ حکمرانی کرگئے۔ عہد محمد شاہی میں دکن اور اودھ خود مختار ہوگئے۔ جاٹ اور سکھ نئی سیاسی طاقت بن کر ابھرے۔ مرہٹوں کی رسائی آگرہ کے دروازہ تک ہونے لگی اور آخر کار دہلی بھی اُن کی دسترس میں آگئی۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں احمد شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ جس کی وجہ سے دہلی کی سیاسی طاقت بُری طرح مجروح ہوگئی۔ اِدھر

روہیلے طاقتور ہوگئے اور اس جنگ کے دوران محمد شاہ چل بسا۔ چھ سال بعد دہلی کا نیا حکمران احمد شاہ قید ہوا اور عالمگیر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں شاہ جہاں ثانی اور اس کے ایک سال بعد شاہ عالم ثانی نے زمام سلطنت سنبھالی اور ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء تک حکمراں رہے۔

اس مختصر خاکہ سے ظاہر ہے کہ ۲۲ سال کے عرصہ میں بارہ حکمراں تخت نشین ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کی حکومت چند فوجی گروہوں کے گٹھ جوڑ اور درباری سازشوں کی رہین منت تھی۔ سیاسی انتشار اور پریشانی کا پورا اندازہ بادشاہوں، شاہزادوں، شاہزادیوں اور امرا کی حالت زار سے ہوسکتا ہے۔ سرجادو ناتھ سرکار نے اس کی نہایت دردناک تصویریں کھینچی ہے۔[۲]

محمد شاہی دور میں پہلی مرتبہ اُردو نثر نگاری کی طرف توجہ مبذول ہوئی جس کے لیے داستانوں اور داستان گویوں نے پہلے ہی سے زمین ہموار کردی تھی۔ غرض ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں "کرب و نشاط کے اِس دور (سیاسی انتشار اور عیش و نشاط) پر اُردو ادب کا جنم ہوا ہے۔"[۳]

یہ قاعدہ اور کلیہ ہے کہ اُسی شہر کی زبان مستند اور معیاری تسلیم کی جاتی ہے جو دارالخلافہ ہے اور جہاں بادشاہ وقت سے متوسل و وابستہ مختلف علوم و فنون کے اساتذہ بھی رہتے ہوں۔ بالفاظ دیگر سیاسی مرکزیت کا منتقل ہونا فطری چیز ہے۔ اُردو شاہانِ تیموریہ کے زیر سایہ دہلی ہی میں پلی بڑھی اور یہیں اس کی پرورش اور نشو و نما ہوئی اور جب تک سیاسی حالات سازگار رہے تمام فنون کے ماہرین یہیں جمع رہے۔ ان کی

بدولت زبان کی ادبی اور لسانی مرکزیت بھی قائم رہی اور جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں نادری، ابدالی، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی تخت و تاراج کی وجہ سے دہلی تباہ و برباد ہو گئی اور جب یہاں خاک اڑنے لگی تو یہاں کے فنکاروں نے مجبوراً ذریعۂ معاش کی خاطر دوسرے شہروں کا رُخ کیا۔ ان شہروں میں لکھنؤ قابلِ ذکر ہے۔ بقول انشاؔ خود لکھنؤ ایک دوسری دہلی ہو گیا۔

محافظ مرکز اردو میں منشی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" نے دہلی کو اردو زبان کا مرکز و سرچشمہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مختلف دلائل پیش کئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

"جس طرح مرکز دائرہ کا وہ وسطی نقطہ ہے کہ اس سے محیط تک جس قدر خط ہوں وہ سب آپس میں برابر ہوں۔ اسی طرح زبان کا مرکز بھی وہ مقام ہے جہاں کی زبان کے ایجاد یا پیدا ہونے کا مہر جہاں تاب طلوع ہوا ہے۔ اور اس سورج کی کرنیں وہاں سے چاروں طرف پھیلی تو ہوں مگر قرب مرکز اور بعد مرکز میں وہی فرق ہو جو ہر ایک چیز کے قرب مخرج اور بعد مسافت میں ہوا کرتا ہے۔

...... اسی طرح زبان بھی اپنی اصلی جگہ اور نکاس چھوڑ کر دوسرے مقام کو اپنا مرکز یا مخرج نہیں قائم کر سکتی۔ ہر ایک ملک کی زبان اپنے ملک اور ہر ایک شہر کی بولی اپنے شہر سے ایک مخصوص خصوصیت رکھتی ہے۔ مرکز ہمیشہ اپنی خاص جگہ پر اس طرح قائم رہتا ہے۔ جس طرح آفتاب اپنے خاص مقام پر قائم ہے اور دیگر سیارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اسی طرح زبان کا مرکز بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتا۔"

اس ضروری تمہید کے بعد صاحب "محافظ مرکز اردو" کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس بنا پر دہلی کو اردو کا خاص مرکز کہنا چاہیئے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"یہ بات بالاتفاق مانی ہوئی اور تسلیم شدہ ہے کہ اردو زبان کا اگر معدن ہے تو دہلی ہے۔ مبدء و مخرج ہے تو دہلی ہے۔ مرکز و ماخذ ہے تو دہلی ہے۔ یہ پیدا کہاں ہوئی؟ دہلی میں۔ اس نے جنم کہاں لیا؟ دہلی میں۔ اس کا نال کہاں گڑا؟ دہلی میں۔ اس کا خروج یعنی نکاس اور رواج کہاں سے ہوا؟ دہلی سے۔ اس کی بنیاد کہاں پڑی؟ دہلی میں۔ اس کا شاہجہانی اردو نام کہاں رکھا گیا؟ دہلی میں۔ اس نے عروج کہاں پایا؟ دہلی میں۔ اس کا سرپرست اور بانی کون ہوا؟ شاہجہاں بادشاہ دہلی و ہندوستان۔ البتہ صاحبقران ثانی سے پیشتر اس زبان کی نیو رکھنے والے بزرگ تیرھویں عیسوی صدی میں جناب خواجہ ابوالحسن امیر خسرو دہلوی ہیں۔

...... جس حالت میں اہل دہلی کی زبان اصل اردو معلیٰ مانی گئی اور یہ شہر زبان کا ٹکسال گھر ٹھہرا تو ہند کے اطراف و جوانب کے باشندے گو وہ لکھنؤ، اکبرآباد، بنارس، کانپور، میرٹھ یا لاہور وغیرہ کے رہنے والے ہی کیوں نہ ہوں دائرۂ تقلید و احاطۂ تتبع سے خارج نہیں ہو سکتے۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دہلی (شاہجہان آباد) کے سوا دوسرا کوئی شہر ٹکسال اور مرکز اردو قرار نہیں پا سکتا۔ کیونکہ اردو بلحاظ اردو ہے اور اس کا صحیح لہجہ ادا کرنا اور ......"

اردو زبان کے سلسلہ میں منشی سید احمد صاحب نے دہلی کی جو اہمیت اور مرکزیت کا ذکر مذکورہ بالا سطور میں کیا ہے وہ واقعی ایک مسلمہ حقیقت ہے

جس سے انکار ممکن نہیں۔ اسی ضمن میں آپ نے "اہلِ زبان" اور "مقلد" کا فرق واضح کیا ہے۔ جس کا جاننا ہمارے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوگا اور اس سے ہمیں دہلی اور دیگر مقامات کے لسانی اختلافات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"کوئی سی زبان کیوں نہ ہو اس کے جاننے اور استعمال کرنے والے دو قسم پر منقسم ہیں۔ ایک وہ جن کا اصلی وطن جن کا مسقط الراس جن کے باپ دادا اور ننھیال کا وطن وہی سرزمین اور خطہ ہو جس جگہ سے وہ زبان نکلی ہے۔ یہ لوگ "اہلِ زبان" کہلاتے ہیں اور اوّل قسم میں شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اس زبان کو مستند کتابوں سے اساتذہ کے کلام سے صحبت سے اہلِ زبان کے مختلف مضامین اور اخباروں سے حاصل کیا ہو۔ بلکہ قریب قریب خاص محاورات و اصطلاحات کے علاوہ ویسی ہی زبان لکھنے اور بولنے لگے ہوں لیکن پس پر بھی ان سے غلطی کا ہو جانا ممکن اور واجب التسلیم ہے مگر اہلِ زبان سے ناممکن اور خلافِ قیاس۔ یہ دوسری قسم کے لوگ زباندان یا "مقلد" کہلاتے اور دوسرے درجہ میں گنے جاتے ہیں۔......

"......اہلِ زبان کو یہ بات ضرور ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ جن الفاظ نے عہدِ حال میں رواج پایا ہے ان پر بنائے سخن موقوف رکھتے ہیں گو قدما کسی اور طرح استعمال کر گئے ہوں مگر انہیں موجودہ طبقہ کے روزمرہ کی طرف رجوع کرنی محاورے کی صحت کے لیے ایک لازمی امر ہے...... اسی طرح مقلد کو بھی اہلِ زبان کے محاورے کی تلاش لازم ہے تاکہ اس کا سخن قابلِ اعتبار ہو۔ مقلد سے غیر ملک کا آدمی ہماری مُراد نہیں ہے۔"

ماہرینِ لسانیات و محققینِ زبانِ اُردو اس بات پر متفق ہیں کہ دلّی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی کھڑی بولی شاہجہاں کے عہد سے بولی کی سطح سے بلند ہو کر ادبی زبان بننے کی سعیِ پیہم میں مصروف نظر آتی ہے۔ مگر اردو میں مرکزِ دہلی کے باقاعدہ ادبی اکتسابات کا سلسلہ عہدِ فرخ سیر سے شروع ہو کر محمد شاہ رنگیلے کے دورِ حکومت میں بامِ عروج پر پہنچتا ہے۔ اگرچہ اس امر سے انکار ناممکن ہے کہ مذہبی نظم و نثر کے قدیم تر دہلوی نمونے بھی ملتے ہیں۔

دہلوی اُردو کو جن زبانوں کے ادب سے فیض پہنچا ہے۔ ان میں فارسی ادب کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ تاہم برج بھاشا، پوربی اور دھنی کھڑی بولی اور ان کے توسط سے سنسکرت کے ادبی رجحانات بھی کم و بیش اُردو ادب پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ فارسی میں سنسکرت کے کلاسیکی ادب کے جو تراجم ہوئے ان سے بھی دہلوی اُردو کا ادب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مغل ہندوستان میں اپنے ساتھ ترکی زبان اور ترکی تہذیب و تمدن کے اثرات بھی لائے تھے۔ نیز عربی ثقافتی زبان تھی اور نصابِ تعلیم میں عربی کو خاص مقام و اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اُردو کے فکری اور شعری رجحانات ہندی، ترکی، ایرانی، عربی اور افغانی میلانات کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔

ہمارے تقریباً سبھی ناقدین مثلاً محمد حسین آزاد، حالی، عبدالسلام ندوی اور عبدالحئی وغیرہ نے ایرانی اثرات کے ساتھ ضمناً برج بھاشا کا تو ذکر کیا لیکن اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ ہندی فارسی کی نشوونما

میں ہندی، ترکی، افغانی اور عرب اثرات بھی کارفرما تھے۔ ان حضرات نے
علاقائی اور عوامی اثرات و عوامل کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔

بابائے اُردو عبدالحق مرحوم نے ان کے برعکس نہایت بے لاگ اور
حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے۔ بابائے اُردو اپنی گراں مایہ تصنیف "قواعد
اُردو" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

"فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستارِ
فضیلت کا ملنا بغیر تحصیلِ زبان عربی ناممکن تھا کیونکہ مسلمانوں کے علوم و فنون
کا خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔ اِدھر ملک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت)
رائج تھی اسے بھی مسلمانوں نے سیکھا۔ عوام وہی زبان بولتے تھے۔ چنانچہ اسی
مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر ہوئے۔ مسلمان شاہی درباریوں اور
علما و شعرا نے بھی یہ زبان سیکھی اور اس میں تالیف و تصنیف ۔۔۔۔۔ بھی کی۔
غرض ہندوستانیوں کے اس میل جول اور خلط ملط سے ایک نئی زبان نے
جنم لیا جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا۔ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں۔ اور
لشکری زبان جیسی ہوتی ہے ظاہر ہے یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر۔۔۔۔۔۔
ہندوستان کی قدیم راجدھانی اس کا جنم بھوم اور دوآبہ اس کا وطن ہوا۔"[15]

اُردو ہندی نژاد ہے اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے
شائستہ صورت ہے۔ برج بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہے۔ اس میں
جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں وہ زمانۂ دراز کے استعمال اور
زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدا پن
اور کرختگی اور تلفظ اور لہجہ کی دقت تھی جاتی رہی اور چھٹ چھٹا کر پاک صاف

سیدھے سادے رہ گئے جس سے زبان میں لوچ، گھلاوٹ اور صفائی پیدا
ہو گئی (اُردو) زبان کی بنیاد ہندی پر ہے۔ تمام حروف فاعلی، مفعولی، اضافت،
نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ ضمیریں، افعال سب کی سب ہندی ہیں
ہیں لیکن عربی، فارسی الفاظ کے اضافہ نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل
خوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہے اور
عربی فارسی الفاظ میں شان و شوکت اور زبان کے لئے دونوں عنصروں
کا ہونا ضروری ہے۔ عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت میں بلکہ خیالات
میں بھی وسعت پیدا کر دی ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا اور وہ
زیادہ وسیع اور کارآمد بن گئی مگر اصل بنیاد جس پر وہ قائم ہے ہندی ہی ہے"[16]

بابائے اُردو عبدالحق نے اُردو زبان کے متعلق جستجو شروع کی کہ
یہ کب اور کس طرح پیدا ہوئی۔ اس کی نشو و نما کس طرح اور ملک کے
طول و عرض میں یہ کیونکر پھیلی۔ اُردو کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کی
اصل حقیقت کا انکشاف مولوی عبدالحق ہی نے کیا ہے ورنہ اب تک
تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ اُردو فوج کی بازاری بولی ہے جس کی ایجاد عہدِ اکبری
میں ہوئی۔

اس تلاش و جستجو میں مولوی صاحب نے پتہ لگایا کہ مسلمان شمالی ہند سے
جب جنوبی ہند میں آئے تو اُردو کو بھی اپنے ہمراہ لائے۔ وہاں تو صرف لوگوں
کی بول چال ہی تک محدود رہی لیکن دکن میں آ کر اس نے بہت جلد ادبی
صورت اختیار کر لی اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے سلاطین کے زیرِ سرپرستی
دکن میں اس زبان نے جو دکنی کے نام سے مشہور ہوئی بڑے بڑے شعرا

اور نثار پیدا ہوئے[17]۔

اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے متعلق ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین کے کے خیالات کا جان لینا بھی ضروری ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

" دہلی شہر اُردو زبان کا جنم بھوم تھا۔ اسی محور کے اردگرد اس کی ابتدائی قوتیں اپنا کام کرتی رہیں۔ یہیں سے وہ دکن گئی اور وہاں سے ترقی یافتہ صورت میں پھر اہل دہلی کو ملی۔ ممکن تھا کہ اس کی موجودہ حیثیت یہاں کی اُردو کو تیزی سے آگے بڑھانے میں زیادہ مدد گار ثابت ہوتی مگر سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی میں کاروانِ ادب اُس رفتار سے نہ بڑھ سکا جس کی اُمید کی جا سکتی تھی[18]۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ اس دَورِ تخریب میں بھی ایک تعمیری کام جاری تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ اُردو زبان ترقی پذیر تھی۔

"شمالی ہند کے اس انتشار و خلفشار کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس دَور میں بجز زندگی کے سوگ منانے کے اور کوئی خاص کام نہیں ہوا...... مگر یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہوتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دَورِ تخریب میں بھی ایک تعمیری کام ہو رہا تھا سلطنت بگڑ رہی تھی لیکن اُردو زبان سنور رہی تھی[19]۔

اُردو زبان پر عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں کہ :-

" اُردو زبان بھی عربی و فارسی زبانوں کے زیرِ اثر پروان چڑھی تھی۔

اس زبان کے معمار و سرپرست وہ بزرگ تھے۔ جو خود عربی و فارسی کے ممتاز عالم تھے[20]۔

اس کے ساتھ ہی آپ لکھنؤ کے تمدن و ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اہلِ لکھنؤ کو اُن کی اَدبی و لسانی خدمات پر اس طرح شاندار خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو زبان کی روانی، نکھار، بندش کی چستی دبستان لکھنؤ کی رہینِ منت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

" جمالیاتی و لسانی شعور نے زبان کو ایک ایسا نکھار بھی عطا کر دیا کہ جو کام اس سلسلہ میں یہاں (لکھنؤ میں) پچاس سال کے وقفہ میں ہوا وہ شاید صدیوں کے ریاض کے بعد اُردو و اَدب کو نصیب ہوتا۔ صرف و نحو کی پابندی محاورات و تراکیب کی بندش و صحت کے قوانین سے لکھنؤ نے پورے اَدب کو ایک ایسے ہموار راستے پر چلنا سکھا دیا کہ مستقبل روشن ہو گیا۔ اختلافاتِ لسانی بہت کم ہو گئے۔ تذکیر و تانیث کی بحث نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ زبان کو مانجھنے اور دلکش بنانے میں اُن کا (اہلِ لکھنؤ کا) کارنامہ رہتی دنیا تک نہیں بھلایا جا سکتا[21]۔

دہلی صدیوں سے ہندوستانی عوام کے جذبات کا ایک ایسا مرکز بن کر رہ گئی تھی جسے ہر ہندوستانی احترام و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا محض اُردو زبان ہی کی بناء پر نہیں...... بلکہ اپنی دیگر گوناگوں خصوصیات کی بناء پر بھی دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

" صدیوں سے یہاں بہترین دماغوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ علم و عمل کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ فتح و شکست کے کارنامے مرتب ہو رہے تھے۔ نظام و

نفاست کے خاکے مرتفع ذہن کے سانچے میں ڈھل کر مسجد، مینار، قلعہ وغیرہ
کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ جلال و جمال کے نمونے عوض سے لوگوں کو اپنا
گرویدہ بنا رہے تھے۔ آخر میں مغلیہ حکمرانوں نے وہ کمی بھی پوری کر دی جو دہلی
کو یگانۂ روزگار بنانے میں رہ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ سارے ہندوستان کیلئے
دہلی ایک ایسا شہر ہو گیا تھا جس سے ہر ایک متاثر تھا۔ جو دہلی کے باشندے
نہ تھے وہ بھی اس کی عظمت کا دم بھرتے تھے اور جو دہلی کے رہنے والے تھے۔
اُن کو تو یہاں تک اس بستی سے وابستگی تھی کہ مرتے دم تک وہیں رہنا
چاہتے تھے۔ غرض کہ دہلی ایک شہر آرزو تھا جس کی تباہی پر ۱۸۵۷ء اور
اس کے بعد بھی .... ماتم کیا گیا۔[۲۴]

گذشتہ صفحات میں درج شدہ مختلف اقتباسات سے ظاہر ہے کہ
اُردو کی جائے پیدائش کی بحث اُردو ادب کی تاریخ میں اختلافی قضیہ بن
گئی ہے۔ اُردو زبان کی ابتداء سے متعلق مختلف نظریات ہمارے سامنے
ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک اس کا آغاز عہدِ شاہجہانی میں ہوا۔ بعض
اس کی قدامت کے پیشِ نظر اس کا رشتہ محمود غزنوی کی فتوحات سے جوڑتے
ہیں۔ بعض حضرات اس کی ولادت اس دور میں دکھاتے ہیں جب محمد بن
قاسم کی فوجیں سندھ میں داخل ہوئیں اور بعض اس کی ابتداء کا سُراغ
امیر خسرو کی شاعری میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم فرماتے
ہیں کہ شہاب الدین غوری جب فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوا تو
اُردو دہلی کی گلیوں میں گھٹنوں چلتی تھی۔ حافظ محمود شیرانی نے اُردو کو پنجابی
کی بیٹی قرار دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اُردو کا جنم پنجاب میں ہوا اور اکثر محققین کا

ماننا یہ ہے کہ اُردو کا آغاز شمالی ہند سے بہت دور دکن میں ہوا۔[۲۵]

اُردو کی پیدائش اس کے ارتقاء اس کے ماخذ و مبداء اس کے
اُصول قواعد اس کے عروج و زوال کے اسباب اس کی ساخت اور خصوصیات
سے کما حقہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے "خطبات عبدالحق" کا مطالعہ ضروری
ہے۔ مذکورہ مسائل پر بعض اہلِ قلم نے پوری پوری کتابیں لکھ ڈالیں مگر
مولوی عبدالحق نے اپنے خطبات میں اُن اہم مسائل پر جس اختصار و جامعیت
کے ساتھ گفتگو کی ہے وہ انہیں کا حصّہ ہے اور مولوی صاحب کی قادر الکلامی
وسیع النظری اور تبحر علمی پر دلالت کرتی ہے وہ اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اُردو زبان نے وہیں جنم لیا۔"[۲۶]

(گذشتہ صفحات میں ہم بابائے اُردو کی وہ رائے بیان کر چکے ہیں جس میں
اُنہوں نے دہلی کو اُردو کا جنم بھوم اور دوآبہ کو اس کا وطن بتایا ہے)

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے شعبۂ بشریاتی لسانیات (ANTHROPOLOGICAL
LINGUISTICS) کے زیرِ اہتمام منعقدہ بین الاقوامی سیمینار کے اُردو سیشن میں
پروفیسر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے اُردو کے
آغاز و ابتداء پر مقالہ پڑھا موصوف نے اُردو کی ابتداء سے متعلق نظریوں کا
جائزہ لیتے ہوئے اِن نظریوں کو باطل اور ناقابلِ تسلیم بتایا جن میں کہا گیا کہ
(۱) اُردو کی پیدائش پنجاب میں ہوئی اور وہاں سے مسلم افواج کے ذریعہ
۱۱۹۳ء میں دہلی پہنچی (محمود شیرانی) یا (۲) اُردو برج بھاشا سے نکلی (محمد حسین آزاد)
یا (۳) اُردو کا ماخذ ہندوستانی زبان ہے جس کا دوسرا نام کھڑی بولی ہے۔
(گریرسن) یا (۴) اُردو کی بنیاد شمالی ہند کا وہ محاورہ ہے جو مسلمانوں کے

وقت لاہور سے لیکر الٰہ آباد تک رائج تھا (ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی)

پروفیسر موصوف نے اُردو کی ابتداء سے متعلق اپنا زاویۂ نگاہ پیش
کرتے ہوئے بتایا کہ ہمیں اُردو کی ابتداء کا سراغ لگاتے ہوئے قدیم اُردو کا دہلی
اور نواحِ دہلی کی بولیوں اور پنجابی کے باہمی رشتوں کا کھوج لگانا چاہیئے اس
طرح یہ عقدہ حل ہو سکتا ہے[۲۳]

اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے یہ ہے کہ :-

" اُردو زبان کو کسی ایک علاقہ سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زبان
ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان علاقوں کی خصوص اور امتیازی
خصوصیات کے زیر اثر نشو و نما پاتی رہی۔ دکن میں جو زبان بنی اس میں
دکن کے علاقائی حالات کا اثر ہوا اور اسی وجہ سے یہ دکنی کہلائی۔ گجرات میں
اس نے اپنی علاقائی خصوصیات کے زیر اثر دکن سے مختلف رنگ اختیار
کیا اور وہ گجری کہلائی۔ شمالی ہندوستان اور دلی میں اس پر اس علاقہ
کا اثر غالب رہا۔ اس لیے ان تینوں کی اپنی علیحدہ علیحدہ انفرادیت ہے۔
یہ ٹھیک ہے کہ مختلف علاقوں میں جیسے جیسے میل جول اور ربط ضبط بڑھتا
گیا۔ یہ ایک دوسرے سے قریب آتی گئیں لیکن اس کے باوجود کچھ فرق
ان میں باقی رہا۔[۲۴]

نور الحسن ہاشمی صاحب نے اپنے مقالہ "دلی کا دبستان شاعری" میں
جا بجا اردو زبان کے ارتقاء اور مختلف ادوار میں اس کی بدلتی ہوئی
خصوصیات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اور مقالہ کے آخر میں "دہلی
کی زبان" کے عنوان سے ایک مستقل باب بھی سپرد قلم کیا ہے۔ ہاشمی صاحب

اپنے مضمون کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے اور ابتداء میں اس بات
کی وضاحت کر دی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے اختلافات بڑی
حد تک ان کے لسانی اختلافات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی
چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ سماجی حالات بھی ان اختلافات کا باعث بنے۔
"آبِ حیات" کے پانچویں دور میں جس میں ناسخ، خلیق، آتش، شاہ نصیر
مومن، ذوق اور غالب کے تذکرے ہیں، آزاد فرماتے ہیں کہ اسی زمانہ میں لکھنؤ
اور دہلی کے درمیان لسانی اختلافات پیدا ہوئے[۲۵]

آخر میں اُردو کے ایک اور محقق و نقاد علی جواد زیدی کی رائے بھی
ملاحظہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں :-

اسکول سازی کا سارا کام ذہنی انتشار کے ساتھ غیر علمی طریقہ پر ہوا ہے
اُردو میں اسکول سازی اور عہد سازی کے لیے ہمیں از سر نو غور کرنا ہوگا۔ لکھنؤ
اور دلی دو اہم ادبی مراکز تو ضرور ہیں لیکن دو ادبی اسکول نہیں ہیں۔ زبان
و ادب ترقی پذیر اکائیاں ہیں۔ دونوں مرکزوں میں زبان اپنی فعالیت
کی بدولت آگے بڑھ رہی ہے ...... اُردو ہندوستان گیر زبان ہے
اور بیک وقت کئی اہم مرکزوں بالخصوص دلی اور لکھنؤ میں معروف
عمل رہی ہے[۲۶]

لکھنؤ اور دہلی کے لسانی اختلافات کے سلسلہ میں نور الحسن ہاشمی نے
میر امن، رجب علی بیگ سرور، فخر الدین حسین سخن دہلوی، ناسخ، آتش
اور شاہ نصیر، ذوق، کریم الدین، محمد حسین آزاد اور صفیر بلگرامی (ڈاکٹر
عبادت بریلوی نے صفیر کے بجائے صفدر لکھا ہے عین ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو

سیّد احمد دہلوی، سجاد مرزا بیگ دہلوی، شرر، سرشار اور حکیم ت
وغیرہ ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے اس موضوع سے
دلچسپی لی ہے[29]۔

ہاشمی صاحب کے خیال میں "دریائے لطافت" کے مختلف نمونوں
(مثلاً مظہر جانِ جاناں کی گفتگو اور مختلف لوگوں کی بولیوں کا جہاں
ذکر ہے[30]) کلیم دہلوی کے ترجمہ "خصوص الحکم" فضلی کی "وہ مجلس" یا کربل کتھا
کے دیباچے، سودا کی نثر کے نمونے (۱۸۰۰ء) شاہ رفیع الدین (۱۷۷۶ء)
اور شاہ عبدالقادر کے قرآن مجید کے ترجموں سے لیکر میر امن کی باغ و بہار
(۱۸۰۰ء) تک زبان دہلی کے لسانی ارتقار کا اندازہ ہوتا ہے۔

یوں تو اردو زبان نے شاہ جہاں سے لیکر ابو ظفر بہادر شاہ تک
تیرہ بادشاہتیں دیکھیں۔ لیکن یہ بادشاہتیں سوا چار کے باقی سب
چند روزہ تھیں۔ چونکہ شاہ جہاں کے عہد میں بڑی حد تک امن و
امان رہا اس لئے اکتیس برس تک اردو زبان کی جڑ بندھتی اور
بنیاد جمتی چلی گئی ہے[31]۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں اس زبان نے اور بھی ترقی شروع کی
اور "دہ مجلس" اسی عہد میں لکھی گئی۔ عالی گوہر شاہ عالم نے جن کا تخلص
آفتاب تھا چار دیوان کے علاوہ نثر میں بھی ایک ضخیم کتاب تصنیف کی تھی[32]۔

اردو نثر کی تاریخ کے مطالعہ سے ہم پر اس حقیقت کا انکشاف ہوگا
کہ فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو بول چال کی طرز میں نہیں لکھی جاتی تھی۔
اس کا مقصد براہِ راست اظہار سے نہیں تھا۔ بلکہ یہ انشاء کی ایک قسم

سمجھی جاتی تھی۔ جس میں شاعری کا سا آہنگ پایا جاتا تھا۔ نثر کی تحریر کو
بول چال کے بے تکلف اسلوب سے جدا رکھا جاتا تھا۔ پرانی اردو کی شکل
یہی رہی کہ بڑے ادیب اکثر فارسی اسالیب کو معیاری اسالیب سمجھتے رہے۔
اور جب اردو نثر شروع میں ارتقائی ادوار طے کر رہی تھی تو اس وقت فارسی
کا اسلوب حد درجہ پر تصنع اور پر تکلف تھا۔ چنانچہ اردو نثر بھی یہ رنگ
قبول کرتی گئی اور نو طرز مرصع اس رنگ کا شاہکار رہے[33]۔

فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں اردو نثر کا ایک نیا دلبستان قائم ہوا۔
یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ورنہ اس کے تحت لکھوائی ہوئی سب کتابیں سادہ و سلیس
ہیں۔ ان کتابوں کا ایک حصہ (جو ابتدائی تعلیم کے لئے ہے) سادہ و سلیس ہے۔ مگر
جو کتابیں اعلیٰ جماعتوں کے لئے ہیں وہ اتنی سادہ و سلیس نہیں۔ تاہم حقیقت
یہی ہے کہ اس کالج کی وہی کتابیں زیادہ مقبول ہوئیں جو سادہ تھیں مثلاً
باغ و بہار وغیرہ۔ میر امن نے باغ و بہار لکھ کر ہمیں بولتی چالتی جیتی جاگتی نثر سے
روشناس کیا جس میں روزمرہ کے علاوہ ماحول کی زندگی کا انعکاس بھی
موجود ہے۔ اور نثر کی رفتار میں حیات کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں ربط بھی
ہے اور لے بھی۔ اس میں مخصوص حیوان ناطق کا نطق ہی نہیں اس کے احساسات
اور اذواق بھی جلوہ گر ہیں۔ اس میں تصوریت بھی ہے اور موسیقیت بھی اور
ان دونوں کے ہمراہ ایک مہذب خوش مذاق دلی والے کی شخصیت بھی رونما ہے[34]۔
فورٹ ولیم کالج سے باہر کی نثری تصانیف میں صرف دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔
پہلی انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی اور دوسری رجب علی بیگ کی فسانہ عجائب۔
"فسانہ عجائب" ادق، مسجع اور مقفیٰ عبارت کی وجہ قدیم نثر اردو کی آئینہ دار ہے۔

انشا نے "رانی کیتکی کی کہانی" لکھ کر پہلی مرتبہ اُردو کو ایک عام فہم اور ملکی زبان بنانے کی باشعور کوشش کی۔ پوری کہانی ہندوستانی زبان میں لکھی ہے۔ لیکن بیان کی دلکشی اور سادگی میں مشکل سے کہیں فرق آتا ہے۔ اُن کے استعمال کردہ الفاظ ایسے سبک، شیریں اور فصیح ہیں کہ ناسخ کی منظم تحریک کے باوجود اُردو سے خارج نہ ہو سکے۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کے بعد دہلی کالج کی تصنیفات و تالیفات اور غالب کے خطوط کو دہلوی نثر کی اہم کڑیاں سمجھنا چاہیئے۔ دہلی کالج سرزمین دہلی کا وہ نامور ادارہ تھا جہاں اُردو کو علمی زبان بنانے کی پہلی منظم کوشش کا آغاز ہوا تھا۔ اس کالج کو فورٹ ولیم کالج پر اس لیے فوقیت حاصل ہے کہ یہاں ہندوستانیوں کو اُردو کے ذریعہ مغربی علوم اور ادب سے آشنا کرانے کی شعوری کوشش کی گئی۔ اُردو کو بطور تعلیم تسلیم کیا گیا اور اس زبان کے ذریعہ ہندوستان میں مغربی علوم کی اشاعت کو ترجیح دی گئی۔ اس کالج میں پہلی بار مختلف موضوعات سے متعلق اور اعلیٰ پایہ کی تصانیف کو اُردو میں منتقل کرکے انہیں کالج کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ ترجمہ کا کام اس سے پہلے اُردو میں بہت کم تھا خصوصاً علمی مضامین لکھنے یا ترجمہ کرنے کی روایت تقریباً مفقود تھی۔ اس لیے انہیں اُردو تراجم کی ابتدائی شکل سمجھنا چاہیئے۔ پھر بھی اصطلاحات اور ہم معنی الفاظ وضع کرنے کی طرف توجہ انگریزی زبان سے مناسبت اور موزوں الفاظ مستعار لینے کی کوشش اور لفظی ترجمہ کی بجائے اظہار مفہوم کی اہمیت کا احساس قابل ستائش ہے۔ اس کالج کے ممبر اراکین میں مولوی امام بخش صہبائی، مولوی کریم بخش، فیلن صاحب، ماسٹر رام چندر، مولوی سبحان بخش، مرزا غالب،

سر سید احمد خاں، مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی احمد علی، مولوی محمد باقر وغیرہ شامل تھے۔ اس حلقے نے اُردو میں متنوع علمی مضامین کے ایک بیش بہا ذخیرہ کا اضافہ کیا۔ یہی مضامین شمالی ہند میں ذہنی بیداری کے آغاز کا سبب بنے۔ اس کالج کے فارغ التحصیل طلبا مثلاً مولانا محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، منشی ذکاء اللہ وغیرہ آگے چل کر اُردو ادب کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ مرزا غالب کے خطوط سے اُردو نثر میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ اگر مرزا اُردو نثر کو اپنے اظہار کا ذریعہ نہ بناتے تو سلیس نگاری کا مستقبل یقیناً تاریک تھا۔ خود مرزا کے عہد کے دوسرے ادیب مثلاً غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث بیخبر وغیرہ اُسی قدیم اسلوب کے والہ و شیدا تھے۔ اور اُن کی تصانیف قدیم اسلوب نگاری کا نمونہ ہیں۔ بہرحال غالب نے اُردو نثر کو جس طرح اپنایا اور اس میں جو سادہ بہار کیفیت پیدا کی وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کے خطوط سے اُردو نثر نگاری میں ایک مخصوص انداز تحریر اور اسلوب کا اضافہ ہوا بلکہ اُردو نثر کی تاریخ ایک نئے راستے سے روشناس ہوئی۔[۴۵]

ادبی لحاظ سے سرسید سے قبل اگر کوئی نثر قابل تقلید اور قابل توجہ ہے تو وہ غالب کی نثر ہے جس میں شاہراہِ عام سے ہٹ کر ایک نیا اندازِ تحریر اختیار کیا گیا اور نثر کے مقصدِ تحقیق، وضاحت و صراحت کو پہلی دفعہ برتا گیا۔ غالب کے خطوط کی بدولت مافی الضمیر کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک نیا سلسلہ وجود میں آیا جو اُردو ادب میں ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ غالب نے دہلی کی زبان کو تحریری جامہ پہنایا اور اس میں اپنی ظرافت اور

مؤثر طرزِ بیان سے وہ گل کاریاں کیں کہ اُردوئے معلّیٰ خاص و عام کو پسند
آئی اور اُردو نثر کے لیے ایک طرزِ تحریر قائم ہو گیا جس کی پیروی دوسروں کیلئے
لازم تھی۔[36]

مرزا غالب کی نثر کی تقلید سرسیّد اور مولانا حالی کے حصّے میں آئی جنھوں نے
اسے مختلف مضامین میں استعمال کر کے جدید نثر کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر رنگ کو
ادا کرنے پر قادر ہو گئی۔ سرسیّد اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کی بنا پر
"تاریخِ ادبِ اردو" کے مصنف فرماتے ہیں کہ:۔

"مرزا کی طرزِ خاص کا سرسیّد پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی
اور بے تکلفی اِن کی عبارت میں پائی جاتی تھی ہے اس کا نقشِ اوّل غالب کے
ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔"[37]

خود مولانا حالی سرسیّد کو اُردو نثر کا آدم یا مورثِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں[38] "یا
غالباً سرسیّد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو نثر میں مضامین کو سادگی
و متانت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ اُردو پر سب سے زیادہ اثر اُن کے
رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا پڑا۔ جب مذہبی نوک جھونک اِس رسالہ میں
شروع ہوئی تو جواب تحریر کرنے والوں نے بھی وہی اندازِ بیان اختیار کرنے کی
کوشش کی جو خود سرسیّد کا تھا۔ اِس سلسلے کے عرصہ تک قائم رہنے کی وجہ سے
سلیس اور عام فہم اُردو کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ
اسی رنگ میں لکھنے کے عادی ہو گئے اور اس وقت سے ہر انشا پرداز نے
یہی روش اختیار کر لی۔

دبستانِ سرسیّد فورٹ ولیم کالج کی طرح در اصل نثر کا دبستان تھا۔

رفقائے سرسیّد کے نثری کارناموں کی اہمیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔
اوّل تو اس لیے کہ یہ ایک تحریک کا ادب تھا۔ دوم اس لئے کہ اِن کے ذریعہ
اُردو میں نئے فنکار داخل ہوئے۔ تاریخ، سوانح عمری، مذہب، فلسفہ، ادبی
تنقید، قصہ نگاری، علمی صحافتی مضمون نگاری ان حضرات کے محبوب
موضوعات تھے۔

سرسیّد کے وقت اُردو کے دو لسانی اسلوب موجود تھے۔ ایک سادہ
و پُرکار اور دوسرا مرصع و پُرشکوہ۔ ایک کے نمائندے میر امّن تھے اور
دوسرے کے تحسین و سرور۔ ایک بہت سپاٹ تھا اور دوسرا بہت ہی
مرصع۔ سرسیّد کی تحریر سے ان دونوں اسلوبوں میں توازن پیدا ہوا۔
سرسیّد کی تصنیفی زندگی کا سلسلہ نصف صدی سے زیادہ یعنی ۱۸۴۲ء
تا ۱۸۹۸ء جاری رہا۔ اُن کی تصانیف متنوع و مختلف موضوعات پر مشتمل
ہیں لیکن انہوں نے نہ محاورہ بندی کے ٹھاٹھ دکھائے نہ مرصع کاری کے
جوہر، نہ زبان کا پُرشکوہ انداز اختیار کیا نہ عالمانہ۔ اُن کے نزدیک زبان کا
مفید ترین مصرف یہ تھا کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کریں۔ اسے قوم کی آواز کا
ذریعہ بنائیں اور اس سے قوم کی تہذیب و تربیت کا کام لیتے رہیں۔
سرسیّد نے عربی فارسی کے الفاظ کے مقابلہ میں انگریزی الفاظ اُردو
میں کھپانے کی کوشش کی۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اُردو نثر کو بے محابا استعمال
کیا اور اُردو میں عقلی استدلال کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے بالکل اچھوتے
اور نئے موضوعات پر قلم اٹھایا جس سے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار
آنے کا موقع ملا۔ ان کی توجہ زبان اور محاورے سے زیادہ نفسِ مضمون پر تھی

جس کی وجہ سے اُردو نثر بہت ہی بے جا بندشوں سے آزاد ہو گئی اور زبان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آزادیاں برتنے کی گنجائش پیدا ہو سکی۔ سرسیّد نے زبان کے چٹخارے کی بجائے استدلال سے معنویت کو وقار بخشا۔ اس سے ایک موثر لسانی اسلوب وجود میں آیا جس کا تسلسل حالیؔ اور عبدالحق سے ہوتا ہوا دورِ حاضر تک پہنچا ہے۔

سرسیّد ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک زبردست مصنف، بلند خیال مفکر، جلیل القدر مصلح اور ہوشیار مدبر تھے۔ اُن کی ذات میں ایک ایسی کشش تھی جو اوروں کو اپنا ہمخیال و ہمنوا بنا لیتی تھی اسی لئے ان کے رفقائے کار میں نواب محسن الملک، نواب وقارالملک، نواب اعظم یار جنگ، مولانا حالیؔ، مولانا شبلیؔ، شررؔ، مولوی چراغ علی، مولوی زین العابدین، سیّد محمود، مولوی اقبال علی، مہدی حسن، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی ذکاءاللہ جیسی مایہ ناز ہستیاں شامل تھیں۔ گویا سرسیّد بذاتِ خود ایک نظامِ شمسی تھے جس کے گرد یہ ستارے حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے ہر فرد اپنی جگہ ایک الگ نظامِ شمسی کا مالک تھا۔ سرسیّد کی خصوصیات محسن الملک میں بھی نظر آتی ہیں۔ اسے ہم سرسیّد کی دوستی کا صلہ کہہ سکتے ہیں یا پھر ان کے ذاتی جوہر کا کرشمہ۔ بہر حال انہوں نے سرسیّد کی طرح بہت سے مذہبی مضامین تحریر کئے جو نہایت مدلل اور تحقیق کے حامل ہیں۔ اُن کی عبارت عام طور سے سلیس اور صاف ہوتی ہے۔ کہیں کہیں پرانی طرز کی تقلید میں رنگینی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ بے باکی تحریر محسن الملک کی تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

محمد حسین آزادؔ اپنے لافانی اور ناقابلِ تقلید طرزِ تحریر کی وجہ سے زندۂ جاوید ہو گئے ہیں۔ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کا حسن اور خوبصورتی اس میں ملی جلی ہے۔ مولانا شبلی آزاد کو اردو کا ایک بہت بڑا ہیرو تصور کرتے تھے اور انہوں نے آزاد کے انتقال پر اُن کو "خدائے اردو" کہہ کر یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاءاللہ بھی اُن کے بڑے مداح اور قدرداں تھے۔ اُردو نثر نگاروں میں آزاد کی ایک بہت ہی وسیع اور نمایاں ہستی ہے۔ نظم و نثر میں آپ کا طرز جداگانہ ہے۔ آپ نے نثر میں وہ کمال دکھایا ہے جو آج تک کسی ادیب کو میسّر نہ ہو سکا آپ نے اُردو ادب پر جتنے احسان کئے ہیں اُن کی نظیر ناممکن ہے۔ آزاد بے مثل انشاپرداز اور تمثیل نگار تھے۔ اُن کے اندازِ تحریر میں بلا کی شوخی، رنگینی، سادگی اور پرکاری ہے۔ اگرچہ عبارت تشبیہات اور استعارات سے بھری ہے۔ تاہم اس میں پانی کی سی روانی ہے۔

اُردو کے عناصرِ خمسہ میں نذیر احمد بھی شامل ہیں۔ آپ سرسیّد کے اصلاحی اور ارتقائی دور کی ایک کڑی تھے۔ آپ نے اُردو ادب کو اپنے زورِ قلم سے مالا مال کر دیا۔ نذیر احمد دہلی کے رہنے والے نہیں تھے مگر وہ بچپن سے دہلی میں آ رہے۔ انہیں دہلی کے محاوروں اور کہاوتوں پر عبور تھا۔ اسی لیے اُن کی تصانیف میں بڑی سادگی و بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ آپ کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے جو بہت صاف، رواں، سادہ، بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔ کہیں کہیں سنجیدہ ظرافت کی بھی چاشنی ہے۔ اور تشبیہ و استعارات کی بھی۔ اُن کی تحریر میں کہیں کہیں عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ آ جاتے ہیں جس سے

لطف کم ہو جاتا ہے۔ آپ نے اردو میں وہی مرتبہ حاصل کیا ہے جو فارسی میں
ابوالفضل اور فیضی نے حاصل کیا تھا۔ آج تک ایسی صاف اور ستھری زبان
دہلی اور لکھنؤ کے معاصرین کو لکھنے کی قدرت حاصل نہ ہوئی۔ آپ نے اردو ناول نگاری
کو مہذب اور پُرمذاق رنگ میں تحریر کر کے دکھا دیا کہ اگر حسن و عشق کے مضامین
کے علاوہ کوئی مقبول تصنیف ہو سکتی ہے تو وہ مولانائے موصوف ہی کی نثر ہے۔

حالی ایک بہترین نقاد اور بے مثل سوانح نگار تھے۔ اردو کے عناصر خمسہ
میں صرف حالی ہی ایک ایسے فرد تھے جو بیک وقت زبردست شاعر بھی تھے
اور ایک بلند پایہ نثر نگار بھی۔ مگر جس چیز نے حالی کو سب سے زیادہ
مقبول اور ہر دلعزیز بنایا وہ اُن کی دلفریب سادگی ہے جو بے رنگ ہونے کے
باوجود ایک خاص حسن کی حامل ہے۔ ان کی عبارت مبالغہ آرائی سے پاک ہے۔
ان کی تحریر نہایت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ سرسید کے بعد اگر کوئی
شخص سلیس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ تو وہ صرف حالی ہیں
مہدی فرماتے ہیں سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا
ہے تو وہ بڑھے حالی ہیں۔ یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں اعلیٰ
درجہ کے ناثر بھی ہیں۔ اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب کی رائے ہے کہ
عام طور سے حالی کی عبارت سادگی اور صفائی کی سرمایہ دار ہے ۔۔۔۔ (اس میں)
روانی ضرور ہے مگر آزاد اور شبلی کی طرح شگفتگی نہیں ہے۔ شبلی کی
طرز تحریر میں عموماً صفائی اور سادگی ہے۔ مضمون کی خشکی رفع کرنے کیلئے
دلچسپ تشبیہ اور استعارے بھی جابجا استعمال کرتے ہیں۔ آپ
زیادہ تر روزمرہ اور عام پسند الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں مگر زور کی خاطر

عربی فارسی الفاظ کی مدد سے بھی اپنا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ آپ کے
اسلوب بیان میں بلند سے بلند مضامین بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ
اردو میں لکھے جا سکتے ہیں۔ آپ کی تحریر میں تقریر کا سا لطف آتا ہے۔
شبلی کے طرز تحریر کی بڑی خوبی ہمواری کلام ہے۔ لکھنوی یا دہلوی نہ ہونے کے
باوجود بھی شبلی کی تحریر مستند مانی جاتی ہے۔ سرسید مرحوم مولانا شبلی
کو اُن کی طرز نگارش پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو لکھنؤ اور
دہلی دونوں کے لئے باعث رشک ہو۔ آزاد نے اردو زبان و ادب کا سنگِ
بنیاد رکھا اور نذیر احمد و حالی نے اس پر بہت کچھ اضافے کئے۔ لیکن اس کی
تعمیر کی تکمیل جس نے کی وہ شبلی کی ذات تھی۔

سرسید سے لیکر شبلی تک کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ تاہم اس
عرصے کے اندر نظم و نثر کے کتنے بڑے ذخیرہ کا اضافہ ہو گیا۔ خصوصاً نثر میں
مختلف موضوعات و مسائل پر نئے اصول و اسالیب کے ساتھ جس قدر
کتابیں حالی، آزاد، شبلی اور سرسید کے دوسرے رفقائے کار نے تصنیف
کیں۔ وہ ہمیں حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ
اس قلیل مدت کو ایک پورا دور قرار دیں۔ اسے جدید اردو نثر کا پہلا
دور کہہ سکتے ہیں۔ یہ اردو ادب کا افادی دور تھا۔ اس دور کے ادب کو
نیا ادب کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اسلئے کہ پرانے ادب اور اس ادب
میں ایک واضح خط فاصل آسانی سے کھینچا جا سکتا ہے اور اس کی
چند ایسی خصوصیات ہیں جن میں ایک خاص قسم کا نیا پن پایا جاتا ہے۔
اس عہد کے علمی و ادبی سرمایہ پہ نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا بخوبی

انکشاف ہوگا کہ اس دور کی نثری تصانیف میں مضامین اور موضوعات کا کتنا تنوع ہے۔ صرف تنوع ہی نہیں فکر کا انداز کتنا نیا اور نرالا ہے۔ ان دونوں باتوں کے علاوہ طرزِ بیان قدیم طرز سے کتنا جداگانہ ہے۔ اس دور کے نثری سرمایہ کے سرسری مطالعے سے ہی فی الفور یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک الگ دور کا ادبی سرمایہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس نثری سرمایہ میں ایک نئی آواز اس کے پیچھے ایک نیا شعور اور نیا ذہن نظر آتا ہے۔

اس عہد کے نثری سرمایہ کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا ہی اس مقالہ کا مقصد ہے۔ اس کے شعور و ضمیر کا جائزہ اسلئے ضروری ہے کہ یہ آج تک بھی ہمارے ذہن و فکر پر اثر انداز ہوتا رہا ہے اور اس نے شعور کے واضح ترین نقوش اور غیر مبہم اور نمایاں راستے قائم کئے ہیں۔ صحت مند ادب کی بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی فکری اور شعوری روح تندرست ہوتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کی پاکیزگی و طہارت اور اس کی تقویت و وسعت میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے ارتقاء پر ایمان و ایقان رکھتا ہے۔ ایسا ادب خود کو اس کے بنیادی اور انفرادی جذبات ابھار کر اس کی اعلیٰ اجتماعی زندگی نہ صرف ترجمانی کرتا ہے بلکہ ان کی تکمیل بھی کرتا ہے۔ جن تک پہنچ کر انسان اُن ملکوتی صفات سے متصف ہو کر اس مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ جو خود فرشتوں کی قسمت میں بھی نہیں۔ ادب انسان کے کامل تر شعور کا خالق بھی ہے اور اس کا معتبر اور نقاد بھی۔ ان تمام صفات کے لئے اس عہد کا نثری سرمایہ نمایاں و ممتاز ہے۔

اس دور کے نثری سرمایہ میں انسان کی اجتماعی زندگی کا جو عقلی تصور

اور اسکے متعلقہ مسائل کو حل کرنے کی جو باشعور کوشش کی گئی ہے وہ اس سے پہلے کے اُردو ادب میں ناپید تھی۔ مزید یہ کہ خطاب اجتماع یعنی ادیبوں کی آواز اجتماع کے توسط سے افراد تک پہنچتی ہے۔ پُرانے ادب میں خطاب افراد سے تھا یا پھر افراد کے واسطے سے اجتماع تک۔ اس عہد کے نثری سرمایہ میں پہلی مرتبہ زندگی کی مادی ضرورتوں کو براہِ راست قابلِ توجہ خیال کیا گیا اور "آنجہانی" کے بجائے "ایں جہانی" زندگی کی ترقی و تکمیل کو علانیہ مطمحِ نظر قرار دیا گیا اور یہ چیز اس سے پہلے کے ادب میں موجود نہیں تھی۔ زندگی کے برحق ہونے کا ایمان و ایقان عمل و ترقی کی اہمیت، انسان اور اجتماع کا تمدنی اور معاشی رابطہ اور ان سب سے زیادہ عقل و دانش کی برتری بلکہ ہمہ گیر نوعیت اور مادیت کی اہمیت وغیرہ۔ اس عہد کا ادب انہیں عقائد کے گرد گھومتا ہے۔

اس دور کے نثر نگاروں نے پہلی بار اپنی اردگرد اور آب و گل کی دنیا سے متعلق غور کیا۔ اس دنیا کو ایک ٹھوس زندہ اور مستقل حیثیت سے دیکھا۔ خودی اور خودشناسی کا عرفان ماقبل ادب میں پایا جاتا ہے۔ لیکن عقلی معیاروں کی روشنی میں خود کو سمجھنے کی باشعور کوشش کا آغاز اسی دور سے ہوا۔ نیچر اور کائنات کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ مختصر یہ کہ اس دور کا نثری سرمایہ فکری لحاظ سے عہد آفریں ہے۔

اس دور کے اکابر کے محبوب موضوعات میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس کی وجہ ان کے ماحول کا تقاضہ ہے۔ مذہب یا

فلسفیانہ اندازِ نظر اور عقلی استدلال کا رجحان سرسید کے علاوہ
بہت سے اور مصنفین کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ نیچر کی فوقیت
اور عقلی استدلال کی اہمیت ان سب میں قدرِ مشترک ہے۔
شبلی، نذیر احمد، محسن الملک اور دوسرے بزرگ سب اس میں
شریک ہیں۔ تاریخ کے موضوع کو بھی اس عہد میں بڑی اہمیت حاصل
ہوئی۔ اس کا مطالعہ ایک نئے زاویئے سے کیا گیا۔ اس دور کے اکابر
تاریخ کو صرف بادشاہوں کی روداد نہیں سمجھا بلکہ انسان کے
اجتماعی احوال کے بیان کو تاریخ کی کتاب کا مقدس فریضہ سمجھا گیا
پہلی مرتبہ تاریخ نگاری کو فلسفے کے ایک شعبہ کی حیثیت حاصل
ہوئی جس کے لئے چند عقلی اور سماجی اصول تراشے گئے۔ اسی
دور میں اردو کی پہلی سوانح عمریاں مرتب ہوئیں اور فنی حیثیت سے
مرتب ہوئیں۔ ان میں زندہ دلی اور خوش دلی کے ساتھ ساتھ
شخصیت کی چشمکش کے رجحان کو مدنظر رکھا گیا۔ نذیر احمد کے ناولوں
کو عموماً معیاری نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اس میں اصلاح کے مقصد کو
زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پھر بھی بلا اتفاق وہ اردو کے پہلے ناول نگار
ہیں۔ انہوں نے داستانی محیر العقول اور فرضی تفریحی فضا سے
ہٹ کر ناول کو انسانی اور اجتماعی زندگی کی حقیقی مسائل کا خادم بنایا۔

یہاں اس حقیقت کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ چونکہ بنیادی طور پر
ادب جذبات اور تخیل کی کارفرمائی کا مرہون منت ہے۔ لہذا
اس کا عمل بھی یہی ہے کہ وہ حقیقتوں اور صداقتوں کو جذبات اور

تخیل کے واسطے سے مخاطب اور قاری کے ذہن کی تربیت کرے
اور اس کی نفسیات پر اثر انداز ہو۔ دہلی کے ان نثر نگاروں کی تحریر سے
یہ واضح ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی وہ اس راز سے اچھی طرح آگاہ تھے۔
اس سلسلے میں انشا، میر امن اور دہلی کالج کے مصنفوں کے علاوہ مرزا غالب
سے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ سرسید کے
تصورِ اسلوب کو سمجھنے کے لئے اسلوب بیان کے متعلق ان کی رائے کا
مطالعہ بھی بے محل نہ ہوگا: "...... مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور
صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت جو تشبیہات و استعارات
خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں
میں رہی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ اس میں کوشش
کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی
دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"
سرسید کی اس تحریر سے ان کے تصورِ اسلوب کے ساتھ ساتھ ان کے
اپنے اسلوب بیان پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے تصورِ اسلوب کا
خلاصہ یہ ہے کہ تحریر سادہ ہونی چاہیے۔ لطف مضمون میں ہو نہ کہ ادا میں
اور جو اپنے دل میں ہو وہی دوسروں کے دل میں پڑے۔ مشہور فلسفی
شوپنہار نے اسٹائل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: "نثر کی سب سے
بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واضح اور صاف ہو۔ لیکن یہ وضاحت اور صفائی
اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک کہنے کی کوئی بات نہ ہو"۔ ویسے
ظاہر ہے کہ جب تک کوئی مقصد یا خیال سامنے نہ ہوگا، کوئی تحریر کیونکر

وجود میں آسکے گی۔ مقصد کے تعین سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ زبان
کی آرائش........ اور نمائش سے زیادہ مقصد اور اس کی تشریح
اہم ہو جاتی ہے۔ اور اس نسبت سے طبیعت سادگی اور صفائی کی طرف
مائل ہو جاتی ہے۔ استدلال اور منطقی رابطہ اس کا لازمی جزو بن جاتے ہیں۔
اردو میں اس رنگ کی ابتدا سرسید نے کی لیکن مقصد پر گہری نظر رکھنے کی
وجہ ان کے یہاں رومانی جذبہ نہیں ابھر سکا جس کی وجہ کہیں کہیں ان کی
تحریروں میں خشکی اور ناصحانہ کیفیت پیدا کر دی۔ افادیت اور مقصدیت
کی بڑھتی لے نے اسے دلکشی اور کیف و کم سے دُور رکھا۔ حالی کے اسلوب
میں سرسید کے اسلوب کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کی نثر کو
سرسید کی ترقی یافتہ شکل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن ان کی تحریروں
میں یکسانیت کہیں کہیں بڑی بُری طرح کھٹکتی ہے۔ اس عہد کے دوسرے
ادبا مثلاً نذیر احمد کو محاورہ عام بول چال اور دلی کی ٹھیٹ ٹکسالی
زبان پر غیر معمولی عبور تھا۔ ان کی عبارت میں زور اور روانی پائی جاتی ہے۔
لیکن بڑے بڑے عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کے کثرتِ استعمال
سے زبان میں برجستگی باقی نہیں رہتی مولانا محمد حسین آزاد اردو زبان کے
سب سے بڑے انشا پرداز ہیں۔ ان کی شاعری فکری اور عقلی عناصر سے
معمور ہے مگر اس میں نفسِ انسانی کے خلاؤں کو پُر کرنے کا بڑا سامان
موجود ہے۔ ان کا ادب خالص ادبی خلوص کا نتیجہ ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے
اس عہد کے دہلوی نثاروں میں شبلی کا ذکر سب سے بعد میں آتا ہے۔
سرسید کے اس معنوی فرزند کے پیشِ نظر ان کے پیش رو دہلی رفقا کے

ادبی کارنامے تھے۔ ان کے سامنے آزاد کی "آبِ حیات" و حالی کے "مقدمۂ
شعر و شاعری" کے نمونے اردو میں موجود تھے۔ تاریخ و سوانح سے متعلق انکے
پیر و مرشد کی انہیں رہبری حاصل تھی اور اپنے ذوقِ سلیم سے شبلی نے
ان میں کچھ اضافے کرنے کی غرض سے ان موضوعات پر قلم اٹھایا تو اس
زمین کو آسمان کر دیا۔ اس طرح ان کے اندازِ بیان میں ان کے ان رفقا
کا رنگ جھلکتا ہے۔ چونکہ ان کے پیشِ نظر دہلی کے ان رفقا کے ادبی
کارنامے تھے۔ اس میں وہ کچھ نئے اضافے کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ
ایسی صورت میں ان کے رفقا کے اندازِ بیان سے بھی انہوں نے ضروری
استفادہ کیا ہوگا۔ چنانچہ ان کے اندازِ بیان میں ان کے تمام رفقا کا
رنگ جھلکتا ہے۔ سرسید کا استدلال۔ حالی کی سادگی، نذیر احمد کا زور
بیان اور آزاد کی شگفتگی اور انشا پردازی کا ایک موزوں و حسین
امتزاج شبلی کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان دہلی کے
ان نثر نگاروں کے اندازِ بیان کی ترقی یافتہ شکل ہے جسے عرفِ عام میں
ہم دہلویت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ غرض اس دور میں موضوعات و اسالیب
کے نقطۂ نظر سے اردو ادب کی تاریخ میں نئے گرانمایہ اضافے ہوئے جو
اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ ادبِ عالیہ کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔
دہلی کے ان نثر نگاروں نے اپنی کاوشوں سے ایک یادگار ادبی اثاثہ بعد
کے نثر نگاروں کے لیے چھوڑا ہے۔ جس کی حیثیت سنگِ میل کی ہے۔ بعد
کے نثر نگاروں نے ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر علم و ادب
کی خدمت کی اور کسی نہ کسی شکل سے اپنے آپ کو ان سے نسبت دینے

فخر محسوس کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے نقاد بعد کے نثر نگاروں کی تخلیقات
پر ان بزرگ دہلوی نثاروں کی چھاپ دیکھ کر کسی کو سرسید کا تربیت یافتہ
کہتے ہیں تو کسی کو حالی یا شبلی اسکول سے وابستہ کرتے ہیں تو کسی کی
تحریر کو آزاد اور نذیر احمد کی صدائے بازگشت قرار دیتے ہیں۔

آج اُردو ادب میں بیش بہا اضافے ہوئے ہیں۔ تاہم ان کی اساس
میں انہیں دہلی ادبا کی فکری روح جاری ہے۔ چراغ سے چراغ روشن
ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد
منعقدہ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء میں سرسید اور علیگڑھ سے متعلق جو فرمایا
اس سے بڑھکر اور کونسی رائے مستند ہو سکتی ہے۔" سرسید نے علیگڑھ
میں صرف ایک کالج ہی نہیں بلکہ ایک علمی وسماجی مرکز قائم کیا تھا۔
جو نئے زمانہ کی روح سے پوری طرح ہم آہنگ تھا اور اس مرکز کی مرکزی
شخصیت وہ خود تھے۔ جن کے چاروں طرف اس وقت کے چند بہترین
عالم جمع ہو گئے تھے۔ شاید ہندوستان کا کوئی دوسرا اخبار یا رسالہ ایک
پوری نسل پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوا جیسے کہ سرسید کا تہذیب الاخلاق
...... "دہلوی دبستان کے دوسرے ممتاز ادیب و شاعر مولانا محمد حسین آزاد نے
۱۸۶۴ء میں لاہور کا رُخ کیا وہاں ان کے دوست پیارے لال آشوب
دہلوی اور پنڈت من پھول وغیرہ تھے۔ مولانا کے اور ان کے تعلقات
دہلی کالج کی طالب علمی کے زمانے سے تھے۔ اس زمانے میں میجر فلر ڈائرکٹر
تعلیمات تھے۔ وہ بڑے علم دوست تھے۔ ان کے بعد کرنل ہال رائڈ
ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ان بزرگوں کی سرپرستی میں آزاد اور

مولانا حالی نے جدید شاعری کے چراغ کو روشن کیا اور ایک بزم ادب انجمن
پنجاب کے نام سے قائم کی جسکے روح رواں دہلی دبستان کے یہی دو نمائندے
تھے۔ سرسید کے تربیت یافتہ علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء لکھنؤ اور
دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ذریعہ اردو کے ادیبوں کی سرپرستی کی۔ ہندوستان
میں تالیف واشاعت کے بڑے بڑے ادارے جاری ہیں اور اپنی جگہ
سب نہایت اعلیٰ پیمانے پر علم وادب اور ملک وقوم کی خدمت کر رہے
ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف دارالمصنفین کو حاصل ہے کہ وہ اسلام و
اسلامیات کا علم بردار ہے۔

"اسلامی کلچر کا اتنا عظیم الشان لٹریچر کوئی جماعت پیدا نہ کر سکی
یہ بھی علامہ شبلی کی نیک نیتی کا ثمرہ ہے ان کو علامہ سید سلیمان ندوی
اور ان کے رفقاء جیسے شاگرد اور جانشین مل گئے۔ جن کے قالب میں
شبلی کو ایک زندگی تو کیا کئی زندگیاں مل گئیں۔"

دارالمصنفین کا فیض آج بھی جاری ہے۔ مولوی وحید الدین سلیم اور
مولوی عبدالحق دونوں بغرضِ ملازمت حیدرآباد آئے۔ ان کی ادبی تربیت
سرسید اور حالی کے دامن میں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کے
ذریعہ انہوں نے اُردو زبان وادب کی جو خدمت کی اور یہاں کے
اہلِ ذوق کی جس طرح انہوں نے سرپرستی کی یہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کی
سرپرستی میں دارالترجمہ حیدرآباد نے ایک مختصر مدت میں بڑی حیرت انگیز
ترقی کی اور اُردو زبان وعلم وادب کی وہ عظیم الشان خدمات انجام دیں۔
جو اپنی مثال آپ ہیں۔ مولوی عبدالحق کا فیض آج بھی انجمن ترقی اردو کے

ذریعہ جاری ہے۔ غرض دہلوی دبستان کی حیثیت ایک مرکز کی سی ہے۔ اس مرکز سے ملک کی چاروں سمتوں میں اسکے فیض یافتہ ارکان نے علمی وادبی شمعیں روشن کیں جو آج تک روشن ہیں اور علم وادب کے ذوق کو برقرار ہیں ان شمعوں میں ظاہر ہے کہ روغن دہلی اسکول کا ہی ہے۔ علاوہ ان مراکز کے ملک کے طول وعرض میں اس دبستان کے فیض یافتہ نثر نگار پھیلے ہوئے ہیں۔ ان نثر نگاروں کو سہولت کی خاطر تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں پہلا گروہ ان نثر نگاروں کا ہے جو دہلی کی خاک سے اٹھے دہلی میں نشو ونما پائی اور دہلوی نثر نگاروں کی صحبت اٹھائی اور علمی وادبی کام کیا۔ ان کی زبان دہلی کے محاورے اور روزمرہ پر مبنی ہے۔ ان کی تحریریں۔ ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا کے مصداق ہیں۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد اب ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے نثر نگاروں کا دوسرا گروہ وہ ہے جس نے بلاواسطہ دہلی نثر نگاروں کے دامن تربیت میں نشو ونما پائی اور ان کے سایہ میں انہیں فروغ نصیب ہوا۔ تیسرا گروہ ان نثر نگاروں کا ہے جو اس دبستان سے بالواسطہ فیضیاب ہوا۔ ان تینوں گروہوں کے کارنامے اردو ادب کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اردو اور اردو داں ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ آئندہ صفحات میں ہم ان نثر نگاروں میں سے چند ممتاز نثر نگاروں کے فکر وفن کا مختصر جائزہ پیش کریں گے۔

خواجہ حسن نظامی کی طرز تحریر میں مولانا محمد حسین آزاد کی طرز کا بہت کچھ رنگ موجود ہے۔ خواجہ صاحب کے قاری پر ابتدا ہی سے

اُن کی طرز تحریر کی دلکشی کا اثر ہونے لگتا ہے۔ شروع سے آخر تک ان کی عبارت میں انتہا درجہ کا بیساختہ پن اور بے تکلفانہ انداز ہے جس میں آمد ہے اور اس سے ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص ندرت اور تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی دوسری ممتاز خصوصیت ان کے بیان کا سوز وگداز ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں موقع کو دردناک بنا دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے جو سادہ و شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔ موصوف ٹھیٹ ہندی کے فقرے بھی استعمال کرتے ہیں اور عربی فارسی کے ادق الفاظ بھی لیکن کہیں بھی روانی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ چھوٹے چھوٹے فقرے نشتر کا کام دیتے ہیں۔ تشبیہات واستعارات کی بھرمار مطلق نہیں۔ عبارت میں صفائی اور چستی کی وجہ سے تاثیر و پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی تصنیف "سی پارۂ دل" اردو میں اعلیٰ انشائیہ کی پہلی مثال ہے۔ اس طرز تحریر کا نقش اول ہمیں آزاد کی "نیرنگ خیال" کے بعض حصوں میں ملتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی جدید اردو کی دنیا میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی سوانح عمری خود لکھ کر اردو ادب میں ایک قسم کا اضافہ کیا۔ جس کتاب کا نام "آپ بیتی" ہے۔ اس میں خواجہ صاحب ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ ان کے مریدوں کی تعداد (ہندوستان میں) ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی اور تالیفات وتصنیفات چالیس سے زیادہ ہو گئیں۔

اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب کی تصنیفات اُن کے مریدوں تک یقیناً تبرکاً ضرور پہنچی ہوں گی۔ اس سے بڑھ کر دہلوی نثر و اشاعت کا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ یوں بھی پیر و مرشد مُرید کو اپنے رنگ میں رنگ ہی دیتا ہے۔ محمد حسین آزاد کے انداز تحریر کے ودسے شایق اور دلدادہ پریم چند ہیں ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں،

"مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کس طرزِ تحریر اختیار کروں کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں۔"[54]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پریم چند آزاد کی رنگین بیانی سے بھی متاثر تھے۔ بقول ..... فراق گورکھپوری "اُن کی (پریم چند کی) نثر وسیع اور مستحکم ہے۔ ان کا طرزِ تحریر ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار ہے۔"[55]

نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں کی طرح پریم چند کی ابتدائی تصنیفات میں اکثر عبارتیں فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ سے بوجھل ہیں۔ فارسی تراکیب اور اضافتیں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔[56] پریم چند نے موٹے رام شاستری کی تخلیق کر کے نذیر احمد، سرشار اور منشی سجاد حسین کی طرح اُردو کو ایک ظریفانہ کردار دینا چاہا تھا مگر اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ نذیر احمد کے تمام ناقدین مکالمہ نگاری پر اُن کی قدرت کا لوہا مانتے ہیں۔ اپنی اسی خداداد صلاحیت سے انہوں نے اپنے اصلاحی قصوں میں جو فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ پریم چند کے علاوہ اُردو کے کسی افسانہ نگار کو میسر نہ ہو سکا۔[57] اردو میں صرف پریم چند ہی ہیں جنہوں نے نذیر احمد، سرشار اور رسوا کے ورثے

اور اُن کی روایت کو سمجھا اور آگے اپنی سعی مسلسل سے آگے بڑھایا۔[58] نذیر احمد کی روایت کو اپنانے والوں میں مرزا عباس حسین ہوش، محمد جعفر الدین اور راشد الخیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[59]

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "سات کروڑ مسلمانوں میں کوئی شخص پریم چند کی سی لطیف اور سنواری ہوئی نثر نہیں لکھ سکتا ہے۔"[60]

پریم چند کی زبان نہایت شستہ اور رواں ہے اور سادگی اس کا جوہر ہے۔ یہ سادگی اور سلجھاؤ پریم چند نے ہندی سے مستعار لیا ہے۔ پریم چند کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ ہندی اور فارسی کے خزانوں سے الفاظ موقع و محل کے لحاظ سے چھانٹ کر لیتے ہیں۔ اُن کی طرزِ تحریر بعض اوقات ناہموار ہونے کے باوجود بے انتہا زور رکھتی ہے اور ان کے اندازِ بیان میں تاثیر کا جادو موجود ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں کہ "پریم چند کے بعد ہر ایسا لکھنے والا جس نے اپنی کہانیوں کا مواد زندگی سے حاصل کیا ہے کسی نہ کسی طرح پریم چند سے ضرور متاثر ہوا۔"[61]

اس سے ظاہر ہے کہ موجودہ افسانہ نگاروں کی پوری نسل پریم چند سے کم و بیش متاثر ضرور رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کا قول ہے کہ ہماری قومی آزادی کی تحریک نے ہمارے نثری ادب کو دو تحفے بخشے ہیں: ایک پریم چند کے افسانے، دوسرے ابوالکلام آزاد کے مضامین۔[62]

مولوی عبدالحق پر سب سے زیادہ اثر سرسید احمد خاں ..... اور حالی کا ہوا ہے۔ سرسید سے انہوں نے اردو کی خدمت کا

جذبہ اور کام کرنے کی دُھن اور حالیؔ سے تنقید نگاری اور طرزِ بیان
کی خوبیاں ملی ہیں۔ حالیؔ کی طرح مولوی صاحب کے طرز میں سب سے نمایاں
سادگی اور خلوص ہے۔ انداز عام فہم ہے اور زبان بول چال کی زبان سے
بہت قریب ہے۔ وہ محاورہ کا التزام نہیں رکھتے مگر محاورہ کے استعمال
سے عبارت میں لطف ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ حالیؔ اور ان کے عہد کے
دیگر مشاہیر کی طرح وہ انگریزی الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ آپ کی
نثر میں خاص پختگی ہے جس میں دلّی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے
رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کے اندازِ تحریر کے بارے میں بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ
"آپ مولانا حالیؔ کے طرز میں لکھتے ہیں لیکن ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے
آپ کا اسلوبِ تحریر زیادہ ترقی یافتہ اور پختہ ہے[93]" مگر رشید احمد صدیقی
فرماتے ہیں "اُن کے لکھنے کا اسلوب سرسیدؔ کے اسلوب کی نہایت
ترقی یافتہ شکل ہے[94]"

سرسیدؔ نے سب سے پہلے اردو نثر کو ایک ایسے اسلوب سے
متعارف کرایا جو ہر طرح کے خیالات و جذبات کے اظہار و ابلاغ کیلئے
موزوں تھا۔ مولوی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سرسیدؔ کے
اسلوب کی ابتدائی ناگزیر ناہمواریوں کو دور کر کے اس میں ادبی خوبیاں
پیدا کر دیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب انگریزی، فارسی اور
ہندی اندازِ خیال، اندازِ فکر و اندازِ بیان کے رموز سے واقف تھے اور ان
اسالیب کو انہوں نے اردو نثر میں اس سلیقہ سے سمویا کہ وہ سلیقہ
اردو کا سلیقہ بن گیا۔[95]

عبدالحق کا اصلی جوہر ان کے اسلوبِ بیان کی خوبی میں پوشیدہ ہے۔
وہ نثر نگاروں کے اس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جس کا آغاز سرسیدؔ
سے ہوتا ہے اور جس کی اُٹھان میں مولانا حالیؔ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس اسلوب
میں عبارت آرائی اور محاورے کے جا و بیجا استعمال سے زیادہ نفسِ
مضمون کی سادگی اور وضاحت پر زور دیا جاتا ہے اور یہ خصوصیات
مولوی صاحب کی تحریروں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ
حالیؔ کے مقابلہ میں مولوی صاحب کا اسلوب زیادہ سلیس اور واضح
ہوتا ہے۔ حالیؔ اسکول کے لکھنے والوں میں مولانا کا درجہ سب سے بلند
ہے آپ کی زبان مستند انداز بیان سادہ اور شگفتہ، پُراثر، دردانگیز
زوردار ہے۔

مولوی صاحب کے خطبات میں کم و بیش وہی ادبی محاسن موجود
ہیں جن کے لیے خطوطِ غالبؔ کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے یہ
ہمیں حیرت نہ کرنی چاہیئے۔ سرسیدؔ اور حالیؔ دونوں غالبؔ سے متاثر تھے۔
ان دونوں کی تحریر میں غالبؔ کی سادہ نثر کے آثار نمایاں ہیں چونکہ
مولوی صاحب سرسیدؔ و حالیؔ دونوں کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے تھے
اس لئے ان پر غالبؔ کا بلاواسطہ اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ مولوی صاحب کے
خطبات میں وہی سادگی، فصاحت اور دلنشینی پائی جاتی ہے جو سرسیدؔ
اور حالیؔ کی نثر کی خصوصیات ہیں۔ مولوی صاحب کی نثر سپاٹ پن،
روکھی پھیکی سنجیدگی اور غیر مانوس عربی و انگریزی الفاظ کی ثقالت سے
پاک ہے جو سرسیدؔ اور حالیؔ دونوں کے یہاں بعض جگہ ہمیں ملتی ہے۔

جس سادہ اور دلکش نثر نگاری کا آغاز میر امن نے کیا تھا جسے غالب نے شوخی و بے تکلفی عطا کی اور جسے سرسید اور حالی نے وسعت و جامعیت بخشی، مولوی عبدالحق کے خطبات نے اس میں پختگی کی شان پیدا کر دی[٦٦] سلام سندیلوی فرماتے ہیں کہ در اصل مولوی عبدالحق حالی کا شیخ ہے[٦٧]

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کی لسانی خدمات میں اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ اردو زبان کو وسیع اور ہمہ گیر بنانے کی عمر بھر کوشش کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو ہر قسم کے مطالبات اور خیالات ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ "وضع اصطلاحات" مولانا کی زندگی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ ہے۔

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے ذریعہ سرسید نے صحافت کے جن زریں اصولوں کی اشاعت کی ان کا ان کے رفقائے کار پر گہرا اثر پڑا۔ مولانا سلیم نے جب سرسید اور نواب محسن الملک کے بعد اس کی ادارت سنبھالی تو سرسید کے ارشادات کو ہمیشہ مد نظر رکھا۔ سرسید کی صحافتی وراثت کے اثرات مولانا کے سبھی صحافتی کارناموں میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کا رسالہ "معارف" تہذیب الاخلاق کا جانشین بالاستحقاق تھا اور بقول نذیر احمد "معارف" نے سرسید احمد خاں کی تحریر کا ترکہ پایا تھا[٦٨]

١٨٩٤ء میں مولانا سلیم سرسید کے ادبی معاون مقرر ہوئے۔ اسی زمانے سے صحیح معنوں میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کو مولانا کے ادبی رجحانات اور اسلوب بیان کی تشکیل میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ یہی وہ دور ہے جب انہیں سرسید اور رفقائے کار حالی، شبلی اور محسن الملک کی صحبت نصیب ہوئی۔

ان کا اسلوب بیان سادہ، فطری، عام فہم اور شگفتہ ہوتا ہے۔ مولانا کے دوسرے ادبی دور کے اسلوب بیان پر صحافتی انداز تحریر کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ مولانا کے اسلوب تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی ہے جو انہیں کے مربی و محسن سرسید سے ورثہ میں ملی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تہذیب و ترتیب میں ان کے ہم وطن مولانا حالی کے اسلوب بیان کو بھی بڑا دخل ہے[٦٩] غرض مولانا سلیم دبستانِ سرسید کے پیرو تھے۔ سرسید کے ہاں سادگی ہے مگر سلاست نہیں یہی وہ خصوصیت ہے جو مولانا کے اسلوب کو سرسید کے اسلوب سے ممتاز کر دیتی ہے۔

مولانا کے اسلوب کی دیگر خصوصیات میں جوش، خطابت، آمد و قار، تنوع اور بیساختہ پن شامل ہیں جن کی بنا پر ان کی نثر کو اردو انشا پردازی میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ صحت زبان، وضاحت خیال اور بیان کی سنجیدگی کے پیش نظر ان کے اسلوب پر حالی کے گہرے اثرات ہیں لیکن ان کا اسلوب حالی کی کورانہ تقلید نہیں۔ ان کی نگارش میں دلآویزی ہوتی ہے اور حالی کے برعکس آپ انگریزی الفاظ کے استعمال میں بڑی احتیاط اور اعتدال سے کام لیتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد کی پیدائش کے وقت اردو ادب کی فضا پر سرسید اور ان کے رفقائے کار چھائے ہوئے تھے۔ آزاد نے سرسید کے بڑھاپے کا آخری دور دیکھا تھا۔ محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، محسن الملک، چراغ علی وقار الملک اور مولوی نذیر احمد بھی بقید حیات تھے اور اپنے ادبی کارنامے انجام دے رہے تھے۔

مختلف مذاہب کے باہمی اختلافات کی بنا پر ملک میں خصوصاً مسلمان ذہنی انتشار میں مبتلا تھے۔ اسی زمانہ میں سرسید کی تصانیف آزاد کے زیر مطالعہ آئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی ذہنی باگ ڈور سرسید کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ان کی کتابوں کے مطالعہ نے ان کو تقلید و عدم تقلید، وہابیت و حنفیت کے دائروں سے نکال کر عقاید و افکار کی ان رفعتوں پر پہنچا دیا جہاں تمام اختلافات بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔ اب وہ ایک بت کی طرح سرسید کے پرستار بن گئے۔ "تفسیر القرآن" "تہذیب الاخلاق" اور دیگر رسائل کے مباحث شدت تاثر اور استعداد طبع سے مولانا کو تقریباً حفظ ہو چکے تھے اور مولانا اس بیش بہا علمی ذخیرہ سے نازاں تھے۔

۱۹۰۱ء میں مولانا وحید الدین سلیم نے آزاد کا حالی سے تعارف انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں کرایا۔ شبلی سے بمبئی میں آزاد ۱۹۰۴ء میں ملے۔ یہ ملاقات شبلی اور آزاد کے مابین استوار رفاقت کا باعث ہوئی۔ شبلی سے خط و کتابت پہلے ہی سے جاری تھا اور آزاد ان کی تصانیف کا مطالعہ کر چکے تھے۔ شبلی ہی کے اصرار پر آزاد لکھنؤ آئے اور "الندوۃ" کی ایڈیٹری قبول کر لی تھی۔ ابوالکلام آزاد اگرچہ "دارالمصنفین" سے متعلق نہ تھے پھر بھی شبلی کے شاگردوں میں ان کا رتبہ مسلّم ہے۔ وہ اپنے استاد شبلی سے کئی معنوں میں مختلف تھے۔ شبلی کا بیشتر وقت تالیف و تدوین میں گذرا۔ مگر آزاد نے جدید پالیسی اور صحافت کے ہمہ گیر اور موثر فن سے کام لیا۔ علاوہ ازیں ڈپٹی نذیر احمد سے بھی آزاد کے ذاتی مراسم تھے۔ ملیح آبادی کی روایت کے مطابق نذیر احمد نے اپنی

کتاب "الحقوق والفرائض" آزاد کو ریویو کرنے کے لیے دی تھی۔ اس کے پہلے وہ مولانا کو اپنے ترجمہ کا ایک نسخہ بھی دے چکے تھے۔

مذکورۂ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ سرسید اور ان کے رفقائے کار سے آزاد کے مراسم بھی تھے اور ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔

"الہلال" اور مخصوص انداز تحریر نے آزاد کو اردو کے بہترین "انشاء پردازوں" کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ آپ کی طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جملے طویل ہوں یا مختصر، توازن، تسلسل اور ربط میں مطلق فرق نہیں آتا۔ اگر کسی لفظ کی ترتیب بدل جائے تو عبارت کا لطف جاتا رہتا ہے۔ آپ زیادہ تر عربی فارسی کے ذخیرے سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات کی آمیزش سے پیدا شدہ ادبیت خاص طور پر عبارت کو دلکش اور موضوع کو بلند کر دیتی ہے۔ آزاد کے تشبیہہ و استعارے عربی و عجمی انداز کے ہوتے ہیں مگر اردو کی فضا میں نہایت برجستہ و موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

جوش و اقبال کی طرح آزاد کی تحریر میں عام طور سے جوش اور پیام عمل ہوتا ہے۔ جوش کے موقعہ پر ان کے ہر فقرہ میں سرگرمی کی آگ بھری محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نثر میں جوش و ایثار کا عنصر اس درجہ ہوتا ہے کہ ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص دلکشی اور امتیازی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی انفرادیت کا بین ثبوت ہے۔

اردو ادب کو آپ کی تحریر و تقریر سے جو فائدہ پہنچ رہا ہے وہ بذات خود اپنی جگہ نہایت اہم اور ناقابل فراموش ہے۔ اردو نثر کو فن لطیف بنانے

والوں میں آپ کو ایک مرتبہ حاصل ہے۔

ابوالکلام آزاد کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ اُن کے طرزِ اسلوبِ نگارش کو سمجھا جاتا ہے۔ اُن کا اسٹائل عظمت اور شان و شوکت کے اعتبار سے ابوالفضل سے مشابہ ہے۔ اُن کے جذبات کا سیل رواں جب اُمڈتا ہے تو راستے کے نشیب و فراز سے بے پرواہ ہو کر کوہ و دمن سے گذر جاتا ہے۔ لیکن غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی تحریروں میں جوش تو ہے لیکن حرارت نہیں ہے۔ آزاد اور غالب کے ذہن میں بڑی مماثلت ہے۔ غالب کی زندگی سے ابوالکلام کے انتہائی شغف کا غالباً یہی سبب ہے۔ بہرحال جہاں تک اُردو نثر کے اسلوب کا تعلق ہے غالب کے بعد اور اُن کی روایت کو آگے بڑھانے والے ابوالکلام دوسرے مجتہد ہیں۔ اول الذکر کے دل شوریدہ نے اپنے عہد کے طلسم پیچ و تاب کو توڑنا چاہا اور آخر الذکر نے اپنے زمانہ کی بینائیوں کو آئینہ دکھایا ہے۔

آزاد نے اُردو اسلوب میں جو جدت کی وہ غالب کی طرح خود رو یا غیر شعوری نہیں تھی۔ اُن کی فطری تڑپ، ذہنی عبقریت اور عملی سوز نے اُردو اسلوب کو نثاریت کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ آزاد کی آواز ہمارے نثری اسلوب میں اس لئے نئی تھی کہ انہوں نے طرزِ بیان کی بنیاد خالص اپنے وجدان و احساس پر رکھی اور اپنے ذہن و رُوح پر کوئی چلمن نہیں ملتی جس کی تیلیوں کے حصار میں ان کی شخصیت کا حسن ہماری نگاہِ شوق سے چشمک کرے بلکہ یہاں رُوح بے نقاب ہو کر ہمارے روبرو آ کھڑی ہوتی ہے۔ مولوی نذیر احمد کی طرح علامہ راشد الخیری بھی عورتوں کی اصلاح و ترقی کیلئے بے چین رہتے تھے۔ اُن کے ذہن و

توجہ کا بڑا مرکز صنفِ نازک کی فلاح و بہبود تھا۔ مولانا عمر بھر اسی واحد مقصد کو انجام دیتے رہے۔ آپ کی تحریر بہت کچھ مولوی نذیر احمد سے ملتی ہے۔ اُن کی زبان دلّی کی ٹکسالی زبان ہے۔ عورتوں اور بیگمات کے محاورے بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ شیرینی، ملائمت، سلاست، روانی، سادگی، شگفتگی، سوز و گداز اور اثر آپ کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بعض اوقات آپ غم کی ایسی درد انگیز تصویر کھینچتے ہیں کہ قاری کے بے ساختہ آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس لیے آپ کو "مصورِ غم" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

نیاز فتح پوری اپنے مقالہ "والد مرحوم" میں "نگار" میں لکھتے ہیں کہ

"اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" جاری ہوا اور اس کی انشاء پردازی نے مجھے بہت متاثر کیا ....

نظموں کے علاوہ میں نے نثر میں بھی سیاسی و قومی مضامین لکھنا شروع کئے جو زیادہ تر "زمیندار" میں شائع ہوتے تھے۔ اس وقت کے ادیبوں میں خان بہادر میر ناصر علی کا اسلوب تحریر بھی مجھے بہت پسند تھا۔ لیکن میں اس کی تقلید نہ کر سکتا تھا۔"

ظاہر ہے کہ نیاز نے میر ناصر علی کے اسلوب کی تقلید کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ مقالہ نگار نیاز کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۱ء "زمیندار" اور لاہور کے ادارہ میں ہوا۔ اس کے بعد میں یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء میں دہلی میں قائم ہوا...... ان کی صحافتی زندگی پر مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ اگرچہ مولانا وحید الدین سلیم اور نیاز کا ساتھ ایک بار

دفتر' زمیندار' میں ہو گیا تھا لیکن نیازؔ نے سلیم کا اندازِ صحافت بالکل قبول نہیں کیا حالانکہ وہ اپنی جگہ ایک خاص وزن رکھتا تھا۔

نیازؔ کے پسندیدہ فنکاروں میں میر ناصر علی، نذیر احمد، راشد الخیری، فکر و فن کو متاثر کرنے والی شخصیتوں میں سر سیّد احمد خاں، محسن الملک، شبلیؔ، ابوالکلام آزاد اور احباب میں ملّا واحدی، ذاکر حسین، حکیم اجمل خاں، خلیق دہلوی وغیرہ شامل تھے[۸۰]۔

"شادؔ کے مکاتیب شادؔ کی شخصی حیثیت کو UNDERRATE کرتے ہیں۔ حالیؔ کے خطوط حالیؔ کی پاکیزہ سرشت کے عکاس ہیں۔ وحشتؔ کے مکاتیب اُن کی خاکساری و انکساری کے نمائندہ ہیں۔ شبلیؔ کے نامہ ہائے شوق اس بات کا ثبوت ہیں، کہ وہ انسان تھے اور ان کے پہلو میں دل اور دل میں جذب و شوق بلکہ ہوا و ہوس کی لہر بھی تھی۔ غالبؔ کے خطوط ایک دور کی تاریخ اور خود غالبؔ کی زندگی کے فوٹو ہیں۔ اقبالؔ کے مکاتیب محض علمی دستاویز نہیں، لیکن نیازؔ کے مکاتیب میں یہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہیں اور ان کے مطالعے کے بعد اُن کی شخصیت کے بہت سارے پہلو اور اُن کے عقیدے و نظریے کے تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں۔"[۸۱]

مذہب، اخلاقیات، معاشرت اور ادب کے وہ پہلو جو سرسیّد، حالیؔ، آزادؔ، نذیر احمد، چراغ علی، شبلیؔ اور ان کے معاصرین کے زیرِ فکر تھے، انہیں کا ارتقائی تسلسل تھا جو نیازؔ، سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزادؔ، مہدی افادی، سجاد انصاری اور بعض دوسرے ادیبوں کے یہاں

ظہور پذیر ہوا۔ اصلاحی طور پر اسے رُوحانی اندازِ نظر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک نئے قسم کے اعتدال اور شاعرانہ جمال پرستی کے دور کا نتیجہ تھا۔[۸۲]

موجودہ دور کی نثر نگاری نے مختلف راستے اختیار کیے۔ طرزِ تحریر کی شگفتگی کے لیے جدت پسند طبیعتوں نے مخصوص انداز اپنائے۔ نیازؔ کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اُردو ادب میں اپنے رنگ سے قابلِ قدر اضافہ کیا۔ نیازؔ کا طرزِ بیان اور زورِ قلم امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی چیز معمولی اور سادہ سی بات کو یقینی طور پر رنگین و دلکش بنا دیتی ہے۔ نیازؔ کی تحریروں میں ہمیں قدم قدم پہ بیباکی اور آزادی پائے ملتی ہے[۸۳]۔ ان کے طرزِ تحریر میں شوخی، نزاکت خیال اور ہلکا سا مزاح بھی مل کر خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں[۸۴]۔ نیاز نے عربی اور فارسی کے بہت سے افکار اور الفاظ کو اُردو میں اس طرح ملا دیا ہے کہ وہ اب اُردو زبان کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ جدت پسندی کے ساتھ معیار کی بلندی نیازؔ کا خاص جوہر ہے۔ نیازؔ کی اَدبی خدمات کا تقاضہ ہے کہ انہیں اُردو کے ادیبوں کی صفِ اوّل میں جگہ دی جائے۔

نیازؔ کے مقالات معلومات سے پُر ہیں۔ نیازؔ انسانی سیرت کے نبّاض اور ہوشیار مبصر ہیں اور وارداتِ قلبی اتنے دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں کھو جاتا ہے۔

غرض نیازؔ کی شخصیت ایک پہلو دار شیشے (PRISM) کی سی ہے جس نے بکھری ہوئی شعاعوں کو یکجا کر کے قوسِ قزحی رنگوں میں منتشر کر دیا ہے۔

اُردو ادب میں نیاز ایک قدآور شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی گراں بہا تصانیف اُردو ادب کا عظیم ترین سرمایہ ہیں۔[85]

سیّد سلیمان ندوی شبلی کے سچے جانشین ہیں۔ آپ کی تحریر گویا شبلی کی تحریر ہے۔[86] آپ کی نثر میں نہ خشکی ہے نہ گرانی وہ نہایت سلیس اور مدلل ہے۔ آپ کی تحریر میں بیداری فکر، عالمانہ ذہنیت، صاف ستھرا پن، سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ آپ کے طرزِ بیان میں کمال دلکشی ہوتی ہے۔ وہ خشک سے خشک مضمون کو بھی اپنے طرزِ تحریر سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ ٹھوس اور علمی مضامین نہایت شگفتہ انداز میں لکھتے ہیں۔ آپ کی عبارت فلسفیانہ ہوتی ہے اور اس میں زور ہوتا ہے۔ تحریریں مدلل ہوتی ہیں اور ان میں کہیں کہیں مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ سیّد صاحب نے مذہبی موضوعات میں ادب کا سا رنگ پیدا کیا اور تحقیق و تنقید کو اس طرح قابلِ مطالعہ بنایا کہ ان کی تحریریں کسی تخلیقی ادب کی تحریروں کی مانند قبول کی جاتی ہیں۔ شبلی نے طنز کے جس دبستان کی بنیاد رکھی اس میں سیّد سلیمان نے مزید لطافت پیدا کی اور سنجیدہ و دینی موضوعات کی علمی شان برقرار رکھتے ہوئے ان کے ادبی تاثر کو بھی مدِ نظر رکھا۔[87]

عبدالماجد دریا آبادی کے بارے میں سیّد احتشام حسین رقمطراز ہیں کہ "بہت ممکن ہے کہ ابتدا میں انہوں نے آزاد اور شبلی کا رنگ پسند کیا ہو۔ مہدی افادی، حسن نظامی اور سلیمان ندوی نے (انہیں) متوجہ کیا ہو۔۔۔ لیکن شروع ہی سے ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور طرزِ اظہار میں کوئی ایسی بات ضرور ملتی ہے جو خود انہیں کی ہے۔ اگر کسی جملہ کی ساخت مولانا محمد حسین آزاد

سے مل جاتی ہے تو تحریر کا دوسرا حصہ شبلی کی یاد دلاتا ہے اور تیسرے میں ابوالکلام آزاد کی خطابت جھلکتی ہے اور طنز کا نشتر رگوں میں دور تک اُترتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر جب مکمل تحریر پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنا تاثر ایک امتیازی اور انفرادی اسلوب کی حیثیت سے چھوڑتی ہے۔ ہر دوسرے ادیب سے مختلف اور ہر تنقیدی اسلوب سے الگ۔"[88]

علامہ شبلی کی نظرِ انتخاب مولانا عبدالماجد پر اس وقت پڑی جب مولانا نے شبلی کے "الکلام" پر "الناظر" لکھنؤ میں ایک تنقیدی نظر ڈالی اور حقیقت میں مولانا عبدالماجد کا یہ مضمون ان کے ایوانِ شہرت کی پہلی اینٹ تھی۔ لطف یہ کہ سارا مضمون علامہ شبلی کی اشائل کا نہایت کامیاب چربہ تھا۔[89] علامہ شبلی نے علامہ سیّد سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی اور ابوالکلام آزاد جیسے ہیرے تراش تراش کر علمی اور اسلامی دُنیا کو دے اُٹھے۔[90]

مولانا عبدالماجد کے طرزِ انشاء کے ارتقاء کی داستان کچھ اس طرح ہے کہ انہوں نے شروع میں شبلی کا تتبع کیا اور پھر انگریزی انشاپردازوں کی شیریں بیانی اور تاثر سے اپنی عبارت اور اشارات کو آراستہ کیا۔[91]

مولانا عبدالماجد نے اپنے تنقیدی اسلوب میں حالی کے اسلوبِ تنقید کی روایت کو برتا ہے۔ لیکن ان کے ہاں وہ سادگی، سنجیدگی، متانت اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ شوخی، شگفتگی اور ایک حد تک رنگینی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

مولانا ہمارے صاحبِ طرز انشاء پردازوں کے سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ اُن کی انفرادیت خود بہ خود ان کی روشن دلیل ہے۔ ان کی تقریر و تحریر کا

کم و بیش وہی خصوصیات زورؔ کی تحریر میں بھی ملتی ہیں۔ ان کی عبارت میں ظرافت، شوخی اور طعن و تشنیع مطلق نہیں۔ وہ ہر بات متانت اور سنجیدگی سے ادا کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں فارسی اور عربی کے بھاری بھرکم الفاظ اور ترکیبیں کم ملتی ہیں۔ وہ بازاری، سوقیانہ اور مبتذل الفاظ سے احتراز کرتے ہیں۔ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

مہدی افادی کی تحریر میں تسلسل، روانی، بلند خیالی، دقیق نظری، فصاحت و بلاغت اور کہیں کہیں محاوروں اور استعاروں کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے[95] ہر معاملے کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر فلسفیانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے اور اچھوتے پیرائے میں اس کو پیش کرتے تھے۔ اقبالؔ میں اگر غالبؔ کی رُوح جلوہ گر تھی تو مہدی مجموعۂ ارواح تھے۔ بیباکی اور جوش گرمیٔ آپ کا ثمرہ تھا[96] مہدی کے اسلوب میں سارا کھیل تخیل کا ہے۔ ان کی زبان اور انداز بیان اِسی تخیل کے خون کی گرمی اور سحر خیزی محسوس ہوتی ہے اِس لیے ان کے اسلوب کی رنگینی اور بانکپن میں بیساختگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے بڑے پیارے اور خوبصورت جملے تراشے ہیں۔ اس قسم کے اسلوب میں ایک مخصوص کیف ہے، دلکشی ہے، جوبوچ، بانکپن، رنگینی اور شوخی کی پیدا کردہ ہے۔ مہدی افادی سرسید سے زیادہ محمد حسین آزاد اور شبلی سے متاثر تھے[97]۔ مہدی نے رنگینی اور بانکپن کو اس حد تک برتا ہے کہ ان کے اسلوب کی حدیں تاثراتی اور جذباتی روانی انداز سے جا ملتی ہیں۔ حالیؔ کا اثر اس میں ایک حد تک توازن

انداز قدر دور سے پہچان لیا جاتا ہے۔ ان کے مقالات میں شبلی اور محمد حسین آزاد کی اُردو خاصہ نگاری اور رنگین نگاری کی جھلک بھی پائی جاتی ہے اور محمد علی جوہر کی جرأت و بیباکی بھی[98]۔ مولانا کی کوئی تحریر ادب و زبان کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی اور کہیں تو ان کا اسلوب نگارش جو اُن کی شخصیت بن گیا ہے۔ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ وہ جیسا ماحول ہو ویسی ہی زبان اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ زبان پر قدرت اُن کی عبارت کو مسلسل و شگفتہ بنائے رکھتی ہے۔

نصیر حسین خیالؔ پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آبا و اجداد فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ میں عظیم آباد (پٹنہ) آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ جس پایہ کے نثر نگار تھے اس کے پیش نظر اگر انہیں آزادِ ثانی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہی دہلی کی ٹکسالی نرم و شیریں زبان ہے۔ وہی رَوانی اور فصاحت اُن کی عبارت کی بھی جان ہے۔ جس طرح محمد حسین آزادؔ روزمرہ اور عام فہم الفاظ سے تاثیر کا طلسم باندھتے تھے، ایسا ہی اُن کو بھی زبان و بیان پر عبور حاصل ہے۔ زور کے موقعہ پر زور اور غمناک منظر کے لیے چبھتے ہوئے دل ہلا دینے والے الفاظ ان کے ہاں ہر جگہ پہ بھی نظر آتے ہیں۔ ہر موقعہ کی تصویر نہایت دلچسپ انداز میں پیش کر دینا اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی عبارت میں اوّل تا آخر کہیں بھی ناہمواری نہیں ملتی[99]۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ (حیدر آبادی) نے اپنے تنقیدی مقالہ میں ایک جگہ حالیؔ کی طرزِ تحریر اور ان کی بعض نمایاں خصوصیات کی فہرست دی ہے۔

قائم رکھتا ہے لیکن شبلی کے سہارے وہ اس راہ پر بہت دور نکل جاتے ہیں[97]۔

عبدالحق، مولانا عبدالماجد اور مہدی افادی کا دور بہت سے لکھنے والوں کا دور ہے۔ لیکن ان کے اسالیب میں انہی رجحانات کے اثرات ملتے ہیں جو ان تینوں کے یہاں نمایاں ہیں[98]۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نثر نگاری میں مولانا حالی کی روش پر گامزن ہیں۔ حالی کے طرزِ تحریر کی سادگی، ہمواری، متانت اور پختگی جس حد تک عابد صاحب کی نثر میں پائی جاتی ہے۔ اس عہد کے کسی دوسرے نثر نگار حتیٰ کہ مولوی عبدالحق کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ حالانکہ موخرالذکر دبستانِ حالی کے خاص نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ عابد صاحب کے لب و لہجہ میں اگرچہ رعنائی یا بانکپن نہیں، تاہم وہ لطافت ضرور ہے جو پختگی، رچاؤ اور خوش سلیقگی کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ مولفینِ تاریخ ادب اردو نے بھی آپ کو نثر نگاری میں حالی کا پیرو بتایا ہے[99]۔

رشید احمد صدیقی اردو کے مشہور مزاح نگار اور طنز نگار ہیں۔ فلسفیانہ اور سنجیدہ طنز میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے ہاں اچھے اچھے فقروں، نادر تشبیہات، دلچسپ لطائف اور چست نثر کی وجہ سے ایک مخصوص شان پیدا ہو گئی ہے[100]۔ وہ لفظوں کے الٹ پھیر اور رعایت لفظی سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں چبھن ہوتی ہے جس سے موضوع (یا نشانۂ طنز) جراحت محسوس کرتا ہے[101]۔ وہ بیشک طنز و مزاح کے بادشاہ ہیں[102]۔ ان کی ظرافت کا ماحول مقامی اور مخصوص ہے اور ان کے

موضوعات زیادہ تر علی گڈھ کی اقامتی زندگی سے متعلق ہیں۔ اس لیے بعض اوقات ان کے اشارے ناقابل فہم ہو جاتے ہیں[103]۔ آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ "اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے ایک رشید احمد صدیقی بھی پیدا کیا۔ جس میں سودا کا سا تخیل، اکبر کی سی صنعت لفظی اور غالب کی سی نکتہ سنجی اور شوخی ہے۔ انہوں نے ظرافت کو ادب بنانے میں حصہ لیا ہے اور ادب کو مشرقیت کی بعض صالح قدروں کا ترجمان بنایا ہے۔ "بقائے دوام" کے دربار میں ان کی جگہ محفوظ ہے[104]۔

رشید احمد صدیقی کی نثر میں ہمیں سجاد انصاری کا اثر زیادہ ملتا ہے[105]۔ مگر ان کے ابتدائی مضامین میں حالی کی قائم کردہ روایت کا اثر غالب ہے۔ ان کے تنقیدی اسلوب میں ایک بڑا دل موہ لینے والا انداز ہوتا ہے۔ جسے لوچ اور بانکپن تو نہیں تیکھا پن کہہ سکتے ہیں۔ یہ تیکھا پن ان کے تنقیدی اسلوب میں جگہ جگہ نمایاں ہے[106]۔

آل احمد سرور دبستانِ حالی سے تعلق رکھتے ہیں[107]۔ ان کا انداز بیان عام فہم ہے۔ ان کی عبارت میں اچھی خاصی روانی ہوتی ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ ادب کو پہلے ادب سمجھتے ہیں بعد میں کچھ اور۔ وہ کسی طرح بھی عبارت کو گنجلک نہیں ہونے دیتے۔ مشکل باتوں کو بھی اپنے شگفتہ طرز تحریر سے واضح اور عام فہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں[108]۔ سرور صاحب پر ایک عرصہ تک حالی کی قائم کی ہوئی تنقیدی روایت کا اثر رہا لیکن اس میں شبلی کی رنگینی کی روایت بھی کہیں کہیں اثر دکھاتی تھی۔ بعد یہ اثر بڑھتا ہی چلا گیا جس سے ان کے اسلوب میں لوچ اور

بانکپن پیدا ہو گیا جو ان کے اسلوب میں سب سے زیادہ اہمیت رہے۔

سرورؔ صاحب پر رشید احمد کے اسلوب کا بھی گہرا اثر ہے۔ درحقیقت انھوں نے رشید صاحب ہی کے اسلوب سے اپنے اسلوب کا چراغ جلایا ہے۔ ان کے اسلوب میں زبان، الفاظ، فقروں اور جملوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں فطری روانی اور بہاؤ ہے اور اسی میں تخیل کی ایسی گلکاریاں ملتی ہیں جن کے باعث اس میں ایک خاص رنگینی اور صفائی پیدا ہو جاتی ہے۔[109]

فراقؔ گورکھپوری کے اسلوب میں ایک خاص انفرادیت ضرور ہے لیکن اس میں حالیؔ اور شبلیؔ دونوں کی قائم کردہ روایات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ جذبے کی شدت اور تخیل کی بلندی انھیں بہت اونچائی پر لے جاتی ہے۔ الفاظ کی دروبست، جملوں کی ساخت، عبارت کا بہاؤ سب کے سب مل کر ان کے اسلوب کو بذاتِ خود ایک دنیا بنا دیتے ہیں۔[110]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اسلوب میں روانی کا کیف ہے۔ اس میں ایک سادگی بلکہ سیدھا سادہ پن ہے۔ اس میں جذبے اور تخیل کی کارفرمائی مطلق نہیں۔ ان کا مقصد تو صرف بعض خیالات کا اظہار اور ترجمانی ہے۔ لیث صاحب کے سامنے حالیؔ کے اسلوب کی روایت ہے۔ جس نے ان کی رہنمائی بھی کی اور جو ان کی راہ میں حائل بھی ہوئی۔ لیث صاحب قدیم ادبی روایات اور شخصیتوں کے ساتھ ساتھ جدید مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔[111] مسعود حسن رضوی کی کتاب "ہماری شاعری" میں حالیؔ کے

تنقیدی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ آپ کی نثر سیدھی سادی ہوتی ہے۔ نرم، ملائم الفاظ کے ساتھ اس میں سلاست، روانی، دلکشی اور دلچسپی ہوتی ہے۔ طرزِ بیان نہایت شیریں اور ہموار ہے۔ آپ نے اپنی تنقیدوں میں زیادہ زور صحتِ زبان اور طرزِ بیان پر دیا ہے۔ صحیح اور سادہ نثر نگاری ان کی امتیازی خصوصیت ہے جو اپنی سادگی کے باوجود نہ تو بے کیف ہوتی ہے اور نہ خشک، بلکہ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی ساخت سے اس میں ایک خاص حلاوت اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔[112]

حالیؔ نے اسلوبِ تنقید کی جو روایت قائم کی تھی اس کے اصلی جوہر تو مجنوںؔ گورکھپوری اور سید احتشام حسین کے تنقیدی اسالیب میں کھلتے ہیں۔ جدید دور کے نقادوں میں حالیؔ کے اسلوب کی نمائندگی صحیح معنوں میں انہی دونوں حضرات نے کی ہے۔[113] مجنوںؔ گورکھپوری پر ابتدا میں نیاز صاحب کے تاثرات ثبت تھے۔ لیکن وہ جلد ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔[114]

سید احتشام حسین کا اسلوبِ بیان کافی اہم اور وزنی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر سائنٹیفک ہونے کے باوجود بے اثر و بے لطف نہیں۔ ان کی عبارت احول سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ان کی نثر میدانِ تنقید میں بڑی نمایاں حیثیت کی مالک ہے۔ پوری عبارت میں شدتِ احساس تنقیدی ضبط کے ساتھ رواں دواں نظر آتا ہے۔ حسبِ ضرورت وہ اپنی تحریر میں تقریر کا لب و لہجہ اختیار کر لیتے ہیں جو ایسے اسلوبِ بیان کے لیے موزوں نہیں۔ پھر بھی موضوع سے والہانہ شغف اس کا جواز بن جاتا ہے۔[115]

حامد حسن قادری نے نثر کے تمام اسالیب پر مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے چند بڑے کام کی باتیں بیان کی ہیں: "انگریزی تعلیم کے زیرِ سایہ اور نئی روشنی کی صبحِ صادق میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیبِ بیان پیدا ہو سکتے تھے وہ سرسید سے شبلی اور شرر تک پیدا ہو گئے۔ اس امر میں سرسید کی جامعیت حیرت انگیز ہے۔ اکیلے سرسید کی تحریر میں عالمانہ اور فلسفیانہ، متین و مزاحی، نرم و گرم ہر طرح کا اسلوب موجود ہے۔ شبلی اپنے اسلوب کے توازن و تناسب، صحت و پختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن سرسید کے جوشش کی ان میں کمی ہے۔ حالی دونوں کے درمیان ہیں، اگرچہ جوشش ان میں بھی نہیں ہے۔ حالی نے سرسید کی صحت و صفائی کو آگے بڑھایا لیکن حسن و موزونیت میں شبلی سے پیچھے رہے۔ نذیر احمد اور آزاد اپنے اپنے رنگ کے موجد و خاتم ہوئے..... بیسویں صدی میں اقسام کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اسالیبِ بیان ایجاد ہوئے..... فلسفہ و سائنس، تاریخ و سیرت، ادب و انشا، تبصرہ و تنقید، ناول و افسانہ وغیرہ مختلف موضوعات کے لئے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہو گئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یا خال خال تھی"[116]

حالی اور شبلی کی تنقیدی روایات سے جدید نقادوں کے ہاں نئے نئے روپ رنگ اور نئے نئے انداز و آہنگ اختیار کئے ہیں، اسی لیے آج ان روایات کا ساری اُردو تنقید پر گہرا اثر ہے۔

محمد حسین آزاد نے اسلوب کی جس روایت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اُس کے اثرات کسی ارتقائی صورت میں نمایاں نہ ہو سکے کیونکہ وہ

غیر فطری تھا۔ علاوہ ازیں انشا پردازی کا خیال جو آزاد کے اسلوبِ نگارش کا بنیادی محور تھا آج پس منظر میں جا پڑا ہے۔ بعض حضرات نے آزاد کی تقلید کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ان میں ایک فرحت اللہ بیگ تھے جو کبھی کبھی آزاد کے رنگ میں لکھتے تھے۔ دوسرے محمد حسین ادیب مرحوم جو آزاد کے انداز میں عرصہ تک رسالہ "ہمایوں" لاہور میں متفرق مضامین سپردِ قلم کرتے رہے۔ تیسرے سید مسعود حسن ادیب ہیں جن کی تصنیف "ہماری شاعری" اس لحاظ سے خاصی مشہور ہے اور چوتھے رسالہ "ادبی دنیا" لاہور کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد جو آخر تک اسی طرز کے مضامین لکھتے رہے۔ ان سب نے اسلوب نگارش میں آزاد کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آزاد بہر صورت آزاد ہیں اور یہ آزاد کے پابند۔[117]

سرسید اور اُن کے رفقاء و معاصرین اپنے محبوب اسلوبِ تحریر پر ابتدائے تحریر سے آخر دم تک قائم رہے۔ مگر عصرِ حاضر کے اکثر معروف اہلِ قلم اسلوبوں اور اندازوں کی طرف دوڑتے پھرے۔ پھر کہیں ایک ایک مدت کے بعد وہ کوئی روش اختیار کر سکے۔ مثال کے لیے ابوالکلام آزاد، نیاز، حسن نظامی، ملا رموزی اور رشید احمد صدیقی کے نام کافی ہیں۔[118] حالی نے اُردو ادب کی دنیا ہی بدل دی مگر شبلی نے قوم کے ذہنی افق پر روشنی ڈالی۔ سرسید کے بعد شبلی سب سے بڑے ادیب ہیں جنہوں نے آنے والی نسلوں کو اپنے فکر و فن سے متاثر کیا۔[119]

ہم نے گذشتہ صفحات میں سرسید، اُن کے رفقائے کار اور دہلی کے

دیگر نثر نگاروں کے فکر وفن پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اِس کاوش میں اُن کے عہد کے رجحانات ہمارے پیشِ نظر رہے ہیں۔ کیونکہ ان تمام نثر نگاروں کا تعلق اُردو کے عہد بہ عہد ارتقاء سے رہا ہے۔ قدیم نثر، فورٹ ولیم کالج کی نثر اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ناموران ادب کا دہلی کے دلبستان سے مقابلہ و موازنہ کرکے ہم نے دہلوی نثر کی امتیازی خصوصیات اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور آخر میں تقسیم ملک سے پہلے دہلی کے علاوہ دیگر بڑے بڑے شہروں کے اُن نثر نگاروں اور ادباء کا تذکرہ کیا جن کے فکر وفن پر دہلویت کی چھاپ ہے۔

حوالے

پہلا باب

اُردو زبان کا آغاز:-

1- اُردو ادب کی تاریخ ص ۱۸
2- ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۵۹
3- داستان زبان اُردو ص ۱۱۵
4- ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۵۸
5- باغ و بہار (دیباچہ) ص ۱۳
6- آثار الصنادید ص ۲۷۶
7- اُردوئے قدیم ص ۱۵
8- مقدمہ آبِ حیات ص ۲۰ تا ص ۲۶
9، 10، 11، 12، 13، 14، 15 ص ۵۵ ص ۵۵
16، 17، 18- پنجاب میں اُردو ص ۸۷ ص ۹۹
ص ۱۲۰ ص ۱۲۳ ص ۱۳۵ ص ۱۲۶ ص ۱۳۱
19، 20، 21، 22، 23، 24 ص ۱۵ ص ۱۲۶ تا ۱۳۱
25- داستان زبان اُردو ص ۱۲۶ - ص ۱۲۹
ص ۱۲۱ ص ۱۵۱ ص ۵۹ ص ۲۷ -

26، 27، 28- مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو
ص ۱۵، ص ۱۲۰، ص ۱۲۴
29، 30، 31، 32- داستان زبانِ اُردو
ص ۹۵ ص ۹۶ ص ۹۹ ص ۹۷ تا ص ۱۰۱
33- پاکستان میں اُردو ص ۲۲
34- ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۵۶
35- داستان زبانِ اُردو (پیش لفظ) ص ۸
36- نوائے ادب (بمبئی) ص ۷۶

دوسرا باب

قدیم نثر کا سرسری جائزہ

1، 2، 3، 4- اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء
ص ۲۲ ص ۲۳ تا ص ۲۶ ص ۲۹ ص ۳۵ -
5- داستان تاریخ اُردو ص ۱۷
6، 7، 8، 9، 10، 11، 12، 13، 14 ص ۳۵
اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۴۷
ص ۵۶ ص ۵۹ ص ۱۱۵ ص ۱۱۵ ص ۱۱۶

۱۴- اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۱
۱۵- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۱۱۹
۱۶- اردوئے قدیم ص ۱۱۶
۱۷- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۱۲۱
۱۸- اردو شہ پارے ص ۳۳
۱۹- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۱۹۰
۲۰- رسالۂ اردو جلد ششم ص ۳۹
۲۱- اردو شہ پارے ص ۷
۲۲- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۲۴۸
۲۳، ۲۴- قدیم اردو ص ۱۳۲ ص ۱۳۰
۲۵، ۲۶- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء۔
ص ۲۵۴ ص ۲۰۴

تیسرا باب

دہلی میں اردو نثر کا آغاز و ارتقاء

۱- گل رعنا ص ۲۹
۲- اردوئے قدیم ص ۴۱
۳- ہندوستانی لسانیات ص ۱۰۳
۴- تاریخ ادب اردو ص ۱۲۴
۵- نکات الشعراء ص ۳
۶، ۷، ۸، ۹ مباحث ص ۵۹ ص ۶۰ ص ۶۱ ص ۶۵
۱۰- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۲۴۹
۱۱- قصۂ مہر افروز و دلبر (پیش نامہ) ص ۲
۱۲- آب حیات ص ۳۸۵
۱۳- قصۂ مہر افروز و دلبر (پیش نامہ) ص ۳
۱۴- مضامین فرحت (حصہ ششم) ص ۱۲۵
۱۵- قصۂ مہر افروز و دلبر (پیش نامہ) ص ۶
۱۶- آثار الصنادید ص ۱۳۸
۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ قصۂ مہر افروز و دلبر
ص ۷ ص ۶ ص ۹ ص ۱
۲۱، ۲۲ اردو کی نثری داستانیں
ص ۲۱۳ ص ۲۱۴
۲۳- قصۂ مہر افروز و دلبر ص ۳
۲۴- اردو کی نثری داستانیں ص ۲۱۵
۲۵، ۲۶، ۲۷- قصۂ مہر افروز و دلبر (پیش نامہ)
ص ۱۳، ص ۱۳، ص ۱۶
۲۸، ۲۹، ۳۰ کربل کتھا ص ۱۹ ص ۱۳ ص ۱۷
۳۱- داستان تاریخ اردو ص ۴۸

۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶- کربل کتھا
ص ۱۳ ص ۱۲ ص ۳۴ ص ۳۶ ص ۴۵
۳۷- آب حیات ص ۲۲
۳۸، ۳۹- داستان تاریخ اردو
ص ۵۳ ص ۵۹
۴۰- سیر المصنفین ص ۱۰۴
۴۱، ۴۲- داستان تاریخ اردو
ص ۵۹ ص ۵۵
۴۳- سیر المصنفین ص ۱۰۵
۴۴، ۴۵- میر و سودا کا دور
ص ۳۷۸ ص ۳۷۵
۴۶- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۲۵۱
۴۷- ارباب نثر اردو ص ۱۷۸
۴۸- داستان تاریخ اردو ص ۱۳۶
۴۹- ارباب نثر اردو ص ۱۷۸
۵۰- انشاء اللہ خاں انشا (عہد و فن) ص ۱۴۲
۵۱- دریائے لطافت (اردو) ص ۳۱
۵۲، ۵۳- دریائے لطافت (اردو)
ص ۴۱ ص ۱۵۵
۵۴- انشاء اللہ خاں انشا (عہد و فن) ص ۲۳۵
۵۵- ہماری داستانیں ص ۹۵
۵۶- اردو کی نثری داستانیں ص ۲۰۴
۵۷، ۵۸- ہماری داستانیں۔
ص ۱۰۱ ص ۱۰۰
۵۹- اردو کی نثری داستانیں ص ۲۰۹
۶۰- ہماری داستانیں ص ۱۱۰
۶۱-۶۲- تحقیق و تنقید ص ۱۲۷ ص ۱۲۹
۶۳، ۶۴ ہماری داستانیں ص ۱۱۹، ص ۱۱۴
۶۵، ۶۶- داستان تاریخ اردو۔
ص ۱۵۲ ص ۱۵۴
۶۷- اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۲۸۰
۶۸- داستان تاریخ اردو ص ۱۵۶
۶۹- تاریخ ادب اردو ص ۲۴۷
۷۰- ماسٹر رامچندر ص ۷
۷۱- مرحوم دہلی کالج ص ۵
۷۲- ماسٹر رام چندر (مقدمہ) ص ۱۱
۷۳، ۷۴- مرحوم دہلی کالج ص ۷، ص ۶
۷۵، ۷۶، ۷۷- ماسٹر رامچندر (مقدمہ)
ص ۲۵، ص ۳۰
۸۰، ۸۱ مرحوم دہلی کالج ص ۱۳۳، ص ۱۲۳

۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵ - اسٹرا پچندر -
ص۱۰۱ ص۱۰۱ ص۱۰۲ ص۹۶ تا ص۱۰۱

۸۶ - شعاع ادب ص۱۲۶

۸۷، ۸۸، ۸۹ - ارباب نثر اردو
ص۳۲ ص۳۳ ص۴۱

۹۰، ۹۱ - مقدمات عبدالحق (حصہ دوم)
ص۱۱۹ ص۱۳۱

۹۲ - داستان تاریخ اردو ص۸۷

۹۳ - شعاع ادب ص۲۹

۹۴ - مقدمات عبدالحق ص۳۱

۹۵ - ارباب نثر اردو ص۱۵

۹۶ - شعاع ادب ص۲۹

۹۷ - ارباب نثر اردو ص۱۷

۹۸ - گنج خوبی از مرتبہ خواجہ احمد فاروقی۔
ص XXXIII

۹۹ - سیر المصنفین (جلد اول) ص۸۵

۱۰۰، ۱۰۱ - گنج خوبی ص۱۶ ص XV

۱۰۲ - ہماری داستانیں - ص۲۳

چوتھا باب

غالب اور معاصرین غالب

۱ - اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص۸۷

۲ - شعاع ادب ص۱۲۹

۳ - میراَمن سے عبدالحق تک ص۱۳

۴، ۵ - شعاع ادب ص۲۹، ص۲۹

۶ - میراَمن سے عبدالحق تک ص۵۲

۷، ۸ - غالب اور مطالعہ غالب
ص۳۸۰، ص۳۸۱

۹ - میراَمن سے عبدالحق (ذیلی حاشیہ)
ص۵۳

۱۰ - یادگار غالب ص۱۹۵

۱۱، ۱۲ - میراَمن سے عبدالحق۔
ص۴۷ ص۴۷

۱۳، ۱۴ - سیر المصنفین ص۲۱۸، ص۲۱۹

۱۵ - داستان تاریخ اردو۔ ص۳۳۴

۱۶ - سیر المصنفین ص۲۲۷

۱۷ - داستان تاریخ اردو ص۱۳۴

۱۸ - سیر المصنفین ص۲۳۷

۱۹، ۲۰ - داستان تاریخ اردو۔
ص۱۸۲ ص۱۸۳

۲۱ - سیر المصنفین ص۲۷۷

۲۲، ۲۳ - داستان تاریخ اردو -
ص۲۲۶، ص۲۲۷

۲۴، ۲۵ - سیر المصنفین ص۲۷۹، ص۲۷۹

۲۶ - داستان تاریخ اردو ص۱۹۳

۲۷، ۲۸، ۲۹ - میراَمن سے عبدالحق تک
ص۸۲، ص۸۳، ص۸۶

۳۰ - سیر المصنفین ص۲۴۲

پانچواں باب

سر سید، ان کے رفقا اور معاصرین

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ -
سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء

ص۱۵ ص۳۳ ص۴۴ ص۴۷
ص۵۳ ص۳۱۶ ص۳۵ ص۶۷

۹ - تنقید و تخلیق ص۱۱۴

۱۰ - فریب نظر ص۲۴۱

۱۱ - سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء ص۸۷

---

۱۲ - اردو تنقید پر ایک نظر ص۲۶

۱۳ - اردو میں تنقید ص۱۹

۱۴ - اردو تنقید کا ارتقا ص۱۹۳

۱۵، ۱۶ - اردو میں تنقید ص۲۳ ص۲۵

۱۷ - محمد حسین آزاد ص۸

۱۸ - سیر المصنفین ص۱۴۳

۱۹ - نیرنگ خیال (دیباچہ) ص۹

۲۰ - ادبی اشارے ص۲۰

۲۱ - داستان تاریخ اردو ص۱۷۱

۲۲ - محمد حسین آزاد ص۹۶

۲۳ - سیر المصنفین ص۱۷۷

۲۴، ۲۵، ۲۶ - محمد حسین آزاد۔
ص۱۱، ص۱۲۶، ص۳۰ -

۲۷ - ادبی اشارے ص۱۲۶

۲۸ - داستان تاریخ اردو ص۳۹۹

۲۹، ۳۰ - تحقیق و تنقید۔
ص۱۴۲، ص۱۴۵

۳۱ - اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ص۴۹

۳۲ - ناول کی تنقید و تاریخ ص۸۵

۳۳، ۳۴ - سرسید احمد خاں اور انکے نامور رفقا
ص ۲۶۶، ص ۲۷۶
۳۵، ۳۶ - ناول کی تاریخ و تنقید۔
جلد ۲، ص ۲۰۳
۳۷ - سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء
ص ۲۷۰
۳۸ - تحقیق و تنقید ص ۱۴۷
۳۹ - ناول کیا ہے؟ ص ۱۱۶
۴۰، ۴۱، ۴۲ - اردو ناول کی تنقیدی تاریخ
ص ۴۴، ص ۳۴۴، ص ۵۰
۴۳ - تحقیق و تنقید ص ۱۵۰
۴۴ - ناول کیا ہے۔ ص ۱۶۷
۴۵ - اردو ناول نگاری۔ ص ۱۵۴
۴۶ - تحقیق و تنقید ص ۱۵۱
۴۷ - ناول کی تاریخ و تنقید ص ۱۸۵
۴۸ - حالی کی نثر نگاری ص ۶۰
۴۹، ۵۰ - اردو میں سوانح نگاری۔
ص ۱۵۳، ص ۱۶۵
۵۱ - یادگار غالب (یادگار غالب)
ص ۵

۵۲ - اردو میں سوانح نگاری۔
ص ۱۶۶
۵۳ - یادگار غالب (یادگار غالب)
ص ۷
۵۴ - اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۱۳
۵۵ - اردو تنقید کا سرمایہ (جلد اول)
ص ۸۸
۵۶، ۵۷ - اردو تنقید کا ارتقاء
ص ۱۴۸، ص ۱۵۱
۵۸، ۵۹ - مقالات حالی (حصہ اول)
(خود نوشت سوانح حیات) ص ۲۷۱، ص ۲۷۹
۶۰ - اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۵۳
۶۱ - اردو تنقید پر ایک نظر ص ۵۵
۶۲ - مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۲۱
۶۳ - اردو تنقید پر ایک نظر ص ۹
۶۴ - مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۲۱
۶۵ - اردو میں تنقید۔ ص ۵۴
۶۶ - اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۵۶
۶۷ - مقدمہ شعر و شاعری ص ۸۶
۶۸ - اردو تنقید کا ارتقاء ص ۵۷

۶۹ - مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۴۶
۷۰ - اردو تنقید پر ایک نظر ص ۹۷
۷۱ - اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۵۹
۷۲ - اردو میں تنقید ص ۵۶
۷۳ - اردو میں تنقید کا ارتقاء ص ۱۶۰
۷۴ - اردو میں تنقید ص ۶۰
۷۵ - مقدمہ شعر و شاعری ص ۸۶
۷۶ - حالی کی اردو نثر نگاری ص ۲۳۵
۷۷ - حالی کی اردو نثر نگاری ص ۲۸۵
۷۸ - داستان تاریخ اردو ص ۲۳۹
۷۹ - مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں
ص ۴۷
۸۰، ۸۱ - سرسید احمد خاں اور ان کے
نامور رفقاء۔ ص ۱۷۰، ص ۱۷۳
۸۲ - سوانح مولانا روم ص ۱۰
۸۳، ۸۴ - سرسید احمد خاں اور ان کے
نامور رفقاء۔ ص ۱۷۲، ص ۱۷۹
۸۵ - مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب ص ۹۴
۸۶، ۸۷، ۸۸ - سرسید احمد خاں اور انکے نامور رفقا
ص ۱۸۶، ص ۱۹۰، ص ۱۹۹

۸۹ - رسالہ اردو ادب (شبلی نمبر) علی گڑھ
۹۰ - سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء
ص ۱۷۷
۹۱، ۹۲ - مقالات شبلی، رسالہ اردو ادب،
علی گڑھ
۹۳ - شبلی نامہ ص ۳۰
۹۴ - اردو ادب علی گڑھ
۹۵، ۹۶ - داستان تاریخ اردو۔
ص ۴۵۲، ص ۴۶۳
۹۷ - داستان تاریخ اردو ص ۴۲۳
۹۸ - " " ص ۴۴۴
۹۹ - " " ص ۴۸۰
۱۰۰ - مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۴۳

چھٹا باب

دہلی کے اخبار و رسائل

۱ - تاریخ صحافت اردو جلد (اول)
۲ - " " جلد دوم حصہ اول
۳ - " " جلد سوم

ساتواں باب

دہلویت

۱، ۲، ۳، ۴ - دہلی کا دبستان شاعری ص۲۲۷، ص۲۴۹، ص۲۷۹، ص۲۸۰

۵ - روایت کی اہمیت ص۵۵

۶، ۷ - اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر - ص۵۶، ص۵۷

۸ - دلی کا دبستان شاعری ص۳۵۷

۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ - محاکمہ مرکز اردو ص۱، ص۲، ص۴، ص۵، ص۶، ص۷، ص۸

۱۵، ۱۶ - قواعد اردو۔ ص۲، ص۳، ص۳

۱۷ - بابائے اردو عبدالحق ص۲۳ - ۲۲

۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲ - اردو شاعری کا سماجی پس منظر - ص۱۵۵، ص۱۰۱، ص۲۰۱، ص۳۰۳، ص۲۸۵

۲۳ - ماہنامہ آج کل (اردو دہلی) بابتہ اگست ۱۹۷۲ء - ص۸

۲۴ - بابائے اردو - عبدالحق ص۲۱

۲۵ - ہماری زبان (علی گڑھ) بابتہ اکتوبر ۱۹۷۲ء

۲۶ - روایت کی اہمیت ص۶۲

۲۷ - آب حیات ص۳۱

۲۸ - دو ادبی اسکول ص۱۱۵، ۱۱۷

۲۹ - دلی کا دبستان شاعری۔ ص۶۰، ۳۵۹

۳۰ - دیباچہ لطائف (مرتبہ عبدالحق) ص۲۸، ۲۷

۳۱، ۳۲ - دلی کا دبستان شاعری۔ ص۳۶۶، ص۳۶۷

۳۳، ۳۴ - میرامن سے عبدالحق تک ص۱، ص۲

۳۵، ۳۶ - تنقیدی نقوش، ص۱۵۲، ص۱۵۳۔

۳۷ - تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) ص۲۴

۳۸ - نقوش ادب (مرتبہ ادارۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ص۳۰ اور تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) ص۲۴۔

۳۹ - مقالہ سر سید کا لسانی اسلوب، از عتیق صدیقی (سہ ماہی ادب بمبئی بابت جولائی ۱۹۷۱ء ص۶۲

۴۰ - الف :- تاریخ ادب اردو (حصۂ نثر) ص۴۳

ب : مصنفین اردو ص۳۳

ج :- نیاز نمبر نگار پاکستان ۱۹۶۳ء

۴۱ - تاریخ ادب اردو ص۵۲

۴۲ - مصنفین اردو ص۱۴

۴۳ - نقوش ادب ص۵۷

۴۴، ۴۵ - مختصر تاریخ ادب اردو - ص۳۶۵، ص۳۶۷ -

۴۶ - مصنفین ص۲۸۰

۴۷ - شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ص۲۷

۴۸ - نیاز نمبر نگار پاکستان' مقالہ جدید اردو نثر نیاز فتحپوری اور نئی نسل از مجنوں گورکھپوری

۴۹ - مباحث ص۳۴۳

۵۰ - ماہنامہ اردو ڈائجسٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر ۱۹۷۲ء مقالہ علم کے اس سوتے بارے میں مولانا آزاد (ابوالکلام) کی رائے۔

۵۱ - داستان تاریخ اردو ص۶۱۹

۵۲ - تاریخ ادب اردو (مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد و ڈاکٹر عباداللہ۔ ص۱۴۳

۵۳ - آپ بیتی۔ خواجہ حسن نظامی

۵۴، ۵۵ - پریم چند نمبر (زمانہ) ص۱۰۱، ص۱۰۴

۵۶، ۵۷ - پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۱۴۶، ص۱۴۷

۵۸، ۵۹ - تلاش و توازن ص۳۵، ص۳۶

۶۰ - نقوش ادب ص۱۵۴

۶۱ - منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے

۶۲ - ادبی تنقید ص۱۴۳

۶۳ - تاریخ ادب اردو ص۸۵

۶۴، ۶۵، ۶۶ - بابائے اردو عبدالحق ص۹۳، ص۹۴، ص۲۰

۶۷ - ادب کا تنقیدی مطالعہ ص۲۴۳

۶۸ - معارف مصنفین ص۱۵۲، ص۱۵۶

۶۹ - وحید الدین سلیم ص۲۸۳

۷۰۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ ص ۳۸۲

۷۱، ۷۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن ص ۴۷ ص ۲۴

۷۳۔ اُردو ادب کی ایک صدی ص ۱۱۵

۷۴۔ اُردو ادب جنگ عظیم کے بعد ص ۳۱

۷۵، ۷۶۔ نقطۂ نظر ص ۳۰ ص ۱۸

۷۷۔ تاریخ ادب اُردو ص ۱۳۸ (ڈاکٹر نذیر احمد و ڈاکٹر عبداللہ)

۷۸۔ نقطۂ نظر ص ۳۰

۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲۔ نیاز نمبر (نگار پاکستان) ص ۳۹-۲۸، ص ۱۷-۱۶، ص ۳۶۱، ص ۱۳۰

۸۳۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ص ۹۴-۹۵

۸۴۔ مصنفین اُردو۔ ص ۱۲۵

۸۵۔ نیاز نمبر نگار سالنامہ پاکستان ص ۲۰۹

۸۶۔ تاریخ ادب اُردو (نذیر احمد) ص ۱۲۸

۸۷۔ اُردو ادب کی ایک صدی۔ ص ۱۱۲

۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نمبر ماہ نامہ فروغ اُردو۔ ص ۹۹، ص ۱۴۷-۱۴۸، ص ۱۱۴، ص ۲۱۶، ص ۲۲۴-۲۲۶

۹۳۔ مختصر تاریخ اُردو ص ۲۶۴

۹۴، ۹۵۔ تاریخ ادب اُردو (نذیر احمد) ص ۱۵۱، ص ۱۵۳

۹۶۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۲۷

۹۷، ۹۸۔ تنقیدی تجربے۔ ص ۷۴، ص ۷۲

۹۹۔ تاریخ ادب اُردو۔ ص ۱۴۷

۱۰۰۔ نقوش ادب ص ۱۷۴

۱۰۱۔ اُردو ادب کی ایک صدی ص ۱۴۳

۱۰۲۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۹۴

۱۰۳۔ اُردو ادب کی ایک صدی ص ۱۴۳

۱۰۴، ۱۰۵۔ نئے اور پرانے چراغ۔ ص ۴۰۳، ص ۱۶۱

۱۰۶۔ تنقیدی تجربے ص ۸۰-۸۱

۱۰۷۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ ص ۶۹

۱۰۸۔ مختصر تاریخ ادب اُردو ص ۹۵

۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱۔ تنقیدی تجربے۔ ص ۵۵، ص ۱، ص ۱۴۷

۱۱۲۔ مختصر تاریخ ادب اُردو ص ۹۴

۱۱۳۔ تنقیدی تجربے ص ۹۰

۱۱۴۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۲۶

۱۱۵۔ مختصر تاریخ ادب اُردو ص ۱۱۵

۱۱۶۔ داستان تاریخ اُردو۔ ص ۷۸۸-۷۸۹

۱۱۷۔ تنقیدی تجربے ص ۹۷

۱۱۸۔ داستان تاریخ اُردو ص ۷۸۹-۷۹۰

۱۱۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن ص ۵۶-۷۷

کتابیات

کتابیات

۱- آزاد (مولانا محمد حسین) آبِ حیات = لاہور ایڈیشن ۱۹۱۷ء

۲- اعجاز حسین (ڈاکٹر سید) مختصر تاریخ ادبِ اردو = ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

ادب و ادیب = ادارۂ انیس اردو الٰہ آباد بار اوّل ۱۹۶۰ء

۳- آل احمد سرور نئے پرانے چراغ

۴- احتشام حسین (سید) ہندوستانی لسانیات کا خاکہ (طبع جدید) (ستمبر ۱۹۶۲ء) دانش محل - امین الدولہ پارک - لکھنؤ۔

احتشام حسین (سید) ذوق ادب اور شعور۔ بار اوّل ۱۹۵۵ء ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔

۵- اسلم پرویز انشاء اللہ خاں انشاؔ - عہد اور فن - پہلی بار جولائی ۱۹۶۱ء مکتبہ شاہراہ دہلی۔

۶- اسلوب احمد انصاری تنقید و تحقیق - پہلا ایڈیشن ۱۹۶۵ء ادارۂ انیس اردو الٰہ آباد۔

۷- احسن فاروقی (ڈاکٹر) اردو میں تنقید - ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

" زیبِ نظر - اشاعت اوّل ۱۹۵۳ء مکتبہ اسلوب ۳/۳۲ د مسلم لیگ کوارٹر ناظم آباد - کراچی۔

اردو ناول کی تنقیدی تاریخ - دوسرا ایڈیشن اگست ۱۹۶۲ء ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔

۸- احسن فاروقی (ڈاکٹر) نورالحسن ہاشمی (ڈاکٹر) ناول کیا ہے؟ دانش محل امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

۹- اختر اورینوی تحقیق و تنقید۔

۱۰- اسلم فرخی مرتبہ نیرنگِ خیال - ستمبر ۱۹۶۲ء اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

۱۱- ایم حبیب خاں اردو تنقید کے معمار - اکتوبر ۱۹۶۵ء انڈین بک ہاؤس محمد علی روڈ علی گڑھ۔

۱۲- تنہا (محمد یحییٰ) سیر المصنفین (جلد اول) - شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب - اندرون لوہاری دروازہ (لاہور)

" سیر المصنفین (جلد دوم) ۱۹۳۴ء

۱۳- تمنشار الحق میر و سودا کا دور - بار اوّل۔ ۱۹۶۵ء ۱۲۱/۱ وحید آباد، کراچی ۱۸ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔

۱۴- جذبی معین احسن — حالی کا سیاسی شعور - بار اول ستمبر ۱۹۵۹ء - انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ۔

۱۵- جہاں بانو بیگم (نقوی) ایم-اے — محمد حسین آزاد - سنہ ۱۹۵۱ء ادارہ ادبیات اردو - رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدر آباد۔

۱۶- جعفر رضا (ڈاکٹر) — مرتب نیرنگ خیال - طبع ۱۹۶۷ء رام نرائن لال بینی مادھو، الہ آباد۔

۱۷- حافظ محمود خاں شیرانی — پنجاب میں اردو - دسمبر ۱۹۶۰ء مکتبہ کلیاں، بسرت گنج، لکھنؤ۔

۱۸- حامد حسن قادری — داستان تاریخ اردو۔

۱۹- حالی (خواجہ الطاف حسین) — یادگار غالب، اردو اکیڈمی سندھ، حیدر آباد۔

" — حیات جاوید

" — مقالات حالی (حصہ اول) جنرل کتاب گھر، دہلی۔

۲۰- رفیعہ سلطانہ (ڈاکٹر) — اردو نثر کا آغاز و ارتقاء - پہلا ایڈیشن مجلس تحقیقات اردو، حیدر آباد۔ فن اور فن کار، مجلس تحقیقات اردو (حیدر آباد)

۲۱- رام بابو سکسینہ — تاریخ ادب اردو۔

۲۲- نادر حسین — مرتب: مصنفین اردو - حالی پبلشنگ ہاوس

۲۳- زور (سید محی الدین قادری) — اردو شہ پارے۔

" — ہندوستانی لسانیات - مارچ ۱۹۶۰ء نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

۲۴- سید احمد خاں (سر) — آثار الصنادید - ۱۹۶۵ء سنٹرل بکڈپو اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

۲۵- سید محمد (پروفیسر) — ارباب نثر اردو ۱۹۴۲ء مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔

۲۶- سید عبداللہ (ڈاکٹر) — مباحث - ۱۹۶۵ء کتب خانہ نذیریہ مسلم منزل کھاری باولی دہلی ۶

" — سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ چمن بکڈپو، اردو بازار، دہلی ۶

" — میر امن سے عبدالحق تک۔ چمن بکڈپو دہلی ۶۔

" — اردو ادب کی ایک صدی - چمن بکڈپو دہلی ۶

۲۷- سید شاہ علی — اردو میں سوانح نگاری - اشاعتِ اوّل جولائی ۱۹۶۱ء گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی، لاہور، ڈھاکہ۔

۲۸- سیدہ جعفر (ڈاکٹر) — تنقید اور انداز نظر - نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

۲۹- سید احمد دہلوی (مولوی) — محاکمۂ مرکز اردو۔

۳۰- سہیل بخاری — اردو ناول نگاری - بار اوّل ۱۹۶۰ء مکتبۂ جدید لاہور۔

۳۱- سلام سندیلوی (ڈاکٹر) — ادبی اشارے - نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔
ادب کا تنقیدی مطالعہ - جلد چہارم ۱۹۷۳ء

۳۲- شمس اللہ قادری (حکیم سید) — اردوئے قدیم - بار سوم ۱۹۶۷ء نول کشور پریس لکھنؤ۔

۳۳- شوکت سبزواری (ڈاکٹر) — داستان زبان اردو - چمن بکڈپو - اردو بازار دہلی ۶۔

۳۴- شرافت حسین — شعاعِ ادب

۳۵- شمس الرحمن — اردو خطوط - بار اوّل جولائی ۱۹۶۴ء کتابی دنیا لمیٹیڈ دہلی۔

۳۶- شبلی (شمس العلماء مولانا) — سوانح مولانا روم - کتاب خانہ نذیریہ مسلم منزل کھاری باؤلی دہلی ۶

شبلی (شمس العلماء مولانا) — شعر العجم - جلد اوّل۔

۳۷- صدیق الرحمن قدوائی (ڈاکٹر) — ماسٹر رامچندر - اشاعتِ اوّل ۱۹۶۱ء شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی۔

۳۸- عبدالحق (ڈاکٹر مولوی) — اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام - انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

〃 — رسالۂ اردو۔

〃 — قدیم اردو - اشاعت اوّل ۱۹۶۱ء کل پاکستان انجمن ترقی اردو - اردو روڈ کراچی۔

〃 — مرحوم دہلی کالج - دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء انجمن ترقی اردو ہند دہلی

〃 — سر سید احمد خاں - حالات و افکار - ستمبر ۱۹۶۰ء - اردو مرکز - اردو بازار دہلی۔

〃 — مرتبہ - دریائے لطافت۔

۳۹- عبدالحی (سید) — گلِ رعنا - دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

عبدالرؤف عروج — مترجم - دریائے لطافت - بار اوّل ۱۹۶۲ء - آفتاب اکیڈمی اردو بازار متصل اردو کالج کراچی ۱

۴۰ - عبادت بریلوی (ڈاکٹر) — اردو تنقید کا ارتقاء = اشاعت ثانی
۱۹۵۴ء - اردو مرکز۔
اردو بازار - دہلی۔

" — غالب اور مطالعہ غالب = بار اول
جون ۱۹۶۷ء سکینہ
پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶

" — تنقیدی تجربے = پاکستانی ایڈیشن
۱۹۵۹ء

" — روایت کی اہمیت = پاکستانی ایڈیشن
۱۹۵۴ء

۴۱ - عبدالقیوم (ڈاکٹر) — حالی کی اردو نثر نگاری = طبع اول
دسمبر ۱۹۶۴ء مجلس ترقی ادب
نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ - لاہور۔

" — تنقیدی نقوش۔

۴۲ - عبدالشکور (پرنسپل) — اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ ۱۹۵۱ء
شاہ اینڈ کمپنی - آگرہ

۴۳ - علی عباس حسینی (سید) — ناول کی تنقیدی تاریخ = بار اول
انڈین بک ڈپو۔
لکھنؤ۔

۴۴ - عبداللطیف اعظمی — مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں
صفیہ اکیڈمی ناشران و تاجران
کتب ۶۱۳/۲ پی آئی بی کالونی
کراچی ۵

" — بابائے اردو عبدالحق - ۱۹۶۲ء

۴۵ - عبدالرزاق ملیح آبادی — آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی۔

۴۶ - عبدالمغنی — نقطۂ نظر۔

۴۷ - علی جواد زیدی — دو ادبی اسکول۔

۴۸ - غلام احمد فرقت کاکوروی — اردو ادب میں طنز و مزاح ۱۹۶۴ء
ادارہ فروغ اردو
لکھنؤ ۳

۴۹ - فرحت (مرزا فرحت اللہ) — مضامین فرحت (جلد ششم)

۵۰ - فرمان فتح پوری — تحقیق و تنقید = پہلی بار ۱۹۶۵ء
صاعقہ بکڈپو، مٹیا محل
دہلی ۶

۵۱ - قمر رئیس (ڈاکٹر) — پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۶۹ء

" — تلاش و توازن ۱۹۶۸ء

۵۲ - کلیم الدین احمد — اردو تنقید پر ایک نظر (مع اضافہ جدید)
۱۹۵۷ء ادارہ فروغ اردو۔
لکھنؤ

۵۳۔ گیان چند جین — اردو کی نثری داستانیں۔
بار اول۔ سنہ ۱۹۵۴ء
انجمن ترقی اردو۔ پاکستان
اردو روڈ۔ کراچی۔

۵۴۔ میر امن — باغ و بہار۔ جولائی سنہ ۱۹۶۵ء
مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی

۵۵۔ مسعود حسین خاں (ڈاکٹر) — مقدمۂ تاریخ زبان اردو۔ بار سوم
اضافہ و نظر ثانی سنہ ۱۹۵۵ء
سرسید بک ڈپو۔
علی گڈھ۔

مرتبہ قصہ مہر افروز و دلبر
شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد۔

۵۶۔ میر (امیر تقی) — نکات الشعراء

۵۷۔ محمد طاہر فاروقی — پاکستان میں اردو۔ بار اول
مارچ سنہ ۱۹۶۵ء
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور۔

۵۸۔ مرزا محمد بیگ صاحب — مرتبہ۔ مقدمات عبدالحق حصہ دوم۔
دفعہ اول ۱۹۳۱ء سلسلۂ مطبوعات
مکتبۂ ابراہیمیہ۔

۵۹۔ مالک رام و مختار الدین — مرتبہ۔ کربل کتھا۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۶۵ء
ادارۂ تحقیقات اردو۔ پٹنہ

۶۰۔ محمد صادق (ڈاکٹر) — اے ہسٹری آف اردو لٹریچر (انگریزی)

۶۱۔ محمد عبداللہ خویشگی۔ — مرتبہ مقالات سرسید۔
نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڈھ۔

۶۲۔ محمد حسن (ڈاکٹر) — مطالعہ سودا۔ ستمبر سنہ ۱۹۶۵ء
ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ۔

〃 — اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر
بار اول سنہ ۱۹۶۴ء
ادارۂ تصنیف علی گڈھ۔

۶۳۔ منظر عباسی نقوی (ڈاکٹر) — وحید الدین سلیم: حیات اور ادبی خدمات
بار اول سنہ ۱۹۵۹ء

۶۴۔ نسیم قریشی — اردو ادب کی تاریخ (بہ ترمیم و اضافہ)
سنہ ۱۹۶۹ء
فرینڈس بک ہاؤس یونیورسٹی
مارکیٹ علی گڈھ

۶۵۔ نصیر الدین ہاشمی — دکن میں اردو۔

۶۶۔ نذیر احمد عبداللہ — تاریخ ادب اردو۔

۶۷۔ نور الحسن ہاشمی (ڈاکٹر) — دلی کا دبستان شاعری

۶۸۔ وقار عظیم — ہماری داستانیں طبع اول ۱۹۶۸ء مکتبۂ عالیہ

زیارت خسروی والئ راجہ وارہ۔

رامپور۔ یو۔ پی

۶۹۔ وحید قریشی (ڈاکٹر) مقدمہ شعر و شاعری۔

رسائل

۱۔ آج کل (دہلی) اگست سنہ ۱۹۷۲ء

۲۔ ادیب شبلی نمبر

۳۔ زمانہ (کانپور) پریم چند نمبر سنہ ۱۹۳۷ء

۴۔ فروغ اردو (لکھنؤ) مولانا عبدالماجد نمبر سنہ ۱۹۷۷ء

۵۔ معارف (اعظم گڑھ) اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء

۶۔ نگار (پاکستان) نیاز نمبر سنہ ۱۹۶۳ء

۷۔ نوائے ادب (سہ ماہی۔ بمبئی) جولائی ۱۹۷۱ء

۸۔ "سہا" اردو ڈائجسٹ (دہلی) اگست سنہ ۱۹۷۲ء

۹۔ ہماری زبان (ہفت روزہ علی گڑھ) اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳	۱۰	فرھنگ	فرنگ
۳۵	۱۷	رہ	وہ
۳۶	۱۵	ولو	دو
۳۹	۹	نثر	نثری
۴۵	۱۰	مماثلث	مماثلت
۴۸	۳	صیدالاولیا	سیرالاولیا
۵۰	۱۳	علام آشنا	علام اعتنا
۶۷	۸	تھپیہ	تھیپ
۶۹	۱۸	مستقدمین	متقدمین
۸۱	۸	برُنج	برنج
۸۲	۱۲	حلدین	حلدیں
۹۱	۱۵	"ہو"	"ا"
۹۴	۱۹	ادکنندہ	مارکنندہ
۹۶	۱۲	بھی	کبھی
۱۰۲	۹	خواہر	جواہر
۱۱۰	۷	ولیث	دیسنہ
۱۱۷	۵	تیرہ ہیں	تیرھویں
۱۱۹	۱۱	عل	عمل
۱۲۰	۶	کے	سے
۱۲۸	۳	سے	نے
۱۴۵	۱۱	واقعے	واقع
۱۴۷	۱۲	سنہ ۱۱۸۵ھ	سنہ ۱۱۷۶ھ
۱۴۷	۱۴	متعدبہ	معتدبہ
۱۸۸	۱۸	تلازسے	تلازمے
۱۹۵	۵	ناخش	نامش
۲۰۳	ضمنی عنوان	۱۸۵۶ء	سنہ ۱۸۰۲ء
۲۰۳	۲	سنہ ۱۲۶۱ھ	سنہ ۱۱۲۱ھ
۲۰۶	۲	موضع	وضع
۲۰۶	۲	ستہا	تنہا
۲۱۲	۱۱	تیعج	نصیح
۲۱۷	۸	(ق)	(ف)
۲۳۲	۹	مرب	صرف
۲۳۳	۲۰	ڈھانت	ذہانت
۲۳۷	۱۵	۲۶	۲۵

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳۷	۱۹	[illegible]	۲۶
۲۴۵	۱۰	ٹیکر	ٹیلر
۲۵۵	۱۰	کے	کی
۲۵۷	۷	کام لیا	حصہ لیا
۲۷۷	۲۰	وہ	دو
۲۸۷	۱	میراحق	میرامن
۲۹۹	۹	گنج	گنج
۳۰۴	۲	نے	کے
۳۳۱	۱۲	غالبًا	غالب
۳۳۸	۵	[illegible]	[illegible]
۳۴۰	۱۲	ترجمہ کیا	ترجمہ کیا گیا
۳۶۱	۷	قرار دیتے ہیں	قرار دیتے ہیں کہ
۳۶۲	۳	میت	معیت
۳۶۲	۲۰	رویات	روایات
۳۶۷	۱۵	موجود	موجود ہے
۳۷۵	۱۹	اجرا	اجراء
۳۷۸	۱۵	علیت	علمیت
۳۹۲	۱۱	اظہار لیا	اظہار کیا
۴۰۱	۷	دہن	ذہن
۵۵۶	۲	حرف نحو معانی	حرف، نحو، معانی
۵۵۷	۲۰	کے	کی
۵۵۷	۹	تیرہ عنوانات تحت	تیرہ عنوانات کے تحت
۵۰۹	۱۰	اہل مستشرقین	ان مستشرقین
۵۱۳	۱۸	تنظریں	تنظر میں
۵۱۵	۸	دلچسپ	دلچسپ
۵۱۹	۱۵	رجحان	رجحان
۵۲۳	ضمنی عنوان	بشریٰ	بشری
۵۲۴	ضمنی عنوان	جستجو	جستجو
۵۴۱	۱۳	وظیفیہ	وظیفہ
۵۴۰	۸	آپ	اب
۵۷۰	ضمنی عنوان	رتیق الاخبار	دقیق الاخبار
۵۸۲	۹	مسئلۂ نرخناس	مسئلۂ خناس
۵۹۲	۸	محمد زین	محمد دین
۶۰۴	۹	اختلاف	بحران
۶۱۱	۲۰	پاکتاف	پاک صاف
۶۵۰	۲	اعتدال	اعتزال
۶۵۰	۳	ونود	وفود

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۳	۲۰	وہ ے کے اور ۓ سے اور ے و	وے کے اور وٗ کی جگہ ے اور ے و
۱۲۰	۱۱	آپ کو شاہ ولی اللہ	آپ شاہ ولی اللہ
۱۲۵	۱۴	اس حقیقت کا آئینہ ہیں کہ اس عہد تک کہ	اس حقیقت کا آئینہ ہیں کہ اس عہد تک۔
۱۵۱	۲۰	اُن کو عبور تھا اور	اُن کا عبور اور
۳۲۲	۲	ندوۃ المصنفین اور اسی طرح کی۔	ندوۃ المصنفین کی اور اسی طرح کی
۳۲۴	۹	رجحانات کی ترجمان ہے سید صاحب	رجحانات کی ترجمان ہے جس تک سید صاحب
۴۵۹	۱۰	انفرادیت عظمت و امتیاز کے متبذل سوقیانہ الفاظ	انفرادیت اور عظمت و امتیاز کے احساس متبذل عامیانہ و سوقیانہ الفاظ
۶۲۲	۱۸	مقصدِ حقیقی وضاحت وصراحت	مقصدِ حقیقی، وضاحت و صراحت

تمت بالخیر